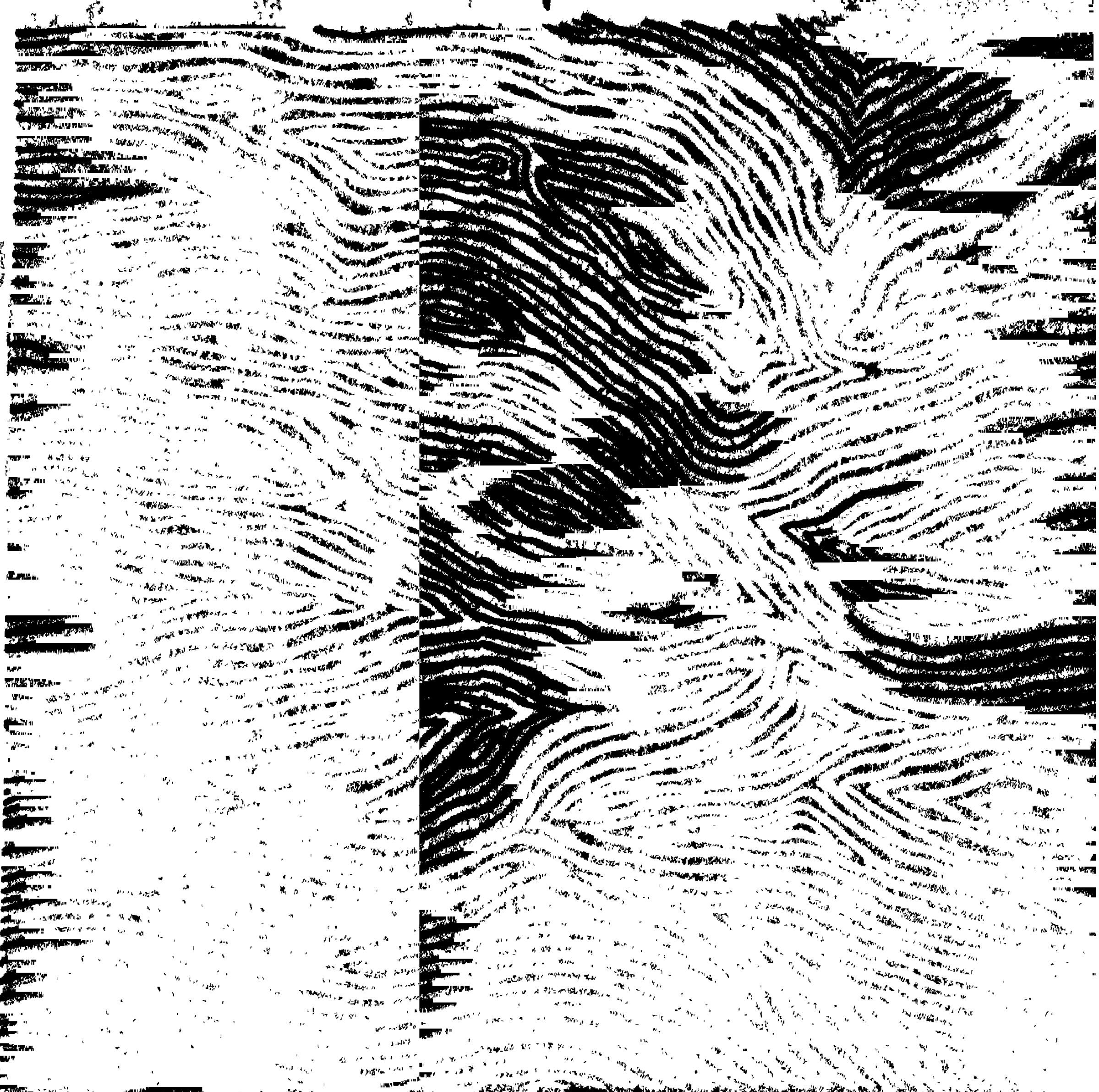
September

1977

(47)



Price : Rs. 1.25

ترتیب

[illegible]

جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت

علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

پونم

جلد (۱۳) شمارہ (۹)

ستمبر ۱۹۷۷

زرِ سالانہ ۱۵ روپے

لائبریریز کیلئے ۲۰ روپے

بیرونی ممالک سے ۲۵ شلنگ

ایڈیٹر

ناصر کرنولی ایم۔اے عثمانیہ

خط و کتابت کا پتہ

منیجر ماہنامہ پونم

16-7-300/1

اعظم پورہ، حیدرآباد ۲۴

ماہنامہ پونم میں شائع ہونے والے تمام مضامین میں نام، واقعات، کردار اور مقامات فرضی ہوتے ہیں۔ ان سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی، جس کے لئے ایڈیٹر، پرنٹر، اور پبلشر پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

طباعت : دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

[illegible]
جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت
علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

پونم

جلد (۱۳) شمارہ (۹)
ستمبر ۱۹۷۷

زرِ سالانہ ۱۵ روپے
لائبریریز کیلئے ۲۰ روپے
بیرونی ممالک سے ۲۵ شلنگ

ایڈیٹر
ناصر کرنولی ایم۔ اے عثمانیہ

خط و کتابت کا پتہ
مینجر ماہنامہ پونم
16-7-300/1
اعظم پورہ، حیدر آباد ۲۴

ماہنامہ پونم میں شائع ہونے والے تمام مضامین میں نام، واقعات، کردار اور مقامات فرضی ہوتے ہیں۔ ان سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی، جس کے لئے ایڈیٹر، پرنٹر، اور پبلشر پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار حیدر آباد

ترتیب

شاباش دھرتی ماں کے بیٹو!

آندھرا پردیش ایک زرعی ریاست ہے جس کی نصف سے زیادہ آمدنی زراعت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔

یہ ریاست ہندوستان کے زرعی نقشہ میں ایک نادر موقف کی حامل ہے۔ یہ غذائی اجناس کی پیداوار کے سلسلے میں نہ صرف یہ کہ خود مکتفی ہے بلکہ اپنے فاضل اجناس برآمد بھی کرتی ہے۔ ریاست کی ۸۰ فیصد سے زیادہ آبادی کا ذریعۂ معاش زراعت ہے۔

آندھرا پردیش نے گذشتہ دو دہوں کے دوران میں اپنی غذائی اجناس کی پیداوار تقریباً دوگنی کرلی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں غذائی اجناس کی پیداوار ۵۹ر۱۶ لاکھ ٹن تھی جبکہ ۱۹۷۶ء میں ۹۴ر۲۷ لاکھ ٹن کی ریکارڈ پیداوار حاصل ہوئی جو ۱۹۷۱-۷۲ء کی مقدار پیداوار ۶۷ر۰۸ لاکھ ٹن کے مقابلے میں ۴۰ فیصد اضافہ ہے۔

پیداوار میں یہ اضافہ زیادہ سے زیادہ اراضی پر اعلیٰ پیداواری صلاحیت کے تخموں کی کاشت کی بدولت ممکن ہوسکا۔

شاباش دھرتی ماں کے بیٹو! قوم کی خوشحالی میں تمہارا حصہ لائق تحسین ہے۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

NO. 13-77-78

LETTER NO. 786/ADVT/C3/77 Dt. 27-6-77

اقبال متین

گریباں گیر

مجھے صحیح طور پہ یاد نہیں کہ سلیمان اریب سے میری ملاقات کس سنہ میں ہوئی۔ اریب سے پہلے میں نظر حیدرآبادی سے واقف ہوا۔ پھر نظر ہی نے اریب سے ملایا۔ غالباً یہ ملاقات نامپلی روڈ پر سرِراہے ہوئی تھی۔ اِن دونوں میں سٹی کالج میں طالب علم تھا۔ اریب سے ملا تو مجھے اُن کی نظم "بنت عم" یاد آئی جس کا آخری شعر مجھے یاد تھا۔

گوری باہیں مری گردن میں حمائل کردیں
مجھ میں اللہ میں خود بینیاں حائل کردیں

یہ نظم میں نے کسی رسالے میں پڑھی تھی غالباً سب رس میں۔ یہ اِن دنوں کی بات ہے جب میں ابا کی ملازمت کے سلسلہ میں ضلع پر تھا ماہنامہ "جامعہ" میں اریب کی نثر بھی پڑھی تھی اور اُن کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ شاعر کی حیثیت سے بھی، نثر نگار کی حیثیت سے بھی۔ اپنی ہی کم آمیزی کے باعث اریب سے دوستی کی منزل تک پہونچنے میں ہماری رسمی ملاقاتوں نے بہت وقت لیا۔ ویسے اریب وسیع القلب اور کشادہ دل کے انسان تھے پھر وہ وقت بھی آیا کہ ہم ایک دوسرے کو بہت عزیز ہوئے اور ہماری دوستی مثالی سمجھی جانے لگی۔ اریب طبعاً مجلسی آدمی تھے اور میں گھر گھسنا۔ ہوسکتا ہے کہ اسی بُعدِ طبع نے ہم دونوں کو دیر تک ایک دوسرے سے دُور رکھا ہو۔

مجھے یاد ہے کہ جب ہم ایک دوسرے کے گہرے دوست ہوئے اور اریب کو صفیہ جیسی چاہنے والی بیوی ملی تو میرے مرحومہ میں اور صفیہ میں بہت گھٹنے لگی۔ میں تو پہلے ہی اریب کا ہوچکا تھا۔ میرے بھی صفیہ کی ہورہیں۔ میرا اندازہ تھا کہ اب اریب صفیہ کی رفاقت میں اپنی گھریلو زندگی کے لئے بھی اپنی "لاوبالی مصروفیات" کے اوقات کا ایک قابلِ لحاظ حصہ مختص کردے گا۔ لیکن اس بندۂ خدا میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ بجائے اس کے کہ اریب گھر کا ہورہتا، صفیہ اریب کا سایہ بن گئیں۔۔۔ ایسا سایہ جو روشنی اور اندھیرے کی تفریق کئے بغیر اریب کے ساتھ ساتھ رہا۔۔۔

سڑکوں پہ صفیہ اریب کے ساتھ ہے۔ دوستوں کی محفلوں میں، صفیہ اریب کے ساتھ ہے "صبا" کے دفتر میں صفیہ اریب کے ساتھ ہے۔ یہاں تک کہ صفیہ اریب کی تلاش میں سرگرداں ہے

"متین بھائی، اریب آئے تھے؟"

"سردار بھائی اریب آئے تھے؟"

"قیصر کیا تم سے آج اریب ملے تھے؟"

"سعید بھائی وہ تو یہ کہہ کر نکلے تھے کہ بس ابھی آپ سے مل کر لوٹتا ہوں۔ آئے ہی نہیں ۔۔۔ ؟"

اور آخر ش اس سائے نے جس کا جسم کھو گیا تھا اپنے جسم کو پالیا۔

"صفیہ میں تمھاری محبتوں سے تنگ آگیا ہوں۔ مجھے آزادی سے سانس لینے دو۔ ڈرتا ہوں کہ مرجاؤں بھی تو تم پیچھا کروگی۔"

صفیہ اور اریب کی اس رفاقت سے کتنے ہی لوگ کبیدہ خاطر تھے۔ لوگ نفرتوں کو پال رہتے ہیں۔ محبتوں کو سمجھ نہیں سکتے۔ اریب سے صفیہ کے اس والہانہ تعلقِ خاطر کو بھی لوگوں نے کئی نام دیئے۔ غیبتیں، پھبتیاں نکتہ چینیاں سب ہوئیں۔ نہ اریب کے پاؤں زنجیر ہوئے نہ صفیہ نے تعاقب چھوڑا۔

اریب کے بعد صفیہ نے مجھے اریب کا ایک خط بتلایا تھا۔ وہ لمحہ آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ صفیہ کے تو دل میں محفوظ ہوگا۔ جب صفیہ نے یہ خط مجھے بتایا تھا اور میں نے دیکھا تھا۔ میں بلاشبہ کہہ سکتا ہوں کہ الفاظ اپنے معانی اور مفہوم ایسے

ہی مقامات پر کھڑے تھے جہاں بے زبانی نطق کے اسرار و رموز منکشف کرتی ہے۔ ادیب نے سادہ کاغذ پر سینکڑوں بار صفیہ کا نام لکھا تھا اور خط کے اختتام پر اپنے نام کی جگہ پھر صفیہ لکھ دیا تھا۔ خط کی تحریر اس کے سوا کچھ نہ تھی۔ میں نے اتنا موثر خط آج تک نہیں پڑھا۔

کچھ ہی دن بعد مجھے کسی نے بتایا کہ ادیب کے اس خط کی تحریر مٹ رہی ہے جس میں صفیہ کے نام کے بار بار اعادہ نے محبت کی ایک کائنات چھپا رکھی تھی اس لئے کہ کہتے ہیں ادیب کے احباب انک ریموور INK REMOVER لے کر ادیب کے گھر کی طرف دوڑ پڑے ہیں۔

زندگی کی گیند کو اپنے سانسوں کے بلے سے چھکے اور چوکے کے اسٹروک لگانے والا یہ کھلاڑی پویلین کو واپس ہونے تک اسی طرح کھیلتا رہا۔ شک کر، تھم کر زندگی سے مخلصانہ برتاؤ کرنا اس کو آیا ہی نہیں۔ صفیہ ادیب کے سانسوں کا گن گن کر حساب رکھتیں تو پانچ دس سال پہلے ہی اس نے اپنا یہ سرمایہ لٹا دیا ہوتا جس کا نام زندگی ہے۔

ادیب نے بہت سارے رسالوں کی ادارت کی۔ جس کسی میں جوہر دیکھا اس کو ادبی دنیا سے روشناس کرایا۔ نئے لکھنے والوں کے ساتھ جس کسی میں بھی اس نے صلاحیتیں دیکھیں مربیانہ برتاؤ کیا۔ زبان و بیان کا وہ بہت خیال رکھتا تھا۔ صبا کے لئے آئے ہوئے مضامین کو بغور پڑھتا۔ زبان کی غلطیوں پر جملے درست کرتا اور مضمون میں جان ہوتی تو شریک اشاعت کر لیتا۔

ادیب جس قدر لاابالی تھا، اتنا ہی بعض معاملات میں اصولوں کو برتتا تھا۔ صبا کی ادارت کے آخری دور میں صبا کا افسانوی حصہ میرے تفویض کر دیا تھا۔ ساری کی ساری کہانیاں وہ مجھے بھجوا دیتا۔ افسانوی حصہ میں مرتب کر کے لوٹاتا اور وہ اسے من و عن شامل کر لیتا، ترتیب تک وہی ہوتی۔ ایک کہانی کی ادیب نے ایک بار مجھ سے سفارش کی کہ اس کو صبا میں شامل کر لوں۔ کہانی مجھے جچی نہیں۔ حالانکہ افسانوی ادب پر بھی ادیب کی نظر گہری تھی۔ لیکن بعض اوقات وہ مروت میں مارا جاتا تھا۔ یہی بات خود میرے تعلق سے بھی شہرت پا گئی تھی۔

لیکن ادیب کی سفارش کے باوجود میں نے کہانی منتخب نہیں کی۔ دبی زبان میں ادیب نے پھر ایک بار کہا۔ میں نے سفارش کی روشنی میں کہانی مکرر پڑھی اور خاموش ہو رہا۔ جب صبا کے تازہ شمارے کا افسانوی حصہ مرتب کر کے میں نے بھجوا دیا تو وہ افسانہ شامل نہ تھا جس کے لئے ادیب اتنا بے چین تھا۔ ملاقات ہوئی تو پوچھا۔

"تو نے وہ کہانی دیکھ لی ہے؟"

میں نے کہا — "ہاں" تمھیں اپنی مروتیں اور دوستیاں عزیز ہیں یا صبا؟

کہنے لگا — "دوستی کے آگے صبا کی کیا حیثیت ہے"

"میں نے کہا — یہ ساری گفتگو تم شعوری حصہ میں بنا ہو"۔

پوچھا — "تو تمھیں افسانہ پسند نہیں آیا؟"

میں نے کہا — "ہاں"

کہا — "ارے یار تو چاہتا تو میری خاطر اس افسانے کو کیا سے کیا بنا سکتا تھا"۔

میں نے کہا "آخر یہ دردِ سر مول لینے کی ہمیں ضرورت ہی کیا ہے"۔

کچھ ہنسی مذاق کے بعد بات آئی گئی ہوئی۔ ادیب نے ان صاحب کے تقاضے پر جن کا یہ افسانہ تھا بالآخر کہہ دیا کہ بھائی میں مجبور ہوں۔ افسانوی حصہ بالکلیہ اقبال متین دیکھتے ہیں انھوں نے پسند نہیں کیا۔ اس واقعے سے ادیب کے مزاج کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ جتنا لاابالی تھا اتنا ہی بااصول بھی تھا۔ وہ چاہتا تو خود ہی کہانی کو شامل کر لیتا یا بہ اصرار مجھ سے کہتا۔ کیوں کہ میں جانتا تھا کہ دل نہ توڑنے کے لئے ادیب نے کئی بار یوں بھی کیا کہ بعض مضامین جو کسی طرح بھی قابلِ اشاعت نہ تھے وہ تعلقات کی بنیاد پر صبا میں شامل کئے، لیکن صبا میں چھپنے تک اس مضمون کی صورت ہی بالکل بدل کر رہ گئی۔ اس نے ایک جملہ نہیں مضمون ہی بدل کر رکھ دیا۔ اس حد تک کہ خالق سے بھی اپنی تخلیق نہ پہچانی گئی۔

صفیہ بیچ کی صورتوں میں، دبی زبان میں

احتجاج کر کے رہ جاتیں۔

"تمہیں اتنا سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے اریب" ؟

اریب مسکراتا۔ اپنے لمبے بالوں کو پیچھے ہٹاتا ہوا سر اُٹھا کر قصوروار کی طرح قطعیہ کو دیکھتا ــــ مضمون کا ایک آدھ پیراگراف یا جملہ پڑھ کر سُناتا۔ ہم سب ہنستے۔ خود بھی ہم سے زیادہ ہنستا۔ پھر کہتا دیکھو میں نے اس کو یوں بنا دیا ــــ اور یوں ہنستے ہنستے مضمون ہی دوسرا بن جاتا۔

اتنی محبتیں بھی اس پاس و لحاظ کے ساتھ اس دور میں اب کون نبھاتا ہے ــ وہ شخص اس دُنیا سے اُٹھ گیا جس نے اس مضمون کی سفارش کی اور جس کو اریب ٹالنا نہیں چاہتا تھا۔ اریب بھی نہ رہا۔

اریب کو شاعر کی حیثیت سے جو کچھ ملنا تھا وہ شاید مل گیا ہے۔ وہ فکر سخن جو لفظی پیرہن میں اپنی انفرادیت کو چھوتی نظر آتی ہے اب اریب کا اسلوب فن بن رہی تھی اریب کی شاعری کا ہم تفریق و تقسیم کے ابواب میں 'رومانی' ترقی پسند یا جدید' نام رکھ لیں بھی تو اس کا مرکزی کردار ترقی پسند رجحانات کا احاطہ کرتا ہے ــــ اریب کی بعد کی شاعری میں موضوعاتی تنوع بھی اس بات کی نفی نہیں کرتا کہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ترقی پسندی سے وہ اپنا دامن بچا سکا ہے احمد آباد کے فسادات پر اس کی مشہور اور منفرد نظم اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ غیر شعوری طور پر بھی انسان دوستی کی ان صالح اقدار سے جو اریب کے فکر و شعور کا جُزو بن گئی تھیں۔ کنارہ کش ہونا اس کیلئے ممکن نہیں ہے ۔ درآنحالیکہ اریب اپنی اس نظم کو جدید نظم کہتا تھا ــ ایک نجی بیٹھک میں اریب سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی تھی ــ مشہور آرٹسٹ سعید بن محمد بھی اس وقت موجود تھے جو اُن دِنوں نقش نہ تھے ــــ اریب نے آخرش یہ تسلیم کیا تھا کہ اریب کی یہ نظم جدید نظم کی تعریف میں نہیں آتی ــــ

یہاں اہم بات یہی ہے کہ کسی نظم کے حسن و قبح کا مدار اس کے ترقی پسند یا جدید ہونے پر نہیں ہے۔ اچھی شاعری بہر حال اچھی شاعری ہے خواہ وہ کسی مکتبۂ خیال کی نمائندگی کرتی ہو یا سرے سے نہ کرتی ہو لیکن اریب کو اِدھر کچھ دِنوں سے جدیدیوں کی صف میں شامل ہو جانے کا یہاں تک خبط ہو گیا تھا کہ وہ اچھے شعر کی تعریف سننے سے زیادہ جدید کہلانا پسند کرتا تھا

اریب صاف گو اور خلیق انسان تھا۔ لیکن اپنی شاعری کے لئے اُس کا اعتماد غلو کی حد تک تھا۔ اس معاملہ وہ بہت ایگوئسٹک تھا۔ نرمی اور خلوص سے کوئی اس کے شعر پر معترض ہوتا تو وہ ایک حد تک گوارہ کر لیتا۔ بات کرنے والے کی نیت مشتبہ ہوتی تو پھر اریب اسے کسی قیمت پر نہ بخشتا۔ اپنے مخصوص انداز میں بگڑ کر کہتا کہ غالب کے بعد اگر کہیں نظر ٹھہرتی ہے تو پھر سلیمان اریب ہی پر ــ

اریب کی 'انا' تین پیگ کے بعد خود اس کو پہچاننے سے انکار کر دیتی تھی۔ اریب کی اس انانیت کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو بات بہت دور تک جاتی ہے۔ یہ چکڑپن یہ جھنجھلاہٹ' دنیا بھر کو بزعمِ خود کمتر سمجھنے کی خود بینی دراصل ڈھکی چھپی احساسِ کمتری کے بطن سے پیدا ہوتی ہے ۔ اعتماد کا فقدان بعض وقت دھیمے لہجے کو بلند آہنگی عطا کر کے خود کو مخفی رکھنے کی سعی کرتا ہے۔ اریب ایک زمانے تک اسی جذبے کا شکار رہا ہے۔ وہ پیپلز رائٹرس اسوسی ایشن کا جنرل سکریٹری بھی رہا۔ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بھی رہا لیکن اس دور میں بھی اُس کی شاعری اس کے اپنے کسی لہجے کی پہچان نہ بن سکی تھی۔ فیض اخترالایمان' مخدوم' کیفی اعظمی اور نیاز حیدر کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی آواز تھی جو ترقی پسند شاعری میں پہچانی جاسکتی تھی۔ اریب کو تو وہ بڑھاوا بھی نہ مل سکا جو ان سہاروں کے برتے پر دوسروں کو وقتی طور پہ سہارا مل رہا تھا اریب جب اسوسی ایشن اور پارٹی سے ٹوٹا تو اُس کا ذہنی ورثہ صحت مند تھا ــ اقلیم سخن کی تنہا راہ نوردی نے جب سہارے چھین لئے تو اسی ذہنی ورثے نے اپنا جوہر اُس کے شعر میں

[illegible] کیوں کہ کچھ دنوں پاکر اپنی بُنَت ہونے کا غیر شعوری احساس اس کے شعر میں جاگزیں ہوا۔ اور اسی ورڈ دیدہ وری نے آریب کے شعر کو ایک جہت اور ایک مخصوص لہجہ ابھی پوری طرح عطا بھی نہ کیا تھا کہ وہ جدیدیت سے بھرپور آگہی کے بغیر اس کا شکار ہوا۔ میں نے شکار کا لفظ سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے اس سے جدیدیت پہ کوئی حرف نہیں آتا لیکن شاعری کے خارجی عوامل کا داخلی جذبات سے اتصال جو اجتماعیت کو انفرادیت کا رنگ عطا کرتا ہے، ضرور معرضِ بحث میں آتا ہے۔ کسی بھی تصورِ حیات کا فن بن جانا اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک کہ داخلی احساس و شعور کی آنچ میں تپ کر شخصیت کا جزو نہ بنے۔ یہی بات تھی کہ آریب کی شاعری کا خاص طور پر ان کی غزلوں میں جو مزاج اور لہجہ بن رہا تھا اس کی صورت گری ابھی مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ آریب نے پینترہ بدل دیا یہ دراصل کسی سہارے کی تلاش تھی جو فن کے کس بل کی کمی سے پیدا ہوئی تھی۔ اُس کی جدید نظموں میں کم نظمیں ہیں جو اچھی ہیں ـــ مجھے یاد ہے میں نے آریب سے اس نکتۂ نگاہ سے بات بھی کی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ اپنے سسرالی مکان موقوعہ معظم جاہی مارکٹ میں مقیم تھا۔ گفتگو کے دوران ترقی پسندوں سے لے کر جدیدیوں تک قریب قریب سارے کمزور شاعر زیرِ بحث آ رہے تھے جو اپنے فن کے کس بل پر نہیں بلکہ تحریک کے حواریوں کے نعرے اُوپر اٹھائے جا رہے تھے۔ جدیدیئے تو ترقی پسندوں سے چار ہاتھ آگے نکلے۔ وہ تو تحریک کے لفظ سے بھی بدکنے لگے اور اس کو روحِ کلام دیا۔ الفاظ کی اس بازی گری میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ڈھکا چھپا رہا سب کچھ ہے جو سیاست سے لے کر ادبی سیاست تک کارفرما ہوتا ہے۔ ورنہ سجاد ظہیر اور فاروقی نے ایک ہی رول ادا کیا ہے اس قبیلے کے سرکاروں میں عالی تھے جو ہر لحاظ سے بڑے فن کار تھے۔ تخلیق کا وہ کسب نہ سجاد ظہیر کے حصے میں آیا نہ فاروقی کے بس کا روگ ہوا اسی لئے یہ دونوں کوئی تخلیقی کام نہ کر سکے، تحریک کی قیادت اور بات ہے حالانکہ شاعری دونوں ہی نے کی۔ سجاد ظہیر نے میزان اور اسکیل توڑ کر اور فاروقی نے میزان اور اسکیل پکڑ کر۔ فرق صرف صورتوں کا ہے باقی رہے نام اللہ کا...

ہاں تو جب اریب سے بات ہوئی تھی اس کے چار چھ دن بعد ہی آریب سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ اُس نے اُس دن کی بات کا اس حد تک اثر قبول کیا ہے کہ ایک نہیں تین تازہ غزلیں اسی گفتگو کے حوالے سے سنائی تھیں۔ اسی بات سے آریب کی اُفتادِ طبع کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ادبی نظریات میں بھی ہر سطح پر تیرتی ہوئی کشتیوں کے بادبانوں سے ہوا کے رُخ کا اندازہ کر کے [illegible] [illegible] گے۔

ہمارے گروپ میں ایک بہت تیز آدمی تھا۔ تھا اس لئے کہ اب پاکستان میں ہے۔ نام تھا سردار سلیم، خاندانی پٹھان، نک سُک کا درست لیکن مشتِ استخواں بلا کا ذہین و فطین۔ ہم سب کا پیارا لیکن لڑنے جھگڑنے میں ماسٹر۔ آریب نے جدید نظموں کے اعلان کے ساتھ جب کچھ نظمیں کہیں اور بہ اصرار سُنا سُنا کر داد چاہی تو احباب یا تو خاموش ہو رہے یا داد دی۔ سردار سلیم کسی لوز بال LOOSE - BALL کو BOUNDRY تک پہنچائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے آریب کی ان جدید نظموں کا پُرزہ کر کے رکھ دیا۔ آریب نہ مانا۔ سردار سلیم بھی خاموش رہنے والا کہاں تھا۔ کرنول پہنچ کر جہاں اُن دنوں وہ رہتا تھا۔ اُس نے آریب کو ایک خط لکھا کہ اس کی ایک بھانجی کو شاعری کا خبط ہو گیا ہے۔ یہ لڑکی مجھے بہت تنگ کرتی ہے۔ لیکن اس کی نظمیں دیکھتا ہوں تو بڑا اسپارک نظر آتا ہے۔ میں نے بہترا سمجھایا کہ کوئی اور ڈھنگ کا کام کرے لیکن اس پر تو شاعری کا بھوت سوار ہے تمہارے مقابلے نے اس کے توسنِ سخن کو اور بھی مہمیز کیا ہے ـــ اور اب تو وہ بے لگام ہو گئی ہے۔ ادھر تمہاری کوئی نظم تب میں دیکھی ادھر اپنی تازہ نظم لئے دوڑی آئی۔ ناک میں دم کر رکھا ہے

میں اس کی یہ چار چھ نظمیں تمہارے پاس بھجوا رہا ہوں۔ تم ہی انصاف کرو۔ ایسا ہی کچھ سردار نے لکھا تھا۔ اس کا خط سامنے نہیں ورنہ من وعن نقل کرتا۔ آریب نے شاید اس کے خط کے ساتھ ہی یہ نظمیں صبا میں شائع کر دیں۔ لیکن جب یہ سلسلہ اور بڑھا تو اریب سمجھ گیا کہ پس پردہ کون مغنیٔ آتش نفس ہے جو پلے بیک سنگر بن گیا ہے۔

"کرڈی کی خوشبو تک پہونچنے میں اریب نے جو ذہنی سفر طے کیا تھا، کاش وہ سفر اور طویل ہو سکتا اور اریب ہم کو ایسی ہی شاعری اور دے سکتے۔ اس ذہنی سفر کے احاطے کے لئے ایک علٰحدہ مضمون چاہیئے۔

شراب جہاں بہت سوں سے اچھا سلوک نہیں کرتی وہ وہ لوگ ہیں جو شراب سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ ورنہ شراب بہت مہذب شئے ہے۔ آپ اس سے اس کی منزلت کو تسلیم کر کے ملیں۔ جھک کر ملیں، انکسار سے ملیں تو آپ کی خوشی اور غم دونوں میں اس سے بہتر کوئی دلداری و دلجوئی کرنے والا نہیں ہوتا۔ اکڑ کر شراب کی بارگاہ میں نہیں جانا چاہیئے۔ وہ بڑے بڑوں کا کس بل نکال دیتی ہے۔ ذرا راز داری میں اگر آپ کچھ اور کہنے کی اجازت دیں تو میں کہوں کہ شراب سے مباشرت کرتے وقت اس کے تقدس کا احساس دل کے کسی گوشے میں چھپا رہنا چاہیئے ورنہ شراب آپ کو زمانے بھر میں رسوا کر کے رکھ دے گی۔ عورت کے نشے اور شراب کے نشے میں اس فرق کو بہرحال ملحوظ رکھنا ہوگا۔ ورنہ ہندوستانی عورت کی طرح شراب ہر ظلم نہیں سہہ لیتی۔ آریب کی یہی کمزوری تھی کہ وہ شراب کو باندی سمجھتے تھے اور شراب ایسے کسی پندار کو خاطر میں نہیں لاتی۔ چنانچہ ہوا یہی کہ شراب نے اریب کو کم بدنام کیا۔ شراب کو بدنام کرنے والوں میں اریب نے نمایاں حصہ لیا۔ شراب اس کی کمزوری تھی لیکن شراب کے اثر سے نکل کر وہ اپنی غلطی کو کھلے دل سے تسلیم کر لیا کرتا تھا۔ اس ایک واقع یا حادثے سے اس کی خود بینی اور خود احتسابی کا بیک وقت اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی اور شہریار کسی مشاعرہ کے سلسلہ میں علیگڑھ سے آئے ہوئے تھے۔ بمبئی سے عزیز قیسی بھی آگئے تھے۔ ان تینوں کے ساتھ شاذ تمکنت، عوض سعید اور میں ایک اچھی سی شام گزارنا چاہتے تھے۔ ایک شام جانس میں محفل سجائی گئی۔ شغل مے جاری تھا اور واقعی محفل کا لطف آنے لگا تھا۔ اردو شاعری پہ بات ہو رہی تھی۔ اتنے میں سلیمان اریب آگئے۔ اریب پہلے ہی سے "طلوع" ہو کر آئے تھے۔ آس حد سے شاید آگے نکل آئے تھے جہاں زد اپنی خود احتسابی کو خود بینی کے حوالے کر دیتے تھے۔ صنف غزل معرض بحث میں آئی تو شہریار نے برسبیل تذکرہ کہا کہ
"ان دنوں پاکستان میں اچھی غزل لکھی جا رہی ہے"

یہ بات شہریار نے بالکل کھلے دل سے کہی تھی۔ ان دنوں اریب نے بھی اچھی غزلیں کہی تھیں۔ شہریار نے پاکستان میں غزل کی جو بات کی تھی وہ بڑی حد تک درست تھی اور پھر ذاتی طور پر کسی شاعر سے اس کا کوئی علاقہ نہ تھا۔ سچ پوچھیئے تو ان دنوں شاذ اور خود شہریار اور اعظمی نے بھی اچھی غزلیں کہی تھیں۔ لیکن یہ بات اریب کو کھل گئی۔ وہ ایک دم شہریار پہ برہم ہو گئے۔ جو محفل علمی سطح پہ بہت ہی مہذب انداز میں برپا تھی ایسی تہس نہس ہوئی کہ جی جل کر رہ گیا۔ اس وقت آریب اس کے اہل ہی نہ تھے کہ کوئی بات سنجیدگی سے اُن سے کی جاتی۔ عزیز قیسی، اریب کے مزاج کے اس پہلو سے واقف تھے کہ انہیں منانے سے کام نہ چلے تو پیار سے ڈرا دھمکا کر بھی کام نکالا جا سکتا ہے۔ سو انہوں نے دہی کیا اور اریب کو لے کر چلے گئے۔ میں، شاذ اور عوض بے حد شرمندہ تھے۔ اعظمی اور شہریار ہمارے مہمان تھے۔ ہم نے حیدرآباد بلا کر اُن کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ ہماری معذرت پر اُلٹے دونوں ہی ہماری دلجوئی کر رہے تھے۔ میں ان دونوں سے پہلی بار ملا تھا۔ اور زیادہ ہی متاثر اور دکھی تھا۔ آریب کے جانے کے بعد بھی انہوں نے اریب کے تعلق سے کچھ نہ کہا۔

گفتگو کے موضوع بدل گئے بلکہ دانستہ بدل دیئے گئے لیکن دلوں کی شگفتگی کو اریب کچھ اس طرح مجروح کر گئے تھے کہ سنبھلنا مشکل تھا۔ یہ سب کچھ اریب سے از خود رفتگی میں سرزد ہوا تھا۔ کسی قسم کے ذہنی تحفظ کے بغیر — پہلے ہی سے کسی بغض و عناد کے زیر اثر کسی کی دل شکنی کرنے کی پلاننگ کرنا اریب کو زندگی بھر نہیں آیا۔ اس واقعے کے پیچھے بھی بات کچھ نہ تھی۔ ڈھکا چھپا کچھ تھا تو یہی تھا کہ شہریار نے اس وقت اریب کی غزلوں کی تعریف نہیں کی۔ اریب پاکستان کے سارے غزل گو شاعروں کو اپنا حریف و مقابل سمجھ بیٹھے اور برس پڑے۔

صبح ہوئی تو انجا کے گھر جا کر میں نے اریب سے اس کے طرز عمل کی شکایت کی مجھ سے ساری روداد سنی۔ بہت شرمندہ ہوا۔ کہا۔ بُرا ہوا یار۔ مجھے کچھ یاد ہی نہیں۔ میں آج ہی دونوں سے مل کر معذرت کرلوں گا۔

ایسا نہیں ہے کہ اریب اپنے سوا کسی کو تسلیم نہ کرتا تھا۔ سچ پوچھیے تو وہ کھل کر داد دیتا اور اچھی چیز کی تعریف و توصیف میں بخل کو کفر سمجھتا۔

اریب، صبا اور صفیہ۔ ایک مثلث تھا۔ جس کے دو خطوط نہیں رہے۔ ایک خط رہ گیا تھا۔ سو اب اریب سے اس کی وابستگی بھی ایک قصۂ پارینہ ہوئی۔ صبا کو اریب نے خون جگر دے کر پالا تو صبا نے بھی اپنا سب کچھ اریب پر لٹا دیا۔ اریب کے لئے ازرقہ کا فراہمی کا ذریعہ صبا ہی تو تھا۔ اس مرد خدا نے دیکھئے صبا سے بھی کیسا برتاؤ کیا۔

ایک بار ایک منسٹر کے گھر گیا۔ صبا کے لئے اشتہار کی فراہمی کا مسئلہ تھا کچھ دیر بیٹھا رہا۔ باریابی جلد نہ ہوسکی اٹھا اور چلا آیا — یہ سلوک اریب نے خود سے کیا ہے۔ اگر منسٹر سے مل لیتا تو اشتہار یقینی تھا اور بڑا تھا۔ جس کا علم بھی اریب کو تھا۔

الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

آج بھی اریب کا خیال آتا ہے تو یہی سوچتا ہوں۔ اللہ میاں نے اگر اس کو خوش آمدید کہنے میں پانچ دس منٹ کی تاخیر کی ہوگی تو وہ لوٹ گیا ہوگا اور جانے کہاں کہاں آسمانوں میں سر پھوڑتا بے اماں پھر رہا ہو — بدمستی کے عالم میں — ہر ایک کے ہاتھ سے شراب طہورہ چھینتا ہوا۔ اور یہ سب کچھ وہ اس وقت تک کرے گا جب تک مشیت ایزدی مسکرا کر اس پر مہربان نہ ہو جائے۔

بلا عنوان

اگست کے پونم میں عاتق شاہ کی کہانی بلا عنوان شائع ہوئی تھی۔ جس کا عنوان قارئین کو تجویز کرنا تھا چنانچہ ادارہ کو کئی عنوانات وصول ہوئے جس میں ڈاکٹر اعظم (لکھنو) کے تجویز کردہ عنوان "زندہ لاشیں" کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ آئندہ ماہ سے چھ ماہ تک پونم انہیں تحفتاً بھیجا جائے گا۔ دیگر پسندیدہ عنوانات تھا بذریعہ "خدیجہ بیگم (گلبرگہ)" "زمین کا بوجھ" اعجاز حسین (پٹنہ) "حقیقتوں کے زخم" محمد رضی الدین اقبال (حیدرآباد) ہیں

نظیر لودھیانوی

علامہ اقبالؒ کی ایک نامکمل نظم کی تکمیل

علامہ اقبالؒ کے اردو کلام کا پہلا مجموعہ بانگ درا کے نام سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا اس وقت تک علامہؒ بہت سی غزلیں اور نظمیں کہہ چکے تھے جب بانگ درا ہمارے ہاتھ آئی تو ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس میں علامہ کی کئی مشہور نظمیں اور غزلیں درج نہیں ہیں جو بعد میں بھی ان کے کلام کے دوسرے مجموعوں میں درج نہیں ہوئیں۔ بانگ درا میں کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن کے کچھ حصے حذف کر دیئے گئے ہیں اور اب وہ نظمیں ایک پہلو سے نامکمل ہیں۔ بانگ درا میں علامہؒ کی وہ تاریخی نظم بھی جس کا عنوان "نالۂ یتیم" تھا درج نہیں ہے علامہؒ نے یہ نظم ۱۸۹۸ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پہلی بار پڑھی تھی علامہ مرحوم نے ۱۸۹۹ء میں انجمن کے جلسے میں فریادِ امّت کے عنوان سے جو نظم پڑھی تھی بانگ درا میں اس کا صرف ایک بند درج کیا گیا ہے۔ "نامکمل" نظموں میں علامہؒ کی تیرہ اشعار کی وہ نظم بھی ہے جس کا عنوان "عقل و دل" ہے۔ یہ دراصل ۳۹ اشعار کی نظم ہے۔ عقل و دل کا مکالمہ اس نظم کا درمیانی حصہ ہے۔ اس حصے سے پہلے بیس اشعار اور آخر کے تین اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں اور شائع شدہ حصے کے بھی تین اشعار حذف ہیں گویا ۳۹ میں سے ۲۶ اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں۔ جب یہ نظم کہی گئی تھی تو اس کا عنوان تھا "پیام بیعت کے جواب میں" کہا جاتا ہے علامہ کو قادیانیوں کے سربراہ نے بیعت کی دعوت دی تھی۔ علامہ نے دعوت نامہ کا جواب انتالیس اشعار کی اس نظم میں دیا۔ نظم کے درمیانی حصے میں عقل اور دل کا مکالمہ تھا جو تین اشعار حذف کر کے بانگ درا میں درج کر دیا گیا ہے اس مکالمے سے پہلے بیس اشعار میں علامہ نے اپنی ذہنی قلبی اور روحانی کیفیات کا اظہار کیا ہے اور اس میں بیعت کا پیغام دینے والے کی فرقہ پرستی علیحدگی پسندی اور عصبیت کے بھی اشارے کئے ہیں۔ ان حذف شدہ بیس اشعار میں سے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔

خضرؑ سے چھپ کے مر رہا ہوں میں
تشنہ کام مئے فنا ہوں میں

کانپ اٹھتا ہوں ذکرِ مرہم پہ
وہ دلِ درد آشنا ہوں میں

تنکے چن چن کے باغِ الفت کے
آشیانہ بنا رہا ہوں میں

کارواں سے نکل گیا آگے
مثلِ آوازۂ درا ہوں میں

مجھ سے بیزار ہے دلِ زاہد
دیدۂ حمد کی حیا ہوں میں

میں نے مانا کہ بے عمل ہوں مگر
رمزِ وحدت سے آشنا ہوں میں

سب کسی کا کرم ہے یہ ورنہ
کیا مرا شوق اور کیا ہوں میں

جام ٹوٹا ہوا ہوں لیکن
مئے حق سے بھرا ہوا ہوں میں

ایک دانے پہ ہے نظر تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں

بھائیوں میں لگاؤ جس سے ہے
اس عبادت کو کیا سراہوں میں

مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں

میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تو
تیرے ہنسنے پہ رو رہا ہوں میں

اس سے آگے عقل و دل کا مکالمہ ہے جو بانگ درا میں درج ہے اس میں بھی دل نے جو کچھ کہا ہے وہ بیعت کا پیغام دینے والوں کے لئے ہے۔ اس میں فرمایا ہے "تو زمان و مکاں سے رشتہ بہ پا" یعنی تو محض ضلع گورداسپور کے ایک قصبہ سے وابستہ ہے اور تیرا مخاطب آفاقی نقطۂ نگاہ کا مالک ہے۔ تو صرف ایک دانے سے لَو لگائے ہوئے ہے اور تیرا مخاطب پورے خرمن کا دیوانہ ہے۔ آخر کے جو تین اشعار حذف کئے گئے ہیں یہ

ہائے یہ دل جو میرے پہلو میں
تو یہ سمجھے کہ دہریا ہوں میں

اہلِ دل کو بگاڑ سے مطلب
سب بزرگوں کی خاکِ پا ہوں میں

فیضِ اقبالؔ ہے اسی در کا
بندۂ شاہِ لافتیٰ ہوں میں

اقبالؔ کی ابتدائی دور کی کئی غزلیں بھی بانگ درا میں درج نہیں ہیں جو خمخانۂ جاوید کی جلد اول میں درج ہیں ان میں بعض وہ غزلیں بھی ہیں جو علامہ نے ابتدائی دور میں بھاٹی گیٹ

اَلعظمۃُ لِلّٰہ

یا شافی
پروردگار کے فضل و کرم اور آپ کی دعاؤں سے آج ہم
اپنی بہتر کارکردگی کے تین سال مکمل کر رہے ہیں

یا حکیم
بفضلِ تعالیٰ آج ہم آپ کی بہتر
خدمات کے دو سال کی تکمیل کر رہے ہیں

آج کے اس مسرت بخش دن ہم اس بات کا وعدہ صمیم کرتے ہیں کہ آئندہ بھی انشاء اللہ آپ کی پُرخلوص بے لوث
اور بہتر خدمت انجام دینے کی بھرپور کوشش کریں گے، اپنے تمام سرپرستوں، بہی خواہوں، دوستوں اور معزز گاہکوں سے حسبِ معمول تعاون و اشتراک کے تمنائی ہیں

اساتذۂ سخن کی اصلاحیں

نواب بہادر حسین خاں انجم نیشاپوری

شعر۔ آفسر لکھنوی
باعث دردِ نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
دل مرا دشمنِ جاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

اصلاح:۔
منزلِ دردِ نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
دل مرا دشمنِ جاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

"باعث" کا لفظ پہلے مصرعے میں بے محل تھا بجائے اس کے "منزل" کا ایک لفظ ایسا معنی خیز رکھدیا جس سے مطلع با معنے اور نہایت عمدہ ہو گیا۔

شعر:۔ آفسر لکھنوی
میں قیامت تک وہیں ٹھہرا جہاں ٹھہرا تھا وہ
کام نقشِ پائے جاناں نے کیا زنجیر کا

اصلاح:۔
میں قیامت تک وہیں ٹھہرا جہاں ٹھہرا تھا وہ
نقشِ پائے یار حلقہ بن گیا زنجیر کا

مصرعۂ ثانی کی ترمیم سے ثبوت مصرعۂ اولیٰ کا قوی ہو گیا "حلقہ بن گیا زنجیر کا" اس ٹکڑے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

شعر۔ حدِ ظاہر سے بڑھ گیا جب شوقِ نظارہ
تو پھر تو پردے میں مجھکو اک نئی دنیا نظر آئی

اصلاح۔ حدِ ظاہر سے بڑھ گئیں جب وسعتیں دل کی
تو پھر پردے میں مجھکو اک نئی دنیا نظر آئی

"بڑھ گیا جب ذوقِ نظارہ" کو قلم زد کر کے "بڑھ گئیں جب وسعتیں دل کی" بنایا جس سے دوسرے مصرعے کا صحیح مفہوم ادا ہو گیا۔

شعر۔ اگر اس بت کی چشم شوخ اپنی بات پر آئی
تو یہ سمجھو قیامت وقت سے کچھ پیشتر آئی

اصلاح:۔
اگر وہ چشم فتنہ ساز اپنی بات پہ آئی
تو یہ سمجھو قیامت وقت سے کچھ پیشتر آئی

"اگر اس بت کی چشم شوخ" کے بجائے پہلے مصرعے میں "اگر وہ چشم فتنہ ساز" بنایا چونکہ دوسرے مصرعے میں قیامت کا لفظ ہے اسکی رعایت سے پہلے مصرعے میں "چشم فتنہ ساز" بنایا گیا

شعر۔ آفسر لکھنوی
کہتے کہتے رات گذری ختم افسانا ہوا
صبح کو وہ پوچھتے ہیں اس کے آگے کیا ہوا

اصلاح:۔
کہتے کہتے رات گذری ختم افسانہ ہوا
صبح کو وہ پوچھتے ہیں اور کہیئے کیا ہوا

دوسرے مصرعے میں "اس کے آگے کیا ہوا" گو غلط نہ تھا مگر "اور کہیئے کیا ہوا" بناکر لطف زبان اور معنوی خوبیوں میں اضافہ کر دیا۔

شعر:۔ آفسر لکھنوی
کیوں ہجر میں خفا ہے لئے قلب زار جاں سے
کیا فائدہ الجھ کر دم بھر کے میہماں سے

اصلاح:۔
کیوں ہجر میں خفا ہے اے قلب زار جاں سے
بیکار الجھ رہا ہے دم بھر کے میہماں سے

مصرعہ ثانی میں "کیا فائدہ الجھ کر" یہ ٹکڑا الجھا ہوا تھا بجائے اس کے "بیکار الجھ رہا ہے" بناکر شعر کو سلجھا دیا۔

شعر۔ آفسر لکھنوی
تیر تیرا تیر ہے جب تک تیری چٹکی میں ہے
دل کے آتے آتے دل کا مدعا ہو جائے گا

اصلاح۔ تیر تیرا تیر ہے جب تک تیری چٹکی میں ہے
دل تک آتے آتے دل کا حوصلا ہو جائے گا

بجائے مدعا کے "حوصلا" بنا دیا جس سے شعر میں تازگی آگئی

شعر۔ آفسر لکھنوی
حقیقت ہے دراصل عشقِ مجازی
ہم اس مبتدا کی خبر دیکھتے ہیں

اصلاح:۔
حقیقت نما ہے مجازی محبت
ہم اس مبتدا کی خبر دیکھتے ہیں

"حقیقت نما" کے ٹکڑے نے شعر کو بامعنیٰ کر دیا ہے۔

آئندہ اصلاحیں
حضرت جاوید لکھنوی

بادۂ کہن

امامِ فن علامہ آرزوؔ لکھنوی مغفور

دو بحروں کے ارکان اگر جگہ معین کر کے التزاماً لائے جائیں تو یہ فعل ارادی ہوگا اور ایک نئی بحر جو کتب عروض کے حلقۂ اثر سے باہر ہوگی وجود میں آجائے گی میں نے یہی کیا ہے یہ ایک بحر نہیں بلکہ ایسا قاعدہ بنا دیا ہے جس سے اختراعِ اوزان کے لئے ایک نیا راستہ پیدا ہوگیا ہے۔ آرزوؔ

چُپ بیٹھ کے دل سے اکیلے میں ہوتی ہیں یہ باتیں کبھی کبھی ۔۔ دُکھ درد جہاں میں روز کے ہیں سکھ چین کی راتیں کبھی کبھی
خوش رہتے ہیں جن کے تصور میں ہوتی ہیں یہ باتیں کبھی کبھی ۔۔ قسمت کو جگانے آتی ہیں متوالی راتیں کبھی کبھی
تارے تو گھٹا میں چھپ جائیں اور چاند مرے گھر اُتر پڑے ۔۔ ہوتی تو ہیں لیکن ہوتی ہیں ایسی برساتیں کبھی کبھی
غم خوار بنے سودائی کا اتنی فرصت ہے بھلا کسے ۔۔ بیکار کی باتیں لاکھوں بار اور کام کی باتیں کبھی کبھی
چھائی ہوئی غم کی گھٹاؤں میں اتنی سی جھلک امید کی ہے ۔۔ برسات میں جیسے ہوتی ہیں اُجیالی راتیں کبھی کبھی

اُکتا کے کوئی پوچھے ہی گا آرزوؔ آخر چپ ہو کیوں
یہ سیدھے سادے حضرت بھی کر جاتے ہیں گھاتیں کبھی کبھی

غیر مطبوعہ، مرسلہ جرم محمد آبادی

غزل

جرمؔ محمد آبادی

آب و تابِ جوہرِ عرفاں نہیں حاصل ابھی ۔۔ دل کا آئینہ نہیں ہے آپ کے قابل ابھی
اس لئے کرتے نہیں ہم پیرویٔ دل ابھی ۔۔ سالکِ منزل ہے خود گم کردہ منزل ابھی
داستانِ غم سنا دیتے ہیں چھٹکارا نہیں ۔۔ ان کو سمجھانا پڑے گا مدعائے دل ابھی
تو نے دیوانہ سمجھ کر در پہ روکا ہے جسے ۔۔ اس کو بُلوا لے تو جم جائے تری محفل ابھی
یہ تڑپنے کی تھکن ہے جس کو سمجھے ہو سکوں ۔۔ ایک کروٹ اور لے گا آپ کا بسمل ابھی
ساتھ دینا ہے تو آجا دل نوازی کے لئے ۔۔ تیری خاطر سے میں ٹھہرا ہوں سرِ منزل ابھی
تیری قسمت میں سکوں ہے میری غرقابی کے بعد ۔۔ ٹکریں لے موجِ غم سے اور کچھ اے دل ابھی
صحبتِ گردابِ غم میں ان کی ہوتی ہے بسر ۔۔ جن کی قسمت میں نہیں ہے دامنِ ساحل ابھی

جرمؔ کہتا ہے یہ آغازِ محبت کی کشش
مثلِ پروانہ رہو انجام سے غافل ابھی

سید احمد شمیم

مَن عَرَفَ نفسہٗ

در حدِّ نظر
گوں آسماں
ر تاباں کی ہر سمت
تابانیاں
راتے ہوئے چاند کی چاندنی
ضوفشاں
گاتے ستاروں کی ہنستی ہوئی
کہکشاں

لوں
دیوں
یوں
ہاروں کا یہ خوبصورت
جہاں
سب ہمارے لئے
سب ہمارے لئے
ہم مگر کون ہیں ــــ ؟
تِ قدرت کا اک لمحہ رائیگاں ــــ
اور کچھ بھی نہیں
اور کچھ بھی نہیں ــــ !!

کھوئی ہوئی صدائے کُن

زمیں اپنے محور سے لمحہ بہ لمحہ
سرکنے لگی ہے
صدائے کُن کی پہلے جو گونج
کبھی تھی
خدا جانے اب وہ
کہاں کھو چکی ہے

خلاؤں میں چاروں طرف
بے کراں خامشی ــــ تیرگی ہے
یہاں روشنی کا
تموّج بھی تابوت میں سو چکا ہے

مقدّر ــــ سیاہی
سیاہی کا گہرا
سمندر ــــ !

صحرائے سکوت

تم نے اکثر یہ محسوس کیا ہوگا ؟
ایک بات مرے لبوں تک
آتے آتے لوٹ جاتی ہے ــ !

ــــ اور شاید تم بھی
ایک مدّت سے کچھ کہنا چاہتی ہو
کہہ نہیں سکتیں ــــ !

تو کیا ہم دونوں
صحرائے سکوت میں
یونہی جلتے رہیں گے ــــ ؟

ہم پہ کبھی کوئی برسات نہ ہوگی ــ ؟؟

غزلیں

مسافتِ حیات میں مجھے وہ ہم سفر ملا
جو دشتِ تیرگی میں بھی بہ صورتِ سحر ملا
میں اپنے جسم میں انا کا روگ پالے بیٹھا ہوں
مجھے تو شہر میں نہ کوئی مجھ سا بے ہنر ملا
سفر کا کرب جس کے زیرِ سایہ بھول جاؤں میں
نہ ریگ زارِ زیست میں مجھے کوئی شجر ملا
ہمارے جلتے ذہن کا نہ کرب آپ سمجھیں گے
کہ خواب تو ملے ہمیں، نہ گھر ملا نہ در ملا
اصولوں کا حصار میری زندگی کے گرد تھا
میں اکثر آپ اپنے سے بھی ہو کے بے خبر ملا
انگوٹھے کانٹے پہ کیوں مُصر ہو کچھ بتاؤ تو
تمہیں ہمارے اندر ایسا کون سا ہُنر ملا
میں آئینہ ہوں ٹوٹ بھی گیا تو کوئی غم نہیں
مرے ہر ایک زخم کو تو حُسنِ معتبر ملا
یہ مہدی اپنا اپنا ظرف، اپنا اپنا عزم ہے
کسی کو سیپیاں ملیں مگر مجھے گہر ملا

مہدی پرتاب گڑھی

ذہن میں پھیلی ہے میرے وہی اک میٹھی دھوپ
ان کے چہرے پہ نظر آئی تھی جو شرم کی دھوپ
کتنے مرجھائے ہوئے چہروں نے رنگت بدلی
یخ زدہ جسموں سے جس وقت کہ ٹکرائی دھوپ
ہوش آیا تو اسے میں نے سمٹتے دیکھا
جانے کب سے مرے آنگن میں مچلتی رہی دھوپ
میرا اظہار ہے روشن مرے اشعار میں ضو
ذہن میں پھیلی ہوئی ہے مرے چمکیلی دھوپ
سرد موسم جنھیں کمروں میں چھپا آیا تھا
سامنے دنیا کے ان چہروں کو لے آئی دھوپ
کھڑکیاں کھول کے بیٹھا ہوں کہ گھر میں آئے
آ کے ہر بار پلٹ جاتی ہے شرمیلی دھوپ
غم کی راہوں میں بھی ملتا ہے سکوں اے تابش
سر پہ ہے سایہ فگن جب سے غم و درد کی دھوپ

طلحہ تابش

ملا تھا پیار کے بدلے جب ان کا جور مجھے
نصیب پھر نہ ہوا عمر بھر وہ دور مجھے
نظر گئی نہ کسی کی کتابِ دل کی طرف
زمانہ پڑھ نہ سکا آج تک بغور مجھے
سمجھ لیا تو پلا دے گی زہر بھی اک دا
سمجھ رہی ہے یہ دنیا ابھی کچھ اور مجھے
ترے بغیر کہاں کھو گئی حیات مر
کبھی نہ کرنے دیا وقت نے یہ غور مجھے
سزا ملی ہے یہ ترکِ تعلقات کے بد
ترے سوا نظر آتا نہیں کچھ اور مجھے
بڑا فریب ہے اب دوستی کے پردے
پسند آئیں نہ کیوں دشمنوں کے طور مجھے
بھٹکتا پھرتا میں کیوں غم کی رہگزاروں
ظفر جو ملتا دیارِ اجل میں ٹھور مجھے

ظفر مرزا پوری

غزلیں

نصر قریشی

میں اپنا گم شدہ ماضی کا چہرہ ، کبھی آئینۂ امروز و فردا ، کبھی دشتِ بلا میں ڈھونڈتا ہوں
اندھیرا روشنی کا کرب بن کر ، رگوں میں اس طرح سے گھل گیا ہے کہ سر سے پیر تک دھندلا گیا ہوں

خباثت کے حصاروں ، دائروں میں ، مقدس چہروں کی نورانی شمعیں ، اندھیروں کو شکستیں دے رہی ہیں
ہر اک خاکی پیکر ، نوری ، ناری ، میں آتش زار کو گلشن بناؤں ، سرابِ زیست میں آبِ بقا ہوں

چٹانوں ، کوہساروں ، مرغزاروں ، زمیں سے آسماں کی وسعتوں تک ، شکستہ خواہشوں کی دھند چھائی
بدن موسم کی بے رحمی سے لرزاں ، ٹھٹھرتی لکڑیاں ، بجھتے الاؤ ، میں جل کر شعلوں کو بھڑکا رہا ہوں

سلگتے لمحوں کی پتھر فضا میں ، کہیں احساس کے شیشے نہ ٹوٹیں ، کہیں دل ریزہ ریزہ ہو نہ جائیں
میں پتھر کا جگر تیشے سے کاٹوں ، لہو کے پھول صحرا میں کھلاؤں ، بکھرتی خوشبو یکجا کر رہا ہوں

گھٹن اور حبس کی شدت کا عالم ، پسِ دیوار بے حسی کا مرکز ، ہر اک اپنی ہی تنہائی کا قیدی
گلِ نغمہ ، زرِ اخلاص لے کر ، کشادہ آنگنوں کی سانس بن کر ، دریچے ذہن و دل کے کھولتا ہوں

یہ الجھے راستے ، لمبی مسافت ، سمندر وقت کا تھک سا گیا ہے ، سفر پیہم سفر ، گردِ سفر ہے
میں اک راہی صلیبِ غم اٹھائے ، سپاہِ جبر سے خود کو بچائے ، عصا ہاتھوں میں لے کر چل رہا ہوں

کتابوں کے درخشاں حاشیوں کو ، سلگتے لفظوں کے سیلاب چاٹیں ، جھلس کر مسخ ہے معنی کا چہرہ
لکیروں کی طنابیں کھینچ کر اب ، علامت ، فکر و فن کے شامیانے ، سخن زاروں میں ہر سو تانتا ہوں

برہنہ شاخ پر اک برگِ تنہا ، کہیں میلے میں کھویا ایک بچہ ، شکستہ قبر کا اک ٹوٹا کتبہ
طلسمِ وقت سے سہما پرندہ ، تماشائی بھی اور خود ہی تماشا ، لبِ گل پر خزاں کا مرثیہ ہوں

تجمل محمد آبادی

کیوں لیں پناہ اہلِ چمن آشیاں سے دو
بجلی چمک رہی ہے ابھی گلستاں سے دو

ایسا نہ ہو کہ موسمِ گل کی ہوا لگے
صیاد رکھ قفس کو ذرا آشیاں سے دو

اہلِ چمن منائیں نہ مل جل کے کیوں خوشی
نزدیک ہیں بہار سے فصلِ خزاں سے دو

انسان پھینکتا ہے وہاں بھی کمندِ شوق
حالانکہ ہے زمین بہت آسماں سے دو

چلئے نہ مل کے پیاس بجھائیں بقدرِ شوق
میخانہ بھی تو کچھ نہیں واعظ یہاں سے دو

حاصل ہے سب کو باغ میں جب حقِ زندگی
کیوں آشیاں بنائے کوئی گلستاں سے دُو

کھاتا پھرے گا ٹھوکریں وادئ عشق میں
منزل نہ پا سکے گا جو ہے کارواں سے دو

پھیلی ہوئی ہے اس لئے گلشن میں ابتری
کچھ ہیں قریب اور ہیں کچھ باغباں سے دُو

وہ ملتفت اگر ہوں تجمل تو پوچھ لو
ہیں کتنے بد نصیب ابھی آستاں سے دو

رام لعل

نئے رشتے

اُس دفتر میں کام کرتے ہوئے اُنہیں تیس سال سے کچھ زیادہ ہی عرصہ ہو گیا تھا وہ دفتر کیا تھا ایک طویل و عریض کانفرنس ہال تھا جس کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر دوسرے کنارے تک نگاہ دوڑائی جاتی تو بے شمار میزوں اور فائلوں سے بھرے ہوئے ریکوں کے درمیان اَن گنت انسانی سر ہی سر دکھائی دیتے تھے طرح طرح کے سر سفید بالوں والے، کالے اور کھچڑی بالوں والے اور ایسے بھی جن پر کبھی کچھ نہیں اُگا تھا اور وہ سب کے سب اپنی اپنی میزوں پر اس طرح جھکے ہوئے نظر آتے تھے جیسے چار سو سے لے کر سات آٹھ روپے تک مہنگائی اور دیگر الاؤنسوں سمیت ماہوار تنخواہ دینے والے افسرِ اعلیٰ کے سامنے سر بسجود ہو رہے ہوں لٹنے بڑے قدیم وضع کے ہال کے بارے میں ایک بات یہ بھی مشہور تھی کہ انگریزوں کے زمانے میں وہ کسی مہاراجہ کا بنوایا ہوا بال روم تھا جس کا آدھا حصہ ڈانسنگ ہال کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور آدھا بانکے ...ے وقت تھے۔ اس پاس جو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے وہ عیش پرست لوگوں کے آرام کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے یعنی بعض جوڑے جب ناچ ناچ کر تھک جاتے یا شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر اپنے اپنے پارٹنر بدل لیتے تو انہی کمروں میں جا کر بند ہو جاتے تھے اُس زمانے میں کچھ بھی ہوتا رہا ہو اُس سے کسی کو کوئی غرض نہ۔ اب تو اُس کشادہ ہال کی تعریف یہی کی جا سکتی تھی جو دو سو سال پُرانا ہونے کے باوجود اپنی گزشتہ شان و شوکت کی ایک عبرت ناک داستان سُناتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چھت میں اور دیواروں، محرابوں اور کھمبوں پر پلاسٹر کی جو مینا کاری کی گئی تھی اب رفتہ رفتہ ٹوٹ ٹوٹ کر میزوں اور فائلوں پر گر رہی تھی۔ کبھی کبھی پلاسٹر کا کوئی بڑا سا ٹکڑا کسی کلرک کی کھوپڑی پر اچانک آ پڑتا تو ایک ہزار کے قریب سارے کے سارے کلرک اپنی محویت کے عالم سے چونک کر ایک ساتھ کھڑے ہو جاتے اور پھر احتجاجاً فوراً باہر نکل جاتے تھے۔ باہر بھی ایک شاندار لان موجود تھا جس میں جگہ جگہ فوارے بنے ہوئے تھے۔ لیکن اُن میں پانی نہیں پہنچتا تھا یہاں سائیکلیں رکھنے کے لئے باڑے کے طور پہ استعمال کیا جاتا تھا اور لنچ کے وقفے میں سردیوں میں دھوپ کھانے کے لئے بھی۔ اُسی جگہ مونگ پھلی اور امرود بیچنے والوں کے ٹھیلے بھی لگے ہوتے اور سُود خوروں کی ٹولیاں بھی دکھائی دیتی تھیں جو بڑی باقاعدگی سے قرض دیتے اور وصول کرتے رہتے تھے۔ اُسی لان میں اسٹاف کے احتجاجی جلسے بھی منعقد ہوتے، رخصتی اور ماتمی اجتماع بھی۔ یعنی جب بھی کسی ساتھی کی موت واقع ہو گئی تو اسے تعزیت پیش کرنے کے لئے اُسی جگہ کا انتخاب کیا گیا۔ ایک بار تو ایک چپراسی کی لاش بھی وہیں جا کر رکھ دی گئی تھی جو صبح اپنی کوٹھڑی میں مرا ہوا پایا گیا تھا۔ سارے لوگ ہال میں سے نکل نکل کر وہاں جمع ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے افسروں تک کو اپنے چھوٹے چھوٹے کمروں اور کیبنوں میں سے نکل کر اُس چپراسی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُس کے بعد وہ سب اُس کی ارتھی اُٹھا کر شمشان گھاٹ کی طرف چل دیئے تھے اور دفتر میں آدھے دن کی چھٹی کر دی گئی تھی۔

اُس دفتر کے لوگوں میں اس قدر مضبوط اتحاد کی بڑی وجہ اُسی ہال کی کشادگی اور وحدت تھی۔ جس کی خستہ حالی کے باوجود اُس کی حیثیت کسی مشترکہ خاندان کے ایک بڑے آنگن جیسی تھی۔ کسی خاندان کا آنگن جب ایک ہوتا ہے تو سب کو ایک دوسرے کا دکھ سکھ نظر آتا رہتا ہے جس میں شریک نہ ہونے کا

غزلیں

نصر قریشی

میں اپنا گم شدہ ماضی کا چہرہ، کبھی آئینۂ امروز و فردا، کبھی دشتِ بلا میں ڈھونڈتا ہوں
اندھیرا اور روشنی کا کرب بن کر، رگوں میں اس طرح سے گھل گیا ہے کہ سر سے پیر تک دھندلا گیا ہوں

خیاشت کے حصاروں، دائروں میں، مقدس چہروں کی نورانی شمعیں، اندھیروں کو شکستیں دے رہی ہیں
ہر اک خاکی پیکر، نوری، ناری، میں آتش زار کو گلشن بناؤں، سرابِ زیست میں آب بقا ہوں

چٹانوں، کوہساروں، مرغزاروں، زمیں سے آسماں کی وسعتوں تک، شکستہ خواہشوں کی دھند چھائی
بدن موسم کی بے رحمی سے لرزاں، ٹھٹھرتی لکڑیاں، بجھتے الاؤ، میں جل کر شعلوں کو بھڑکا رہا ہوں

سلگتے لمحوں کی پتھر فضا میں، کہیں احساس کے شیشے نہ ٹوٹیں، کہیں دل ریزہ ریزہ ہو نہ جائیں
میں پتھر کا جگر تیشے سے کاٹوں، لہو کے پھول صحرا میں کھلاؤں، بکھرتی خوشبو یکجا کر رہا ہوں

گھٹن اور حبس کی شدت کا عالم، پسِ دیوار بے چینی کا مرکز، ہر اک اپنی ہی تنہائی کا قیدی
گلِ نغمہ، زرِ اخلاص لے کر، کشادہ انگلیوں کی سانس بن کر دریچے ذہن و دل کے کھولتا ہوں

یہ الجھے راستے، لمبی مسافت، سمندر وقت کا تھک سا گیا ہے، سفر پیہم سفر، گردِ سفر ہے
میں اک راہی صلیبِ غم اٹھائے، سپاہِ جبر سے خود کو بچائے عصا ہاتھوں میں لے کر چل رہا ہوں

کتابوں کے درخشاں حاشیوں کو، سلگتے لفظوں کے سیلاب چاٹیں، جھلس کر مسخ ہے معنی کا چہرہ
لکیروں کی طنابیں کھینچ کر اب، علامت، فکر و فن کے شامیانے سخن زاروں میں ہر سو تانتا ہوں

برہنہ شاخ پر اک برگِ تنہا، کہیں میلے میں کھویا ایک بچہ، شکستہ قبر کا اک ٹوٹا کتبہ
طلسمِ وقت سے سہما پرندہ، تماشائی بھی اور خود ہی تماشا، لبِ گل پر خزاں کا مرثیہ ہوں

تجمل محمود آبادی

کیوں لیں پناہ اہلِ چمن آشیاں سے دور
بجلی چمک رہی ہے ابھی گلستاں سے دور

ایسا نہ ہو کہ موسمِ گل کی ہوا لگے
صیاد رکھ قفس کو ذرا آشیاں سے دور

اہلِ چمن منائیں نہ مل جل کے کیوں خوشی
نزدیک ہیں بہار سے فصلِ خزاں سے دور

انسان پھینکتا ہے وہاں بھی کمندِ شوق
حالانکہ ہے زمیں بہت آسماں سے دور

چلئے نہ چل کے پیاس بجھائیں بقدرِ شوق
میخانہ بھی تو کچھ نہیں واعظ یہاں سے دور

حاصل ہے سب کو باغ میں جب حقِ زندگی
کیوں آشیاں بنائے کوئی گلستاں سے دور

کھاتا پھرے گا ٹھوکریں وادیٔ عشق میں
منزل نہ پا سکے گا جو ہے کارواں سے دور

پھیلی ہوئی ہے اس لئے گلشن میں ابتری
کچھ ہیں قریب اور ہیں کچھ باغباں سے دور

وہ ملتفت اگر ہوں تجمل تو پوچھ لو
ہیں کتنے بد نصیب ابھی آستاں سے دور

رام لعل

نئے رشتے

اُس دفتر میں کام کرتے ہوئے اُنہیں تیس سال سے کچھ زیادہ ہی کا عرصہ ہو گیا تھا وہ دفتر کیا تھا ایک طویل و عریض کانفرنس ہال تھا جس کے ایک سرے پہ کھڑے ہو کر دوسرے کنارے تک نگاہ دوڑائی جاتی تو بے شمار میزوں اور فائلوں سے بھرے ہوئے ریکوں کے درمیان اَن گنت انسانی سر ہی سر دکھائی دیتے تھے طرح طرح کے سر سفید بالوں والے، کالے اور کھچڑی بالوں والے اور ایسے بھی جن پر کبھی کچھ نہیں اُگتا تھا اور وہ سب کے سب اپنی اپنی میزوں پر اس طرح جھکے ہوئے نظر آتے تھے جیسے چار سو سے لے کر سات آٹھ روپے تک مہنگائی اور دیگر الاؤنسوں سمیت ماہوار تنخواہ دینے والے افسرِ اعلیٰ کے سامنے سر بسجود ہوں اتنے بڑے قدیم وضع کے ہال کے بارے میں ایک بات یہ بھی مشہور تھی کہ انگریزوں کے زمانے میں وہ کسی مہاراجہ کا بنوایا ہوا بال روم تھا جس کا آدھا حصہ ڈانسنگ ہال کے طور پہ استعمال ہوتا تھا اور آدھا بازو کے بیٹھک تھا۔ آس پاس جو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے وہ عیش پرست لوگوں کے آرام کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے یعنی بعض جوڑے جب ناچ ناچ کر تھک جاتے یا شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر اپنے اپنے پارٹنر بدل لیتے تو انہی کمروں میں جا کر بند ہو جاتے تھے اُس زمانے میں کچھ بھی ہوتا رہا ہو اُس سے کسی کو کیا غرض! اب تو اُس کشادہ ہال کی تعریف یہی کی جا سکتی تھی جو دو سو سال پُرانا ہونے کے باوجود اپنی گذشتہ شان و شوکت کی ایک عبرت ناک داستان سُناتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چھت میں اور دیواروں، محرابوں اور کھمبوں پہ پلاسٹر کی جو مینا کاری کی گئی تھی اب رفتہ رفتہ ٹوٹ ٹوٹ کر میزوں اور فائلوں پر گر رہی تھی۔ کبھی کبھی پلاسٹر کا کوئی بڑا سا ٹکڑا کسی کلرک کی کھوپڑی پر اچانک آ پڑتا تو ایک ہزار کے قریب سارے کے سارے کلرک اپنی محویت کے عالم سے چونک کر ایک ساتھ کھڑے ہو جاتے اور پھر احتجاجاً فوراً باہر نکل جاتے تھے۔ باہر ایک شاندار لان موجود تھا جس میں جگہ جگہ فوارے بنے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں پانی نہیں پہنچتا تھا یہ لان سائیکلیں رکھنے کے لئے باڑے کے طور پہ استعمال کیا جاتا تھا اور لنچ کے وقفے میں سردیوں میں دھوپ کھانے کے لئے بھی۔ اُسی جگہ مونگ پھلی اور لُردو بیچنے والوں کے ٹھیلے بھی لگے ہوتے اور سُود خوروں کی ٹولیاں بھی دکھائی دیتی تھیں جو بڑی باقاعدگی سے قرض دیتے اور وصول کرتے رہتے تھے۔ اُسی لان میں اسٹاف کے احتجاجی جلسے بھی منعقد ہوتے، رخصتی اور ماتمی اجتماع بھی۔ یعنی جب بھی کسی ساتھی کی موت واقع ہو گئی تو اسے تعزیت پیش کرنے کے لئے اسی جگہ کا انتخاب کیا گیا۔ ایک بار تو ایک چپراسی کی لاش بھی وہیں جا کر رکھ دی گئی تھی جو صبح اپنی کوٹھڑی میں مرا ہوا پایا گیا تھا۔ سارے لوگ ہال میں سے نکل نکل کر وہاں جمع ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے افسروں تک کو اپنے چھوٹے چھوٹے کمروں اور کیبنوں میں سے نکل کر اُس چپراسی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُس کے بعد وہ سب اُس کی ارتھی اُٹھا کر شمشان گھاٹ کی طرف چل دیئے تھے اور دفتر میں آدھے دن کی چھٹی کر دی گئی تھی۔

اُس دفتر کے لوگوں میں اس قدر مضبوط اتحاد کی بڑی وجہ اُسی ہال کی کشادگی اور وحدت تھی۔ جس کی خستہ حالی کے باوجود اُس کی حیثیت کسی مشترکہ خاندان کے ایک بڑے آنگن جیسی تھی۔ کسی خاندان کا آنگن جب ایک ہوتا ہے تو سب کو ایک دوسرے کا سکھ دکھ آتا جاتا نظر آ جاتا ہے جس میں شریک نہ ہونے کا

کبھی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سارے — ایک دوسرے کے اس قدر قریب رہتے تھے کہ دفتر آتے ہی اُنہیں معلوم ہو جاتا تھا کہ فلاں، فلاں کرسی آج کیوں خالی پڑی ہے؟ کون بیمار ہونے کی وجہ سے نہیں آیا ہے یا کون سے ضروری کام کی وجہ سے چھٹی لے کر گیا ہوا ہے

ایک روز اچانک یہ خبر آئی کہ یہ پوری بلڈنگ گرا دی جائے گی اور اس کی جگہ پر ایک دس منزلہ فائیو اسٹار ہوٹل بنا دیا جائے گا اور آفس کے لئے ایک دوسری جگہ زمین خریدی جا رہی ہے۔ جہاں ایک نئی بلڈنگ تعمیر کی جائے گی۔ اس خبر کو سُن کر سارے کلرک حیران ہو اُٹھے۔ کچھ پریشان تھے جنھوں نے دفتر کے قریبی محلوں میں ہی اپنے مکان بنا لئے تھے اور یہاں تک آنے جانے میں اُنہیں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کچھ لوگ خوش تھے کہ جہاں دفتر کی نئی عمارت بنے گی وہاں تک وہ بڑی آسانی سے اور کم سے کم وقت میں پہنچ جایا کریں گے۔ اُن کی خوشی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ نئی بلڈنگ زیادہ مضبوط، زیادہ ہوادار اور جدید قسم کی لائیٹوں اور فرنیچر سے آراستہ ہوگی۔ اس پُرانے اور فرسودہ دفتر میں کام کرتے ہوئے اُنہیں شرم سی محسوس ہوتی تھی جہاں وہ ملنے کے لئے کسی کو بلا بھی نہیں سکتے تھے۔ کچھ لوگ بالکل خاموش رہے۔ یعنی اُنھوں نے خوشی یا ناپسندیدگی کا کوئی بھی ردِ عمل نہ دکھایا اور ہال کے اندر چپ چاپ گھوم گھوم کر اپنے ساتھیوں کی باتیں ہی سنتے رہے۔

دو تین سال تک اُن کے سخت اضطراب اور ہیجان میں مبتلا رہنے کے بعد آخر ایک روز پُرانا ہال خالی کر دیا گیا۔ فائیلوں کے انبار ٹرک میں بھر بھر کر نئی بلڈنگ میں پہنچا دیئے گئے۔ جس کے کئی چھوٹے اور بڑے کمرے تھے۔ اُن میں ٹیوب لائٹیں اور کولر بھی فٹ تھے اور ایگزاسٹ فین بھی جو گندی ہوا کو باہر پھینک دیتے تھے روشندان اور کھڑکیاں اتنی زیادہ تھیں کہ تازہ ہوا لینے کے لئے کلرکوں کو بار بار باہر نہیں بھاگنا پڑتا تھا۔ چونکہ دفتر کی عمارت انتہائی خوب صورت بنائی گئی تھی اور اُسے اعلیٰ درجے کے نفیس ترین فرنیچر سے بھی سجا دیا گیا تھا اس لئے کام کرنے والوں کی عادات و اطوار پر بھی گہرا اثر پڑا۔ پہلے تو وہ معمولی یا میلے کپڑے ہی پہن کر پُرانے دفتر میں چلے جاتے تھے اور اس میں کسی قسم کی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ لیکن اب وہ صاف ستھرے اور نئی وضع کے کپڑے پہن کر آنے لگے کیونکہ ایسا کر کے اُنہیں اپنی ایک نئی اہمیت کا احساس ہونے لگا اور وہ مسرور بھی نظر آتے تھے۔

لیکن ایک دو مہینوں کے بعد اچانک اُنھوں نے ایک تکلیف دہ تبدیلی محسوس کی۔ نئی بلڈنگ کے مختلف کمروں میں منتقل ہو کر وہ ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئے تھے اُس عرصے میں کون کون بیمار پڑ گیا تھا۔ کس کس نے چھٹی لے لی تھی اس کا علم پہلے کی طرح سب کو نہ ہو سکا۔ بلکہ ایک عجیب بات یہ بھی ہوئی کہ ایک کلرک جب ریٹائر ہو گیا تو اُس کی الوداعی دعوت کر کے اُس کے سیکشن والوں نے اُسے رخصت بھی کر دیا۔ جہاں وہ اُن کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ اس پر کئی دوسرے لوگوں نے شکایت کی تو اُنہیں یہ جواب دے دیا گیا کہ اب تو ایسا ہی ہوگا۔ پُرانی بلڈنگ کے ہال میں سب ایک دوسرے کی نظروں کے سامنے رہتے تھے تو وہ ایک دوسرے کے قریب بھی تھے۔ اب تو آپس کے رشتوں کی بنیاد ہی بدل گئی ہے جو جس کمرے یا سیکشن میں ہے اُس کی دوستی وہیں کے لوگوں کے ساتھ قائم رہ سکے گی۔۔

امرلال ہنگورانی
مترجم: بانو سرتاج ایم۔اے۔بی۔ایڈ

بلاعنوان

(سندھی کہانی)

قارئین پونم سے اس کہانی کے لئے عُنوان تجویز کرنے کی خواہش کیجاتی ہے۔ سب سے بہتر عُنوان تجویز کرنے والے کے نام "پونم" چھ ماہ کیلئے تحفتہً بھیجا جائے گا۔

(ادارہ)

کسی آسے پاگل کہتے اور کئی آسے پہنچا ہوا درویش سمجھتے۔ شاید وہ پاگل بھی تھا اور درویش بھی۔ وہ اوسط سے کچھ لمبے قد کا اور گیہوئیں رنگ کا دُبلا پتلا سا آدمی تھا وہ اپنے گرد ہمیشہ ایک گُدڑی سی لپیٹے رکھتا۔

کسی فلسفی کی طرح وہ اپنے ہی خیالوں میں کھویا رہتا۔ کبھی وہ مسجد میں بیٹھا دکھائی دیتا، کبھی کسی مندر میں۔ اکثر شام کو سکھر میں ندی کے گھاٹ پر لوگ جمع ہوتے اور سنت سمی کے گیت گائے جاتے۔ وہ بھی وہاں ہوتا اور بڑے دھیان سے سنتا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ جیسے خود سے باتیں کرتا۔ "اچھا تو بھائی عبدالرحمٰن! تم سمجھ رہے ہونا؟ آخر تم روشنی کب دیکھنا شروع کروگے؟"

ایک دن وہ سڑک پر جا رہا تھا تو اُسے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی۔ اُس وقت اُس نے خود سے کہا "بھائی عبدالرحمٰن، تمھارے اندر دھوکا بھرا ہوا ہے۔ تمھاری آنکھوں پر غرور کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اگر تم کھول کر مسکینی سے چلتے تو تمھیں ٹھوکر نہ لگتی۔"

وہ کچھ سوچتا ہوا بیٹھ گیا۔ چند لمحوں میں ہی اُس نے خود سے پھر کہنا شروع کیا۔ "بھائی عبدالرحمٰن دیکھو تم کتنے خودغرض ہو۔ کیا اُس پتھر کو وہاں سے ہٹائے بنا ہی چلے جانا تمھارے لئے ٹھیک ہے؟ ذرا سوچو تو بھائی! شاید کوئی اور راہگیر بھی اُس سے ٹھوکر کھا کر گر پڑے" کچھ دیر رُک کر سوچتے ہوئے اُس نے اپنے آپ کو حکم دیا۔ "بھائی عبدالرحمٰن، اگر تم سچ مچ اچھے آدمی ہو، تو اُس پتھر کو اُٹھا کر ایک طرف پھینک دو" اور اُس نے پتھر اُٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔

اُس کی یہ عادت تھی کہ وہ خود کو "بھائی عبدالرحمٰن" کہہ کر مخاطب کرتا اور اُونچی آواز میں خود سے باتیں کرتا۔ اس طرح شاید وہ اپنے اندر جھانکتا، تاکہ اُس کی آتما اُس کی اپنی آواز میں اُسے حکم دے اُسے اس طرح اپنے آپ سے باتیں کرتے دیکھ کر لگتا کہ دو الگ الگ شخصوں کا آپس میں تنازعہ چل رہا ہے اور اُن میں سے ایک نڈر پہرے دار کی طرح دوسرے کو راستہ بتا رہا ہے۔

اگر کوئی اس عجیب وغریب شخص سے کھانا کھانے کو کہتا تو وہ پہلے خود سے وہی بات کہتا اور پھر جواب میں ایک فارسی کہاوت کے مطابق کہتا۔ "آدمی کو جینے کے لئے کھانا چاہیئے نہ کہ کھانے کے لئے جینا چاہیئے۔" اس طرح کھانے کے لئے مدعو کرنے والے شخص کو جواب دینے سے پہلے وہ خود سے پُوچھ لیتا۔

وہ فارسی زبان کا شاعر تھا اور اُسے حفیظ کا سارا دیوان حفظ تھا۔ شاہ اور سمیع کی تخلیقات بھی اُس نے پڑھی تھیں۔ بیدل کی شاعری سے وہ بہت متاثر تھا۔ اُسے اُردو کا بھی علم تھا۔ جب لوگوں کے پاس پنجاب سے اُردو میں لکھے ہوئے خط آتے تو وہ انہیں پڑھوانے کے لئے عبدالرحمٰن کے پاس آتے۔

وہ منکسر المزاج تھا اور اُس کی دنیاوی ضرورتیں بہت کم تھیں تھوڑا سا معمولی کھانا پا کر وہ مطمئن ہو جاتا۔ گُدڑی اُس کا ہمیشہ ساتھ دیتی رات کے وقت چاہے وہ گرمیوں کی ہی رات کیوں نہ ہو، وہ گُدڑی اوڑھ کر سو جاتا۔ گُدڑی کے نیچے وہ پوشیدہ طور پر خُدا سے باتیں کرتا۔

ایک دن ایک بے گناہ شخص کسی کے جال میں پھنس گیا۔ پولیس نے اُس پر چوری کا الزام لگایا کہ اُس نے ایک مسلمان سیٹھ کی سونے کی گھڑی چرائی ہے۔ وہ گھڑی اُس کی چیزوں میں پائی گئی تھی اور اُسے ثابت کرنے کے لئے گواہ بھی تھے۔ اُس آدمی کے بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا کیونکہ وہ سیٹھ اثر رسوخ والا آدمی تھا۔

ملزم نے اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا کہ ایک دن وہ سیٹھ کے گھر کے پاس سے گذر رہا تھا تو اُسے پکڑ لیا گیا اور یہ کہہ کر اُسے خوب پیٹا گیا کہ اُس نے سیٹھ کی بہو بیٹیوں کی طرف تاکا ہے اور گندی حرکتیں کی ہیں۔ اگر عبدالرحمٰن جو کہ اُس وقت وہاں حاضر تھا، اُسے نہ چھڑاتا تو اُسے جان سے مار ڈالا جاتا۔

سیٹھ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا اور بار بار کہتا رہا کہ میرے خاندان کی بدنامی ہوتی ہے اور میں اس آدمی سے ضرور بدلہ لوں گا۔

تب عبدالرحمٰن اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا "دیکھو" بھائی عبدالرحمٰن سیٹھ اپنی ضد پہ اڑا ہوا ہے۔ اُسے اپنی عزت کا بہت خیال ہے۔ اُس کی ایک بہن ہے۔ جس کی عمر پینتیس ۳۵ سال کی ہو چکی ہے۔ پر وہ اُس کی شادی نہیں ہونے دے رہا۔ اُسے ڈر ہے کہ شادی ہونے پر وہ جائیداد میں سے اپنا حصہ مانگے گی۔ اگر اُس لڑکی کی شادی نہ ہوتی تو....' یہ کہتے ہوئے وہ اچانک رُکا اور اُس نے گھور کر دیکھا۔ 'نہیں نہیں بھائی عبدالرحمٰن' تمہیں دوسروں کا پردہ فاش نہیں کرنا چاہیئے۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر سیٹھ کے پاس جاؤ اور اُسے سمجھاؤ۔ اگر وہ پھر بھی نہ مانے تب تم سچی بات کہہ دینا'

عبدالرحمٰن نے اونچی آواز میں خود سے یہ باتیں کی تھیں یا وہ بہت سے لوگوں کے سامنے بول رہا ہو۔ جس جس نے بھی اُس کی باتیں سُنیں وہ اُس کا اشارہ سمجھ گیا۔ سیٹھ بھی بنا سمجھے نہ رہا۔ اس طرح اُس غریب آدمی کو چھٹکارا ملا۔ پر عبدالرحمٰن نے خود سے جو باتیں کہیں اس کی چرچا سارے شہر میں ہونے لگی اور سیٹھ کی عزت مٹی میں مل گئی۔

آخر عدالت میں مقدمہ شروع ہوا گواہوں میں تین شخص سیٹھ کے پڑوسی تھے اور چوتھا عبدالرحمٰن تھا۔ دو گواہوں کو سیٹھ نے لالچ دے کر اپنی طرف کر لیا تھا اور تیسرے گواہ نے ڈر کر صاف کہہ دیا تھا کہ اُسے معاملے کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ اب عبدالرحمٰن ہی ایک گواہ تھا جس پر سارے مقدمے کا انحصار تھا۔ ملزم کے وکیل کو اس عجیب قسم کے آدمی پر بھروسہ نہیں تھا مگر خود ملزم کو عبدالرحمٰن پر پورا بھروسہ تھا جسے سچی بات کہنے میں کسی کا ڈر نہیں تھا۔

جب عبدالرحمٰن کو بُلایا گیا تو اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ 'بھائی' عبدالرحمٰن تمہیں عدالت میں بُلایا گیا ہے۔ وہاں جاؤ اُس نے اس موقع کے لئے کہیں سے جوتے لئے اور انہیں اپنی گدڑی میں لپیٹ کر کمرے میں داخل ہوا۔

چپراسی نے اُس سے کہا۔ "اپنے جوتے اُتار دو" یہ سُن کر عبدالرحمٰن نے اپنے آپ سے کہا 'بھائی عبدالرحمٰن، چپراسی تمہیں جوتے اُتارنے کے لئے کہہ رہا ہے۔ اُس سے کہو کہ تم نے یہ جوتے اس خاص موقع کے لئے کسی سے لئے ہیں تاکہ عزت کے ساتھ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہو سکو۔ جب وہ گواہی دینے کے لئے کٹ گھرے میں کھڑا ہوا تو مجسٹریٹ نے کچھ تیکھی آواز میں اُس سے پوچھا کہ تم نے اپنے گرد گدڑی کا کیوں لپیٹ رکھی ہے؟

تبھی عبدالرحمٰن نے اپنے آپ سے کہا۔ 'سنو بھائی عبدالرحمٰن، مجسٹریٹ صاحب نے تم سے گدڑی کے بارے میں پوچھا ہے۔ یاد رکھو تم اس وقت عدالت میں ہو۔ جواب دینے سے پہلے پھر سوچ لو۔ اُن سے کہو کہ ہندو گواہ ایسے موقع پر اپنی گردن کے گرد گلوبند یا تولیہ لپیٹ لیتے ہیں۔ سو تم نے بھی عدالت کے لئے عزت ظاہر کرنے کے لئے اس رواج کو اپنایا ہے! پھر اُس نے یہی بات سنجیدہ آواز میں مجسٹریٹ سے کہی۔ عدالت میں حاضر سبھی لوگوں پر اس کا گہرا اثر پڑا۔

'جیسا میں کہوں، ویسا ہی کہو،' عدالت کے کلرک نے اُس سے کہا۔ 'خدا کے نام پہ میں سچ کہوں گا، پورا سچ کہوں گا' عبدالرحمٰن نے پہلے اپنے من سے یہ بات دُہرائی اور پھر کہا 'ہاں، کلرک سچ ہی کہہ رہا ہے' تب کلرک کی طرف مڑ کر اُس نے بلند آواز میں اُس کا کہا ہوا جملہ دہرایا۔

"تمہارا نام؟"

'بھائی عبدالرحمٰن، کلرک تمہارا نام جاننا چاہتا ہے۔ ہاں اُسے اپنا نام بتاؤ' تب بلند آواز

میں نے کلرک سے کہا، 'میرا نام عبدالرحمٰن ہے'

مجسٹریٹ جو پہلے خوش دکھائی دے رہا تھا اب صبر کھونے لگا ایک وکیل نے اٹھ کر مجسٹریٹ کو انگریزی میں بتایا کہ اس طرح باتیں کرنا اس کی عادت ہے'

"تمھارا مذہب؟"

عبدالرحمٰن نے جیسے کچھ الجھن میں پڑ کر خود سے کہا 'اب بھائی عبدالرحمٰن' یہ نہ بھولنا کہ تم نے سچ بولنے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔ آخر تمھارا مذہب کیا ہے؛ اوہ! یہ تو سچ مچ ایک بے ڈھنگا سا سوال ہے۔ اگر میں کہوں کہ میں مسلمان ہوں تو ہندو اعتراض کریں گے اگر کہوں کہ میں ہندو ہوں تو مسلمان ضرور ہی برا مانیں گے۔ سچ بات کیوں نہ کہی جائے بھائی عبدالرحمٰن' آخر تم اس چھوٹی سی بات پر الجھن میں کیوں پڑ گئے؛ سنت سچل کی وہ سطور کیوں نہیں دہرا دیتے۔ میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان ہوں' میں بس وہ ہوں جو ہوں'

کلرک نے حیرت سے مجسٹریٹ کی طرف دیکھا۔ مجسٹریٹ نے حکم دیا اچھی بات ہے اِسے مسلمان لکھ لو۔

تمھاری عمر؟

بھائی عبدالرحمٰن' اب یہ تمھاری عمر جاننا چاہتا ہے جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان نہیں ہوں تو مجسٹریٹ صاحب میرے بارے میں لکھواتے ہیں کہ میں مسلمان ہوں۔

اچھا تو کلرک سے کہہ دو کہ وہ اس کے بارے میں بھی مجسٹریٹ سے ہی پوچھے' تب کلرک کی طرف مڑ کر اس نے کہا' تم یہ سوال بھی مجسٹریٹ صاحب سے ہی پوچھ سکتے ہو؛

مجسٹریٹ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا' جاہل جاٹ' اپنی زبان کو لگام لگاؤ اور ٹھیک طرح سے گواہی دو۔ تم عدالت میں کھڑے ہو'

عبدالرحمٰن مسکراتا رہا اور خود سے باتیں کرتا رہا۔ بھائی عبدالرحمٰن' مجسٹریٹ صاحب کہتے ہیں کہ تم جاہل جاٹ ہو۔ ان سے پوچھو کہ جاٹ سے ان کا مطلب کیا ہے؟"

اس سے پہلے کہ عبدالرحمٰن خود سے کہی گئی اس بات کو دہرائے مجسٹریٹ کہہ رہا تھا۔ جاٹ ان پڑھ آدمی کو کہتے ہیں

"اسی لئے بھائی عبدالرحمٰن' تم جاٹ ہو۔ تم سندھی' فارسی' اردو' سنسکرت اور ہندی جانتے ہو تم کُل ملا کر پانچ زبانیں جانتے ہو۔ مجسٹریٹ سے پوچھو کہ وہ خود کتنی زبانیں جانتے ہیں؟ تب اس نے مجسٹریٹ کی طرف مڑ کر پوچھا۔ جناب....

اس کی بات چیت بیچ میں ہی کاٹ کر مجسٹریٹ نے غصّے میں کہا' جاٹ وہ ہے جو انگریزی نہ جانتا ہو' مجسٹریٹ کی آنکھوں میں فتح کی چمک تھی پر عدالت کا سکون درہم برہم ہو چکا تھا اور سبھی اس بحث مباحثے کو سنتے ہوئے آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے۔

عبدالرحمٰن نے سنجیدہ اور بلند آواز میں اپنے آپ سے پھر کہا۔ "بھائی عبدالرحمٰن" مجسٹریٹ صاحب کہتے ہیں کہ انگریزی کا نہ جاننے والا جاٹ ہوتا ہے۔ سنا تم نے اس توہین کی کے بیٹے کو؛ ہاں ڈھور چرانے والا توہین ہی تو ہے نا؟ مجسٹریٹ سے پوچھو ان کے وہ آباؤ اجداد جو انگریزی نہیں جانتے تھے کیا سب جاٹ تھے؟ اور اگر وہ خود ...'

اب مجسٹریٹ غصّے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ گرچہ کہ وہ اسے چپ ہونے کو کہتا رہا۔ آخر اس نے کاغذ اور قلم لیکر عبدالرحمٰن کو حکم دیا۔ بہت ہو چکی تمھاری ڈھٹائی۔ عدالت کی بے عزتی کرنے کے جرم میں تم پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ اب اپنی زبان بند رکھو۔ اور اپنے بچاؤ میں جو کچھ کہنا ہو' کاغذ پر لکھ دو۔

عبدالرحمٰن نے کاغذ اور قلم لے لیا اور میز پر جھک کر لکھا!

جناب مجسٹریٹ صاحب

بھائی عبدالرحمٰن نے عدالت کی بے عزتی نہیں کی ہے۔ اگر کسی نے عدالت کی بے عزتی کی ہے تو وہ آپ خود ہیں۔ آج آپ نے کئی گواہوں کی بے عزتی کی ہے۔ یہ آپ کی کی ہوئی یہ بے عزتی بھائی عبدالرحمٰن کو چھو بھی نہیں سکی۔ یاد رکھیئے آپ جن لوگوں کا فیصلہ کرنے یہاں بیٹھے ہیں ان کے آپ مالک نہیں ہیں۔ آپ ان کے نوکر ہیں۔ ہم گواہ اس عدالت میں اپنی مرضی سے نہیں آئے ہیں

(سلسلہ [illegible] پر)

قاتل

ضیا حسنی

افسانہ

اُس نے اپنے سبھی ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ وہ اُنہیں چُن چُن کر مارتا رہا اور اُسے ذرا بھی رحم نہ آیا۔ اس کے پہلو میں دل نہ تھا کوئی پتھر کا ٹکڑا تھا۔ جن لوگوں کو اس نے موت کی نیند سُلا دیا' ان میں سے کوئی اس کا رفیق تھا اور کوئی غم گسار' کوئی مخلص و جاں نثار تھا اور کوئی دل دار' انجام کار وہ بالکل اکیلا ہو گیا اس کی زندگی پر ایسا مہیب سناٹا چھانے لگا کہ وہ بدحواس ہو کر سر ٹکراتا پھرتا' رس بھرے انسانی بولوں کے لئے اس کے کان ترس گئے۔ اس نے سب کو ٹھکانے لگا کر الگ تھلگ زندگی گزارنے کا منصوبہ بنایا تھا پھر بھی اسے یکسوئی حاصل نہیں ہوئی وہ اندر ہی اندر گھلنے لگا اسے یوں لگتا جیسے اس کی زندگی کا چراغ مدھم ہو چلا ہو' اس کا تیل بتدریج گھٹ رہا ہو۔ ایسے میں وہ بھیانک مستقبل کی جھلکیاں دیکھتا' تفکرات کے جھونکوں سے اس کا نیم مردہ جسم پتے کی طرح لرزنے لگتا۔

میں نے جب اسے دیکھا تو وہ کسی لق و دق صحرا میں کسی بے برگ و بار درخت کی مانند کھڑا تھا جیسے ہوا کے جھکڑ جھنجوڑتے اور وہ ہر آن زمین پر گرتا ہوا محسوس کرتا۔ آخری دنوں میں وہ اپنے ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے جسم کو سمیٹتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکل پڑتا۔ وہ راہ چلتے لوگوں کو گھور گھور کر دیکھتا انہیں پہچاننے کی کوشش کرتا لیکن کوئی ہم دم' کوئی ہم مذاق' کوئی ساتھی دکھائی نہ دیتا جس سے وہ دو گھڑی بات کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا کرتا وہ تو جیسے اس بھری دنیا سے کٹ گیا تھا' سڑکوں' ریستورانوں اور پارکوں میں انسانوں کے ٹھٹ لگے رہتے۔ چلتے پھرتے بے فکری سے بیٹھے ہوئے' ہنستے قہقہے لگاتے' خوب رو لیوں سے چھیڑ کرتے ہوئے انسانوں کے درمیان کھڑا ہوا وہ خود کو ایسا اجنبی محسوس کرتا کہ جیسے بھٹک کر کسی انجانے دیس میں نکل آیا ہو' تنہائی کا کانٹا اس کے ذہن میں اس طرح چبھتا ہوا لگتا کہ وہ بے چین ہو کر بے مقصد ٹہلنے لگتا اور کبھی اُکتا کر آخر کسی گھٹیا سی چائے کی دوکان میں پناہ لیتا۔ چائے پیتا' چارمینار کے سگریٹ پھونکا کرتا۔ وہ بارہا میرے دل کو مسل چکا تھا بے رحمی سے میرے بدن پر ضربیں لگا چکا تھا ایسے میں میرا کئی بار جی چاہا کہ میں اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لوں لیکن جب میں اسے اکیلا تنہا بیٹھا ہوا دیکھتا تو فوراً ہی میرا دل موم کی طرح پگھلنے لگتا اور میں اس کے پاس پہنچ کر دل داری کرنے لگتا تھا۔ جب وہ باتیں کرتا تو مجھے لگتا جیسے تپ دق کے کسی مریض کی کھانسی کے مسلسل جھٹکے ہوں' بڑی کرب انگیز یکسانیت ہوتی اُس کی گفتگو میں' وہی الم ناک زندگی کا مرثیہ' وہی تنہائی بے چارگی اور بے بسی کا شکوہ' وہی زنگ لگے ہوئے اصول اور نظریات' ان کڑوی کسیلی باتوں کو کوئی کہاں تک سُنتا؟

ایک دن میں نے اس کی کرب انگیز گفتگو کو سن کر اس طرح موڑ دیا۔

"بڑی چلچلاتی دھوپ ہے انعامی صاحب! چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں سارے بدن میں' پسینے سے نہا گیا ہوں'

ذرا ہمت کیجئے۔ آئیے' ذرا دو فرلانگ چل کر اس پُر فضا باغ میں داخل ہو جائیں جس کی زندگی بخش فضاؤں میں ہم کافی فرحت محسوس کریں گے۔ دھوپ اور تیز و تند گرم ہواؤں کی اذیت کو جھیلنے کے بعد کہیں سایہ ملتا ہے"

اتنا کہہ کر جو میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تو وہ متغیر ہو گیا تھا وہ چمک کر بولا۔

میں تمہارا مطلب سمجھ گیا' میں کاہل ہوں سہل انگار ہوں' میں نے اپنی زندگی سے انصاف نہیں کیا ہے اسے برباد کر تا رہا ہوں۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا! لیکن میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی دلکش شاعری کو کاسۂ گدائی بننے نہیں دیا۔ رنگین افسانوں کا کشکول لے کر کبھی نیتا یا

[illegible] کے کانٹے نے کسی دواخل نہیں ہوا۔ چند سکوں کے لئے کسی اخبار سے رشتہ نہیں جوڑا۔ میں [illegible] میں نے کسی دوسرے طریقہ علاج کا سہارا لیا نہیں یہ جعلی سرٹیفکیٹ نہیں دیئے، مریضوں سے ہمدردی رکھتا ہوں ان کی جیبوں پر کبھی ڈاکہ نہیں ڈالا۔ میں ناکام ہوں، پریشان ہوں۔ میں ہمیشہ اسی طرح رہنا چاہتا ہوں یقین جانو! مجھے یہ پسند نہیں کہ میں ڈھیر ساری دولت جمع کر دوں اور اپنی زندگی کو مکر اور فریب سے حاصل کئے ہوئے سرمایہ سے جگمگاؤں..."

وہ بولے جا رہا تھا کہ میں نے دخل دے دیا

"آپ کے خیالات اور نظریات لائق تحسین ہیں لیکن اچھے خیالات عمل کی بھٹی میں پک کر خوب نکھرتے ہیں۔ محض سوچتے رہنے سے کام نہیں چلتا۔ آپ کی باتوں سے مایوسی جھلکتی ہے ایسی مایوسی جو کسی باعمل انسان کے پیروں سے لپٹ کر اسے آگے بڑھنے سے روکتی ہے زندگی کی کشمکش سے تنگ آکر سپر تو نہیں ڈال دینی چاہئیے الغانی صاحب!"

"تم مجھے کیا سبق دے رہے ہو؟ پہاڑوں سے ٹکرا چکا ہوں لیکن سر نہیں جھکایا۔ طوفانوں کو مسکراتے ہوئے سہہ چکا ہوں۔ نسیم آباد روڈ پر میرا کام خوب ہی چلتا تھا میری کامیابی ڈاکٹر یوسف کی نگاہوں میں کھٹکتی تھی، اس نے سرمایہ سے میرے مالک مکان کو خرید لیا اور نبو پہلوان کی مدد سے اس نے میرا سامان باہر پھینکوا دیا۔ میں بالکل پریشان نہیں ہوا، شہر کے کنارے ادھر تو کام شروع کیا۔ تنگ دست ہوں پریشان رہتا ہوں لیکن ہمت نہیں ٹوٹی ہے کام کئے جا رہا ہوں۔ مسئلہ معاش الجھا ہوا ہے تو ازدواجی زندگی کیسے پرسکون رہ سکتی ہے؟ نکہت کو سکوں کی کھنک سے دلی لگاؤ ہے افسوس! کبھی میں اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا اس کے اشاروں پر جان دیتا تھا، جو کچھ کماتا اس کے ہاتھ میں رکھ دیتا۔ اس سے محبت کی بھیک مانگتا، پیار کے دو بولوں کے لئے ہاتھ پسارتا اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس کی مست انگڑائیوں میں ڈوب کر تھوڑی دیر کے لئے اپنی پر آلام زندگی کو فراموش کرنے کی کوشش کرتا لیکن وہ مجھے کبھی چاہت نہیں دے سکی کبھی نہیں، تب ہی تو میں اس سے الجھ کر کہتا ہوں۔

"یہ بھی ایک سرمایہ دار کی سازش تھی نکہت! کہ تم انتقام لینے کے لئے میرے سر تھوپ دی گئیں تاکہ میں کسی کل چین سے نہ بیٹھوں!"

"آپ اپنے پیشے میں ناکام ہیں تو کسی اخبار میں کام کر کے کسب معاش کیجئے!"

"تم ہمیشہ ناقابل عمل مشورے دیتے ہو کوئی اخبار میری زندگی کی الجھی گتھیوں کو سلجھانے میں معاون نہ ہوگا۔ وہاں بھی کوئی یوسف سامنے آجائے گا اور مجھے ستانے کے نت نئے منصوبے بنائے گا۔ میں کسی اخبار میں نوکری نہ کر سکوں گا۔

تب میں نے تلخی کو کم کرنے کے لئے [illegible]

"آپ نکہت بھابھی سے خواہ مخواہ خفا رہتے ہیں۔ وہ کالج میں سر کھپا کر کسی طرح گھر کی گاڑی کو کھینچ رہی ہیں۔"

ایسی بات سنتے ہی وہ آگ بگولا ہو گیا اور مجھے سخت سست کہتا ہوا آگے بڑھ گیا اس کے بعد وہ مجھے جہاں کہیں ملتا علیک سلیک کے آگے بات بڑھاتا ہی نہ تھا، اگر میں کوئی بات کرنے کا ارادہ بھی کرتا تو وہ ایسا موڈ طاری کر لیتا کہ میں خاموش آگے بڑھ جاتا تھا مہینوں یہی سلسلہ چلتا رہا وہ بت بنا ہوا میری نگاہوں کے سامنے ابھرتا اور خشمگیں نگاہوں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ ایک دن میں جرأت کر کے اس کے یہاں جا پہنچا۔ نکہت بھابھی سے معلوم ہوا کہ وہ مہینوں سے اپنے گھر نہیں آیا ایک دن وہ خط لکھ رہا تھا کہ منی نے کوئی بات معصومیت سے پوچھ لی، بس پھر کیا تھا وہ اتنا برہم ہوا کہ منی کو کئی چانٹے مار دیئے وہ رونے لگی تو انہوں نے مداخلت کی۔ اس بات پر وہ ان سے خفا ہو کر اپنا سامان لیکر یہاں سے چلا گیا

"انہیں منا لیجئے نکہت بھابھی!"

"یقین کیجئے، میں انہیں کوئی تکلیف نہیں دیتی۔ اب تو ان کی آمدنی [illegible] سے [illegible] بھی [illegible] نہیں مانگتی۔ [illegible] بنا ہوا تھا اسلئے میں اٹھانے باز آئی۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ وہ خوش خوش رہیں، کھانا

[illegible]
جانے کیوں وہ اُلجھے رہتے ہیں۔ وہ جن
اصولوں اور نظریات کا پرچار کرتے ہیں وہ
میری سمجھ سے بالاتر ہیں، جاوید صاحب!
تھوڑی دیر ٹھہر کر میں اپنے گھر آگیا لیکن
الغفانی پہروں میرے ذہن پر چھایا رہا۔ ایک دن
وہ مجھے ڈاکٹر احمد کی کلینک سے نکلتا ہوا مل گیا۔
خلاف معمول اُس دن وہ کافی تپاک سے ملا۔ یوں
لگتا تھا جیسے وہ ساری تلخی پی گیا ہو۔ اس نے
ایک آستین کہنی سے اوپر چڑھا رکھی تھی، اس
کا اُترا ہوا چہرہ، حلقوں میں دھنسی ہوئی بڑی
بڑی ذہین آنکھوں اور سُتے ہوئے بازو کو
دیکھ کر دل کو دھکا لگا۔ میں نے پوچھا
"کیسے مزاج ہیں الغفانی صاحب!"
"انجکشن لگوا کر آیا ہوں، ٹیپ ٹاپ
ہو رہی ہے لیکن اس سے کام نہ چلے گا، تھوڑے
دنوں میں یہ لونا لگی عمارت زمین پر آجائے گی۔"
"یہ عمارت پُرانی کیسے ہو گئی؟ اس میں
لونا کیسے لگا؟ یہ ٹوٹ پھوٹ کر اتنی جلدی زمین
پر کیوں گرنے والی ہے؟"
ایسے سوالات میرے ذہن میں اُبھرے
لیکن انہیں زبان پر لانے کا موقع نہیں تھا۔
میں نے جلدی سے کہا۔
"آپ اس قدر مایوس نہ ہوں، علاج
جاری رکھیے انشاء اللہ آپ جلدی تندرست
ہو جائیں گے۔"
"ٹھیک کہتے ہو جاوید! میں جلد ہی تندرست
ہو جاؤں گا [illegible] ہو جاتی ہے۔"

[illegible] سے آیا تھا
جانے کا آرڈر دیا" وہ اب بھی اپنی بیماری
پریشانیوں اور نکہت سا بھو کی بے وفائی کا
تذکرہ کیے جا رہا تھا۔ میں نے اسے بغور دیکھا
تو اس نے تیزی سے موضوع بدل دیا اور ان
مضامین، کہانیوں اور غزلوں کی باتیں کرنے لگا
جو اس اثنا میں اس کی نگاہوں سے گزر رہی تھیں
پھر سیاسی گفتگو چھیڑ دی وہ جیسے آج سب
کچھ کہہ دینے کے لئے ملا تھا۔ سابق حکمراں
پارٹی کو جی بھر کے کوستا رہا۔ اس نے
طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔
"کاش! میں اُن دنوں مر لیتا کہ جب
اس کے مخلص جیالے 'کارکن' بقید حیات
تھے۔ اِن کا اور اُن کا کوئی مقابلہ نہیں۔ مفاد
پرستی، فرقہ پرستی، صوبہ داریت، ذات پات
کی تفریق اور کینہ پرستی عام ہو رہی ہے۔ کسی
بُرائی کا نام لیجیے وہ ان میں مل جائے گی۔
غریب غریبی کے دلدل میں دھنسے جا رہے ہیں
کوئی بول نہیں سکتا، کوئی لکھ نہیں سکتا،
صدائے احتجاج بلند نہیں کر سکتا۔ اس کا گلا
رُندھ گیا تھا وہ کھانسنے لگا۔ میری نگاہوں
کے سامنے کئی مخلص کارکن اُبھر رہے تھے اُن
میں سے چند نے الغفانی کو تعاون بھی دیا
تھا۔ جی چاہا کہ ان کا نام لے لوں لیکن وہ بُری
طرح اُلجھ جاتا اس لئے میں خاموش ہی رہا
تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں
اسے سہارا دے کر باہر لے آیا اور اسے
رکشا سے اس کے گھر تک پہنچا دیا۔

[illegible] تو وہ بولا
"اب نکہت سے میرا نباہ نہیں ہو سکتی۔
اس نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے نظریات
کا اختلاف عذاب بن جاتا ہے جاوید!"
میں بھی چلا گیا اور کئی مہینے وطن نہیں
آسکا وہیں میں نے کسی دن روزنامہ "اپنی آواز"
میں ایک مختصر لیکن متوقع خبر پڑھی۔
"ڈسٹرکٹ ہسپتال میں بیمار رہ کر کینسر
ممتاز شاعر الغفانی کا انتقال ہو گیا"
وہاں کون اپنا تھا الغفانی! جو شریک
غم ہوتا۔ میں بیٹھے بیٹھے تمہاری زندگی کی
جھلکیاں دیکھتا رہا اور کرب و غم میں
ڈوبتا رہا۔ میں خواہ مخواہ ملول اور محزون
ہوا تم نے تو خود ہی اپنا تابوت تیار کر لیا تھا
یقین جانو! تم بہت دن جی سکتے تھے لیکن
نہ تو تم خود جیئے اور نہ تم نے اپنی ازدواجی
زندگی، شاعری اور افسانہ نگاری کو جینے دیا۔
پیسے کو آگ لگائی، کتنے احباب اور مخلصین
کا منہ بند کر کے ایک گوشے میں تڑپ تڑپ
کر جان دے دی ——

بقیہ: بے لاگ فلمی تبصرے

رندی کھوسہ نے لڑائی کے ایک دو سین اچھے ڈائریکٹ
کیے ہیں۔ فوٹوگرافی بس ٹھیک ہے۔
اگر آپ ہر قسم کی تفریح سے مایوس ہو گئے
ہوں تو اپنے بیکار وقت کو "چاچا بھتیجا" کی نذر
کر سکتے ہیں ◘

معلوماتی مضمون

حافظ حکیم محمد محمود خان مقوی

ہیضہ کی بیماری اور اس کا علاج

مرض ہیضہ موسم گرما میں زیادہ اور موسم سرما و بہار میں کم ہوتا ہے۔ اس بیماری میں غیر منہضم فاسد مواد قوت دافعہ کی سختی سے تنگ ہو کر بدن سے جدا ہونے کے لئے قئے اور اسہال کی شکل میں خارج ہوتی ہے اس کا سبب کبھی یہ ہوتا ہے کہ غذا کا فاسد ہو کر صفرا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ معدہ میں حرارت زائد ہوتی ہے یا غذا ہی فاسد اور قابل احتراق ہوتی ہے جس کے لطیف حصے کو جو معدے کے بالائی حصے میں تیرتا ہے بذریعہ قئے اور غلیظ حصے کو جو قعر معدہ میں ہوتا ہے بذریعہ دستوں کے طبیعت دفع کرتی ہے کیونکہ معدہ پر اس کی گرانی ہوتی ہے نیز اس سے معدہ میں جلن اور تکلیف ہوتی ہے جس وقت یہ خارج ہوتی ہے تو تمام بدن اور رگوں کے فاسد اور غیر منہضم مواد اور اس کے ساتھ اچھے مواد بھی کشاں کشاں آجاتے ہیں طب جدید کی تحقیق سے اس مرض کا سبب ایک خاص قسم کا جرثومہ یا مخصوص مادہ ہے غور کیا جائے تو دونوں میں صرف لفظی اختلاف ہے

اس بیماری کی ابتدا عموماً صبح کے وقت پہلے پیٹ میں درد ہوتا ہے دست اور قئے آنے لگتے ہیں دستوں میں پہلے فضلہ براز خارج ہوتا ہے اس کے بعد چاولوں کی پیچ کے مانند سفید دست آنے لگتے ہیں دستوں کے ساتھ ہی یا ان کے کچھ دیر کے بعد قئیں بھی آنے لگتے ہیں ان میں بھی پہلے غذا خارج ہوتی ہے اس کے بعد صفرا اور قئے آتی ہے اور آخر میں جو مادہ خارج ہوتا ہے وہ چاولوں کی پیچ کے مانند ہوتا ہے دوسرے درجہ میں قئے اور دست بشدت ہونے لگتے ہیں ہاتھ اور پاؤں اینٹھنے لگتے ہیں سر اور پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے پیاس کی شدت ہو جاتی ہے لیکن پانی یا دوا پیتے ہی فوراً قئے ہو جاتی ہے گھبراہٹ اور بے چینی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہے یہ حالت بعض مریضوں میں دو تین ساعت اور بعضوں میں دس بارہ گھنٹے رہتی ہے

تیسرے درجہ میں مریض نہایت کمزور ہو جاتا ہے سرد پسینہ آنے لگتا ہے ہاتھ پیر ٹھٹھر جاتے ہیں جسم کی جلد نیلی پڑ جاتی ہے ناخن بھی نیلے پڑ جاتے ہیں تمام جسم ٹھنڈا ہو جاتا ہے، کیونکہ دستوں اور قئے کے ذریعے خون کی مائیت بہت بڑی مقدار میں خارج ہو جاتی ہے جس کے باعث خون گاڑھا ہو جاتا ہے اور اس کا دوران سست پڑ جاتا ہے جس کی بناء پر پیروں اور جسم کی حرارت کم ہو جاتی ہے رخسار بیٹھ جاتے ہیں چہرہ لاغر ہو جاتا ہے پیاس شدید لگتی ہے ہونٹ نیلے پڑ جاتے ہیں آنکھیں پتھرا جاتی اور اندر گھس جاتی ہیں اور ان کے گرد نیلگوں حلقے پڑ جاتے ہیں اور پیشاب بند ہو جاتا ہے اسہال کے ذریعے جو غلاظت خارج ہوتی ہے اس میں رطوبت بیضیہ پائی جاتی ہے بے چینی بڑھ جاتی سانس لینے میں تکلیف ہونے لگتی ہے بات چیت کرنا محال ہوتا ہے سانس کمزور اور ٹھہر ٹھہر کر چلتی ہے کبھی اس کی حرکت بھی محسوس نہیں ہوتی دست اور قئے آنے بند ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی قئے آتی ہے مریض اٹھارہ گھنٹے کے اندر فوت ہو جاتا ہے چوتھے درجے میں علامات مذکورہ میں رفتہ رفتہ کمی ہو کر مرض بالکل رفع ہو جاتا ہے۔ قئے کا آنا موقوف ہو جاتا ہے پیاس نہیں لگتی پیشاب آنے لگتا ہے نبض تیز چلنے لگتی ہے اور بعض مریضوں کو بخار بھی ہو جاتا ہے چہرے پر تازگی اور شگفتگی آنے لگتی ہے آثار و علامات سے بیمار ہیضہ شفایاب ہونے کا یقین ہو جاتا ہے مرض ہیضہ میں اولاً دستوں میں فضلہ خارج ہوتا ہے اس کے بعد چاولوں کی پیچ کے مانند دست آنے لگتے ہیں اور قئے میں پہلے منہضم غذا خارج ہوتی ہے اور اس کے بعد صفراوی قئے اور پھر پیچ کے مانند قئے آنے لگتے ہیں اس بیمار کا

کے عوارض شدید ہوتے ہیں ایک دو دست کے بعد ہی مریض بیحد کمزور ہو جاتا ہے۔ اسہال صفراوی میں دستوں اور قئے کی رنگت صفراوی ہوتی ہے جو ہیضہ سے مختلف ہے۔ مند ہیضے میں قئے اور دست نہیں آتے مریض ابتدا ہی سے سرد پڑ جاتا ہے لیکن اس قسم کے ہیضہ کا وقوع اس وقت ہوتا ہے جبکہ ہیضہ کا پھیلاؤ بہت شدت کے ساتھ ہو۔ ہیضے کے علاج میں زہریلے مادہ کی اصلاح۔ سمی مادہ کا اخراج تقویت قلب و روح قلب و ترویح حرارت غریزی بدن۔ سکون ارواح و قوٰی بدنی اور ترک حرکات بدنی و نفسانی ضروری ہے۔ اگر طبیعت کی مدافعت سے مادہ قئے یا اسہال کے ذریعہ کافی دفع ہو رہا ہے تو معالج کی تمام توجہ تقویت قلب و انعاش حرارت غریزی و اصلاح سمیت کی جانب ہونی چاہیئے۔ نار جیل دریائی۔ پپیتا ایک ایک ماشہ آدھ پاؤ عرق گلاب میں پیس کر ڈیڑھ تولہ سکنجبین مخلوط کر کے پلانا چاہیئے یا گائے کی چھاچھ میں لوہا چاندی و سونا تپا تپا کر سات بار بجھایا گیا ہو دینا چاہیئے یا اور کوئی ادویہ جو اس موقع کے لائق ہوں دینا چاہیئے۔ اور اگر پیاس شدید ہے تو عرق بید مشک عرق گلاب پانی ان سب کو مخلوط کر کے برف سے سرد کر کے آلو بخارا اس میں چھوڑ دیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے فاصلہ سے رفع تشنگی کیلئے پلانا چاہیئے اور تقویت قلب کیلئے ٹھنڈے مخلوط جات سنگھانا چاہیئے۔ اور اگر طبیعت مادہ متحرکہ زہریلی کو اچھی طرح دفع کرنا پر قادر نہیں ہے یا غذا کے فاسد و غیر منہضم موجود ہے تو آثار و علامات سے فوراً معلوم کرنا چاہیئے کہ مادہ سمیہ کو دفع کرنے طبیعت کا رجحان کس جانب ہے بے چینی کے آثار پائے جاتے ہیں یا قئے ہوتی ہے لیکن کھل کر نہیں ہوتی ہے تو ان امور سے ثابت ہوا کہ طبیعت کا رجحان قئے کی طرف ہے نیم کی چھال کو پانی میں جوش دے کر سکنجبین بقدر ضرورت مخلوط کر کے نیم گرم پلا کر قئے کرانی چاہیئے قئے کے بعد سے آرام و سکون کا بہت خیال رکھنا چاہیئے۔ اور اسے نیند لانے کی تدبیر کرنی چاہیئے۔ اگر مادہ سمیہ قئے کے ذریعے خارج ہو جائے تو اصلاح مادہ سمیہ کی طرف کامل توجہ کرنے کی ضرورت ہے جس کے لئے تریاقات خصوصاً تریاق فاروق، تریاق رفاعی یا نارجیل دریائی و جدوار عرق گلاب عرق بید مشک میں موقع محل کے لحاظ سے دینا چاہیئے اور اگر مادہ سمیہ متحرک کو طبیعت براہ اسہال دفع کرنا چاہتی ہے۔ مثلاً اسہال رک رک کر آرہے ہیں اور آنتوں میں مروڑ قراقر اور نفخ کے آثار نمودار ہیں تو اس حالت میں طبیعت کی مدد کے لئے آلو بخارا دس دانہ، املی اتولہ گلقند آفتابی دو تولہ عرق گلاب، عرق کاسنی میں تر کر کے چھان کر پلانا چاہیئے۔ اگر اس تدبیر سے بھی کام نہ چلے اور اسہال کے ذریعے مادہ خارج ہونے میں امن و عافیت ہے تو فوراً ڈیڑھ پاؤ عرق گلاب اسی قدر عرق کاسنی میں نمک سوڈ محلول کر کے اور روغن گل شامل کر کے حقنہ دیا جائے اور اگر اسہال و قئے کا سلسلہ منقطع نہ ہوتا ہو یا کثرت و شدت سے قئے و اسہال کا باعث کسی سخت و بدترین حالت کے پیدا ہونے کا خوف ہو تو فوری انسداد قئے و اسہال کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے حب مدار یا حب حلتیت دو دو تین تین گھنٹوں کے وقفہ سے کھلانا چاہیئے ۔۔

بقیہ: کہانی "بلا عنوان"

آپ نے ہمیں بلایا ہے تاکہ ہم انصاف کرنے میں آپ کی مدد کریں۔ کیا اپنے مہمانوں سے اس طرح کا سلوک کیا جاتا ہے؟ اگر آپ گواہوں کی بے عزتی کریں گے تو عدالت میں گواہی دینے کون آئے گا؟ سچ پوچھیئے تو مقدمہ آپ پر چلنا چاہیئے اور آپ کو نوکری سے الگ کر دیا جانا چاہیئے۔ کیونکہ آپ نے عدالت میں ایسی بیہودہ زبان استعمال کی۔ اور آپ نے بادشاہ کو نیچا دکھایا ہے۔ جس کے سامنے آپ نے وفاداری کی قسم کھائی ہے۔

خود کھائی ہوئی قسم کے مطابق بھائی عبدالرحمٰن کہتا ہے کہ اس نے سچ کہا ہے۔ پورا سچ کہا ہے، اور صرف سچ کہا ہے اور اللہ جس کے ہاتھ میں ہمارا فیصلہ ہونا ہے اس کا گواہ ہے۔

دستخط

(بھائی عبدالرحمٰن)

مصنفہ اکرام اللہ

فلمی دنیا کے شب و روز

کوئی بھی آدمی ہو جب وہ یہ محسوس کرے کہ اس کے ذاتی معاملات میں ضرورت سے زیادہ مداخلت کی جا رہی ہے تو وہ ہرگز گوارا نہیں کرے گا۔ فلم والے بھی مداخلت بیجا کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتے ہیں انھیں "سیاست" سے کوئی سروکار کا واسطہ بھی نہیں ہوتا لیکن جب انھیں واسطہ پڑ جاتا ہے تو سیاست کی بازی ہی الٹ پلٹ کر کے رکھ دیتے ہیں ایمرجنسی کے زمانے میں حکومت نے بعض اداکاروں کو مجبور کیا تھا کہ وہ ان کے اشاروں پر کام کریں۔ اپنی نئی پرانی فلمیں ٹیلی ویژن کے لئے وقف کر دیں۔ اور خود بھی ٹیلی ویژن کے پروگراموں کو دلچسپ بنانے کی کوشش کریں۔ حکومت کے اس رویے کے خلاف ایمرجنسی کے دوران جو آواز اٹھائی گئی وہ صدا بہ صحرا ہو کر رہ گئی ان خاموش احتجاج کرنے والوں میں دیو آنند کی شخصیت بھی شامل ہے۔ دیو آنند نے ہمیشہ ہنگاموں سے دور رہ کر تعمیری اقدامات کئے ہیں۔ انھیں دھوم دھڑکا پسند نہیں وہ چپکے سے فلمیں بنانے کے قائل ہیں اور فلم کی کامیابی اور ناکامی کو چپکے سے قبول بھی کر لیتے ہیں ان

دنوں ان کی فلم "من من" تیار ہو کر سنسر کے لئے پیش ہو چکی تھی ان کی ایک اور فلم "دیس پردیس" بھی تکمیل کے مراحل طے کر رہی تھی جس میں لندن میں رہنے والے ہندوستانیوں کی زندگی پر مبنی حالات کو فلمایا جا رہا تھا۔ دیو آنند چاہتے تھے کہ فلم کے کچھ مناظر کی شوٹنگ لندن میں ہو قاعدہ کے مطابق انھیں مرکزی وزیر اطلاعات سے اجازت درکار تھی جس کے لئے انھوں نے شکلا صاحب کی خدمت میں درخواست بھی پیش کر دی تھی جو شاید میز اور ردی کی ٹوکری کے درمیان جھول رہی تھی۔ اس خصوص میں انہوں نے کئی مرتبہ منسٹر صاحب سے ملنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ آخر کار ایک دن انھیں شکلا صاحب کے دربار میں باریابی کا موقع نصیب ہوا۔ شکلا صاحب نے دیو آنند سے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟ یہ صاحب تھے وٹھل بھائی پٹیل جنھوں نے دو ایک فلموں میں گیت لکھے تھے اور اس وقت شکلا صاحب

کے ساتھ بے تکلف گفتگو میں مصروف تھے شکلا صاحب نے دیو آنند سے کہا کہ آئندہ تمام فلمی معاملات پٹیل صاحب سے رجوع کریں وہی ان کو حکومت کے سامنے پیش کریں گے۔ دیو آنند کو اس گفتگو میں سودے بازی کی بو محسوس ہونے لگی۔ جب انہوں نے اپنی فلم جان من کے متعلق دریافت تو کہا گیا کہ فلم ابھی سنسر بورڈ کے زیر غور ہے "دیس پردیس" کی لندن میں شوٹنگ سے متعلق پوچھا گیا تو شکلا صاحب نے صاف کہہ دیا کہ بیرونی زرمبادلہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن اس کے باوجود رکاوٹیں دور ہو سکتی ہیں اگر آپ ایک سیدھے سادے کاغذ پر دستخط کر دیں کہ ٹیلی ویژن پر آنے اور کانگریسی نمائندہ کی تائید کرنے میں آپ کو کوئی تامل نہیں ہوگا۔ دیو آنند کا کہنا ہے کہ آج سے پچیس سال قبل جب وہ لاہور سے بمبئی آئے تھے تو اس وقت ان کی جیب خالی اور مستقبل تاریک تھا۔ اس وقت بھی انہوں نے حالات سے مجبور ہو کر سمجھوتہ نہیں کیا تو اس وقت گھٹنے ٹیکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا چنانچہ انہوں نے انکار کر دیا۔

ایک زمانے میں آشا پارکھ کا طوطی بولتا تھا۔ ناصر حسین کی اس دریافت نے پردہ پر جو جو قیامتیں ڈھائیں وہ آج بھی ذہنوں میں تازہ ہیں لیکن جب عمر ڈھلنے لگتی ہے اور شباب کا رنگ اڑنے لگتا ہے تو ساری قیامتیں ایک معمولی سا واقعہ بن کر رہ جاتی ہیں

مجھے یاد ہے کسی وقت راجکپور نے کہا تھا کہ ہماری عمر کے ساتھ ساتھ مقبولیت میں بھی کمی ہوتی جاتی ہے چہرے پر جھریاں اور بالوں میں سفیدی آتے ہی پروڈیوسروں کی آؤ بھگت بھی کم ہو جاتی ہے اور عوام کے ذہنوں میں ماضی کی مقبولیت کے نقوش خود بخود دھندلے ہونے لگتے ہیں جس طرح پہلوان بوڑھا ہونے کے بعد اپنے ماضی کے تذکرے سے رعب جمانے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح فلموں کی یہ خوبصورت قیامتیں بھی شباب ڈھلتے ہی شکوے شکایتوں کا دفتر بن جاتی ہیں ایک فلم آئی تھی "چھپکے چھپکے" جسے رشی کیش مکرجی نے بڑی عمدہ کامیڈی بنا کر پیش کیا تھا کہا جاتا ہے کہ شرمیلا ٹیگور والا رول آشا پارکھ کو دیا جانے والا تھا بات چیت بھی ہو چکی تھی لیکن بعد میں دھرمیندر کی مخالفت کی وجہ سے یہ رول شرمیلا ٹیگور کو دیا گیا۔

سنیل دت نے بھی دو ایک فلموں سے آشا پارکھ کو نکلوا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل آشا پارکھ کے پاس شکوے شکایتوں کا بازار گرم ہے اگر وقت کی رفتار کے ساتھ فلمی اداکار اپنے آپ کو تبدیل نہ کریں گے اور اپنے ماضی کی عظمت کو حال کے تعاقب میں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ ان کی سب سے بڑی بھول ہو گی یہ بات شاید آپ کو معلوم ہو کہ ہمارے بڑے بڑے اداکار بھی اپنے ایسے ساتھی اداکاروں سے گھبرانے لگتے ہیں۔ جو اپنی فطری صلاحیتوں کے ذریعہ سین پہ چھا جاتے ہیں۔ ایسے اداکاروں کو فلمی اصطلاح میں "سین چرانے والے اداکار" کہا جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ راجکپور اور شمی کپور نے ایک مرتبہ کامیڈین محمود کے ساتھ کام کرنے سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ محمود ہر طرح سے سین پہ چھا جاتے ہیں اور ہیرو ہونے کے باوجود ان کی انفرادیت اور اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

آج بھی ہماری کئی ہیروئینوں کو ناظمہ اور فریدہ جلال کے ساتھ کام کرتے ہوئے گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ فلم میں چھوٹے سے چھوٹے رول کیوں نہ ہو وہ اپنی بے ساختہ اداکاری کے ذریعہ اپنی اہمیت منوا لیتی ہیں فلم دیدار کی تبسم نے "بچپن کے دن بھلا نہ دینا" کے گیت کے دوران اپنی اداکاری کے ذریعے فلم کے دیگر اہم اداکاروں، دلیپ کمار، اشوک کمار اور نرگس کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ محبوب کے انداز میں یوں تو دلیپ کمار، نرگس اور راجکپور نے ایک سے بڑھ کر ایک اداکاری کے جوہر دکھائے تھے لیکن ککو نے "دل توڑ نہ" کے گیت کے دوران اس قدر متاثر کن اداکاری کی تھی کہ لوگ آج بھی اسے بھول نہیں سکے ہیں بعض فلموں میں کم سن بچوں نے اپنی اداکاری سے فلم کو کامیاب بنایا ہے ایک ہی راستے میں ڈیزی ایرانی، بیجو باورا میں تبسم اور رتن کمار وغیرہ اس کی اچھی مثالیں ہیں اور تو اور بعض وقت یا تو جانو بھی فلم پر چھا جاتے ہیں فلم انسانیت کا بندر زپ یاب اداکاری میں دلیپ کمار، دیو آنند اور بینا رائے سے بہت آگے نظر آتا ہے۔ فلم ہاتھی میرے ساتھی میں رامو ہاتھی راجیش کھنہ کو بہت پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ سنا ہے کہ آج کل راجیش کھنہ کو کسی جانور کے ساتھ کام کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔

غرض یہ فلمی دنیا ہے جہاں پاؤڈر اور لپ اسٹک کا میک اپ بوڑھوں کو جوان اور جوانوں کو بوڑھا بنا دیتا ہے۔ اچلا سچدیو اچھی خاصی نوجوان عورت ہمیشہ ہی بوڑھی بنی رہی۔ رنگ و نور کی اس دنیا میں چمک دمک کے ساتھ چہرے بھی یاد رہتے ہیں۔ جب روشنی ماند پڑ جاتی ہے یا غائب ہو جاتی ہے تو فلمی چہرے بھی اندھیرے میں غائب ہو کر ذہنوں سے اتر جاتے ہیں۔

بقیہ۔ "فلمی ڈائری"

بنائی جائیں تو انھیں فلمایا جائے گا۔ معلوم نہیں واجدہ تبسم اب کیسے پہ دہ پر عریاں کری

★

فلم "قصہ کرسی کا" ابھی عدالت میں زیر بحث ہے لیکن اس کے پروڈیوسر امرت نہاتا نے اسے اب بڑے پیمانے پہ بنانے کا اعلان کر دیا ہے۔ ان کی دوسری فلم "قصہ نس بندی کا" ہو گی۔ قصہ کہانیوں کا یہ دور چلتا رہا تو کسی دن کوئی پروڈیوسر "قصہ امرت نہاتا کا" بنانے کا اعلان کر دے گا۔

فلمی ڈائری

دلیپ کمار منوج کمار کی فلم کرانتی میں ایک اہم رول ادا کریں گے جو ان کی زندگی کا پہلا تجربہ ہوگا ۔ اگر یہ تجربہ کامیاب ہو جائے تو وہ آئندہ بھی اسی قسم کے کیرکٹر رول کرنا پسند کریں گے ۔ دلیپ صاحب کو یہ اقدام بہت پہلے کرنا چاہیئے تھا ۔ بہرحال ہماری تمنائیں دلیپ صاحب کیساتھ رہیں گی ۔ کرانتی کی کہانی سلیم جاوید لکھ رہے ہیں اور موسیقی لکشمی کانت پیارے لال دیں گے ۔

★

سہراب مودی نے اپنی فلم 'پکار' کے لئے دلیپ کمار، سائرہ بانو، راج کپور، دھرمیندر، ہیما مالنی اور ششی کپور کے ناموں کا اعلان کیا تھا اب معلوم ہوا ہے کہ وہ ان بڑے ستاروں کے بجائے نئے ابھرتے ہوئے اداکاروں کو لیکر "پکار" بنائیں گے ۔ سہراب مودی آج سے چالیس سال پہلے اگر اس قسم کا تجربہ کرتے تو وہ ضرور کامیاب ہوسکتے تھے کیونکہ اس زمانے میں ستاروں سے زیادہ ڈائرکٹر کی اہمیت ہوا کرتی تھی اور ڈائرکٹر کے نام ہی سے فلم چلتی تھی آج معاملہ دوسرا ہے اس لئے سہراب مودی کو سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیئے ۔ ورنہ ان کی ساکھ بھی جاتی رہے گی

★

سنا ہے کہ راجیش کھنہ اور سلیم جاوید کے اختلافات ختم ہوگئے ہیں اور ان میں بعض دوستوں کی مدد سے صلح صفائی ہوگئی ہے ۔ اختلافات کی بنیاد سلیم جاوید کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ جس اداکار کو اپنی کہانی کے لئے منتخب کرتے ہیں وہ کامیاب ہوتا چلا جاتا ہے ۔ راجیش کھنہ نے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا تھا لیکن جب اس کی کئی فلمیں یکے بعد دیگرے فلاپ ہوتی چلی گئیں تو اس نے ہار مان لی اور سلیم جاوید سے سمجھوتہ کر لیا ہے

★

دلیپ کمار ایک نئی فلم بنا رہے ہیں جس کی کہانی انھوں نے خود لکھی ہے ۔ ان کے کہنے کے مطابق فلم طوفانی رفتار سے مکمل کی جائے گی ۔ معلوم نہیں طوفانی رفتار سے ان کا کیا مطلب ہے خدا کرے وہ "بیراگ" کی طرح کوئی بیہودہ فلم نہ بنائیں ۔ جب نئے نئے فلم ساز حقیقت افروز فلمیں بنا رہے ہیں تو پتہ نہیں ۔ دلیپ صاحب کو حقیقت سے دور رہنا کیوں پسند ہے ۔ امید کہ ان کی نئی فلم "بیراگ" کے خسارے سے کوسوں دور رہیگی

★

فلم فیر ایوارڈ فنکشن میں تقریر کرتے ہوئے مرکزی وزیر اٹل بہاری واجپائی نے کہا کہ وہ اکثر فلمیں دیکھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایمرجنسی کے دوران جیل میں انھوں نے فلم "تپسیا" دیکھی تھی ۔ فلمی اداکاروں میں انھوں نے راکھی اور مدھو کمار کی بیحد تعریف کی ۔ اور تقریب سے واپس ہوتے ہوئے انھوں نے منتظمین پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں نے مجھے وزیر ہونے کے ناطے یہاں بلوایا ہے کل اگر میں وزارت پہ باقی نہ رہوں تو مجھے بلانا نہ بھولیئے گا ۔

★

فلم والوں میں آج کل پاکستانی پلے بیک سنگر مہدی حسن کی بڑی دھوم ہے جہاں بھی شوٹنگ ہو ان کے ریکارڈ کی آواز سنائی دینا لازمی ہے گذشتہ دنوں کشمیر کے اوبرائے پیلس ہوٹل میں امیتابھ، شتروگھن سنہا، راکھی اور رینا رائے ٹھہرے ہوئے تھے اور ان کے کمروں سے مہدی حسن کے ٹیپ کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی ۔ ایک ہیرو صاحب نے غضب کر دیا سیٹ پر وہ کافی دیر سے پہونچے اور تاخیر کی وجہ یہ بتلائی کہ وہ مہدی حسن کی آواز میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ انھیں شوٹنگ کا خیال ہی نہیں رہا

★

آئی ایس جوہر نے اپنی نئی فلم کا نام نسبندی رکھا ہے جس میں امیتابھ بچن سے ملتا جلتا ایک نوجوان ہیرو کا رول ادا کرے گا ۔ جوہر صاحب کی خواہش تھی کہ سنجے گاندھی کی منظور نظر رخسانہ سلطانہ اس فلم میں ہیروئین کا رول کرے لیکن اس نے انکار کر دیا ۔ کچھ عجب نہیں جوہر صاحب رخسانہ سے ملتی جلتی کسی لڑکی کا انتخاب کریں ۔

★

مشہور افسانہ نگار واجدہ تبسم اب فلموں کی کہانیاں لکھیں گی ۔ آج کل وہ کمال امروہی کی فرمائش پہ دو کہانیاں لکھ رہی ہیں ۔ آگے

بے لاگ فلمی تبصرہ

چاچا بھتیجا

"چاچا بھتیجا" من موہن ڈیسائی کی تیسری کامیاب فلم ہے جو دوسری دو کامیاب فلموں "دھرم ویر" اور "امر اکبر انتھونی" کے مقابلے میں کم دلچسپ اور جاذب نظر نہ ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ کامیاب بزنس کر رہی ہے سچ پوچھئے تو فلم میں کوئی بھی بات ایسی نہیں ہے جو فلم کی مقبولیت کی ضمانت بن سکے لیکن اس کے باوجود فلم باکس آفس پر بہت چل رہی ہے۔ کیوں چل رہی ہے اس کی وجہ کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔ خود من موہن ڈیسائی بھی نہیں بتا سکتے۔ باکس آفس کی کامیابی کا "نسخہ کیمیا" آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آسکا۔ بعض وقت بڑی بڑی فلمیں فلاپ ہو جاتی ہیں اور معمولی فلمیں چل نکلتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ وہ کونسی باتیں ہیں وہ کونسے عناصر اور اسباب و عوامل ہیں جو کسی فلم کو کامیاب بناتے ہیں؟ اس کا صحیح تجزیہ آج تک نہیں ہو سکا ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ قسمت کا کھیل ہے جس کا فلم کی کہانی سے تعلق تو ہوتا ہے مگر اتنا گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ اگر واقعی گہرا تعلق ہوتا تو "چاچا بھتیجا" جس کی کہانی پریاگ راج نے لکھی ہے اور جو انتہائی بے جان کمزور اور گھسی پٹی کہانی ہے کبھی کامیاب نہ ہوتی۔

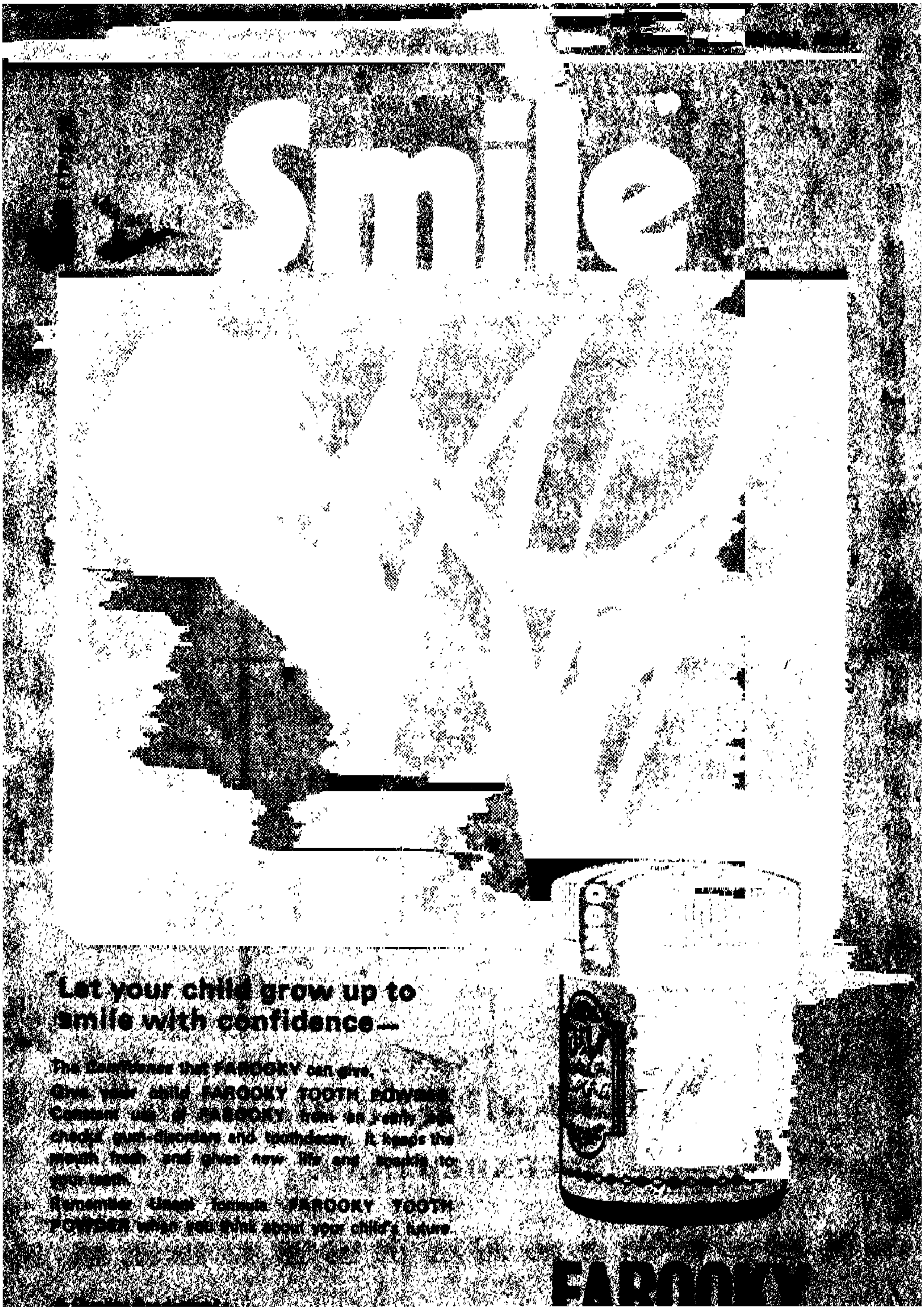
پریاگ راج کی کہانی ایک دولت مند بزنس مین تیجا (رحمان) سے شروع ہوتی ہے جو دنیا کی تمام نعمتوں سے نوازا گیا ہے لیکن زندگی کی سب سے بڑی نعمت اولاد سے محروم ہے۔ اس کی بیوی سیتا دیوی (اندرانی مکرجی) مندر جاتی ہے اور بھگوان سے پرارتھنا کرتی ہے کہ اس کی گود ہری ہو جائے۔ اسی وقت وہاں مندر میں ایک لڑکی سونی (سمی) آتی ہے جو بھگوان سے موت مانگتی ہے تاکہ وہ بن بیاہی ماں بننے سے بچ جائے۔ سیتا دیوی جب اُسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے تو سونی اُسے دعوت دیتی ہے کہ وہ خود سونی کے بچے کو اپنالے جب کہ اسے بچے کی شدید تمنا ہے۔ سیتا کچھ سوچ کر سونی کی بات مان لیتی ہے اور گھر آکر تیجا کو باپ بننے کی خوشخبری سنا دیتی ہے۔ تیجا اس دوران یورپ جا کر لوٹتا ہے تو سیتا کے گود میں اپنے معصوم وارث کو دیکھ کر پھولے نہیں سماتا مگر خوشیوں کے یہ پھول کچھ ہی دنوں بعد مرجھا جاتے ہیں۔ سونی سیتا کو بلیک میل کرتی ہے۔ ٹونی (دیو کمار) جو سونی کا شوہر اور بچے کا باپ ہے سیتا دیوی سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کرتا ہے۔ سیتا اس کے گھر روپے دینے آتی ہے تو تیجا ٹونی کی اطلاع پر اسے ٹونی کے گھر دیکھ لیتا ہے اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ سیتا بے وفا ہے اور اس کے تعلقات دوسرے مرد سے ہیں۔ یہ غلط فہمی بیوی اور شوہر کے تعلقات کو ختم کر دیتی ہے۔ اور سیتا تیجا کا گھر چھوڑ کر خودکشی کے راستے پر نکل پڑتی ہے لیکن یہاں ایک خدا ترس پٹھان گل خان (انور حسین) اسے دریا میں ڈوبنے سے بچا لیتا ہے۔ اسے پتہ چلتا ہے کہ سیتا دیوی ماں بننے والی ہے اس کو جو لڑکا پیدا ہوتا ہے وہ سندر (رندھیر کپور) ہے جو فلم کا دوسرا ہیرو یعنی بھتیجا ہے فلم کا پہلا ہیرو چاچا شنکر (دھرمیندر) کے روپ میں آتا ہے جو تیجا کا چھوٹا بھائی ہے۔ شنکر سیتا دیوی کے گھر سے جانے کے بعد سے اپنے بھائی سے ناراض ہے کیونکہ وہ اپنی بھابھی کو بے گناہ سمجھتا ہے۔ جب اُسے پتہ چلتا ہے کہ تیجا کی نئی بیوی سونی اُسے جان سے مار ڈالنا چاہتی ہے تو وہ بھی گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ یہاں اُسے ایک

نیک دل ماحر سیدھ کر کچھ محبت پناہ بھی دیتا ہے اور ماں کا پیار بھی۔ سیتا دیوی کو گھر سے نکالنے اور سونی کو تیجا کی بیوی بنانے کا پلان لکشمی داس (جیون) بناتا ہے جو تیجا کا قابل اعتماد نوکر ہے۔ لکشمی داس تیجا کی ساری دولت ہڑپ کرنا چاہتا ہے لیکن شنکر اور سندر بلکہ اس کے شیطانی منصوبے کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔ شنکر فلموں کے ٹکٹیں بلیک کرتا ہے اور "یہودی کی لڑکی" سے "پالی" تک پہنچتے پہنچتے ایک شریف دادا بن جاتا ہے۔ اس کی محبوبہ مالا (ہیما مالنی) ایک شراب کا اڈہ چلاتی ہے۔ سندر بمبئی آتا ہے اور اپنے باپ تیجا کے فرم میں ملازم ہو جاتا ہے۔ سونی کا بھیا کرن (پریمیش کمار) اس کا "باس" بنا ہوا ہے۔ سندر اور کرن ایک ہی لڑکی پنکی (یوگیتا بالی) کو چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پنکی تو صرف سندر ہی کو چاہے گی جو فلم کا ہیرو ہے اور جس نے اس کی جان بچائی تھی۔ چاچا بھتیجا یعنی شنکر اور سندر ملکر لکشمی داس کی بےایمانی اور اس کے کالے کارناموں کو بے نقاب کرتے ہیں اور اس طرح ہر ہندوستانی فلم کی مانند راون کیفر کردار کو پہنچتا ہے اور سیتا کو بن باس سے چھٹکارہ مل جاتا ہے۔

کہانی بے حد کمزور اور بے جان ہے جسے سلیم جاوید کے تیز رفتار اسکرین پلے نے بڑی حد تک سہارا دیا ہے۔ سیتا دیوی کو ٹونی کے فلیٹ پر جانے کی قطعی فرصت نہیں تھی وہ مطلوبہ رقم سونی کے ذریعے بھی بھیجوا سکتی تھی۔ تیجا ٹونی کے فلیٹ میں اس کے ساتھ ایک دوسری لڑکی کا پچھلا حصہ دیکھ پاتا ہے اور ٹونی کی اطلاع پر بھروسہ کرتے ہوئے اسی کو سیتا سمجھ بیٹھتا ہے یہ غلط فہمی بڑی آسانی سے دور ہو سکتی تھی اگر سیتا کو فلیٹ سے نکلتے ہوئے بتایا جاتا اور اس وقت بھی تیجا اسے اپنا دور بین سے دیکھ لیتا۔ تیجا اپنی بیوی کے کردار پر شک کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے بچے کی پرورش کو قبول کرلیتا ہے حالانکہ ایسی صورت میں اسے بچے کو سیتا کے حوالے کر دینا چاہیئے تھا سیتا اپنے پتی کو چھوڑ دینا گوارا کرتی ہے لیکن بچے کے راز کو فاش کرنا نہیں چاہتی جب کہ اس طرح وہ اپنی چھوٹی سی غلطی کا اعتراف کرکے ایک سنگین اور جھوٹے الزام سے بچ سکتی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ اگر ہوتا تو کہانی شروع ہی نہیں ہو پاتی تھی۔ لکشمی داس جو انتہائی چالاک ہے اپنے پلان کی کامیابی کے بعد تیجا کی دولت ہڑپ کر جانے کی بجائے شنکر اور سندر کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے تاکہ وہ بڑے ہو کر واپس آئیں اور اس کے تمام کئے دھرے پر پانی پھیر جائیں۔ کہانی میں ان بنیادی خامیوں کے علاوہ بھی بہت ساری خامیاں موجود ہیں فلم کی بڑی خوبی اس کا تیز اور مضبوط اسکرین پلے ہے جو تماشائی کی توجہ کو برقرار رکھتا شنکر ہڑتال کے دن اپنی ماں کو دواخانہ کو لے جانا چاہتا ہے لیکن وہ پتہ ساتھ کو صورتحال سے واقف کرانے کی بجائے اندھا دھند شنکر دوڑاتا رہتا ہے جو کلا کے سوائے اور کچھ نہیں۔ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے بڑے شانس تماشائی کو ہدایتکار کی عقل پر ہنسنے پر مجبور کرتا تھا اور یہی حال سندر کے بمبئی آنے پر اس کی اور شنکر کی غیر ضروری لڑائی کا ہے اس قسم کے حصول کو ایڈیٹ کرکے فلم کی طوالت کو بڑی حد تک کم کیا جاسکتا تھا۔

شنکر کے رول کو اپنی جاندار اداکاری سے دھرمیندر نے دلچسپ و زندہ کردار بنانے کی کوشش کی ہے۔ رندھیر کپور نے کہیں متاثر نہیں کیا۔ ہیما مالنی کا رول نہ اور دلچسپ ہے جس سے ہیما نے بڑے خوبصورت انداز میں انصاف کیا ہے۔ اندرانی مکرجی نے کامیاب اور متاثر کن اداکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ یوگیتا بالی اپنے رول میں بس ٹھیک ہی جا سکتی ہے کا اپنے چھوٹے سے رول میں بھی کافی بہتر ہے دوسرے کرداروں میں رحمان، جیوا انور حسین اور رد بیش کمار قابل ذکر ہیں۔ لکشمی کانت پیارے لال کی موسیقی آنند بخشی کے گیت برائے نام ہیں شعلہ کا گانا یا ہوا ایک گانا شاید مقبول ہو پائے

(سلسلہ صفحہ ۲۵ پر)


Smile
Let your child grow up to
smile with confidence—
FAROOKY

November,

1977



کا سنو میرے ہاتھوں سے کہیں چھوٹ نہ جائے کہ میں پاس کا [illegible] ہم سے [illegible]
آتش کہاں جا بیٹھے گی ذرا مجھے دلا دے
اے باد بہاری ذرا گلشن مجھے دکھلا دے
میں ستارے سے لوٹا ہوں مرجھا دیر سے چپ ہوں لیکن میرے دل
سر تا پا قدم اپنی مرادوں کو سمیٹ لے
چاند ہو کے نکلے ہیں [illegible] والے
میں لالہ صحرا ہوں مرجھا دیر سے چپ ہوں لیکن [illegible]

اشاعت کا تیرھواں سال
جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت
علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

پونم

جلد (۱۳) نومبر ۱۹۷۷ء
شمارہ (۱۱)

زرِ سالانہ (۱۵) روپے
لائبریریز کیلئے (۲۰) روپے
بیرونی ممالک سے (۲۵) شلنگ

ایڈیٹر
ناصر کرنولی ایم اے (عثمانیہ)

خط و کتابت کا پتہ:
منیجر ماہنامہ پونم
16-7-300/1
اعظم پورہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴

طباعت:
مشیر پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد

ترتیب

● سرورق: شاعرِ مشرق علامہ اقبال، جن کے یوم پیدائش کی صد سالہ تقاریب دنیا کے اکثر ممالک میں اہتمام سے منائی جا رہی ہیں۔

پہلا بچہ چراغ خاندان ہے اُسے توانا اور صحت مند بننے کا پورا موقع دیجئے۔



اس کے لئے لازم ہے کہ دوسرا بچہ مزید تین سال تک پیدا نہیں ہونا چاہئے...

پہلے تین سال بچے کی ذہنی اور جسمانی نشو و نما کے لئے بہت اہم ہیں۔ یہی وقت ہے جب بچے کو آپ کے پورے پیار اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے اگر آپ پر پہلے بچے کے ساتھ ایک دوسرے بچے کو پالنے کی ذمہ داری نہ ہو۔ دو بچوں کی پیدائش کے درمیان تین سال کا وقفہ ماں اور بچہ دونوں کی صحت کے لئے بڑا ضروری ہے یہ وقفہ نرودھ، گولیوں یا آئی یو ڈی کے استعمال سے یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے اپنے قریب ترین صحت مرکز سے رجوع کیجئے۔

پہلے بچے کا حق اور ادھیکار — ملے تین سال تک پورا پیار

davp 77/100

کرنیں

اداریہ :

اقبال صدی تقاریب

ان دنوں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے یوم پیدائش کی صد سالہ تقاریب ہند و پاک کے علاوہ دنیا کے بیشتر ممالک میں نہایت ہی اہتمام سے منائی جا رہی ہیں۔ حیدرآباد میں بھی اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام ان تقاریب کا انعقاد عمل میں آیا ہے۔ ان چار روزہ تقاریب میں اقبال کے کلام اور پیام کے مختلف گوشوں پر جس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے اس سے اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں اقبال کے کلام کی عظمت، اہمیت اور افادیت کو عام کرنے اور عوام تک پہونچانے کی شدید ضرورت ہے۔ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ جس کے لئے وہ یقیناً مبارکباد کی مستحق ہے۔ اقبالؒ کے پرستاروں اور عقیدتمندوں کو چاہیئے کہ وہ اکیڈیمی کے ساتھ پر خلوص تعاون کریں تاکہ اقبالؒ کے کلام و پیام کی صحیح روح سے عوام اور بالخصوص نئی نسل کو روشناس کرایا جاسکے ـــ (ادارہ)

ابراہیم جلیس

اُردو کے ممتاز افسانہ نگار، ادیب اور صحافی جناب ابراہیم جلیس کا ۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۷ء کو انتقال ہوگیا۔

ابراہیم جلیس کا شمار ہند و پاک کے صف اول کے طنز نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق حیدرآباد دکن سے تھا علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں گریجویشن کی تعلیم کے دوران ہی وہ ایک اچھے افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں جلیس پاکستان منتقل ہوگئے اور روزنامہ "جنگ" کے طنزیہ کالم نگار کی حیثیت سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور اپنی تحریروں کے ذریعہ نہایت ہی قلیل عرصہ میں ملک گیر شہرت حاصل کرلی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۵۴ سال تھی اور وہ روزنامہ "مساوات" کے ادارتی فرائض انجام دے رہے تھے۔ صحافت سے ہٹ کر بحیثیت ادیب و افسانہ نگار جلیس کی کئی تصانیف ہیں جن کو خاص و عام میں مقبولیت حاصل ہوچکی ہے نہ صرف قارئین بلکہ ارباب نقد و نظر نے بھی ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ جہاں تک ان کے نظریات کا تعلق ہے جلیس ترقی پسند رجحانات اور ادب کی دیگر صحت مند قدروں کے علمبردار رہے ہیں۔ حق و انصاف کے لئے ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھانے میں جلیس نے کبھی تامل نہیں کیا۔

جلیس کی اچانک موت سے اُردو ادب اور صحافت کا جو نقصان ہوا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر، چھوٹے بھائی مجتبیٰ حسین اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ (ادارہ)

ڈاکٹر محمد باقر

اقبال کی توضیحات بندۂ مومن کے بارے میں

اقبال دو حیثیتوں سے دنیا سے روشناس ہوا ایک بحیثیت شاعر، جس پر وہ فخر نہیں کرتا دوسرے بحیثیت مفکرِ اسلام جس پر اسے بجا طور پر ناز ہے۔ جب ہم اسے مفکرِ اسلام کہتے ہیں تو صحیح طور پر اس سے ہمارا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اقبال کے فکر کو اسلام نے جلا دی ہے اور اس نے اسلام کے اصل منابع قرآن مجید اور احادیثِ نبوی سے استفادہ کیا ہے چنانچہ بندۂ مومن کی جو توضیحات وہ کرتا ہے ان کی بنیاد بھی انہی منابع پر ہے۔ ان منابع میں سے صرف قرآن مجید پر نظر ڈالیں تو کم از کم سینکڑوں مقامات پر مومن کی تعریف پروردگارِ عالم نے خود فرمائی ہے۔ صرف سورۃ "المومنون" کی ابتدائی آیات پر نظر ڈالیں تو ارشاد ربانی راہنمائی کرتا ہے کہ:-

"مومنوں نے یقیناً فلاح پائی ہے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ لغویات سے دور رہتے ہیں۔ جو زکوٰۃ (ادا) کیا کرتے ہیں (اور) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں...... اپنی اماتنوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں اور اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔"

مومنوں کے یہ صرف چند خصائص ہیں جن کا ذکر اس موقع پر ہوا ہے۔ اب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر نظر ڈالیں تو انہی کی خصائص کی توضیحات کے لئے آپ نے متعدد اسالیب پسند فرمائے ہیں۔ مثلاً فرمایا: "جو امانت کی صفت نہیں رکھتا وہ ایمان نہیں رکھتا اور جو عہد کا پاس نہیں کرتا وہ دین نہیں رکھتا" (بیہقی فی شعب الایمان)

اب اجماع مشائخ پر نظر ڈالیں تو آدابِ ایمان کی یہ توضیح ملتی ہے کہ ایمان تبھی تکمیل پاتا ہے جب زبان سے توحید و رسالت کا اقرار کیا جائے۔ دل سے ان کی تصدیق کی جائے اور ان کے ارکان پر عمل کیا جائے۔ پھر یہ بھی کہا کہ جو آدمی زبان سے اقرار نہیں کرتا وہ کافر ہو جاتا ہے جو آدمی دل سے تصدیق نہیں کرتا وہ منافق ہے اور جو ترک اعمال کرتا ہے وہ فاسق ہے اور رسولؐ کی متابعت نہ کرنے والا مبتدع ہے۔ اس لئے بعض آدمی ایمان کے اعتبار سے دوسروں سے افضل تر ہوتے ہیں معروف تابعین میں سے ساتویں آٹھویں صدی عیسوی کے مشہور بزرگ حسن بصریؒ (وفات ۱۱۰ ہجری) سے پوچھا گیا، "کیا آپ صحیح مومن ہیں؟" تو آپ نے جواب دیا: اگر اس ایمان سے مراد یہ ایمان ہے جو میرے خون اور مال کو معصوم رکھتا ہے اور میرے کشتہ اور نکاح کو حلال بناتا ہے تو میں صحیح مومن ہوں لیکن اگر تمہاری مراد اس ایمان سے ہے جس کی وجہ سے بہشت تک میری رسائی ہوگی اور دوزخ سے نجات ملے گی اور خدائے رحمٰن مجھ سے مطمئن ہوگا تو اگر خدا نے چاہا تو میں مومن قرار دیا جاؤں گا۔"

اسی دور سے تقریباً نصف صدی بعد کے ایک اور صالح بزرگ سفیان ثوری (وفات ۱۶۱ ہجری) نے اس رویے کی وضاحت یہ کی ہے کہ: ہم خدا، رسولوں، ملائکہ اور صحف سماوی پر ایمان تو لے آئے لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ خدا کے سامنے ہماری کیا حیثیت ہے"۔ یعنی مومن کا مرتبہ پالینا کوئی آسان بات نہیں۔ غالباً اسی جذبے نے اقبال سے کہلوایا تھا:-

بندۂ مومن ز آیات خدا ست
ہر جہان اندر بر او چون قبا ست
چون کہن گردد جہانی در برش
می دہد قرآن جہانی دیگرش

(مومن خدا کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ ہر دور اس کے جسم پر قبا کی مانند چست ہے اور جب ایک دور اس کے لئے پرانا ہو جاتا

ہے تو قرآن اسے ایک نیا دور عطا کر دیتا
ہے) یا یہ کہ ؎

مومنی بالای ہر بالاتری
غیرت او برنتابد ہمسری

(مومن ہر بالاتر سے اونچا ہے اس کی غیرت کسی کو اپنے برابر تسلیم نہیں کرتی)

گویا مومن اتنا اونچا انسان ہے کہ وہ ہر زمانے میں قرآن کی راہنمائی سے اپنے لئے ایک نیا جہان تخلیق کرتا ہے مومن کی اس علو ہمتی اور اس کے چلن کی وجہ سے اقبال اسے "تقدیر الٰہی" کے خطاب سے یاد کرتا ہے اور کافر یعنی ایمان نہ رکھنے والے آدمی پر اس کا تفوق ہر اعتبار سے ثابت کرتا ہے ؎

کافر ہے مسلمان، تو نہ شاہی، نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

یہ مومن جو تقدیر الٰہی ہے اس کی صفات اقبال نے متعدد مقامات پر گنوائی ہیں۔ چند ایک ملاحظہ فرمائیے : ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکار حق، مرد خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

مومن کی دنیاوی مساعی کو اقبال کس نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی
یہ مال و دولت دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتان وہم و گماں، لا الٰہ الا اللہ

مومن کی قدرت اور قاہری اگر مال و دولت دنیا نہیں تو کیا ہے ؟ ؎

مومن از عزم و توکل قاہر است
گو ندارد این دو جوہر کافر است
خیر را از بازی داند ز شیر
از نگاہش عالمی زیر و زبر
کوہسار از ضربت او ریز ریز
در گریبانش ہزاران رستخیز

(مومن تو اپنے عزم اور توکل کی بدولت پہلوان ہے اگر اس میں یہ دو خوبیاں نہیں تو وہ کافر ہے۔ وہ نیکی اور بدی میں خوب تمیز کرتا ہے اور اس کی ایک نظر سے دنیا زیر و زبر ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی ضرب سے کوہسار ریزہ ریزہ ہوتے ہیں اور اپنے گریباں میں ہزاروں قیامتیں لئے پھرتا ہے)۔

یہ تو اس مومن کی بات تھی جو ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

اور ؎

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

لیکن مومن نے جب ایمان ہاتھ سے کھو دیا تو اس پر کیا گزری، یہ حقیقت بھی اقبال کی نظر سے اوجھل نہ تھی ؎

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری

اس صوفی نے مومن کے مرتبے سے نیچے اتر کر مسلمان کو تن بہ تقدیر آمادہ کیسے کیا وہ بھی سنیے ؎

اسی قرآں میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

اور اس نام کے مومن نے جب اپنے زوال پر ناداری کا رونا عذر کے طور پر رویا تو اقبال کو کہنا پڑا ؎

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

اور پھر اس زوال میں زوال پذیر مسلمہ مومن کی جو شکل بنی اس کی تصویر حضرت

علامہ نے یوں کہی ہے —

مومن و پیش کسان بستن نطاق
مومن و غداری و فقر و نفاق
با پشیزی دین و ملت را فروخت
هم متاع خانه و هم خانه سوخت
لا اله اندر نمازش بود و نیست
نازها اندر نیازش بود و نیست
نور در صوم و صلوٰة او نماند
جلوه ای در کائنات او نماند
آنکه بود الله او را ساز و برگ
فتنهٔ او حب مال و ترس مرگ
رفت ازو آن مستی و ذوق و سرور
دین او اندر کتاب و او بگور!
تا جهاد و حج نماند از واجبات
رفت جان از پیکر صوم و صلوٰت
روح چون رفت از صلوٰت و از صیام
فرد ناهموار و ملت بی نظام
سینه ها از گرمی قرآن تهی
از چنین مردان چه امید بهی

(یہ کیا مومن ہے جو دوسرے انسانوں کے سامنے پیٹی باندھ کر کھڑا ہوتا ہے! یہ کیا مومن ہے جو غداری، غربت اور نفاق میں مبتلا ہے۔ یہ وہ مومن ہے جس نے دین اور ملت کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دیا۔ اس طرح اپنے گھر کا سامان اور خود گھر جلا دیا۔ اس کی نماز میں لا الہ تھا مگر نہیں رہا۔ اس کے عجز میں فخر تھا جو نہیں رہا۔ اس کے نماز روزے سے نور چھن گیا اور اس کی کوئی میں کوئی جلوہ نہ رہا۔ یہ وہ (مومن) تھا جس کا ساز و سامان صرف اللہ تھا لیکن یہ مال کی حرص اور موت کے خوف سے برباد ہو گیا (نتیجۃً) اس سے (زندگی کا) نشہ، ذوق اور سرور چھن گیا۔ اس کا اسلام قرآن کے اندر اور وہ خود قبر میں بند ہو گیا اس نے جب جہاد اور حج کے فرائض ترک کر دیئے تو اس کے نماز روزے کے جسم سے جان نکل گئی اور جب اس کے نماز روزے سے روح نکل گئی تو وہ اکھڑا اکھڑا فرد بن گیا جس کی ملت بے نظام تھی۔ اس کا سینہ قرآن کی حرارت سے خالی ہو گیا۔ ایسے لوگوں سے فلاح و بہبود کی کیا توقع کر سکتے ہو!)

مومن است و پیشہ او آذری ست
دین و عرفانش سراپا کافری ست

(مومن تو ہے لیکن پیشہ اس کا بتگری، بت پرستی ہے اور اس کا دین و عرفاں سر تا سر کفر ہے)

وہی ہے بندۂ حر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری
وجود انہی کا طواف بتاں سے ہے آزاد
یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری

ایسا مومن جس نے صرف علائق دنیا سے دل بستگی پیدا کی ہے اقبال اس سے براہ راست سوال کرتا ہے۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

مومن اور کافر کے خصائص کی بحث اقبالؒ کے تمام کلام میں ایک رو کی طرح جاری و ساری ہے وہ مومن کی تعریف کرتا ہے اس کے زوال کے وجوہ بیان کرتا ہے اور اس زوال کے نتائج کی توضیح کرتا ہے مختصر طور پر —

(۱) بسوز و مومن از سوز وجودش
کشود ہر چہ بستند از کشودش
جلال کبریائی در قیامش
جمال بندگی اندر سجودش

(مومن اپنے وجود کے سوز سے دہکتا رہتا ہے اس کی آزادی سے ہر پابند کو آزادی نصیب ہوتی ہے اس کے قیام میں جلال کبریا ہے اور اس کے سجدے سے خدا کی اطاعت کا نور نمایاں ہے)

یعنی وہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو جلالِ الٰہی کا مظہر ہوتا ہے اور سجدے میں گرتا ہے تو اطاعت خدا کے انوار سے کائنات کو منور کرتا ہے۔

(۲) لیکن اگر توحید و رسالت کے انوار سے خود اس کا کردار منور نہ ہو تو پھر یہ خود بھی سیاہ ظلمات کردار سے باہر نہیں نکل سکتا اور یہی اس کی زوال پذیری کی علامت اور وجہ ہے۔

روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

(۳) اور اس زوال سے مومن جس بربادی تک پہنچتا ہے اور اس سے جو صورت حالات پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے —

من و تو از دل و دین نا امیدیم
چو بو بیرون گل از اصل خود رسیدیم

دل ما مرد و دین از مرد نشمرد
دو تا مرگی بیک سودا خریدیم

میں اور تو (ہم دونوں) اپنے دل اور دین سے ناامید ہو چکے ہیں اور گلاب کی خوشبو کی طرح اپنے منبع سے الگ ہو گئے ہیں۔ ہمارا دل فوت ہوا تو اس کے ساتھ ہی ہمارا دین بھی مر گیا۔ (اور ہم کتنے احمق ہیں کہ) ایک بیوپار سے ہم نے دو موتیں خرید لیں)...

سوچنے والی بات یہ ہے کہ اقبال نے جو باتیں آج سے نصف صدی پہلے کہی تھیں اور قرآن مجید نے مومن کی جو تعریف کی ہے اور نا مومن رہنے سے جو نقصانات ملت اسلامیہ کو پہنچتے ہیں کیا ہمارے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم قرآن مجید احادیث نبویؐ اور کلام اقبال کو پہلو بہ پہلو رکھ کر اور سمجھ سوچ کر اپنے آپ کو مومن کی صفات سے متصف کرنے کی کوششیں کریں تاکہ ہم فلاح دارین سے مستفید ہو سکیں صرف زبانی سطح پر تقریریں کرنے کرانے، مقالات پڑھنے سننے اور ان سے چٹخارے لینے سے تو کام نہیں چلے گا۔ ملتِ اسلامیہ کا معاشرہ آج ہر ایسی پراگندگی کا شکار ہے جس کی وجہ نامومن اشخاص کے افعال ہوتے ہیں۔ ہمارے باہمی معاملات، لین دین، تعلیم و تربیت، کاروبار سیاست سب کچھ نامومنی کے مہیب سایوں سے تاریک ہو رہا ہے۔ معاشرتی زندگی انوار الٰہی سے محروم ہوتی جا رہا ہے اور ہم اس صورت حالات کو حیرت سے تک رہے ہیں۔

■■

ابراہیم جلیس کی یاد میں

جلیس رُک جاؤ ...!

عاتق شاہ

ابراہیم حسین کو ابراہیم جلیس بننے کے لئے جس ذہنی سفر سے گذرنا پڑا۔ اُس سے میں واقف نہیں ہوں۔ اور نہ یہ جانتا ہوں کہ ابراہیم حسین کون تھے البتہ میری ملاقات ابراہیم جلیس سے تھی اور وہ مسلم ضیائی کے توسط سے!

مسلم ضیائی سب کے دوست اور کسی کے دشمن نہیں تھے۔ اُن کا یہی کام تھا کہ نئے آنے والے ادیبوں اور شاعروں کو پُرانوں سے ملائیں۔ اور پرانوں کو اپنے دل میں، اپنے کمرے میں جگہ دے کر سڑکوں پر آوارہ گردی کریں۔ یا کسی سینما گھر میں آدھی رات گذاریں ـــ

اور اگر کسی نئے فنکار نے پرانے کی جگہ حاصل کر لی تو اُس کی خوشنودی کی خاطر ایک ایک ہفتہ کمرے سے باہر رہیں اور شہر کا تفصیل سے سروے کرتے پھریں

اس وقت ابراہیم جلیس نے مسلم ضیائی کے دل میں اور کمرے میں وہ جگہ حاصل کر لی تھی!

یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ مسلم ضیائی کا مجرد گاہ والا کمرہ ادیبوں اور شاعروں کا ایک طرح سے اڈہ تھا۔ مسلم ضیائی کے تعارف پر جلیس نے اس طرح مصافحہ کیا جیسے وہ مجھ سے مدتوں سے واقف ہیں حالانکہ حقیقت اس کے خلاف تھی!

یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جلیس سے ملنے کے بعد کسی اجنبیت کا احساس ہوا اور نہ کسی نے ازراہ کرم یہ اطلاع دی کہ میں کسی غیر معمولی ادیب سے ملا ہوں۔ بلکہ پہلی ہی ملاقات میں میں نے یہ تاثر لیا کہ جلیس بھی ہم میں سے ایک ہیں۔ کوئی غیر نہیں اور میرا یہ تاثر یا احساس آخر وقت تک باقی رہا۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جلیس میں ادیبوں یا فن کاروں میں پائی جانے والی وہ سستی قسم کی "انا" نہیں تھی جو انھیں زمین سے اٹھا کر آسمان پہ لے جاتی۔ یا پھر انہیں اپنی ذات کے خول میں اس طرح بند کر دیتی کہ وہ دوسروں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے جلیس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوسرے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی اچھی صلاحیتوں کو نہ صرف اپریشیٹ کرتے بلکہ ان کی عزت بھی کرتے تھے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ میں جلیس کے قریب ہو گیا۔

اُس زمانے میں، میں حیدرآباد آرمی میں کلرک کم ٹائپسٹ تھا اور صبح صبح تیز تیز سیکل کی پیڈلیں مارتے ہوئے اپنے آفس سرجلیس ہارسس ڈپو کو جاتا جو ملٹری کے پل کے آگے تھا۔ راستے میں جلیس کا گھر پڑتا تھا۔ جو حمایت نگر میں تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا جس کے نچلے حصے میں جلیس رہتے تھے اور اوپری حصے میں ایک اینگلو انڈین خاندان۔ صبح و شام میرا اُدھر سے گذر ہوتا۔ اور جلیس سے کسی نہ کسی لمحے میں سلام علیک ہو جاتی۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جلیس صبح صبح اپنے چھوٹے سے فلیٹ کے وارنڈے میں کھڑے رہتے اور اُونچی آواز میں میرا نام لے کر پکارتے۔ میں اشارے سے جواب دیتا، مجھے معاف کریں۔ یہ ملٹری کی نوکری ہے۔ ایک ایک لمحے اور ایک ایک پل کا حساب دینا پڑتا ہے۔ ورنہ کورٹ مارشل۔

جلیس قہقہہ مار کر اصرار سے مجھے روک لیتے اور کہتے "چائے پی کر جائیے کورٹ مارشل نہیں ہوگا۔ یہ میرا ذمہ"۔

سکنڈ لفٹنٹ شہریار سے جلیس کی دوستی تھی جو حیدرآباد آرمی ہیڈ کوارٹر سے نکلنے والے فوجی رسالے "سپاہی" کے ایڈیٹر تھے۔ اس رسالے میں میری ایک کہانی بھی چھپی تھی۔ اور جلیس شاید یہ کہنا چاہتے تھے کہ ان کے تعلقات سکنڈ

لفٹننٹ تاج کی طرح اور دوسرے افسروں سے بھی ہیں۔ اس لیئے مجھے نوکری کے تعلق سے اتنا پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔

بہرحال جلیس ایک مخلص دوست ہی نہیں بلکہ نڈر اور بے باک آدمی بھی تھے ان سے ملنے کے بعد کم از کم میں یہ محسوس کرتا تھا جیسے جلیس کارپوریشن میں ایک گزیٹیڈ افسر نہیں بلکہ حیدرآباد آرمی میں میرے ساتھ کام کرتے ہیں۔ ایک فوجی کا دوسرے غیر فوجی کے بارے میں یہ احساس اپنائیت کی ایک بہترین مثال نہیں تو اور کیا ہے!

آج جلیس نہیں ہیں۔ سنا کہ وہ اپنی بیوی، بچوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو روتا چھوڑ کر چلے گئے۔ جلیس کی یہ جدائی حرکت ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ جلیس جیسے دل گردے کا آدمی اتنا جلد ہار مان لے گا۔ اور اپنے تیکھے چبھتے ہوئے طنز اور زہر میں بجھے ہوئے سارے ہتھیار کو یوں چپکے سے اپنے مقابل کے سامنے رکھ دے گا۔

پتہ نہیں جلیس نے ایسا کیوں کیا۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن جلیس نے یوں اچانک موت کے فرشتے سے ہاتھ ملا کر سب کو چونکا دیا ہے۔ اور اب سب جلیس کی بات کر رہے ہیں مجھے بھی جلیس کی، ماضی کی اور زندگی کی ایک ایک بات یاد آ رہی ہے۔

جلیس میرے دوست تھے۔ سب کے دوست تھے اور دوستوں کے بغیر وہ ایک منٹ تنہا نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ سو فیصد محفل کے آدمی تھے۔ گھنٹوں بے تکان بولتے، ہنستے، قہقہے لگاتے اور لطیفے سنا کر دوسروں کو ہنساتے۔ اگر اس بیچ میں کوئی دوست نہ آئے تو اس کے لئے بے چین ہو جاتے!

مسلم ضیائی کے کمرے کے علاوہ نظامیہ وہ واحد ہوٹل تھی جہاں شہر کے سارے ادیب، شاعر، صحافی، وکیل ڈاکٹر، عالم اور دانشور جمع ہوتے اور گھنٹوں مختلف موضوعات پر بات کرتے۔ نظامیہ کو وہی اہمیت حاصل تھی جو بعد میں اورینٹ کو حاصل ہوئی۔ نظامیہ کا مالک صاحب ذوق تھا کرسیاں بید کی بنی ہوئی انتہائی آرام دہ تھیں۔ کافی یا چائے یا کھانا سپلائی کرنے والے بیرے بھی انتہائی شستہ مذاق کے حامل تھے۔ کیا مجال جو کسی سے یہ پوچھ لے کہ کیوں صاحب! ایک چائے پی کر یہاں بیٹھے بیٹھے پورا دن گزار دیا۔ آخر بات کیا ہے۔ گھر کیوں نہیں جاتے؟

میں نہیں جانتا کہ جلیس کن اوقات میں اپنے سرکاری کام سے نپٹتے۔ لیکن نظامیہ میں وہ اکثر دن میں نظر آتے۔ اور ادیبوں و شاعروں کو کیپسٹن سگریٹ پلاتے۔

میں تکلف کرتا تو وہ اصرار کرتے اور کہتے، بھئی! آپ کیسے افسانہ نگار ہیں بغیر سگریٹ پیئے افسانے کیسے لکھینگے!

یہی نہیں بلکہ کبھی مجھے یا کسی اور ساتھی کو اپنی برانڈ کا سگریٹ نہیں پینے دیتے!

جلیس نے ہمیشہ اچھے سگریٹ پیئے اچھے کھانے کھائے۔ اور اچھا کپڑا پہنا۔ اور اچھی شاندار زندگی گذاری۔ کہا جاتا ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر ۵۴ سال کی تھی۔ لیکن ان چوپن سالوں میں انھوں نے ایک صدی گذار دی۔ دو صدیاں گذار دیں۔ انھوں نے زندگی کو دیکھا۔ سمجھا چکھا۔ یہی نہیں بلکہ اسے برتا بھی۔ اور اس انداز سے برتا کہ وہ شہر حیدرآباد کی ناک بن گئے!

میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اس وقت جلیس حیدرآباد کے ادبی حلقوں کی محبوب شخصیت تھے۔ ان کے مجموعے زرد چہرے، چالیس کروڑ بھکاری چور بازار اور تکونا دیس بازار میں آچکے تھے۔ اور اردو دنیا میں یہ اپنے تیکھے طنز اور اسلوب کی وجہ سے اپنا ایک مقام بنا چکے تھے۔ اور میں نیا نیا اس میدان میں داخل ہوا تھا۔ میری کہانیاں حیدرآباد کے اخبار میزان، رسالہ رباب کے علاوہ بمبئی سے قدوس صہبائی کی ادارت میں نکلنے والے انقلاب، صہبا لکھنوی کے افکار لاہور کے عمر خیام اور مرزا ادیب کے ادب لطیف میں چھپ چکی تھیں۔ اس

ج میں اُردو دنیا میں مشہور نہیں تو اجنبی
ی نہیں تھا۔ لیکن جلیس کے مقابلے میں یا
ین کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین
جلسوں میں کہانیاں پڑھنا اور مختلف
عتراضات کا جواب دینا مشکل نہیں تو
نا آسان کام بھی نہیں تھا۔ لیکن میری
جیت کام آگئی۔ اور میں آہستہ آہستہ
پنے پڑھنے کا اور سننے والوں کو اپنی طرف
توجہ کرنے لگا!

لیکن انجمن ترقی پسند مصنفین کے
ک جلسے میں جو ملے پلی میں اختر حسن صاحب
گھر پر منعقد ہوا تھا بڑا ہنگامہ رہا۔
س جلسے میں جلیس نے اور میں نے کہانی
نائی۔ جلیس کی کہانی پر بڑی واہ، واہ
وئی اور میری کہانی پر خود جلیس نے بڑا
عتراض کیا، اور کہا کہ عاتق شاہ صاحب
نے اس کہانی میں فاشزم کا پرچار کیا ہے۔

اس کہانی میں بڑھتی ہوئی آبادی
کے تعلق سے ایک شدید اور گہرا طنز تھا۔
ور اس میں بتایا گیا تھا کہ بغیر کسی ذمہ
اری کو قبول کئے بچے پیدا کرنا ایک سماجی
گناہ ہے۔

کہانی صیغہ واحد متکلم میں پیش کی
ئی تھی۔ اور اس کے مرکزی کردار نے
کہا تھا، میری ماں نے غلطی کی تھی۔ میرے باپ
نے غلطی کی تھی۔ اور ان دونوں کی غلطیوں
کا نتیجہ، میں پیدا ہوا۔ لہذا میں ایسی کوئی
غلطی نہیں کروں گا جس کی بدولت مستقبل
کا کوئی دوسرا آدمی یہ کہہ سکے کہ آج سے
بیس سال پہلے میری ماں نے، میرے باپ
نے — !

یہ کہانی میرے پہلے مجموعے "فٹ
پاتھ کی شہزادی" میں غلطی کے نام سے شامل
ہے —

اس کہانی پر بڑی سخت بحثیں
ہوئیں۔ ترکی بہ ترکی میں نے سب کا
جواب دیا۔ پچانوے فیصد جلیس
کی تائید میں تھے۔ اور پانچ فیصد میری
حمایت میں بول رہے تھے۔

مجھے یاد ہے میری تائید میں بولنے
والوں میں ڈی، پی، مترا، پروفیسر قادری
مسلم ضیائی اور راشد سرشار قابل ذکر ہیں۔
ان سب کا کہنا یہ تھا کہ کہانی کا مرکزی کردار
نئی نسل کی نمائندگی کرتا ہے جو فرسٹریشن
کا شکار ہو چکی ہے۔ ورنہ فاشزم کے پرچار
سے اس کہانی کا دور سے بھی متعلق نہیں!

بہر حال میٹنگ ختم ہو گئی۔ لیکن یہ
بات قریبی دوستوں کے ذہنوں میں تازہ
[illegible] بھی چند دنوں کے لئے نظامیہ
نہیں گیا۔ اور جب گیا تو جلیس نے کہا،
بھئی عاتق شاہ! آپ تو ہم سے خفا
ہو گئے۔ میں نے کہا، یقیناً خفا ہوں گا
آپ مجھے فاشسٹ کہیں تو کیا مجھے اس پر
خوش ہونا چاہیئے!؟

اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا
اور جلیس نے کیا کہا۔ لیکن اتنا ضرور
یاد ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے
گلے مل رہے تھے۔ اور نظامیہ میں مختلف
میزوں پر بیٹھے ہوئے حضرات ہمیں حیرت
سے دیکھ رہے تھے۔

اس میٹنگ کی تفصیل سنانے کا مقصد
یہی تھا کہ ادیبوں اور شاعروں میں بھی
اُس زمانے میں اختلافات ہوتے تھے۔
اور کسی بھی سماج میں ایسا ہونا ایک
فطری بات ہے۔ لیکن ایسے نہیں کہ ایک
پیگ پر بہک جانے والے سفلی انا کا
مظاہرہ سڑکوں پر کریں۔ یا پھر ایک
دوسرے کی قابلیت کا سر دے کر کے
خاندان کے شجرہ پر نظر ڈالیں۔ اور یہ
ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ اُردو
دنیا میں آج تک اتنا عظیم فن کار پیدا
نہیں ہوا۔ اور نہ مستقبل میں اس کی
توقع ہے۔ [illegible]
کے یہی ایک [illegible]
جلیس جاگیردارانہ [illegible]
تہذیب اور اس [illegible]
کرنے والے کردار کے سخت مخالف
لیکن اس کے باوجود اس تہذیب کی
اچھائیوں کے وہ نمائندے تھے [illegible]
پرانی اور نئی تہذیب کے بیچ کی ایک کڑی
تھے۔ اور آج وہ کڑی ٹوٹ گئی ہے
اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اب
اچھائیوں اور صحت مند انسانی قدروں
کو پوچھنے والا کوئی نہیں رہا۔ کیونکہ اب

یہ سننے میں آرہا ہے کہ اچھائی، برائی اضافی قدریں ہیں۔ سچ اور جھوٹ صرف الفاظ ہیں۔ خودغرضی اور ایمانداری محض لغت کے لفظ ہیں۔ ورنہ اصل میں ذات ہے اور ذات کے سوا کچھ نہیں۔ نہ انسانی سماج ہے اور نہ انسانوں کا آپس میں کوئی خونی یا سماجی رشتہ ـــ اس طرح میں نہیں جانتا کہ جلیس کو اب کس نظریئے کے خانے میں رکھا جائے! کیونکہ آج ہم جس زمانے میں سانس لے رہے ہیں اس میں انسان کی موت کی بھی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ اور ایک نظریہ فکر رکھنے والا گروپ دوسرے گروپ سے وابستہ شخص کی موت کا ماتم نہیں کرتا۔ کیونکہ ان کے نزدیک [illegible] انسان نہیں ہوتا۔ [illegible] اور ہوتا ہے۔

ـــ ایک نام ـــ

[illegible] پتہ نہیں کیا کچھ۔

آج [illegible]ت پسندی کہاں نہیں ہے۔ موت بھی اس کی زد سے بچ نہ سکی اظہار تعزیت [illegible] جلسے بھی اس کا شکار [illegible]۔ انسان کا ماتم کم ہوتا ہے اور عہدے یا اس کے اثر و رسوخ کا اظہار زیادہ!

یہ صحیح ہے کہ ابراہیم جلیس وقت کے سیلاب میں بہہ گئے تھے۔ لیکن ایک جلیس پھر کیا منحصر تھا، میں نے اس وقت کے بڑے بڑے رستموں اور سورماؤں کو دیکھا جو ایک تنکے کی طرح بہہ رہے تھے!

کہاں ہیں وہ لوگ؟
اور کہاں ہیں ان کی وہ بڑی بڑی باتیں؟

صرف چند لوگ تھے جنھوں نے اپنے آپ کو سیلاب سے بچائے رکھا۔ ادیبوں اور شاعروں میں ڈاکٹر حسینی شاہد، زینت ساجدہ، س۔ ا۔ عزت، قمر ساحری اور سلیمان اریب قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ ایک میں بھی تھا جو اپنے آپ کو اس سیلاب سے محفوظ رکھا!

باقی جانے کہاں کہاں چلے گئے۔ شفقت رضوی (افسانہ نگار) ماجد (افسانہ نگار) معین الدین کولاس (بزم اقبال) حبیب اللہ اوج (میزان) حمید الدین شاہد، نظر حیدرآبادی اور ایسے کئی چہرے نظروں سے اوجھل ہو گئے ـــ اور نظروں کے سامنے جو رہے ہیں ان کے نام نہیں گنواں گا۔ اور اس [illegible] کیا جاننے والے جانتے ہیں کہ انھوں [illegible] کو دھوکہ دیا یا وقت نے انھیں [illegible] دیا۔ وقت جو سب سے بڑا جج ہے!

لیکن ایک بات اپنی جگہ اہم ہے اور کم از کم میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ وقت کبھی کسی کو نہیں بخشتا۔ ایک ایک لمحے کا حساب سب کو دینا پڑتا ہے ـــ

ابراہیم جلیس بھی چلے گئے۔ اور جا کر اُس وقت آئے جب وہ دو ملک ایک کہانی لکھ چکے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی درجنوں کتابیں بازار میں آچکی تھیں اس وقت دنیا بدل چکی تھی۔ لیکن حیدرآباد نے انھیں گلے لگایا۔ ان کی آمد پر اُردو ہال میں بڑا شاندار جلسہ ہوا۔ گھر پر ان سے ملاقات ہوئی ـــ دیکھتے ہی آگے بڑھ کر گلے ملے۔ بہت دیر تک باتیں کیں۔ اور نام لے کر ایک ایک کو پوچھتے رہے۔ اور میں نے محسوس کیا کہ ابراہیم جلیس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ گذرے ہوئے اور گذرتے ہوئے وقت نے ان کی انسانیت کو ختم نہیں کیا۔ اور جب تک کسی فن کار میں انسانیت باقی ہے اُس کے قلم کی سیاہی نہیں سوکھتی ورنہ اس طویل عرصے میں، میں نے ایسے کئی فن کاروں کو دیکھا ہے جو غم ذات میں مبتلا ہو کر آئینے کے سامنے بیٹھ گئے اور خود کے علاوہ دُنیا اور اس کی ہر شے کو بھلا دیا۔

پھر سُنا کہ ابراہیم جلیس چلے گئے۔ اس طرح گئے کہ پھر کبھی نہیں آئیں گے پتہ نہیں یہ انداز انھوں نے کہاں سے سیکھا۔ ورنہ وہ حساب کتاب میں اتنے کھرے نہیں تھے۔ جانے والوں کو روکتے تھے۔ فوجی کو غیر فوجی بننے پر اُکساتے تھے۔ لیکن اب

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۴۱)

اساتذہ سخن کی اصلاحیں

منشی حیات بخش رسا تلمیذ حضرت داغ دہلوی

ص : احمد محمود نعیمی مرادآبادی

ــ دل ہے بتاؤ تو میں کس کس کو دوں صاحب

دخی کو' شرارت کو' کرشمہ کو' حیا کو

صلاح :

ــ دل ہے مرے پاس بتاؤ تو کیسے دوں

خی کو شرارت کو کرشمہ کو حیا کو

رسا نے پہلے مصرعہ تبدیل کر کے لفظ

احب" پر مکھاہے کہ متروک ہو گیا۔

ں : کیا جانو ابھی دردِ محبت کا مزا' تم

جب آپ کا دل آئے کسی پر تو خبر ہو

صلاح :

جانیں ابھی آپ محبت کے مزے کو

بـ آپ کا دل آئے کسی پر تو خبر ہو

پہلے مصرع میں "تم" اور دوسرے مصرعے

"آپ" یہ شتر گربہ تھا اس لئے مصرعہ

نادرست کیا گیا۔ اب شعر صاف ہو گیا۔

ص :

ہی اس وقت کی پھڑکن کا نہ پوچھو احوال

ی بچھڑا ہوا ارمان جو آ ملتا ہے

صلاح :

کے اس وقت پھڑکنے کا نہ پوچھو عالم

بچھڑا ہوا ارمان جو آ ملتا ہے

[illegible] میں "پھڑکن" کے بجائے

ڑکنے بنادیا اور احوال کو عالم سے بدل

دیا کیونکہ پھڑکن کوئی چیز نہیں اور احوال

جمع ہے جو داغ مرحوم کے یہاں متروک ہے

شعر :۔

دل میں الفت ہے کسی کی نہ کسی کا ہے فراق

ہم بڑے چین سے اب زیرِ زمیں رہتے ہیں

اصلاح :۔

دل میں الفت ہے کسی کی نہ ہمیں رنجِ فراق

چین سے بعد فنا زیرِ زمیں رہتے ہیں

پہلے مصرعے میں کسی کا ہے فراق کی

جگہ "ہمیں رنجِ فراق" بنادیا ہے اور دوسرے

مصرعے میں بجائے "بڑے چین سے اب"

کے "چین سے بعد فنا" بناکر شعر کو درست

کر دیا ہے۔

شعر :

دیکھ برباد نہ کر خانۂ دل کو ظالم

تیر آتے ہیں جو تیرے وہ یہیں رہتے ہیں

اصلاح :۔

دیکھ برباد نہ کر خانۂ دل کو ظالم

جتنے ارمان ہیں تیرے وہ یہیں رہتے ہیں

دوسرے مصرعے کو بدل کر شعر

کو بلند کر دیا ہے۔

شعر :۔

دستِ دعا اٹھے ہوئے دیکھے تو یہ کہا

تو نامراد ہے تری قسمت میں ہم نہیں

اصلاح :۔

اٹھے جو میرے دستِ دعا ہنس کے یوں کہا

تو نامراد ہے تری قسمت میں ہم نہیں

پہلا مصرعہ اب صاف ہو گیا۔

شعر :

اب ظلم سے بھی ہاتھ انھوں نے اٹھا لیا

اللہ ان کے جور کے قابل بھی ہم نہیں

اصلاح :۔

اب تو انھوں نے ظلم سے بھی ہاتھ اٹھا لیا

اللہ ان کے جور کے قابل بھی ہم نہیں

استاد رسا نے اصلاح تو دی مگر غالب

کے مشہور مصرع سے توارد ہو گیا۔ مشہور شعر ہے

اب ستم سے بھی ہیں محروم [illegible] اللہ اللہ

اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

شعر : نگہ ناز میں شوخی ہے قیامت کی بھری

جو ادا پائی ہے کافر نے غضب پائی ہے

اصلاح :۔ نگہ ناز کی شوخی نے مٹا یا دل کو

جو ادا پائی ہے کافر نے غضب پائی ہے

اصلاح سے پہلا مصرع بہت بلند ہو گیا اور "ہے

قیامت کی بھری" یہ تعقید بھی دور ہو گئی [illegible]

اصلاح ہے ـــــ

آئینۂ اصلاحیں

حضرت زاہد سہارنپوری

شیریں و درخشاں مستقبل

یقیناً تعلیم تیز رفتار معاشی ترقی اور عاجلانہ تکنیکی فروغ کے لیے اہم ترین منفرد عنصر ہے
سال ۱۹۷۶-۷۷ میں تقریباً ۶۹.۰۰ لاکھ اضافہ بچوں کو اول تا پنجم جماعتوں میں داخلہ دیا گیا جس کے نتیجے میں ۶ تا ۱۱ سال عمر والے بچوں میں لڑکوں کے داخلے کا فیصد ۸۴.۶۴ اور لڑکیوں کے داخلے کا فیصد ۶۰.۶۹ ہو گیا۔ کسی لحاظ سے بھی یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے

ہماری ریاست میں فی الوقت ۶۵۰۰ ہائی اسکول ہیں۔ سال ۱۹۷۷-۷۸ کے منصوبے میں ثانوی تعلیم کے فروغ کے لیے ۳۴٫۶۷ کروڑ روپیوں کی کثیر رقمی گنجائش فراہم کی گئی ہے۔ ریاست کے تینوں رہائشی اسکولوں کا بڑا شاندار ریکارڈ رہا ہے۔ ۱۹۷۶-۷۷ میں ان تینوں اسکولوں کے پورے طلباء درجہ اول سے کامیاب ہوئے۔

آندھرا پردیش ان پڑھوں کے ساتھ نئے ڈھنگ سے پیش آ رہا ہے۔ چنانچہ فی الوقت ان کے فائدے کے لیے اضلاع کرشنا۔ کھمم اور کڑپہ میں غیر رسمی تعلیم کی ایک اسکیم چل رہی ہے۔ اس سال ضلع عادل آباد کے علاوہ دو اور اضلاع میں بھی اس اسکیم کو لاگو کر دیا جائے گا۔

ہماری پروان چڑھتی ہوئی نسل ایک شیریں و درخشاں مستقبل کی سمت بڑھ رہی ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش، حیدرآباد

NO: 18/77-78/R

LETTER NO 173/ANT/C3/77 DATED 7-10-77

وقار خلیل

شکستِ شب

رات کی شبیہ کتنی بے صدا، مہیب ہے
عجیب اور غریب ہے :
کبھی بہت قریب ہے، کبھی یہ دور دور ہے
تھکی تھکی، بجھی بجھی، اڑی اڑی
بدن نہ نغمگی / فقط سکوت ہی سکوت ہے
جمود کی سی کیفیت، نہ ہست اور نہ بود ہے
کہیں کہیں فغانِ شب
اِدھر اُدھر کبھی کبھی سسکتی، بے صدا، کراہ
نفس نفس پہ جیسے برف کا دھواں دھواں
طویل کھانستی ہوئی یہ شب
کرن کرن چھپا گئی
فلک شگاف تیرگی کہ واہمہ حیات کا
حقیقتوں پہ کولتار مل گئی

یہ کیا ہوا کہ جاگتے میں
رات
وہ مہیب رات، وہ شبیہہ پُر فتن
سحر کی اک کرن سے کھا گئی شکست
اور مر گئی

••

محسن جلگانوی

سمٹا ہوا دائرہ

زمیں کے سنگیں سخت سینے کے بیچ اک گہرا گھاؤ کر کے
چھپی تہوں کے پگھلتے پتال کے کٹھی میں خبائثوں نے
سلگتی بارود جھونک دی ہے
کہ یہ جوالا مکھی کا بدوضع دیو پتھر کی سِل ہٹا کر
مہیب آتش فشاں کے مانند
رقیق لاوا اُگل رہا ہے
شدید شعلوں کی آگ پا کر
سلگ اٹھا ہے لہو کا جنگل
جھلس گئی ہیں یہاں بدن کی کھڑی ہوئیں سر بلند فصلیں
سیاہیوں کی ردائیں اوڑھے
رعونتیں ہیں نظر نظر تک
دشالِ آدرش کالے چہرے کا کوڑھ بن کر
اندھیری نگری کے پشت کے گہرے کالے غاروں میں جا چھپا ہے
شکستہ مسلخ میں تندہی سے غصیلا قصاب جاگ اٹھا ہے
جو پچھلی صدیوں کے زنگ آلودہ اک چھرے سے
گلے سڑے لخت لخت لاشوں سے گردنوں کو چھڑا رہا ہے
شعور خود بے حسی کا بے کرب بدنصیبی کا زہر پی کر
نشے میں بدمست
جلتی لاشوں کے دائرے پہ امنڈتے شعلوں سے اُٹھتے
اندھے دھوئیں سے جا کر یہ پوچھتا ہے
کہ کون قاتل ہے زندگی کا ـــــ ؟
لہو کا
زخموں کا
ظلمتوں کا

وسیع تر دائرہ سمٹ کر
قریب تر ہوتا جا رہا ہے
کہ یہ جوالا مکھی کا بدوضع دیو آتش فشاں کے
دوزخ کے اس کنارے پہ آ گیا ہے
جہاں سے اب
لوٹنے کا ہر ایک راستہ ختم ہو گیا ہے۔

حسن کمال

سب کی بگڑی کو بنانے نکلے
یار ہم تم بھی دِوانے نکلے

دھول ہے، ریت ہے صحرا ہے یہاں
ہم کہاں پیاس بجھانے نکلے

ہر طرف شورِ قیامت ہے بپا
اور ہم گیت سنانے نکلے

اتنی رونق ہے کہ جی ڈوبتا ہے
شہر میں خاک اڑانے نکلے

ان اندھیروں میں کرن جب ڈھونڈی
سب کے جلنے کے بہانے نکلے

چاند کو رات میں موت آئی تھی
لاش ہم دن کو اٹھانے نکلے

کوئی تو چیز نئی مل جاتی
درد بھی صدیوں پرانے نکلے

عمر برباد یوں ہی کر دی حسنؔ
خواب بھی کتنے سہانے نکلے

کب تلک یہ شعلۂ بے رنگ منظر دیکھیے
کیوں نہ حرفِ سبز ہی لکھ کر زمیں پر دیکھیے

پھر کہیں صحرائے جاں میں کھائیے تازہ فریب
پھر سرابِ چشمہ و عکسِ صنوبر دیکھیے

لیٹ رہیے بند کر کے آنکھیں جلتی دھوپ میں
اور پھر سبز و سیہ سورج کا منظر دیکھیے

پھر برہنہ شاخوں کے سائے میں دم لیجے کہیں
رینگتے سانپوں کو اپنے تن کے اوپر دیکھیے

چاندنی راتوں میں ایک آسیب بن کر گھومیے
گھر کی دیواروں پہ اپنا سایہ بے سر دیکھیے

ہے جگر کس کا جو اس تیغِ ہنر کی داد دے
اپنے ہاتوں زخم کھا کر اپنا جوہر دیکھیے

بے دلی کی تہہ میں غوطہ مار کر بیٹھے ہیں ہم
زیبؔ پھر پانی پہ کب ابھرے گا پتھر دیکھیے

زیبؔ غوری

یہاں سے شہرِ ستمگر دکھائی دیتا ہے
جسے بھی دیکھیے پتھر دکھائی دیتا ہے

جتن ہزار کئے ہر لباس میں پھر بھی
وہ جسم ہے کہ برابر دکھائی دیتا ہے

وہ سرو قد پسِ دیوار بھی نہیں چھپتا
ہزار جھک کے چلے سر دکھائی دیتا ہے

مری طرح مرا سایہ بھی سوچتا ہوگا
یہ شخص تو مرا ہمسر دکھائی دیتا ہے

کہاں ہے کون ہے اس کا کوئی جواب ہے
جو خواب میں مجھے اکثر دکھائی دیتا ہے

اسی خطا پہ وہ اک روز مارا جائے گا
غریب ہو کے تونگر دکھائی دیتا ہے

شجر سے گرتی ہیں کٹ کٹ کے پتیاں شاہدؔ
نہ کوئی ہاتھ نہ خنجر دکھائی دیتا ہے

شاہد کبیر

غزلیں

راستہ سنسان تھا تو مڑ کے دیکھا کیوں نہیں
مجھ کو تنہا دیکھ کر اس نے پکارا کیوں نہیں

ریگ زاروں میں رہا ہے مدتوں تنہا مگر
دیکھنے میں پھر بھی وہ لگتا ہے پیاسا کیوں نہیں

دھوپ کی آغوش میں لیٹا رہا وہ عمر بھر
مہرباں تھا وہ تو مثلِ ابر آیا کیوں نہیں

ایک پنچھی دیر تک ساحل پہ منڈلاتا رہا
مضطرب تھا پیاس سے تو بحر میں اترا کیوں نہیں

قرب کی قوسِ قزح کمرے میں بکھری تھی مگر
رات بھر رنگِ تمنا پھر بھی نکھرا کیوں نہیں

اس کو تنہا پا کے انجم رات اپنے روم میں
قطرۂ خونِ ہوس آنکھوں میں آیا کیوں نہیں

[illegible]

افسانہ

گھروندے

عفت موہانی

ٹرمپ چال"۔ ڈرائنگ روم سے برابر قہقہے بلند ہو رہے تھے۔

"اف یہ لوگ!" روحی نے بے چینی سے تکیے پر سر پھیرا۔

"بے ایمان پتہ رکھ کر؟" عذرا باجی چیخیں۔

"کوئین میری کا ہے۔ باجی۔ میری کوئین" عدنان بیچ چیخا۔

"تجھے کیسی کوئین ملی ہے۔ یہ دیکھ میرا کنگ" اور حیدر تاجل ترپ کے پتے بیکار ہ۔

باجی نے کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا اور شاید بازی مار لے گئیں۔

"کنگ مل گیا آپ کو!... عدنان نے ڈھیرسے سے دانش بھائی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہشت۔ بے وقوف!" باجی نے جھینپ کر کہا۔

"ایک بازی اور ہو جائے؟" دانش بھائی ہنسنے لگے!

"اب بس۔" باجی نے اسے چھڑایا۔ "یہ جیسے کھیل رہا ہے مسلسل ہار رہا ہے۔ آپ عورتیں کچھ جیت کر کیوں خوش ہم عورتیں ہارتی ہیں تو تم مردوں کی طرح بسورتی کبھی نہیں ہیں!" باجی نے اسے غصہ دلایا۔

"ہم بھی آپ کو جتا کر خوش کر دیتے ہیں۔" اُس نے کہا۔

"تو پھر ایثار کر کے شوہے کیوں بہا سکتے ہو؟"

"اس لیے کہ آپ ہمارے ایثار کی قدر نہیں کرتیں!۔ کیوں نا انکل!" عدنان نے بیرسٹر صاحب کو مخاطب کیا۔

"بھئی تم دونوں اپنی لڑائی میں مجھے مت گھسیٹا کرو!۔" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "ہار جیت کے معاملے میری سمجھ میں نہیں آتے!"

"حالانکہ ہارنے میں آپ کا جواب نہیں" وہ ہنس پڑا۔

"اپنی جیت پر ہنسنا بے وقوفی کی علامت ہے۔" باجی نے فلسفہ ارشاد فرمایا۔ "جیت وہی ہے جو آخر میں کسی کو نصیب ہوتی ہے۔

اب جائیں بھی۔ ننھی منی!

اپنے تاش سے کھیلو!۔" باجی نے اسے جھٹکار دیا۔ اور ننھی عدنان کے پیچھے پڑ گئی۔

عذرا باجی میں تو ذرا بھی بزرگی نہیں۔ وہ تیس سے اوپر کی ضرور ہوں گی۔ ابھی وہ سکنڈ ائیر میں تھیں کہ باجی کی شادی ہو گئی۔ ان کی پچھلی زندگی بڑی اداس تھی۔ لیکن اس نے باجی کو کبھی اداس یا پریشان نہیں دیکھا۔ اگر لب مسکرائے تو پلکیں نم ہو جاتی تھیں۔ جیسے ایک دوسرے کو خبر ہی نہ ہو۔

شادی کے دن فضا بڑی مغموم تھی۔ ان کی امی کو انتقال کیے صرف ڈیڑھ ماہ ہوئے تھے وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی بہت دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھیں لیکن اسی عرصہ میں دانش بھائی کا ٹرانسفر ہو گیا۔ وہ بار بار آ نہ سکتے تھے ابھی ماں کی قبر کی مٹی گیلی ہی تھی کہ بیٹی کے ہاتھوں میں مہندی رچ گئی۔ باجی روئیں مگر انہوں نے اپنے بوڑھے ابا کو دیکھا اور آنسو جہاں تہاں روک لیے۔ الوداعی وقت سب ہچکیاں لے رہے تھے۔ لیکن باجی گم صم تھیں۔ روحی جھکی اس نے باجی کی پیشانی چوم لی۔ ایک اچھوتی مہک روحی کے وجود میں سرایت کر گئی۔ جب دل روتا ہے تو آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔ باجی نے آہ بھر کر سر جھکا لیا۔ بارات چلی گئی۔

اسے بہت کچھ یاد آ گیا۔ بچپن کے دلاویز لمحے اور جوانی کی جانگسل گھڑیاں جن گلیوں میں لڑکپن بیتا۔ وہ چھن گئیں۔ اس اونچی کوٹھی کے سائے میں وہ اور عدنان پہروں ریت کے گھروندے بنا[illegible] کرتے گھروندے بنا کر عدنان ٹھوکروں سے بگاڑ

پھر بناتے کیوں ہو؟" وہ بپھر جاتی
مٹانے کے لیے ۔ [illegible] ضدی تھا۔ اپنی
بات تو منوا ہی کے چھوڑتا تھا۔

یہ ریت کے گھر۔ ہُنھ۔ ان کی بنیادیں
کہاں ہیں۔ چھوٹی سی عمر سے وہ عقلمند ہو چلا
تھا۔ عینکیں چھیلنے والے بہت عقلمند ہوتے ہیں
بنیاد ۔۔! اس کی سمجھ میں نہ آتا۔
جب کوئی اونچا سا محل بنتا ہے تو پہلے
زمین کا سینہ چیر کر اس میں بنیاد رکھ دیتے
ہیں۔ تب محل خوب مضبوط بنتا ہے۔" وہ
بتاتا۔ روحی ڈر جاتی۔ زمیں بے چاری کیا
سوچتی ہوگی جب اس کا سینہ چیرا جاتا ہے
اُف اللہ۔ ایک بار بلیڈ سے اس کی انگلی
کٹ گئی تھی۔ اور بے حد ننھا سا شگاف دیکھ
کر روحی پہروں روئی تھی۔ لیکن اتنی بڑی زمین
کا سینہ۔ کیا سب اونچے اونچے محلوں کی بنیادیں
زمین کے اندر چھپی ہوتی ہیں!

آؤ پہلے بنیاد کھود دیں۔ پھر گھر بنائیں
گے۔" ایک دن عدنان اپنے گھر سے بڑی سی
کھرپی لے آیا۔ روحی کے پاس کوئی اوزار بھی
نہ تھا۔ اگر ہوتا تب بھی وہ زمین کو تکلیف دینا
پسند نہ کرتی!

نہیں نہیں۔ عدی۔ تمھیں میری قسم۔"
وہ اس کی خوشامدیں کرنے لگی۔ "بن کر گر جانے
والے محل کے لئے زمین مت کھودو۔ وہ تو ماں
ہے ہماری۔ ہم سب کی ماں۔" اور وہ مٹی
سے بھرے ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔
میری ماں کہاں ہے۔" عدنان نے

حسرت سے کہا۔ وہ اس کا چہرہ تکنے لگی۔
اور جب عدنان اسے بُرا بھلا کہہ کر چلا
گیا تو اس نے مارے غصے کے تمام ریت
برابر کر دی۔ اور پھر وہیں بیٹھ کر رو دیا کی!

اس کی امی اس کی پیدائش میں ختم
ہو گئیں تھیں۔ پل بھر کے لئے بھی انھوں نے
نہیں سوچا کہ بے چاری بچی بھوکی ہوگی تو کیا
پئے گی۔ کس کے سہارے جیئے گی! ابّا نے
ماں بن کر اسے سینے سے لگا لیا۔
کوٹھی کے گھنیرے سائے تلے شام
ہوئی۔ روحی غریب کی لڑکی تھی اس کے ابا
معمولی ٹیچر تھے۔ عدنان شہر کے دولت مند
اور نامور بیرسٹر صاحب کا منہ بولا بیٹا تھا
باجی ان کی بھابی تھیں۔ لیکن اس چھاؤں
تلے سب امتیاز مٹ جاتے! امیر غریب
ساتھ کھیلتے۔ وہ اودھم مچاتا کہ بیرسٹر صاحب
کی بھاری بھرکم بیوی اوپر سے چیختیں۔
او شیطانو۔ دھیرے دھیرے کھیلو۔
او عدنان۔ تجھ سے خدا سمجھے۔ شیطان کے بچے۔
ارے حلق نہ پھاڑ۔ تیرے انکل سو رہے
ہیں۔

اماں پھر میں کمانڈر کیسے بنوں گا؟
عدنان اور زیادہ حلق پھاڑ کر پوچھتا۔ یوں
بھی کسی کا رعب ماننا تو اس نے سیکھا ہی
نہ تھا! جب بھی اماں سامنے پڑتیں وہ
زور سے ہاؤ ہو کر کے بھاگتا۔ حالانکہ
بے چاری اس سے بہت محبت کرتی تھیں
روحی اپنے سجیلے خوابوں میں اسے

بڑا آدمی دیکھ رہی تھی۔ عدنان پینٹ شرٹ پہنے
ہاتھ ہلا رہا ہے۔ ایک شاندار گھوڑے پہ
سوار۔ وہ خواہ مخواہ مرعوب ہو جاتی۔
تم سپاہی بن کر مجھے بھول تو نہ جاؤ گے
وہ بے چاری سہم کر پوچھتی۔
قطعی بھول جاؤں گا۔" وہ اکڑ کر کہتا"
بھلا یہ چپٹی ناک والی رخسانہ، لمبے لمبے
کانوں والا عرفان اور ہونٹ لٹکا کر بولنے
والی روحی مجھے کیوں یاد آئیں گے۔ چھی توبہ
کیسی خراب بات:
جاؤ۔ تم سے اب کبھی جو بولوں!"
ایسے تو ہونٹ نہ بسورا کرو۔ یاد
رکھوں گا!۔
ہنستی رہا کرو! " اس نے خوش ہو کر پوچھا
اور کیا۔۔!
میرے لیے کیا لاؤ گے جب واپس آؤ گے"
ڈھیر سارے کھلونے!
کھلونے۔" وہ متحیر رہ جاتی۔ اے لو۔
بھلا تب بھی کیا میں اتنی ہی سی رہوں گی۔
ارے میں تو بڑی ہو جاؤں گی۔"
اُف۔ میں تو بھول جاتا ہوں۔"
عدنان سخت شرمندہ ہوتا۔ " اچھا تو میں
تمھارے لیے بہت سے روپیے۔ چمکیلی سلائیاں
اور رنگ برنگی ربن لاؤں گا۔"
میں انہیں ابا کے صندوق میں چھپا دوں گی
ورنہ رخسانہ اور فوزیہ چھینے نہ دیں گی اسے
وہ بے حد سنجیدگی سے بولتی۔
ارے تب کہاں ہوگی فوزیہ اور رخسانہ

وہ تو اپنے اپنے دولہا کے گھر چلدیں گی۔

عدی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میرا بھی خوب بڑا سارا ایک گھر ہو۔ جیسے اپنے انکل کا ہے نا۔

ایک دن تم اسی کوٹھی میں آجاؤ گی!

عدنان بے حد بڑوں کی طرح کہتا۔

کیسے؟۔

میں لے چلوں گا! انکل نے مجھے اپنا بیٹا بنا رکھا ہے۔ وہ مجھے فوجی افسر بنا دیں گے تمھیں بھی کچھ نہ کچھ بنا ہی دیں گے۔ پھر تم خوب امیر کبیر ہو جاؤ گی!۔

روحی نے کان بند کر لیے۔

یا اللہ۔ مجھے حواسوں سے عاری کر دے

پھر ایک آندھی اور چلی۔

وہ اس باغ میں پہونچ گئی جہاں پھول تو بس اکا دکا ہی تھے مگر کانٹے بہت سے تھے! ادھر ادھر۔ خوب سارے کانٹے جنھوں نے اس کا سارا وجود چھلنی کر دیا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اس کے ہونٹوں نے خیالوں کی شرارت پر مسکرانا سیکھا تھا۔ جب روٹی پکاتے پکاتے آپ ہی آپ مسکراتی تو بے چارے ابا سوچنے لگتے کہ روحی اس قابل ہو گئی ہے کہ جلد تر اس کے ہاتھ پیلے کر دیے جائیں۔ سیاہ گھٹاؤں کے بیچ۔ بجلی کی سی چمکتی ہوئی مانگ، سیندور کی سرخی مانگ رہی ہے۔ ان کی دھندلی نظریں بوسیدہ در و دیوار پر سے ہوتی ہوئی خلاء میں بھٹکنے لگتیں۔ اور وہ سر تھام لیتے۔ ان کی پینشن ہو چکی تھی۔ معاوضہ صرف ڈھائی ہزار ملا تھا۔ اتنی قلیل رقم میں وہ کوئی معقول لڑکا نہیں خرید سکتے!

اماں کے انتقال پر باجی سسرال سے آئیں۔ بیرسٹر صاحب ایران سے ہو کر رہ گئے تھے۔ عدنان بھی رنجیدہ تھا۔ وہ اب کسے ستاتا۔ کسے چھیڑتا؟ اسے بس یہی غم تھا۔ کوئی اس پر چیخنے والا نہیں رہا!

باجی اس کے ابا سے ملنے بھی آئیں اور ان کے گلے لگ گئیں۔ رئیس اعظم کی بھانجی۔ ایک بزنس مین کی بیوی۔ ابا بہت متاثر ہوئے۔ محلے داری کا ایسا پاس بھلا کس نے کیا تھا!۔

ابا آپ کی پسلیاں میرے چبھ رہی ہیں!" انہوں نے ابا کی پسلیاں دیکھیں اور بڑے دکھ سے آہ بھری۔ پھر وہ دیر تک بیٹھی ابا سے سرگوشیاں کرتی رہیں۔ روحی مشکوک تھی۔ آخر باجی اتنی سنجیدہ کیوں نظر آ رہی تھیں۔ ابا کیا سوچنے لگے تھے وہ انہیں غور سے دیکھنے لگی۔ پھر اپنے جھلنگے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی۔ سامنے رکھی ہوئی ٹائم پیس برابر بولے جا رہی تھی۔ ٹک ٹک ٹک۔ عدنان جب گھوڑے پر سوار آئے گا تب ایسی ہی آواز آئے گی وہ سب سے پہلے اسے خوش آمدید کہنے دوڑی جائے گی۔ آنگن میں پھولنے والی چمیلی کا بڑا سا ہار لے۔ مٹھی میں برفی کی ڈلی چھپائے۔ وہ اتنا ہی سوچ سکی تھی!

عذرا باجی ابا سے کہہ رہی تھیں۔

عدنان جا رہا ہے۔ پانچ سال کے لئے فوجی ٹریننگ لینے"

پانچ سال؟ پانچ سال کے کتنے دن ہوئے وہ بوکھلا گئی۔ ابا نے دعاؤں کے پل باندھ دئیے۔ اور جب باجی ان کے یہاں روٹی اور پالک کا ساگ کھا کے واپس جانے لگیں تو ابا بہت تھکے تھکے نڈھال معلوم ہو رہے تھے۔ وہ ان کے محلے کی بیٹی تھیں۔ ان کے سامنے کھیل کود کر بڑی ہوئی تھیں۔ انہیں باجی کے دکھ سے دکھ تھا۔

" میں اس کی دشمن تو نہیں ابا" باجی نے کہا تھا۔ آپ خوب سوچ لیجئے۔ وہ انکار نہیں کریں گے۔ میری بات مانتے ہیں۔ میں انھیں راضی کر لوں گی۔ روحی لاکھوں میں کھیلے گی!!

" لیکن اُن کی عمر" بے حد آہستہ سے گھٹے ہوئے لہجے میں ابا نے کہا۔

اوہ۔ ابا وہ زیادہ سے زیادہ پچاس کے ہوں گے۔ اور کیا۔

بیٹی جو مناسب سمجھو! ابا نے کہا اور آہ بھر کر چہرہ پھیر لیا۔

باجی چلی گئیں۔ روحی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اس رات ابا نے بہت سی آہیں بھری تھیں۔ نماز کے بعد روئے تھے۔ اور روحی سے نظریں چرائی تھیں۔ مگر وہ اتنی احمق تھی کہ نہیں سمجھی!

ایک نکھرا ستھرا [illegible] اسے اچانک عدنان مل گیا۔

آپ ! - وہ گھبرا گئی۔

جانے وہ صبح ہی اتنی پُر نور تھی کہ عدنان کے چہرے سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ روحی اس کی طرف دیکھ ہی نہ سکی۔ اس کی پلکیں جھپک گئیں۔

کیا - مجھے نہیں پہچانا ؟ وہ مسکرا رہا تھا۔

اب وہ ملتے ہوئے شرما رہی تھی۔

بچپن کا زمانہ ' زمانہ کے ساتھ چلا گیا تھا۔ یہ پچیس چھبیس برس کا آدمی اُن دنوں بالکل لڑکا سا لگتا تھا۔ اب تو روحی بھی سات آٹھ سال کی بچی نہیں رہی تھی۔ گزرنے والے دن رات بچپن لے گئے تھے۔ جوانی دے گئے تھے۔ یکایک اس کے رخسار آگ کی طرح دہکنے لگے۔ جیسے عدنان کی آنکھوں سے آگ نکل رہی ہو ! -

روحی۔ مجھے الوداع کہہ لو - میں جا رہا ہوں۔ [illegible] مدت کے بعد آؤں گا۔ میرا وقت ہو رہا ہے۔ میں تم سے ملنے کے لئے بھاگتا ہوا آ رہا ہوں۔ ورنہ ایک خلش رہ جاتی - مجھے یاد رکھنا روحی وعدہ کرو۔ [illegible] کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ لب جنبش سے رہ گئے۔ زبان رک گئی۔

عدنان نے جھک کر آہستہ سے کہا۔ خدا حافظ۔ اور اس کے شانے پر تھپکی دے کر چلا گیا۔ آ[illegible] اس کی جوڑی چلی بیٹھ [illegible] اوجھل ہوتے ہوئے چاند کی طرح دکھائی دی۔ اور پھر پانچ سال کے لئے وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پھر کب آئیے گا ! - وہ بے آواز چلائی۔ اس کے نقش قدم پر دوڑی مگر وہ تو جا چکا تھا۔ ایک دن ابا جی پھر اس کے گھر آئیں اور اس کی انگلی میں نہایت بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی پہنا دی۔ اور تیسری ہی شام ایک خاموش بارات اس کے دروازے سے آ لگی !

وہ یقین نہ کر سکی کہ جو دولہا سہرے کے اندر چھپا تھا۔ اُسی کا تھا

بیٹی۔ تجھے جدا کر رہا ہوں ! - ابا نے اس کے بالوں میں اپنے لب چھپائے ' اسے سینے سے لگا لیا اور اس نے عمر بھر میں پہلی بار ابا کو روتے دیکھا۔

جس جگہ تو جا رہی ہے۔ وہی تیرا گھر ہے بیٹی یاد رکھنا جہاں تیری ڈولی رکھی جائے وہیں سے تیرا ڈولا اُٹھایا جائے۔ بیٹی۔ بدھائی ہو

ابا جی۔ وہ نیم بے ہوش تھی۔

ایک تیز رفتار کار پھولوں سے ڈھکی کچی سڑک پر دھول اڑاتی لئے کسی اور دیس میں پہونچ گئی ! گھونگھٹ کی ٹک ٹک دور ہوتی گئی۔ بیگم ! — بیرسٹر صاحب نے سونے موتی میں غرق روحی کے کندھے تھپکا ! اب یہ سب کچھ تمہارا ہے !

بنیادیں کھوکھلی تھیں۔ گھر دلہن نہ بن سکا۔

لندن میں بیٹھا عدنان بے خبر تھا ! -

وہ کیا کہے گا۔ چمکیلی ساڑیاں کون پہنے گا اور رنگ برنگی ریشمی۔ اوہ خدا - یہ کیا کیا۔ روحی [illegible]

تم ہمیشہ کے لئے یہاں آ گئیں۔ کیا وہ مقبولیت کی گھڑی تھی ؟ کون جانے -

اس ویرانے میں کوئی آہٹ بھی نہ آتا کمرہ زندہ کی قبر تھا۔ گیلا۔ ٹھنڈا۔ اداس۔ بیرسٹر صاحب نے دھن دولت اسے بخش دی۔ نہال کر دیا۔ اس کی پیاسی دھرتی پیاسی کا رہی اور کوئی برسات اس پہ نہ برسی !

ایک بھیانک احساس نے اس کے کس بل نچوڑ لیے -

یہ کیا ہو گیا اس کے مقدر کے ساتھ۔ وہ مبہوت رہ گئی۔

پتھر ! اس نے کئی بار دانت پیسے - سنگدل۔ وہ ان کا مذاق اڑا چکی تھی

بیرسٹر صاحب کا سارا لہو رگوں میں جم گیا تھا وہ پچاس برس کی عمر میں اسّی سال کے بوڑھے لگتے !

تلخی کا احساس ان کی رگ رگ میں سما گیا تھا۔

یہ وسیع و عریض کوٹھی۔ دو دو کاریں دولت کے انبار۔ اگر یہی خوشی دے سکتی اگر ان چیزوں سے زندگی مل سکتی۔ اس کا دل چاہتا وہ در و دیوار سے سر ٹکرا کر لہولہان کر ڈالے۔

آپ نے یہ کیا کیا ؟ اس نے بیرسٹر صاحب کو نکتہ چیں کر ڈالے۔

وہ سن ہو جاتے یوں روم روم [illegible] ہو جاتے جیسے تعلق ہی سلب ہو گیا ہو۔ وہ اس کے [illegible]

تھے۔ مگر وہ ایسے سہم گئے تھے کہ کبھی مسکرا
نہ سکے!
آپ نے میری زندگی کیوں تباہ کی۔ اگر
کسی غریب کے گھر جاتی تو وہاں سکھ سے تو
تی۔ آپ نے عذرا باجی کو اپنی بیٹی بنایا تھا
ی دھن دولت انہی کے بچوں میں بانٹ دیتے
صبر کیوں سمیٹا ہے آپ نے۔؟
اف۔ میں نے بڑی غلطی کی۔ بے چارے
بجود تھے۔
اسے تو ان کی شکل بھی زہر لگتی۔ وہ
اس ہوتی اور بیرسٹر صاحب زندگی سے
بیزار نظر آنے لگتے۔ اپنا رتبہ اور وقار بھول
اس کی خوشامدوں میں لگ جاتے!
مگر جھوٹ اور منافقت سے وہ پہلی
ہیں۔
خشک اور بھٹی کی طرح دہکتی ہوئی زمین
اپنی آگ میں جگہ جگہ سے پھٹنے لگی۔
ایک گھٹا پورب سے امڈ کر آئی۔ بے سان
ان۔ نہ گھوڑے کی ٹاپ کی آواز۔ نہ آمد
خبر۔ وہ بدحواسی میں چائے میں نمک چائے
پیالی میں گھول گئی۔
آپ؟ عدنان بہت سنجیدہ تھا
اس نے بار بار آنکھیں ملیں۔
کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ یا یہ
کی اور ہے۔
آپ گھوڑے پر سوار ہو کر نہیں آئے؟
نہیں۔ میں بائی پلین آیا۔۔۔ اس
خشک لہجے میں کہا اور اس کے وجود کو یوں

دیکھنے لگا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ ہو
پھر اس نے روحی سے بات چیت کئے بغیر
باہر کا رخ کیا۔
میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ روحی سناٹے
میں رہ گئی۔
بیگم۔ بیرسٹر صاحب نے تاکید کی۔ اس
کی مدارات میں کمی نہ ہو۔ وہ اب یہیں رہے گا
میں کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ بہت بے رحم بن گئی
ایسے نہ بولو۔ بیگم۔ وہ تقریباً گڑگڑانے
لگے۔ میں تمہارا قصوروار ہوں۔ اس نے کیا
کیا ہے؟
وہ خاموش خاموش صبح کے تیز نور میں
دمکتی مسجد کی اونچی گنبد اس کے کلس دیکھنے لگی
بڑ کا پرانا پیڑ ہواؤں میں جھوم رہا تھا۔
سامنے ایک جھیل تھی۔ اس کا پانی چمک رہا تھا
ایک طرف گھروندے کا گھنا جنگل۔ دوسری
طرف گہری گہری کھائیاں۔ گھاٹیاں۔ غار۔
وہ پھر بھٹکنے لگا۔
باجی بھی اس سے ملنے آئیں۔ ان دنوں
زندگی بہت مصروف ہو گئی تھی۔ عذرا باجی
لیے ڈائن لگتیں۔ جو اس کی کومل زندگی کا
کلیجہ چبا گئی تھیں۔
میری تقدیر میں کچھ بھی نہیں۔ وہ
احساس کمتری کے مارے چھپ چھپ کر
روتی۔ عذرا باجی کے تینوں بچے گھر میں ادھم
مچاتے پھرتے۔ میری قسمت میں ایسا اجالا نہیں
ہے۔ وہ ہائے کر کے بیٹھ جاتی۔
"آغا کو بلا لاؤ تو پھر گھومنے چلیں۔!"

باجی کہہ رہی تھیں۔ نفی لینے ملانے نہیں
آئی۔ یہ سب امیروں سے نفرت کرتے۔ پہلو
کے زخم کون دیکھتا ہے۔ وہ کہیں نہیں
جائے گا۔ ہرگز نہیں!۔
حد ہو گئی ہے۔ اگر آپ بھی چلیے۔
عدنان ہاف ڈور پر بازو رکھے کھڑا تھا۔ وہ
خاموش رہی۔
اب تو سوچنے کو کچھ باقی نہیں۔" اس
نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔" جو کچھ
آپ کا ارمان تھا وہ پورا ہو گیا۔ یہ محل
نما کوٹھی ملی۔ دولت کے انبار ملے۔ اب
آپ کو دوسری کس چیز کی تمنا ہے؟ مجھے بتا دیجیے
تو میں آپ کے بچپن کا ساتھی ہوں۔ مجھ سے
آپ کی اداسی برداشت نہیں ہوتی!"
یہ کیا آپ آپ کر رہے ہیں آپ؟۔" وہ
جھلا گئی۔ جو کچھ نصیبے میں لکھا تھا وہ ہوا
اس میں اس کا کیا قصور تھا؟
مگر وہ تو بے حد سنجیدہ تھا۔ نہ پہلی
سی شوخیانہ شرارت۔
آپ میری اداسی مت دیکھیے!"
اس نے کہا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں
ہو رہی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آیا۔
میں اپنی آنکھیں کیسے پھوڑ سکتا ہوں
بہتر یہی ہے کہ اپنے مہمان کی خاطر اپنے سلوک
میں ترمیم کیجیے۔
میرا کوئی مہمان نہیں
میں بھی نہیں۔۔!
آپ اس گھر کے فرد ہیں مہمان نہیں

کہلائے جا سکتے۔

میں تو آج آیا ہوں [illegible] ہی چاہتا ہے کہ میں کوٹھی میں بیٹھوں۔ مخمل پہ چلوں حریر و دیبا کے لباس پہنوں۔ کچھ بھی نہیں۔

روز و شب کے اس کے طعنوں نے روحی کا کلیجہ چھید ڈالا۔ اس نے بیرسٹر صاحب سے کہا۔

"مجھے کہیں اور لے چلئے۔ میں یہاں نہیں رہوں گی!"

عجیب کہو بیگم۔" وہ رلیشہ خطمی ہو گئے۔

ابھی اس روز عدی بھی کہہ رہا تھا۔ میرے پاس مقدموں کی بھرمار ہے تم اور عدنان چلے جاؤ"

آپ اتنے ناسمجھ کیوں ہیں۔ عدنان عدنان۔ میں ان کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتی وہ بچوں کی طرح روئی۔ "میرے ساتھ آپ چلیئے۔ میرے سب کچھ تو آپ ہیں!"

اس نے بیرسٹر صاحب کے سینے پر سر رکھ دیا۔ یکبارگی اس کے جسم کی ساری رگیں کھنچ کھنچ کر ٹوٹ گئیں۔ خون میں طغیانی آ گئی۔ مدہوش و بے خود وہ سسکنے لگی۔

اور قریب آیئے۔ اور قریب۔

مگر انہوں نے بے حس لہجے میں کہا۔ اچھا میں ہمارے چلوں گا تمہیں کچھ فرصت مل جائے۔

اس نے مدہوش نشیلی آنکھیں کھولیں کمرے میں سگریٹ کی بو چکراتی پھر رہی تھی۔ وہ جا چکے تھے۔ اس نے کرسی کے ہتھے پر سر پٹخ دیا۔

[illegible] زمین سخت آسمان دور ہے۔ موت تو ملتی نہیں مگر نہیں آتی۔ بڑی ضد ہے۔

عدنان بھی اک آئیڈیا ہے انکل بتائیے نا۔ [illegible] دن بھر مکھیاں مارتا پھرتا ہوں [illegible]

کہیں گھومو پھرو۔! باجی رائے دیتیں۔

سب کچھ بچپن کا دیکھا بھالا ہے۔ وہ جان بوجھ کر بچپن کی یاد ضرور دلاتا۔ "مسز ہاشمی کو تو یاد ہو گا۔ یہیں تو کھیلا کرتے تھے۔

پھرو۔! وہ خواہ مخواہ ہنستا۔

مسز ہاشمی!۔ اس کے کان جل اٹھتے اب بھلا روحی کہہ کے کیوں نہیں مخاطب کرتا!

مسز ہاشمی۔ ایسے گستاخ۔ وہ آنٹی ہے تیری۔ باجی آنکھیں نکالتیں۔

آنٹی! اس کا قہقہہ طویل ہوتا۔ بھلا یہ کیسی آنٹی ہیں۔ نہ تو کبھی مسکرا کر اپنے بھانجے سے بات کی نہ اس کی خاطر تواضع سے کوئی واسطہ رکھا.... مگر یہ کیسا عجیب رشتہ ہو گیا ہے۔

تم بھی اس سے خفا رہتی ہو۔" باجی اس کی طرف مڑیں۔

نہیں تو۔ بھلا کیوں! وہ بے حد کراہیت سے بول کر رخ پھیر لیتی۔

تم انہیں آنٹی کہا کرو۔ شاید راضی ہو جائے! باجی نے ترکیب بتائی۔

ہا ہا۔ انہیں آنٹی پکاروں گا۔ سب مجھے یاد ہے۔ بکھرے بالوں والی چھوٹی سی لڑکی میرے ساتھ دیوار تلے کھیلا کرتی تھی۔ ننھے منے گھروندے بناتی تھی اور بنیاد رکھتے بھول جاتی تھی۔ وہ

اس نے اب [illegible] آنٹی کہہ کے مخاطب کروں گا۔ بہت اچھے۔ بہت اچھے۔

وہ زمانہ گیا۔" باجی اس کو احساس دلاتیں۔

باجی عدنان نے یہ پانچ سال کیسے کاٹے۔ آپ سے کیا بتاؤں۔ پھر جب واپس آیا تو میری روح کا کنول کھل اٹھا۔ انہیں اس کوٹھی میں دیکھ کر مجھے بے پایاں خوشی ہوئی۔ آپ کا بڑا احسان ہے باجی آپ نے تینوں موتی ایک مقدس رشتے کی لڑی میں پرو دیئے۔ انکل تو آپ کے احسان سے عمر بھر سر نہ اٹھا سکیں گے۔

یہ انداز وہ خوب جانتی تھی۔ وہ اس سے دور رہنے کی کوشش کرتی۔ لیکن وہ تو ایک عدنان کے کئی بھوت تھے۔ یہاں وہاں۔ ہر کہیں۔ جان بوجھ کر برف کے چرکے لگاتا۔ اور لطف لیتا۔

آپ کو پرانی باتیں یاد کر کے کیا مل جائے گا؟ وہ اس سے ڈرنے لگی تھی۔

آپ نہیں جانتیں۔ مسز ہاشمی۔ یہ یادیں ہی اب میری سب کچھ ہیں۔ اگر یہ چھین گئیں تو سب کچھ چھن جائے گا۔ آپ بے شک بھول جائیے مگر آپ یہ ظلم مجھ پر نہ کیجئے کہ مجھے بھی سب کچھ بھلا دینے پر اصرار کیجئے گا۔ میرا دماغ گنجینہ بن کر رہ گیا ہے۔ یادوں کا۔ خدا کی پناہ۔"

اس میں میری کیا خطا ہے۔ اس نے سوچا کہ اسے نرمی سے رام کرے گی۔

میں باجی کو ایسا سنگدل بے مہر نہیں سمجھتا تھا انہوں نے مجھ سے میری زندگی لے لی۔ وہ دوسروں کے کرب کا تماشہ دیکھتی ہیں۔ میں اپنی ہستی کو

بیٹی کہہ دو ناں۔ میں کیا کروں!

روحی۔ یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔!

مجھے ہوش نہیں آتا۔ میں خود کو کیوں نہیں سمجھا سکتی کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا ہوں ہائے۔ مجھے اپنی بدبخت تقدیر ملتی میں اسے گولی سے اڑا ڈالتا۔

تقدیر پر کس کا کیا بس ہے؟ وہ اسے سمجھاتی۔

سچ کہو۔ روحی۔ کیا تم اس زندگی سے خوش ہو۔

اگر اپنے بس میں ہوتا۔ اس نے کہا پھر مسکرائی اور اپنے قیمتی ساز و سامان کے در و دیوار پر نظریں دوڑا کر انہیں دیکھنے لگی۔

زندگی ان چیزوں کا نام نہیں ہے۔ اس کوٹھی کی نہ تو کوئی بنیاد ہے نہ کوئی چھت ہے۔ تم کھلے میدان میں کھڑی ہو۔ تم خوب سمجھتی ہو۔ روحی

اور اس وقت روحی کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ جلنے لگتا!

اس کے قرب سے اس کا بدن چھلکنے لگتا تھا۔ کتنی بار اس نے ایسے کھیت دیکھے تھے جن پر مدتوں سے پانی نہیں برستا تھا۔ جن کی مٹی سوکھ کر چٹخنے لگی تھی۔

دھرتی پیاسی کی پیاسی ہی رہی۔ امڈ گھمنڈ کر گھٹا چھائی۔ نہ برسی نہ سرکی یونہی کھڑی رہی

خاموشی تو ہولناک علامت ہے طوفان سے پہلے کا خطرہ۔

اور پھر وہ بچوں کا پروا ہو گیا۔ دن بھر بچوں میں مگن رہتا۔ قہقہے لگاتا۔ پڑوس کی مس اسمتھ سے واکنگ سیکھنے لگا تھا پہروں مس اسمتھ کے بھونڈے چہرے کے قصیدے پڑھا کرتا۔

سرخ پھولدار اسکرٹ میں تو مس اسمتھ بیر بہوٹی لگتی ہیں۔ ذرا چھوا اور سکڑ گئیں۔

پھٹکار ہے تمہاری اوقات پر ــ

باجی نفرت کرتیں" ارے کیا یہی مس اسمتھ رہ گئی تھی۔ ایک ذرا اشارہ کر دو۔ اصل نسل سید زادی مل جائے گی۔

مگر باجی مس اسمتھ اس قدر بہترین والز ناچتی ہیں۔

اچھا تو پھر مرو اسی کے ساتھ۔ باجی جل جاتیں۔

پھر دانش بھائی آئے اور بیوی بچوں کو لے کر چلے گئے! گھر میں سناٹا چھا گیا۔

بیرسٹر صاحب پر مقدموں کی یلغار ہو گئی۔ ایک سہ پہر وہ کہنے لگے۔

تم دونوں رات کے کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا۔ منشی کے یہاں ایٹ ہوم ہے!

آپ تو بہت بڑے آدمی ہو گئے ہیں انکل۔ وہ خوش ہو کر بولا۔

مکار۔ فریبی۔ وہ جل کر خاک ہو گئی آخر یہ اس کا لہجہ سمجھتے کیوں نہیں۔ ہنستے کیوں ہیں۔ بدھو کہیں کے۔ جب وہ چلے گئے تو روحی نے بڑے غصہ سے کہا۔

یوں انہیں پاگل نہ بنایا کیجئے!

پاگل! ارے میں تو ان کی خوش قسمتی پہ سر دھنا کرتا ہوں۔

آپ کو شرم نہیں آتی۔

جس کو آنی چاہیئے تھی اسی کو نہ آئی۔ تو مجھے کیا آئے گی! اچھا خیر۔ میں آپ کو گانا سناؤں۔

اس نے میز پر رکھا ہوا ساز اٹھا لیا۔

دھیرے دھیرے سارا کمرہ دلنواز موسیقی سے بھر گیا۔ وہ مسحور اور گم بخود ان مضبوط بازوؤں کو دیکھ رہی تھی۔ چوڑا سینہ خوبصورت چہرہ۔

آخر وہ کب تک خود کو فریب دیتی۔ جدھر عدنان نے اسے اپنے ساتھ چلانا چاہا۔ وہ چل پڑی۔

روحی یہ سب رشتے ناطے واہیات چیزیں ہیں۔ تم دنیا سے کیوں ڈرتی ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

کیسے توڑ دوں یہ رشتے۔

کوئی اس کے ضمیر کو جگاتا۔ اور کوئی اسے تھپک کر سلاتا۔

تم محروم ہو۔ محروم ہی رہو گی۔ آخر کب تک ــ کب تک؟

خدا کا شکر ہے۔ تم نے روحی کو خوش رکھنا شروع کر دیا ہے۔ بیرسٹر صاحب نے ایک دن کہا۔

آپ کو خوش رکھنے کے ڈھنگ ہی نہیں آتے انکل۔

بہت سے دن گزر گئے۔

اس دوپہر بھی بیرسٹر صاحب کے سر میں درد تھا۔ عدنان نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ

وہ انکل کے سامنے [illegible]
وہ ان سے دیکھا نہیں گیا۔ سر [illegible] کر
چپ چاپ سر دبانے لگی۔

تم کہیں جا رہی تھیں۔

جی نہیں۔

دالان سے عدنان پکار رہا تھا۔ مسز ہاشمی۔ روحی۔ روحی۔ پھر وہ ادھر آ گیا۔

کیا ہوا انکل ڈیئر۔ اور بیرسٹر صاحب کا جواب سننے سے پہلے اس نے دیکھ لیا۔ روحی ان کا سر دبا رہی تھی۔

چلو! اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔

مگر۔ وہ ہچکچائی

اللہ! اللہ کتنا درد ہے۔ بیرسٹر صاحب کراہ رہے تھے۔

چند منٹ عدنان نے روحی کے اٹھنے کا انتظار کیا پھر چلا گیا۔

دوسری صبح ناشتہ کی میز پر سناٹا تھا روحی اسے منانے لگی۔

تم خفا ہو گئے ہو مجھ سے

مجھے بھلا کیا حق پہونچتا ہے۔

تو پھر چلو ناشتہ کر لو

مجھے بھوک نہیں لگی

عدی۔ ضد نہ کرو

میں کہیں جا رہا ہوں

کہاں

اپنے ماں باپ کے گھر۔!

بیرسٹر صاحب برآمدے میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ وہ انکے پاس آیا اور انہیں [illegible] کر دیا۔

[illegible] جا رہا ہوں!

کیوں بھائی ایسی بھی کیا جلدی ہے۔

اب یہاں دل نہیں لگتا۔

وہ اپنے سامان کی درستگی میں مشغول ہو گیا

بیگم۔ اس پاگل کو تم ہی سمجھاؤ۔ بیرسٹر صاحب نے کہا۔

اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر عدنان نے زہر خند کرتے ہوئے کہا۔

چارہ گری کے لئے تشریف لائی ہیں آپ

مجبوری کو تو مانا کرو۔ عدنان!۔

کچھ مجبوری نہیں! تم انکار کر سکتی تھیں

کیسے کرتی۔ ابا ضعیف تھے۔ میں اکیلی میں کہاں جاتی!۔

میرا انتظار کر سکتی تھیں۔

آج سے پانچ سال قبل مجبوریاں زیادہ شدید تھیں۔

میں یہاں سے جاؤں گا روحی اور خود کو دل بھر کر برباد کر دوں گا۔ شراب پیوں گا۔ ریس کھیلوں گا۔ جوئے میں رقمیں لگاؤں گا۔ خراب عورتوں کا قرب تلاش کر دوں گا!

اس طرح مجھے سزا دو گے!

خود کو۔

بتاؤ میں کیا کہوں۔

میرے ہم قدم چلنے کا وعدہ کرو۔ ورنہ میں سب میں چیختا پھروں گا کہ میری بربادیوں کی تنہا ذمہ دار روحی بیگم ہاشمی ہیں۔ تم دیکھ رہی ہو گی!

اور جب اس نے [illegible] سوچ کر ایک فیصلہ کیا تو اسے خود پر ترس آنے لگا اور وہ عدنان کو بھی حق بجانب سمجھنے لگی۔

روحی سنو! عدنان فرط شوق سے بوکھلا کر بولا۔ "تم ایک نئی زندگی شروع کرو گی۔ اپنا لباس اپنا زیور سب کچھ یہیں چھوڑ دو۔ یہ دقیانوسی چیزیں میں پسند نہیں کرتا!"

اور اس رات اس نے جاگتے میں گزار دی۔ عدنان فوری خالی کرنے کے لئے ریزرویشن کرنے چلا گیا تھا!

بیرسٹر صاحب کا دنیا میں کوئی نہیں تھا وہ پھر پاگل ہونے لگی۔ انہوں نے اسے آج تک کوئی تکلیف نہیں دی۔ اس کی راحت اور آسائش کا سامان کرتے رہے ہیں! بے سہارا۔ بے وسیلہ۔ میں کیا کروں۔ میرے خدا۔

پھر اس کے مرحوم ابا اس کے کانوں میں بولنے لگے۔

"وہ تمہاری زندگی کے سفینہ کے ناخدا ہیں بیٹی۔ تمہارے مجازی خدا۔ یاد رکھنا جس جگہ تمہاری ڈولی رکھی جائے اسی جگہ سے تمہارا جنازہ اٹھے۔"

دھوپ ڈھل چکی تھی۔

پھر کے کلس سونا بن گئے تھے۔ ہر طرف سر شام کا سناٹا محیط تھا۔ بڑا کا ہیبت ناک اب بھی چپ تھا۔ پوری دنیا خاموش تھی۔ صرف اس کا دل بول رہا تھا۔

کیا کرتے ۔ کیا نہ کرتے
یہاں مجھے کیا ملا ۔
وہاں تو بہت کچھ ملے گا ۔
بیرسٹر صاحب ضعیف ہیں ۔
مگر عدنان ۔ اور یکبارگی اس کا دل
اُچھل کر حلق میں آگیا ۔

بیرسٹر صاحب کے سر میں سخت تکلیف
تھی ۔ پھر بھی اسے پریشان دیکھ کر انہوں نے
پُوچھا ۔

کیا بات ہے بیگم تم بہت افسردہ
خاطر نظر آرہی ہو ! ۔
کچھ نہیں ۔ آپ کا درد کیسا ہے !
"کون سے درد کو پوچھتی ہو روحی"
کون سا درد ۔ وہ چوری بن گئی ۔
عدنان کہاں ہے ۔ اب تم نے سمجھ لیا
ہے نا ! ۔

اسی وقت عدنان آیا ۔ اس کے ہاتھ
میں ایک پیکٹ تھا
کہاں تھے میاں" بیرسٹر صاحب نے
بے حد محبت سے پُوچھا ۔
جی انکل ۔ ضروری کام میں مشغول تھا
یہ کیا لائے ہو ۔
دیکھئے !" عدنان نے پیکٹ کھول
ڈالا ۔ اور ایک نہایت سفید جھاگ ایسی
حسین ساڑی ان پر پھیلا دی ۔
مسز ہاشمی کے لئے ۔ میری طرف سے
وہ بولا ۔
بیرسٹر صاحب خوش ہو کر تعریف
کرنے لگے ! اچانک روحی کے دل نے پھر تو
گرفتار پرند کی طرح پھڑپھڑانا شروع کر دیا
کیسے دیکھے کیسے نہ دیکھے ایک طرف شباب
کے شعلے ۔ دوسری طرف برف کا تودہ ۔
اس نے گھبرا کر کرسی پیچھے سرکائی ۔ اچانک
میز میں دھکا لگا اور چائے کی کیتلی یوں لڑھکی
کر کلی جیسی ساڑی کو یہاں سے وہاں تک
داغدار بنا گئی ۔

یا خُدا ۔ یہ کیا کیا آپ نے ۔ عدنان
چیخ کر بولا ۔
وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس
داغ کو دیکھ رہی تھی ۔
دھو ڈالیئے جلدی سے ۔ عدنان
نے کہا ۔
بہت گہرا داغ ہے ۔ بیرسٹر صاحب
نے کہا " اب ہرگز نہ چھوٹے گا ۔
اور اچانک اس نے دونوں ہاتھوں
سے چہرہ چھپا لیا ۔
ہزاروں میں انتخاب تھی ۔ عدنان
بڑبڑا رہا تھا ۔
برباد کر دی ۔ !" بیرسٹر صاحب
بولے ۔ حسین چیزوں کا دردناک انجام بہت
روح فرسا ہوتا ہے !"
اور پھر ایک جانگسل کشمکش نے روحی کے
ضبط کی طنابیں ہلا دیں !
اس نے دونوں ہاتھوں سے ساڑی
سمیٹی اور دریچے کے باہر باغ میں پھینک
دی ۔ اور سرک کر بیرسٹر صاحب کے پہلو
میں کھڑی ہو گئی ۔ پھر اس نے سرد مگر ہموار
لہجے میں عدنان سے کہا ۔
آپ کل صبح جا رہے ہیں ۔ معاف کیجئے گا
میں آپ کو رخصت کرنے نہ جا سکوں گی ! ۔
اور شوہر سے بولی ۔
" آپ آرام سے لیٹ جائیے ۔ میں آپ کا
سر دبا دوں ۔ اتنے سے درد میں چہرہ اُتر
گیا ہے ! "

فلمی دنیا کے شب و روز

(پردہ پس پردہ)

اپنا کالم لکھنے بیٹھا ہی تھا کہ یہ افسوس ناک خبر ملی کہ ہندوستان اور پاکستان کے عظیم افسانہ نگار، طنزیہ نگار اور بے باک صحافی جناب ابراہیم جلیس کا دماغ کی شریانیں پھٹ جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دو دن قبل ہی ان کے اخبار "مساوات" کو وہاں کی حکومت نے بند کر دیا تھا۔ ایک صحافی کے لئے اس سے بڑا صدمہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے قلم چھین لیا جائے ۔۔۔!!

آج سے بارہ پندرہ سال پہلے وہ غالباً پہلی اور آخری مرتبہ پاکستان سے آئے تھے۔ ان دنوں میں رائل تاکیز سے وابستہ تھا۔ ہمارے ہاں کمال امروہی کی فلم "دل اپنا اور پریت پرائی" لگی ہوئی تھی جسے کشور ساہو نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ مینا کماری اور راجکمار نے بڑے معرکہ کی اداکاری کی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ابراہیم جلیس جناب شاہد صدیقی کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ سلام دعا کے بعد پتہ چلا کہ وہ شاہد صدیقی کے ساتھ فلم دیکھنے کی غرض سے آئے ہیں۔ دوران ملاقات فلمی دنیا سے اپنی وابستگی کے کئی قصے سنا ڈالے کئی فلمسازوں کی حماقتوں کا ذکر کچھ اس انداز سے کرتے کہ بے ساختہ قہقہے نکل جاتے۔ فلم تو دو ڈھائی گھنٹوں میں ختم ہو گئی لیکن باتوں میں اس سے زیادہ وقت نکل گیا۔ ذہن میں آج بھی اس ملاقات کے خوش گوار نقوش محفوظ ہیں۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

علی رضا ہماری فلموں میں ایک زمانے سے کہانی اور مکالمے لکھ رہے ہیں۔ کئی سلور جوبلی فلمیں لکھ ڈالیں لیکن اپنے لئے جتنی بھی تصویریں بنائیں وہ ان کے کسی کام نہ آئیں۔ مشہور عالم اداکارہ نمی سے شادی کی اور بڑے سکون سے زندگی گذار رہے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کے گھر پر ایک مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی تھی غالباً اس وقت اُن کا خیال حیدرآباد میں کوئی فلم بنانے کا تھا۔ بہت سی باتیں پوچھتے رہے۔ بعد میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پتہ نہیں اس فلم کا کیا ہوا۔ ابھی حال میں انھوں نے حاجی مستان کی زندگی پر فلم بنانے کا اعلان کیا ہے جس کی کہانی وہ خود لکھ رہے ہیں اور ڈائرکٹ بھی خود ہی کریں گے آج کل وہ حاجی مستان کی زندگی کے واقعات جمع کرنے میں مصروف ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ یہ فلم ایسی بن کر آئے گی کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھیں گے۔ اور تو اور یہ بھی اطلاع آئی ہے کہ فلم کا مرکزی کردار کوئی اور نہیں بلکہ خود حاجی مستان ادا کریں گے۔ غرض اس کا مہورت اسٹوڈیو سے باہر صابو صدیق سرائے کے سامنے اسی فٹ پاتھ پر ہوا جہاں حاجی مستان نے بچپن سے جوانی تک کی منزلیں طے کی تھیں۔ مہورت میں سنیما [illegible] "آغا حشر کاشمیری" [illegible] کیمرہ کار نے حرکت کی۔ فٹ پاتھ کی اس دلچسپ اور رنگارنگ تقریب میں انڈسٹری کے عظیم اداکار دلیپ کمار کی موجودگی نے مہورت کی اہمیت میں بے حد اضافہ کر دیا۔

ایک زمانے میں ڈکشٹ کا بڑا نام تھا۔ یہ حضرت جتنے موٹے تھے اتنے ہی زندہ دل بھی! ان کی اداکاری کو کسی نے کبھی اداکاری نہیں کہا۔ ایسی ایسی دلچسپ حرکتیں کر جاتے کہ لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ایک مرتبہ وہ کسی فلم کے مہورت کے لئے تاج محل ہوٹل ٹیکسی میں جا رہے تھے۔ فلم ایکٹر کو دیکھ کر ٹیکسی ڈرائیور کی رفتار اور زبان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ ڈکشٹ صاحب سے کہنے لگا "صاحب کچھ پیسہ جمع کر لیا ہے آئندہ سال تک ایک فلم شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ ایک عدد [illegible] سے کیجئے

کہ آپ میری فلم میں کام ضرور کریں گے"۔
ڈکنٹ صاحب نے کہا کیوں نہیں بھائی تمہاری اس ہمت کو دیکھ کر مجھ میں کام کرنے کی لگن بھی بڑھ گئی ہے۔ جب تاج محل ہوٹل پہونچے تو ٹیکسی کے قریب ایک گدھا کھڑا ہوا نظر آیا۔ ڈکنٹ صاحب نے ٹیکسی والے کا کرایہ ادا کیا اس سے ہاتھ ملایا اور آگے بڑھتے ہوئے جب گدھے کے برابر سے گذرنے لگے تو بڑے ادب سے انھوں نے گدھے کو سلام کیا۔ ہوٹل میں کھڑے ہوئے لوگ حیرت سے پوچھنے لگے کہ حضرت! یہ کیا حرکت آپ نے کی۔
______ تو کہنے لگے کیا بتاؤں بھائی زمانہ ہی ایسا آگیا ہے معلوم نہیں کون گدھا کل پروڈیوسر بن جائے۔

من موہن دیسائی کی دو تین فلمیں یکے بعد دیگرے کیا ہٹ ہوئیں کہ یہ حضرت زمین پر قدم ہی نہیں رکھ رہے ہیں۔ ان کا کہا ہوا ہر لفظ آج کل اپنی جگہ سند بنا ہوا ہے ایک زمانہ تھا کہ ان کی ہر فلم پٹتی تھی اور یہ حضرت ہر بڑے ہیرو کی خوشامد میں اپنا وقت برباد کرتے تھے کہا جاتا ہے کہ پرانی فلم جانور میں شمی کپور نے ان سے یہاں تک کہدیا تھا کہ "کس گدھے نے تم کو پروڈیوسر ڈائرکٹر بنایا ہے۔ بات کرنی تو آتی نہیں اور فلم میں دخل دیتے ہو"۔ تو جناب یہی من موہن دیسائی خاموش بیٹھے ہوئے یہ سب کچھ سنتے اور دیکھتے رہتے اور فلم ہیرو۔ ہیروئن کے صوابدید پر بن جاتی۔ ان کی کامیابی کو دیکھ کر نڈیا ڈوالا نے ان سے ایک فلم بنانے کی خواہش کی اور کہا کہ فلم میں دلیپ کمار کو لیا گیا ہے۔ من موہن دیسائی نے کہا نا بابا مجھے فلم بنانا ہے سیٹ کے باہر بیٹھنا نہیں ہے۔ عام طور پر یہ افواہ ہے کہ جس فلم میں دلیپ کمار کام کرتے ہیں وہاں کسی کی نہیں چلتی۔ اب اگر دلیپ کمار کے لئے ایسے ڈائرکٹر لائے جائیں تو لے جا کے دلیپ کمار کی خود کیسے چلے گی!

جنوبی ہند کی مشہور ایکٹریس بھانومتی کی ایک ہی فلم چندر لیکھا نے سارے ہندوستان میں وہ شور مچایا کہ بمبئی والوں نے توبہ کرلی۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ اپنے شوہر کی دو سو روپیہ آمدنی پر زندگی گذارتی تھی دو تین فلمیں کیا چلیں کہ یہ محترمہ پروڈیوسر ڈائرکٹر اور اسٹوڈیو کی مالک اور نہ جانے کیا کیا ہو گئیں۔ شاندار بنگلہ پر ایک دو نہیں کئی موٹر کاریں کھڑی رہتی تھیں ___

ہاں تو یہ ہماری فلم انڈسٹری ہے جہاں بقول ڈکنٹ گدھے بھی پروڈیوسر ڈائرکٹر ہو جاتے ہیں اور دلیپ کمار جیسے نامور اداکار بھی بیکار سمجھے جاتے ہیں ___ !!

بقیہ:۔ فلمی ڈائری کا صفحہ سے آگے

راج کپور نے "فلموں کے تعلق سے مرکزی وزارتِ اطلاعات و نشریات پر تنقید کی ہے۔ ویسے یہ تنقید تو بجا ہے کیونکہ حکومت کی کسی بھی خامی یا غلط پالیسی پر تنقید کرنی چاہیئے۔ لیکن بعض لوگ راج کپور سے پوچھتے ہیں کہ اندرا راج میں جب فلم والوں پر ظلم و ستم ڈھایا جا رہا تھا تو بوٹ پالش کے راج صاحب نہ صرف خاموش تھے بلکہ حکومت کی مسکہ پالش میں کیوں معروف تھے

بلا عنوان

اکتوبر کے شمارے میں۔ یس۔ ایم۔ حیات کی کہانی بلا عنوان شائع ہوئی تھی جس کا عنوان قارئین کو تجویز کرنا تھا چنانچہ ادارے کو کئی عنوانات وصول ہوئے جس میں آفتاب عالم فیض آباد کے تجویز کردہ عنوان "کبھی کا گناہ" کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا آئندہ ماہ سے چھ ماہ تک پونم انھیں تحفتاً بھیجا جائے گا
دیگر پسندیدہ عنوانات یہ ہیں
بے گناہی کی صلیب، معیم النساء دھنباد
موت کی زندگی۔ محمد رضی الدین اقبال
حیدرآباد
بے تصور مجرم، انور حسین، دہلی اور
عذرا تسنیم ۔ دہلی

فلمی ڈائری

ہماری فلموں کی تیاری پر کس طرح پیسہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ایک فلم "کالا پتھر" کے ایک سیٹ کی تیاری پر ۱۴ لاکھ روپئے خرچ کئے گئے ہیں۔ عموماً ۱۵ یا ۱۶ لاکھ روپئے کسی بڑی فلم کی ایک ادھ ٹیریٹری کا معاوضہ ہوتا ہے۔ اس سیٹ پر شوٹنگ کے لئے آرٹسٹوں کی تاریخیں ایک سال پہلے ہی لے لی گئیں تھیں۔

★

نئی فلموں کے ناموں کے لئے پرانی مشہور فلموں کے نام آج کل دہرائے جا رہے ہیں۔ لیکن بعض فلم ساز اس سلسلے میں بھی اپنی عقلمندی کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں ایک فلم ساز نے راجکپور کی مشہور و مقبول فلم "جس دیش میں گنگا بہتی ہے" کے نام کو توڑ موڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس نے اپنی نئی فلم کا نام رکھا ہے "جس دیش میں رادھا ناچی تھی"۔ اسے عقلمندی کہا جا سکتا ہے کہ بے وقوفی اس کا فیصلہ آپ خود کیجئے۔

★

ڈاکٹر سری رام لاگو اسٹیج کی دنیا

ہے [illegible] ان میں دو [illegible] میں بڑے پیارے کیریکٹر رول کر رہے ہیں۔ دیپ کمار نے انہیں کسی فلم میں نہیں اسٹیج پر دیکھا اور ان کی اداکاری سے اتنا متاثر ہوا کہ انہیں اپنی ایک نئی فلم کے لئے منتخب کر لیا۔ سری رام لاگو یقیناً خوش قسمت ہیں کہ انہیں بہت جلد اداکاری کی دنیا کے اس عظیم شہنشاہ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے گا۔

★

ناصر حسین کی فلمیں ہمیشہ نوجوانوں کو اپنا دیوانہ بنا لیتی ہیں۔ ان کی نئی فلم "ہم کسی سے کم نہیں" ہر جگہ باکس آفس پر کامیاب جا رہی ہے سُنا ہے کہ بمبئی کے ایک سنیما تھیٹر میں اس فلم کے دوران نوجوان اپنی نشستوں سے اٹھ کر ناچنے لگے تھے۔

★

۱۹۷۷ء جیتندر کا سال ہے اس سال اس کی سب سے زیادہ فلمیں ریلیز ہوئی ہیں۔ اور تقریباً تمام فلمیں باکس آفس پر کامیاب رہی ہیں۔ "دھرم ویر" "دلدار" "کنارہ" "ایک ہی راستہ" "ضمانت" "پریتما" اور "قسم خون کی" نمائش کے لئے پیش کی جا چکی ہیں۔ اس کے علاوہ "اپنا پن" اور "جے وجے" اسی سال ریلیز ہو جائیں گی۔

★

[illegible] بھی ہیں ریلیز ہوئی تو [illegible] بغیر نہیں [illegible] فلمی کے باوجود فلم باکس آفس پر ہٹ ثابت ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اشتہار بازی ہی سب کچھ نہیں۔ فلم کا معیار بھی اس کی کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔

★

آج کل ہمارے ہاں انتہائی معیاری کلر لیبارٹریز قائم ہو چکی ہیں اور ہماری فلمیں ٹکنک کے اعتبار سے بہت سی باہر کی فلموں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ مگر اس حقیقت کے باوجود سُنا جا رہا ہے کہ راجکپور اپنی نئی فلم "ستیم شیوم سندرم" کلر کے لئے لندن روانہ کر رہے ہیں۔

★

ایک زمانہ میں اشوک کمار اور لیلا چٹنس کی جوڑی فلمی دنیا کی سب سے مشہور و مقبول جوڑی سمجھی جاتی تھی۔ ان دونوں کی کئی فلمیں سلور جوبلی اور گولڈن جوبلی کا ریکارڈ رکھتی ہیں۔ اس کے بعد اشوک کمار کیریکٹر رول کرنے لگے اور کئی فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ بلکہ اب بھی دکھا رہے ہیں۔ لیلا چٹنس امریکہ چلی گئیں اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ معلوم ہوا ہے کہ محمود نے "جنتا حوالدار" میں اشوک کمار اور لیلا چٹنس دونوں کو کام کرنے پر راضی کر لیا ہے۔ ۲۰، ۲۵ سال بعد فلموں

کہ یہ یادگار جوڑی ایک بار پھر آ رہی ہے عمر کے اعتبار سے یہ اداکار بوڑھے ہو چکے ہیں لیکن ان کی اداکاری تو آج بھی جوان ہے اور بہت سے نوجوان اداکاروں سے زیادہ اثر انگیز ـــ!

★

"امر، اکبر، انتھونی" اس سال ریلیز ہونے والی فلموں میں سب سے کامیاب فلم ہے۔ باکس آفس پر اس فلم نے بہت بڑا ہنگامہ مچایا ہے اور اب بھی بہت سارے شہروں میں "ہاؤس فل" جا رہی ہے۔ پچھلے چھ ماہ میں اس کے گانوں کے دس لاکھ ریکارڈس فروخت ہو چکے ہیں۔ اور اس طرح کم وقت میں ریکارڈس کی فروخت کا یہ ایک نیا ریکارڈ ہے۔ فلموں کی شہرت و مقبولیت پبلسٹی کے تمام وسائل کو متاثر کرتی ہے چنانچہ "امر، اکبر، انتھونی" کی مقبولیت نے کئی چیزوں کی پبلسٹی کو متاثر کیا ہے۔ امول سے لیکر سمولائی شرٹس کی پبلسٹی کے لئے یا تو "امر اکبر انتھونی" کے ٹائپ کے حروف استعمال کئے جا رہے ہیں یا پھر AAA کا نشان لگایا جا رہا ہے۔

★

فلمی ستاروں سے جارج فرنانڈیز مرکزی وزیر صنعت کے تعلقات کافی خوش گوار رہے ہیں چنانچہ فلمی ستاروں کی ایک بڑی اکثریت کی طرف سے جنتا پارٹی کی تائید کے سلسلے میں جارج فرنانڈیز نے فلم والوں کو شکریہ کا ایک خط بھی لکھا تھا لیکن جب جارج فرنانڈیز وزیر بن گئے تو ان کا طرز عمل فلم والوں کے لئے بڑا حیرت انگیز تھا۔ فلم انڈسٹری کی ایک اہم شخصیت سری رام بوہرہ فلموں کے بعض اہم مسائل پر ان سے بات کرنا چاہتے تھے۔ رام بوہرہ جب ان سے ملنے کے لئے گئے تو انھیں وزیر موصوف نے بات چیت کے لئے صرف دو منٹ دیئے۔ رام بوہرہ پریشان تھے کہ وہ واقعی جارج فرنانڈیز سے مل رہے ہیں یا پھر کسی ایسے شخص سے جو فلم والوں کے لئے بالکل اجنبی ہو ـــ

★

فلمی دنیا میں ہر وقت چڑھتے سورج کی پوجا ہوتی ہے۔ جب کوئی فلم اسٹار یا ہدایت کار کسی فلم میں کامیاب ہو جاتا ہے اور فلم باکس آفس کے معیار پر پوری اترتی ہے تو اس اداکار یا ہدایت کار کے گھر پر فلم سازوں کی قطار لگ جاتی ہے۔ ناکام اداکار یا ہدایت کار سے اس کا اپنا سایہ بھی کتراتا ہے لیکن راجشری پروڈکشن کی روایت اس کے برخلاف ہے۔ اس فلمی ادارے نے ان ہدایت کاروں کو بھی موقعہ دیا ہے جن کی فلمیں ناکام ہو گئی تھیں اور پھر یہی ناکام ہدایت کار اپنی صلاحیتوں سے کامیاب فلموں کے تخلیق کار بن پائے۔ ان ہدایت کاروں میں باسو چیٹرجی، دینک بہری اور لیکھ ٹنڈن کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے اس وقت راجشری کے ساتھ کام کیا جب ناکامی کے سائے ان کے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ آج یہ تینوں ہدایت کار کامیاب ہدایت کاروں میں شمار کئے جاتے ہیں ـــ باسو چیٹرجی کی "چھت چور" دینک بہری کی "ایجنٹ ونود" اور لیکھ ٹنڈن کی "دلہن وہی جو پیا من بھائے" باکس آفس کے معیار پر بھی کامیاب فلمیں ثابت ہو چکی ہیں

★

مرکزی وزارت اطلاعات "ملٹی اسٹار" فلموں پر پابندی لگانا چاہتی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ فلم والے اس کی شدید مخالفت کریں گے۔ "شعلے" "دھرم ویر" "چاچا بھتیجا" اور "امر اکبر انتھونی" جیسی فلموں نے باکس آفس آمدنی کے جو ریکارڈ قائم کئے ہیں اسے دیکھتے ہوئے آج ہر فلمساز کے سر پر "ملٹی اسٹار" فلم کا بھوت سوار ہے ویسے بعض ایک ہیرو والی دوسری فلمیں بھی کامیاب ہوئی ہیں مگر ان کی کامیابی کا مقابلہ "ملٹی اسٹار" والی بڑے بجٹ کی فلموں سے کسی صورت میں نہیں کیا جا سکتا۔

★ منوج کمار کی مشہور اور معرکتہ الآرا فلم "کرانتی" کے لئے پریم چوپڑہ کو بھی لیا گیا ہے دلیپ کمار پہلی مرتبہ منوج کمار کے باپ کے کیریکٹر رول میں آ رہے ہیں اس عظیم فلم کی باقاعدہ شوٹنگ ۱۸ نومبر سے شروع ہو رہی ہے۔

بے لاگ فلمی تبصرہ

ہتھیارا

از۔ تماشائی

"ہتھیارہ" ڈاکوؤں کی زندگی پر بنائی جانے والی بے شمار فلموں میں سے ایک ہے اور اس حقیقت کے باوجود کہ کہانی کار نے اس سماجی پس منظر کو ابھارنے کی کوشش کی ہے جو ڈاکو کے نام کے ساتھ وابستہ بدنامی کو کسی قیمت پر گلے کا ہار بنانے اور ایک ڈاکو کو جو شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے سویکار کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوتا، فلم کسی بھی سنجیدہ تماشائی کو قطعاً متاثر نہیں کرتی کیونکہ سٹوری دھیر پر سادگی بے جان دکھاؤ اس کہانی میں حقیقت پسندی اور فارمولے پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ مگر فارمولے کا یہ مصالحہ بھی فلم کو باکس آفس پر خاطر خواہ کامیاب نہیں بنا سکا۔

دولت سنگھ (پران) ایک بدنام ڈاکو ہے۔ لوٹ مار اور قتل و خون اس کا پیشہ ہے لیکن ایک دفعہ لوٹ مار کے دوران جب ایک شریف آدمی کا قتل ہو جاتا ہے اور مقتول کا معصوم بیٹا دولت سنگھ سے اپنے باپ کی جان لوٹانے کے لئے کہتا ہے اور گڑگڑا کر اس سے سوال کرتا ہے کہ اس نے وہ چیز کیوں لے لی جسے وہ واپس کرنے کی سکت نہیں رکھتا تو سنگدل ڈاکو موم بن جاتا ہے اور لوٹ مار کے پیشے کو ترک کر دیتا ہے۔ فلم کا یہ حادثہ جس پر کہانی کی بنیاد رکھی گئی ہے صرف فلم کا ایک سین لگتا ہے اور اس حد تک باقی پس منظر کی عکاسی نہیں کرتا جو دولت سنگھ کے شدید ردعمل کا باعث بن سکتے۔ عدالت دولت سنگھ کو پھانسی کی سزا دینے کی بجائے عمر قید دیتی ہے۔ یہاں بھی قانون کے تقاضے کو کم اور کہانی کار کی مرضی کو زیادہ دخل حاصل ہے۔ دولت سنگھ کی بیوی (چاند عثمانی) اپنے بچوں وجے (ونود کھنہ) اور گیتا (پریہ درشنی) کے ساتھ ایک گاؤں میں شریفانہ زندگی بسر کرتی ہے۔ وجے ایک شریف فارسٹ آفیسر ہے جسے ڈیوٹی سے زیادہ نیکی اور شرافت کے پرچار کا اور اپنی محبوبہ گوری (موسمی چٹرجی) کی دلداری کا زیادہ خیال رہتا ہے اسی گاؤں میں اس کا بچپن کا ساتھی پرکاش (راکیش روشن) بھی ایک پولیس آفیسر متعین ہوتا ہے اور وجے کی بہن گیتا کے ساتھ پریم کہانی کی ابتدا کرتا ہے۔ اس دوران دولت سنگھ کی ٹھیک میعاد کم ہو جاتی ہے اور وہ گاؤں واپس لوٹ آتا ہے۔ یہاں اس کو وجے کے باپ کی حیثیت سے کافی مان دیا جاتا ہے لیکن یہ مان اس وقت اپمان میں بدل جاتا ہے جب پرکاش کی ماں دولت سنگھ کے ہاں آتی ہے اور اسے پہچان لیتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے سے کہتی ہے کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا اسی وقت گوری کے باپ (راج مہرہ) جو گاؤں کا زمیندار ہے گوری کے لئے وجے کے رشتے کو ٹھکرا دیتا ہے اب گاؤں والوں کے دلوں میں دولت سنگھ کے لئے شدید نفرت جاگ اٹھتی ہے۔ دولت سنگھ ہر بے عزتی برداشت کر لیتا ہے لیکن شرافت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اب فلم کا دوسرا اہم موڑ اس وقت آتا ہے جب گوری کی شادی گاؤں کے ایک بدمعاش بانکے (من موہن) سے طے ہوتی ہے اور زمیندار بھرے منڈپ میں دولت سنگھ کی بے عزتی کرتا ہے اسی وقت وجے جسے ظالم سنگھ (دیو کمار) نے گرفتار کر لیا تھا معجزانہ طور پر منڈپ میں پہنچ جاتا ہے۔ بانکے کو قتل کر دیتا ہے اور گوری کو اس کی اپنی مرضی سے اپنے ساتھ لیکر فرار ہوتا ہے تو دولت سنگھ کا ساتھی بھیرو سنگھ (پردیپ کمار) وجے کی مدد کرتا ہے اور اسے دولت سنگھ کی جگہ لینے کی دعوت دیتا ہے اس طرح

[illegible] کرتے بچا تاہے اور باپ [illegible] قدم پر بھی پڑتا ہے۔ دولت سنگھ اسے راہ راست پر لانے کی لاکھ کوشش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔

اب وجے سنگھ کے ایک طرف ظالم سنگھ ہے جو اس سے انتقام لینا چاہتا ہے اور دوسری طرف پرکاش ہے جو اسے گرفتار کرنا چاہتا ہے۔ اس کشمکش میں جو واقعات و حادثات ہوتے ہیں ان کا تعلق حقیقتوں سے کم اور حماقتوں سے زیادہ ہے۔ فلم کے آخر میں پرکاش پستول لئے وجے کی طرف بڑھ رہا ہے اور وجے بندوق اٹھائے واپس جانے کے لئے کہہ رہا ہے دوسری طرف دولت سنگھ کھڑا ہے۔ جس بچے کی باتوں سے متاثر ہو کر دولت سنگھ نے ہاتھ سے بندوق چھوڑ دی تھی اسی کی جان بچانے کے لئے وہ رائفل لئے کھڑا ہے۔ اس کی رائفل سے گولی نکلتی ہے اور باپ کے ہاتھوں بیٹے کا خون ہو جاتا ہے دولت سنگھ نے کبھی پرکاش کے باپ کا خون کیا تھا آج پرکاش کی جان بچانے کی خاطر اس نے اپنے بیٹے کو گولی مار دی۔ کہانی کا یہ جذباتی خاتمہ اچھا ہے اور اس کی فلم بندی بھی اچھے انداز میں کی گئی ہے۔ وجے اپنے باپ سے کہتا ہے کہ اس کی بندوق میں گولیاں نہیں تھیں وہ پرکاش کو صرف اس لئے دھمکی دے رہا تھا کہ دولت سنگھ اس پر گولی چلائے اور اس طرح اپنے باپ کے ہاتھوں مر کر وہ اپنے خون سے اس کا کلنک دھو دے جس نے اس کی اور اس کے باپ کی زندگی کو جہنم بنا رکھا تھا ۔ واقعی وہ کلنک مٹ جاتا ہے اور وجے کا بیٹا ایک قابل پولیس آفیسر بن کر اپنے باپ دادا کا نام روشن کرتا ہے۔

فلم کی کمزور کہانی کو رام کیلکر کے اسکرین پلے نے کسی حد تک دلچسپ بنا دیا ہے۔ تیز رفتار اسکرین پلے کی وجہ سے تماشائی واقعاتی حماقتوں کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ ہدایت کار سریندر موہن نے اسکرین اور کرداروں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ وجے جب اپنے اسکول کے ساتھیوں سے کہہ دیتا ہے کہ اس کا باپ جیل کاٹ رہا ہے تو پتہ نہیں کہ اس نے گاؤں والوں سے یہ بات کیسے چھپائی کہ اس کا باپ جیل سے رہا ہو کر گاؤں پہنچا ہے۔ پھر گاؤں والے اس بات کو کیسے نظرانداز کر دیتے ہیں کہ دولت سنگھ نے نیکی اور سچائی کا راستہ اپناتے ہوئے خود کو پولیس کے حوالے کیا اور اپنے کئے کی سزا پائی تھی۔ کہانی میں حقیقت پسندی سے کم اور انتہا پسندی سے زیادہ کام لیا گیا ہے جس کی وجہ سے فلم بحیثیت مجموعی کوئی تاثر نہیں چھوڑتی۔ راہی معصوم رضا کے مکالموں نے فلم کے کمزور پہلوؤں کو سہارا دینے کی ناکام کوشش کی ہے موسیقی فلم کا ایک اور کمزور پہلو ہے جس کے ذمہ دار کلیان جی آنند جی ہیں۔ اداکاری کے اعتبار سے فلم میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے۔ تمام اداکاروں نے اپنے چھوٹے بڑے کرداروں کو نبھایا ہے پر ان کی اداکاری فلم کی جان ہے۔

نئی اداکارہ پریہ درشنی نے بھی اچھا کام کیا ہے۔ شاہد بجنوری کے ایک گانے محمود اور جانی وسکی پر جو تیسری جنس کی صورت میں پیش ہوتے ہیں نئے ڈھنگ سے فلمایا گیا ہے بشرطیکہ آپ کا ذوقِ سلیم اسے پسند کرے؟ ظاہر ہے کہ فلم ساز آپ کی پسند کا نہیں عوام کی پسند کا خیال کرتا ہے۔ اور اس نے یہ فلم اسی نکتہ نظر سے بنائی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ آپ کو ایسی فلم دیکھنی چاہئیے یا نہیں ——؟ ■

بقیہ: سلسلہ "جلیس رک جاؤ" صد ۱۲ سے آگے

آن میں اتنا ڈسپلن کہاں سے آگیا کہ ایک ایک لمحے کا حساب کرنے بیٹھ گئے!

مجھ سے ملاقات ہوتی تو میں کہتا جلیس! رک جاؤ، زندگی آگے بہت پڑی ہے۔ ابھی تو قلم کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی۔ کیوں جلدی کر رہے ہو۔ یقین کرو کوشش مارشل نہیں ہوگا۔ یہ ہم سب کا ذمہ! ■■

[illegible]

ایک پسماندہ علاقے یا ایک ترقی پذیر ریاست کی تیز رفتار ترقی کے لیے برقی قوت کا فروغ ایک لازمی اور اولین ضرورت ہے۔ کتہ گوڑم مرحلہ نمبر۔ ۴ کی ۱۱۰ میگاواٹ والی پہلی یونٹ کے حال ہی میں چالو ہو جانے سے ریاست میں برقی کی تنصیبی صلاحیت ۱۲۲۸ میگاواٹ ہوگئی ہے۔

ناگرجناساگر اور سری سیلم ہائیڈرو الکٹرک اسکیمات کی عاجلانہ تکمیل کے لیے سعودی عرب فنڈ سے بیرونی امداد کے حصول کی جو انتھک مساعی جاری تھیں وہ بارآور ہوگئی ہیں اور ۲ / جون ۱۹۷۷ء کو اسی سلسلے میں معاہدات پر دستخطیں کی جاچکی ہیں۔

تھرمل پاور کی پیداوار پر بھی اچھی خاصی توجہ مرکوز کی جارہی ہے۔ کتہ گوڑم تھرمل پاور اسٹیشن اسٹیج۔ ۴ "بی" توسیعی اسٹیشن کے پیش نظر ۱۱۰ میگاواٹ والی دو یونٹوں کی تنصیب ہے۔ پہلی یونٹ نے کام کرنا شروع کردیا ہے اور دوسری یونٹ ستمبر ۱۹۷۷ء سے کام شروع کر دے گی۔

ہماری ریاست میں ۲۷۲۲۱ مواضعات ہیں جن میں سے نصف کو مارچ ۱۹۷۷ء کے ختم تک برقیا لیا گیا ہے جو واقعی ایک سنگِ میل کی حیثیت والا کارنامہ ہے۔

آندھرا پردیش برقی قوت کی پیداوار کے سلسلے میں خود مکتفی بن جانے کی بھرپور مساعی کر رہا ہے تاکہ ریاست کے گوشے گوشے میں اُجالا ہو جائے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش، حیدرآباد

No. 19/77-78/A


زندہ طلسمات
گھر اور سفر کا ساتھی
زندہ طلسمات
ZINDA TILISMATH
MUST BE IN EVERY HOUSE
Trade Mark 577
Registered No. 118
بدہضمی، قے اور متلی کے لئے
زندہ طلسمات ہر گاؤں اور ہر شہر میں ملتا

حضرت جوش ملیح آبادی کی

تازہ ترین رباعیات

اندرون صفحات پر



March

ترتیب

★ سرورق

ہندوستان کے قابلِ فخر پینٹر سعید بن محمد نقش نے "ناخن کے پتوں" میں ایسے جادوئی کرتب سے جو زندگی کو زندگی بخشتے ہیں، سرورق کی تصویر میں "یکجائی اور رانی" تنہائی اور عشق و محبت کی غمازی کرتے ہیں۔ ••

... سال
... اشاعت علمی، ادبی اور تہذیبی

پونم

(۱۴)
(۳) مارچ ۱۹۷۸ء

زرِ سالانہ : (۱۵) روپے
لائبریریز کیلئے : (۲۰) روپے
بیرونی ممالک سے : (۲۵) شلنگ

ایڈیٹر :
ناصر کرنولی ایم اے (عثمانیہ)

خط وکتابت کا پتہ :
ماہنامہ پونم
16-7-300/1
... پورہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴

○

ماہنامہ پونم میں شائع ہونے والے تمام مضامین میں نام، واقعات، کردار اور مقامات فرضی ہوتے ہیں، ان سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔ جس کے لئے ایڈیٹر ... اور پبلشر پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی

طباعت
... پریس چھتہ بازار حیدرآباد

روشن مستقبل

آندھرا پردیش شیڈولڈ ٹرائبس کارپوریشن، گریجن کوآپریٹیو کارپوریشن، گریجن ڈیولپمنٹ ایجنسی اور انٹگریٹیڈ ٹرائبل ڈیولپمنٹ ایجنسی کی تشکیل کی بدولت ریاست آندھرا پردیش جائز طور پر یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ قبائیلیوں کی ترقی کے لیے ایک مستحکم ادارہ جاتی بندوبست فراہم کرنے کے معاملے میں وہ ملک کی اوّلین ریاست ہے

یہ ریاست اس بات پر فخر کرسکتی ہے کہ اس نے پہاڑوں کی آغوش میں پرورش پانے والے اپنے باشندوں کو ایک نیا معاشی نظام عطا کیا ہے۔ تیسرے منصوبے میں قبائلی بہبود کے لیے اخراجات کی گنجائش ۱ر۸۰ کروڑ روپیے تھی جو بڑھ کر پانچویں منصوبے میں ۴۵ر۶۵ کروڑ روپیے ہوگئی ہے۔

منصوبہ جاتی اسکیمات، زراعت، افزائش مویشیاں، برقی، چھوٹی آبپاشی اور تعلیم سے متعلق سرگرمیوں پر مرکوز ہیں۔ آج ایسی طاقتیں فتحمند ہیں جو ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ قبائیلیوں کو ان کی اپنی دقیانوسی دنیا سے نکال کر تابناک ماحول میں لایا جارہا ہے۔

ایک روشن مستقبل ان کے انتظار میں ہے

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

NO .37/77-78
LETTER NO: ADVT/C4/MAR 78/290
Dt 9-2-78

ہاں مشغلۂ جام و سبو جاری ہے
اب تک وہی ہم یا و ہو جاری ہے
کھاتا ہے کچھ انسان سے تکرّہ ایسی
ہر دین کے ماتھے سے لہو جاری ہے

٥

انسان کی جس قدر بھی طرّاری ہے
بس وقت گذارنے کی بیماری ہے
افسوس کہ بے معرفتِ رازِ حیات
جینا کتنی شدید بے کاری ہے

٥

مست و سرشار ہیں اُمنگیں اب تک
رقصاں ہیں جوانی کی ترنگیں اب تک
کوندے خوبانِ سیم تن ہیں صد شکر
بھرتا پھرتا ہوں میں شلنگیں اب تک

٥

سینے میں جوانی ہو تو پیری کیسی
ہر رات ہے لیلائی تو ہر دن قیسی
پائل کی جھنک ہو اور ساربے گا ما
انبوہ مہ و سال کی ایسی تیسی

٥

اے صاحبِ تاج و تخت، شاہِ ذی جاہ
یہ نشّہ، یہ بے خودی، عیاذاً باللہ
کیا آدم و حوّا کا نہیں ہے فرزند
یہ سوختہ جاں، گدائے بے کفش و کلاہ

٥

ہر یاس کے غار میں ہیں گلہائے امید
ہر قفل کے زنداں میں پرافشاں ہے کلید
چٹکی سے جو ایک ذرّہ مَسلا ہم نے
دیکھا کر تحرک رہے ہیں لاکھوں خورشید

٥

جوشؔ ملیح آبادی

تازہ ترین رُباعیاں

٥

ذرّات پہ ہے لعل و گہر کا دھوکا
ہر جلوہ ہے اک رقصِ شرر کا دھوکا
جب سطحِ مشاہدے کی بدلی تو کھلا
آفاق تمام ہے نظر کا دھوکا

٥

کہتا ہے مجھے بزرگ، ناداں خاموش
رگ رگ میں ہے آمدِ جوانی کا خروش
ہیں تمام تذا پیر نہیں ہوں اب تک
میری [illegible] میں جھنک رہی ہے اے جوشؔ

٥

ممنوں کی کٹھریا سے مرا انگ نہ ٹوہ
ہے رام چھری پھیر کے جیون کو نہ موہ
دھرتی بولا گئی گگن ڈوب گیا
نجروں کا تڑکوا یہ گیا کا اکھوہ

٥

تاریخ نے کی عقدہ کشائی کیا کیا
ماضی نے جھلک اپنی دکھائی کیا کیا
گذرا جو بصد شکوہ سلطان کا جلوس
شاعر کی گدائی مسکرائی کیا کیا

٥

ذہنِ مشرق ہے دورِ وحشت میں اسیر
آنکھیں بے آب، خال و خط بے تنویر
کس طرح بیٹھے بنائے ایوانِ دماغ
چہرے اب تک نہیں ہوئے ہیں تعمیر

٥

گستاخ ہیں یہ بھکنڈر، گرا دو ان کو
یہ عرش پہ خندہ زن ہیں، ڈھا دو ان کو
خود صاحبِ گھر کا یہ ہیں اک طنزِ جلی
یہ جھونپڑیاں، اے جلا دو ان کو

ہمارے منصوبوں کو کامیاب ہونا چاہیئے

ہمارے پانچسالہ منصوبوں کا مقصد فیصلہ کُن انداز میں ملک کے مستقبل کی تشکیل جدید عمل میں لانا ہے برسوں سے ہمارے منصوبے ملک کی معاشی ترقی کی رفتار کو تیز تر کرتے آرہے ہیں۔ آندھرا پردیش میں قومی تعمیر کی سرگرمیوں پر ان منصوبوں نے پائیدار اثرات مرتب کیئے ہیں۔

معاشی ترقی کے معاملے میں پانچواں منصوبہ سب سے زیادہ امید افزا ثابت ہوا ہے۔ منصوبے کے تحت اخراجات کی گنجائش سال ۷۴-۱۹۷۳ میں ۹۳ کروڑ روپیے تھی جو بڑھ کر ۷۵-۱۹۷۴ میں ۱۴۸ کروڑ روپیے۔ ۷۶-۱۹۷۵ میں ۲۰۳ کروڑ روپیئے۔ ۷۷-۱۹۷۶ میں ۲۹۸ کروڑ روپیے اور ۷۸-۱۹۷۷ میں ۳۸۲ کروڑ روپیے ہوگئی ہے۔ اندازہ ہے کہ سال ۷۹-۱۹۷۸ میں منصوبے کے تحت فراہم کی جانے والی گنجائش ۴۵۰ کروڑ روپیوں تک پہنچ جائے گی۔ اس طرح سال ۷۹-۱۹۷۸ میں منصوبہ جاتی اخراجات کی رقم پورے چوتھے منصوبے کی رقم کے تقریباً مساوی ہوجائے گی جو ۴۹۹ کروڑ روپیے تھی۔ پانچویں منصوبے کی پوری مدت کے دوران ۱۴۸۰ کروڑ روپئے سے زائد رقم خرچ ہوگی جو چوتھے منصوبے کے اخراجات سے تین گنا زیادہ ہے۔

ہمارے منصوبوں کی کامیابی کی صورت میں ہی

عوام خوشحالی سے ہمکنار ہوسکتے ہیں۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش، حیدرآباد

No 38/77-78

LETTER No: ANT/C4/ MAR '78/280 Dt 9.2.1978

کچھ یادیں کچھ باتیں
مولانا دریابادی کی

گہرا پُرسکون رواں دواں دریا۔ نام پایا مولانا دریابادی کا۔ اکثر لوگ شہر اور ملک کی نسبت سے جانے پہچانے جاتے ہیں لیکن یہاں شخصیت نے شہر کو مشہور و معروف کر دیا۔ کسی نے مولانا دریابادی کہا تو ذہن مولانا دریابادی مدیر "صدق جدید" ہی کی طرف گیا۔ ایک شہر دریاباد ہی مشہور نہیں ہوا بلکہ "صدق جدید" اور "سچ" نے بھی آپ کے ہاتھوں نام پایا۔ آپ ایسا پارس تھے جسے ہاتھ لگایا وہ سونا تھا۔ قیمتی اور انمول بھی۔ لیکن وہ خود پتھر کی تعریف میں نہ آتا تھا بلکہ اس کی صفت ان کی ذات و شخصیت کا ایک حصہ تھی، اور وہ خود سونا تھے اور کندن بھی۔

مطالعہ کا شوق ہوا اور جب سچی باتیں پڑھیں تو سچ ملتے نہ صرف "سچ" اخبار پڑھا بلکہ ان کا ہر مضمون چاٹ گئے۔ ہر کتاب خریدی ان کی طرز تحریر میں بڑا عجیب جادو تھا۔ پہلے لفظ اور سطر پہ نظر پڑی، دل و دماغ اس کی نذر ہو گئے۔ زبان بڑی آسان اور رواں دواں پاک و شفاف چشمہ، سمجھ میں صاف آتی تھی فصیح تھی [illegible] بلا کا اثر ہوتا تھا۔

اس لئے بلیغ بھی تھی اور سچی باتیں نہ صرف سچی اور دل کو لگنے والی تھیں بلکہ ان میں جو طنز لطیف ہوتا تھا وہ اپنی آپ مثال تھا۔ بقول ڈاکٹر مسعود حسین خان صاحب رشید احمد صدیقی اسے "چٹکی" سے تعبیر کرتے تھے کتنا موزوں اور برمحل لفظ استعمال کیا تھا۔

جسے زیادہ سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے اس کے بارے میں بہت کچھ، ممکن ہو تو سب کچھ جاننے کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے۔ ہم نے سنا ہے اور آگے چل کر مولانا دریابادی کے قلم سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی کہ آپ پر الحاد کا بھی بھرپور حملہ ہوا تھا۔ جس کے وہ کچھ دن شکار رہے اللہ دلوں کا حال جاننے والا ہے اور پھر اس کی مصلحتیں وہ خود جانے۔ بظاہر محمد علی جوہر اور اکبر الہ آبادی کی بے باک و نیک صحبتیں، مثنوی مولانا رومؒ، مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی اور قرآن کا مطالعہ رنگ لایا اور ان تمام سے افضل ان کے والد محترم عبدالقادر مرحوم کی خانہ کعبہ میں اس مرض سے شفایابی کے لئے دعا تھی جو قبول ہوئی۔ دل کی بستی الحاد سے پاک اور تصوف کی طرف مائل رہی اور زبان نے یہ شعر ادا کیا ہے

ایک عمر کی گمراہی اک عمر کی سرتابی
جز تیری غلامی کے آخر نہ مفر پایا

مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ہاتھ پہ بیعت کی، پھر حضرت اشرف علی تھانوی جیسے بزرگ کے ہو رہے۔ اب عجیب عالم تھا۔ ایک فلسفی، ایک مذہبی عالم تھا۔ راقم نے شوکت تھانوی مرحوم کے ایک مضمون میں پڑھا تھا کہ آپ کے ہاتھ پہ الحاد کا کچھ نقش، نقش کی صورت میں نقش یا گڈا ہوا تھا۔ مومن کو اب کب گوارا تھا کہ یہ نقش باقی رہے اور یہ بھی ناگوار تھا کہ بے ہوشی کے عالم میں آپریشن کے ذریعہ نکال پھینکا جائے کیونکہ اس صورت میں نشہ آور دوا کا استعمال ضرور ہوتا اور یہ بات ایک مومن کی شان کے خلاف تھی درد برداشت کرنا منظور تھا۔ عالم بے ہوشی میں آپریشن کرانا گوارا نہ تھا۔ آخر عین عالم ہوش میں درد کی ساری ٹیسوں کے ساتھ یہ آپریشن ان کے لئے قابل قبول تھا

آپ کسی بھی ادبی اور مذہبی مسئلے پہ کسی بھی بڑے سے بڑے عالم و ادیب سے اختلاف فرماتے، کبھی نرمی سے، کبھی شدت سے، اگر وہ معاملہ اخلاق و مذہب کے دائرے کے منافی ہوتا۔

مولانا مودودی کی بعض باتوں پر وہ برابر اختلاف کرتے، وہ لوگ جو تھے

...تے تھیں، مگر پھر اچھی بات یہ کہ جلد مولانا کے سر رہتے۔ دعائیں دیتے، معافی ...کال کر رکھ دیا ہو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ...امیت کے وہ معترف تھے۔ جب وہ ...ریۂ ہند کے صدر چنے گئے تو ہر اخبار میں ...ں بیوی کا فوٹو چھپا۔ مولانا کو پردہ ...خاتون کی بے پردگی پسند نہ آئی۔ سخت ...تراض فرمایا۔

شوکت تھانوی سے مشفقانہ و بزرگانہ ...سم تھے۔ بقول شوکت تھانوی آپ ہی کے ...شورے سے عبدالرؤف صاحب عباسی نے ...سالہ کا ئنات شوکت تھانوی کی ادارت ...ں نکالنا شروع کیا۔ جب پتہ چلا کہ تبسم ...ے ان کا قدم خراماں خراماں اداکاری کے میدان ...ں بڑھ رہا ہے تو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

...لعت محمود کے تعلق سے بھی انھیں یہ ...سند نہ تھا کہ لکھنؤ کے ایک شریف خاندان کا ...چشم و چراغ گانے کا پیشہ اپنائے۔ مذہب ...کے معاملے میں جس بات کو برا سمجھتے تھے۔ اس ...کے اظہار میں مروّت نہ برتتے تھے۔

سعادت حسن منٹو بڑے افسانہ نگار تھے۔ اپنی افتادِ طبیعت کے ہاتھوں، بڑی تکلیفیں اٹھائیں لیے چاہے سنے۔ مگر مولانا منٹو کو کبھی بے چارہ نہ سمجھا۔ آپ نے ان کی موت پر جب یہ سنا کہ آخری وقت بھی پانی کے بجائے شراب سے پیاس بجھائی اور استعمال فرمایا تو سخت ملامت کی۔ ایک مومن اور ام الخبائث کا استعمال، وہ بھی وقتِ آخر؟ بھلا کیسے برداشت کرتے مولانا؟ آخری وقت میں بھی اپنی انفرادیت کا لوہا منوانے کا یہ طریقہ بالکل غلط ہی سہی، لیکن منٹو کو حق تھا۔ مگر بات مذہبی طور پر یقیناً غلط تھی۔ مولانا کے اعتراض پر مولانا چراغ الدین حسرت (سندباد جہازی) سخت معترض ہوئے۔ منٹو کی چاہ یا خاطر کتنے اعتراض مولانا کی ذات پر کر بیٹھے۔

اسی طرح لیکن اپنی نوعیت کا الگ یا انوکھا اعتراض مدیر "تجلی" نے بھی کیا تھا، یعنی مولانا کی زبان پر، اس ناچیز کے خیال میں مولانا نادر یا بادری کی زبان کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

مولانا کے بارے میں ایک بات میں نے علیگڑھ میں سنی تھی۔ راوی نے کہا کہ مولانا نے اردو کے ایک مشہور و معروف نقاد اور پروفیسر کے متعلق فرمایا تھا کہ اردو کے متعلق لکھتے لکھتے انھیں اردو لکھنی آگئی ہے[1] یہ اعتراض غلط ہی سہی لیکن اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا کو اپنی زبان پر بجا ناز تھا۔ آپ نے ذاکر حسین خان صاحب کے ایک خط میں لکھا تھا کہ:

"ایسے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں جن کا طرزِ تحریر خالص اردو ہو۔ اور ان کے جملوں کی نحوی ترکیب صحیح ہو۔ آج کے نوجوان ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی میں سوچتے ہیں اور اردو میں لکھتے ہیں۔"

کتنے ہی نوجوان ایسے تھے جو ہر کٹھن مسئلہ کے لئے آپ سے رجوع ہوتے تھے اور ہر مسئلہ پانی ہو جاتا۔ گتھی سلجھ جاتی اور فلسفہ جیسے ادق موضوع کو پانی کرنے والے ادیب کے لئے ایسے مسائل واقعی پانی ہی تھے۔

میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ خطوط کے جواب دینے میں مولانا نے کبھی مایوس نہ کیا یہی حال رشید احمد صدیقی اور سید احتشام حسین کا تھا۔ رہے نام اللہ کا۔ یہ دونوں بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا کو جب بھی راقم نے کوئی خط لکھا فوراً جواب ملا۔ جبکہ تجربہ تو یہ بتلاتا تھا کہ بڑے نام، حاتم کم، کنجوس زیادہ ہوتے ہیں۔ اور ممکن ہے کوئی اور عملی مجبوری بھی ہو۔

مولانا بدخط تو نہ تھے مگر آپ کا خط پڑھنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ شوکت تھانو

---

[1] پروفیسر سید احتشام حسین نے جب "اردو کی کہانی" لکھی تو مولانا نے تبصرہ کیا اور لکھا کہ "پروفیسر احتشام حسین اردو میں لکھتے لکھتے اب اردو بھی لکھنے لگے ہیں" ممکن ہے بات اس طرح گڈمڈ یا الجھ کر رہ گئی ہو۔ لیکن ممکن ہے سخن پروفیسر احتشام کی طرف نہ تھا کسی اور کی طرف، دروغ برگردنِ راوی۔

بش محل میں ٹھیک ہی لکھا ہے۔
لکھیں گے بڑی سی بڑی بات اور
ر گا وہ محل سے چاول پر قل ھو اللہ
حاق ہے۔
ریاست کرناٹک میں آپ کے بیسیوں
ں گے لیکن میں یہاں مولانا کے جتنے
طا اس حقیر کے برادرِ عزیز نعیم اقبال
زم دوست منظور احمد کے نام نامی ہے
ان کے پس منظر کے ساتھ نقل کئے دیتا
۔ کیوں کہ کل کلاں کو کوئی آپ کے
ر کو اکٹھا کرنا چاہے تو آسانی ہو۔ آپ
خط کا ہر لفظ 'سطر' مختصر' معتبر'
درقیمتی سرمایہ ہے سلہ اس لئے
ہر حال کتابی صورت میں شائع ہو جانا
۔

فاروقیہ ہائی اسکول اور ہائر سکنڈری
کا قیام عمل میں آیا تو اس کے سالنامے
رق کے لئے میں نے چند بزرگوں کو پیغام
منامیں نظم و نثر کے لئے درخواست کی۔
زرگوں نے مجھ پر احسان فرمایا اور
اِر ساغر کھینچ کی زحمت نہ دی ان میں
رست عبد الماجد دریا بادی' رشید احمد

صدیقی' ڈاکٹر ذاکر حسین۔ آثر لکھنوی'
گوپال متل' آل احمد سرور' سید احتشام حسین
سید محمد ٹونکی' عبد الوہاب بخاری وغیرہ
کے نام تھے۔ اور نوجوان دوست واحباب
میں محمود ایاز' مخمور سعیدی' شہاب جعفری
نعیم اقبال اور حسنی سرور۔

۱۵ر نومبر ۱۹۶۳ء کا لکھا مولانا کا
نوازش نامہ چلا آیا۔

مکرم بندہ۔ السلام علیکم
آپ نے جو حالات لکھے[۱] ان کے بعد
آپ کے مدرسہ فاروقیہ کے پرچے فاروق
کے حق میں بجز مبارکباد اور دعائے خیر
کہے اور وہ ہی کیا جاتا ہے۔ اللہ ہر طرح
کامیاب و مبارک کرے۔

جواب میں اتنی تاخیر بالکل غیر ارادی
طور پر ہو گئی۔ عفو خواہ[۲]

عبد الماجد

انجمن اشاعتِ اردو میسور کے ایک
ادبی اجلاس میں اقبال کا ایک فکر انگیز
شعر زیرِ بحث رہا۔ اس کے متعلق میں نے
مولانا دریا بادی کو بھی خط لکھا تو ۲۰ر اکتوبر
۱۹۶۷ء کو جواب مرحمت فرمایا۔

مہربان بندہ!

وعلیکم السلام

اس وقت وطن سے باہر سفر میں ہوں۔
وہیں سے یہ جواب لکھ رہا ہوں۔ حنیف شریف
کی شرح' جو آپ نے کی ہے۔ گو بظاہری نظر
میں یہ صحیح ہی معلوم ہوتی ہے۔ خدا معلوم
شارح اقبال یوسف سلیم چشتی نے کیا شرح
اس کی کی ہے۔
پنڈت جی[۳] نے نفسِ روایات تو صحیح
لکھی ہے۔ حدیث۔ تفسیر کی کتابوں میں اس
کا پڑھنا یاد ہے لیکن نام عثمان بالکل
خیال میں نہیں آ رہا۔ جن جن صاحبوں[۴]
نے سلام کہلوایا ہے ان سب سے جواب میں
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

والسلام۔ عبد الماجد

ایک دن خواجہ محمد شفیع کو پڑھ رہا
تھا۔ "چاند کا دھبہ" رقم کیا تھا۔ میں نے
مولانا دریا بادی اور رشید احمد صدیقی کو
لکھا کہ میں نے یہ لفظ پہلی بار پڑھا ہے
یہ ٹکسالی ہے؟ لکھنو اور دلی میں کہاں
زیادہ بولا جاتا ہے۔
آپ نے ۱۶ر مارچ ۱۹۷۱ء کو تحریر فرمایا۔

۱ے اس طرح اللہ کرے حکیم عبد القوی صاحب کے ہاتھوں مولانا کی کتاب "ہم عصر" اور خود نوشت سوانح چھپ جائے۔
۲ے ناچیز نے لکھا تھا کہ مسلمانوں اور اردو والوں کا کوئی اپنا ہائی سکول نہ تھا جہاں ہم نصابی اور حکومت کی مقررہ کردہ پالیسی کے ساتھ ساتھ اپنی زبان اور مذہبی تعلیم کا بھی بندوبست کر سکیں۔
۳ے اس لفظ نے کافی شرمندہ کیا لیکن کسی کی بڑائی اور عظمت دل میں گھر کر گئی
۴ے راقم نے اسے اقبال کا کلام سمجھا اور مولانا کے تحریر کیا تھا۔ کیونکہ کسی نے قرآن اور کسی نے پنڈت جی ... سے تعبیر کیا تھا۔
(باقی حاشیہ آگے صفحہ پر)

عزیزم ! وعلیکم السلام
"محور" ابھی ابھی میرے علم میں پہلی بار
آیا لیکن خواجہ شفیع جب یہی تعلیم مان رہے ہیں
تو ضرور صحیح ہوگا۔ گو لاکھ قلیل الاستعمال ہو
فاروقیہ کا ہائر سکنڈری اسکول اور
پھر کالج بن جانا ' اللہ آپ سب لوگوں کو
مبارک کرے ۔ والسلام
دُعاگو ۔ عبدالماجد

برادرِ عزیز نعیم اقبال مولانا کے
مداحوں میں ہیں ۔ انھوں نے ایک افسانے میں
آنکھ کے دان دینے کی بات پہلی بار لکھی تھی ۔
اس پر رسالہ "خیال" میں خوب بحث چلی
تھی ۔ اس کے جواب میں نعیم اقبال اس دان
اور آپریشن کی ساری تاریخ تفصیل سے لکھی
تھی لیکن ان کے دل و دماغ میں ایک اور بات
بھی تھی جو انھیں پریشان کئے ہوئے تھی ۔
مولانا کے لکھا ۔

محترم قبلہ ! السلام علیکم
میں چاہتا ہوں کہ اپنی آنکھیں بینک
(EYE BANK) کی نذر کروں ۔ میں یہ
وصیت کر چھوڑ جانا چاہتا ہوں کہ میرے
مرنے کے بعد میری آنکھیں نکال لی جائیں
تاکہ دوسرے کے کام آئیں ۔
مجھے ایک خیال ستا رہا ہے جس کی
وضاحت چاہتا ہوں ۔ اس سلسلے میں مجھے
کسی کا جواب مطمئن کر سکتا ہے تو وہ صرف
آپ کا ۔ لہذا آپ کو تکلیف دے رہا ہوں
کہتے ہیں کہ روح کے پرواز کرنے
کے بعد ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی چاہئے جس
سے میت کو کوئی تکلیف ہو ۔ کیا اس صورت
میں آنکھوں کا نکالنا ' میت کو تکلیف
دینے کے مصداق نہ ہوگا ؟ مگر نیک ارادے
اور وصیت کا لحاظ کرتے ہوئے آنکھیں
نکال لینے میں کیا کوئی قباحت ہے ؟
براہِ کرم تفصیل سے مجھے یہ جواب
دینے کی زحمت فرمائیے کہ کیا میری وصیت
اسلام کے کسی قانون کی خلاف ورزی تو نہ ہوگی !
خاکسار ۔ نعیم اقبال

۱۳ رجون ۱۹۶۹ء کو مولانا نے اس
خط کا جواب عنایت فرمایا ۔

کرم گستر ! وعلیکم السلام
آپ نے سوال سخت کر دیا اور میرے
لیے بصیرت کا [illegible] جن مسائل میں
مجھے اطمینانِ قلب یا شرحِ صدر ہو چکا ہے
ان کا جواب بے دھڑک دے دیتا ہوں لیکن
جن مسائل میں یکسوئی مجھے خود حاصل نہیں
اُن کے بارے میں بہت ہکا رکا ہوا ۔
تذبذب میں دیتا ہوں ۔
یہ مسئلہ ہی اتنا نازک و دشوار مسائل
میں سے ہے کہ موافقت و مخالفت دونوں
میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے ۔ بہرحال میں خود
اپنے لئے تو ایسی وصیت کو پسند نہ کروں گا ۔
اور احتیاط کا تقاضہ یہی ہے
عام علماء نے بھی سرے سے ناجائز
قرار دیا ہے ۔ والسلام
دُعاگو ۔ عبدالماجد

میرے عزیز ترین دوست محمد منظور احمد
سکریٹری مجلسِ ادب بنگلور سن ۱۹۶۱ء میں سخت
بیمار ہوئے ۔ اس بیماری نے دل و دماغ میں
عجیب و غریب وسوسے پیدا کر دیئے ۔ اس
سے بچنا مشکل ہو گیا تو مولانا دریابادی کے خط
لکھا ۔ دل و دماغ کی بات رکھی ۔ مولانا موصوف
نے ۲۹ رمئی ۱۹۶۱ء کو جواب خط سے اندیشے

---

۵ (حاشیہ صفحہ [illegible]) پنڈت سندر لال نے ہندی میں ایک کتاب بہ عنوان "حضرت محمدؐ" لکھی تھی ۔ جہالتِ عرب کی ایک مثال دیتے ہوئے لکھا تھا کہ عثمان نامی ایک شخص ایک مدت کے بعد سفر سے مطمئن لوٹا تو یہ دیکھ کر ندامت ہوئی اور بھائی بندوں نے طعنے دیئے کہ گھر میں لڑکی نے جنم لیا اور اب اس قابل ہوئی کہ گھٹنوں گھٹنوں چل رہی ہے ۔ عزت اور طعنوں تشنیع کا مارا باپ ' لڑکی کو زندہ دفن کرنے گڑھا کھودنے لگا ' ڈاڑھی کے بالوں میں مٹی لگی نظر آئی تو معصوم لڑکی نے بڑے پیار سے اپنے ننھے منے نازک ہاتھوں سے مٹی جھاڑی ۔ یہ دیکھ باپ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بے اختیار گرے

۶ پروفیسر سید نذیر احمد

طرات اور وسوسے دور کر دیجئے۔

کرم گستر، وعلیکم السلام

جب حقیقت شعوری طور پر بحمداللہ برقرار ہے تو گستاخی کا یہ واہمہ محض ایک وسوسۂ شیطانی ہے۔ اس پر لاحول پڑھ کر اپنے کام میں حسب دستور لگے رہیئے اور اس وسوسے پر اصلاً التفات نہ کیجئے۔ شیطان آپ کے غیر ملتفت پا کر مایوس ہو کر خود ہی خاموش ہو جائے گا۔ اس کی بابت التفات و توجہ کرنا ایک سفلہ کو منہ لگانا اور سر چڑھانا ہے۔

طویل تحریر کا مختصر موثر جواب بس یہی ہے۔ ہاں احتیاطاً ضعف اعصاب ضعف قلب کے طبی علاج جاری رکھیئے۔

والسلام

عبدالماجد

میرے ایک علم دوست، دوست جناب محمد اسحاق صاحب نے ایک دن مولانا مرحوم کی خدمت میں یہ خواہش، بذریعہ تحریر پیش کی کہ قرآنی نفسیات پر کوئی کتاب مولانا کے قلم سے نکلے۔ یہ ان پر اور بہت ساروں پہ احسان ہوگا۔ اس کام کے لئے آپ سے بہتر کوئی اور موزوں نظر میں نہیں آتا، آپ نے اس کا جواب صدق جدید میں مرحمت فرمایا۔ اس کا نفس مضمون کچھ یوں تھا۔ راقم الحروف نے لکھا ہے کہ قرآنی نفسیات پر بھی ایک کتاب لکھوں۔ جو یقیناً نوع انسان کو قرآن سے قریب لانے میں مفید ثابت ہوگی۔ یہ وقت کا اہم ترین اور بہتر کام ہے مگر میری عمر اور میری مصروفیات کی وجہ سے میں یہ کام کرنے سے مجبور ہوں، لہٰذا کوئی صاحب یہ کام کرنا چاہیں تو میں اس کام میں ان کی مدد ضرور کروں گا۔"

اس کے علاوہ کرناٹک کے اکثر ادبا و شعراء اپنے شعری و نثری مجموعے اور مدیران رسائل اپنے رسائل تبصرے کے لئے روانہ کرتے۔ طلباء اپنے مجلوں و سالناموں کے لئے پیغام کے خواہاں ہوتے۔ یہ ساری باتیں آپ سے عقیدت اور چاہت جتانے کی تھیں۔ آپ کی شخصیت ادبی، مذہبی اور صحافتی میدان میں لوہا منوا چکی تھی۔

جنھیں زیادہ چاہا جاتا ہے ان کے تعلق سے جدا ہونے کی بات نہیں سوچی جاتی۔ آدمی بیمار ہوتا ہے، بیماری کی دوا اور دعا کے ذریعے چنگا کرنا چاہتا ہے مگر بہر حال اور ایک دن وصال کا معین ہے

مولانا پر فالج کا حملہ ہوا۔ ان کے چاہنے اور پڑھنے والوں کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھ گئے۔ رو بصحت ہونے لگے۔ ہر ہفتہ بیمار کے قلم سے اپنی بیماری کی باتیں تحریر ہوتیں سچی باتوں کا کالم آپ کے قلم سے آہستہ آہستہ محروم ہونے لگا۔ اخبار سچ (۱۹۲۹ء) سے سچی باتیں منقول ہوتی رہیں۔ پھر آپ کے لائق داماد حکیم عبدالقوی صاحب نے اس کالم کو بہت حد تک سنبھال و نبھا لیا۔

ایک خبر صدق جدید میں حکیم عبدالقوی صاحب کے قلم سے بعنوان "شیخ معذوری" چھپی کہ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۷۶ء کی شب میں مدیر صدق جدید مولانا عبدالماجد دریابادی اچانک پلنگ سے اترتے ہوئے گر پڑے اور اس کے باعث ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ہڈی کا ایک ماہر معالج نے اپنی جگہ بٹھا کر مناسب بندش کر دی ہے"

اس خبر پر ماتھا ٹھنکا۔ اس عمر میں ہڈی کا ٹوٹنا آسان مگر جڑنا مشکل تھا۔ کچھ دنوں بعد ایک پریشان کن خبر نے مایوس کر دیا۔ تنفس کی شکایت بدستور تھی کہ دوبارہ فالج کا بھی حملہ ہوا۔ زبان گنگ، کان سماعت سے خالی دماغ ہوش سے خالی۔ تین دن پہلے بقول حکیم عبدالقوی صاحب خدا حافظ تو کہہ ہی دیا تھا پھر [illegible] کے معبود سے ملنے کی گھڑی آن پہنچی۔

۶ر جنوری ۱۹۷۷ء پنجشنبہ کا دن صبح سوا چار بجے ۸۵ سال کی عمر پا کر جنت الفردوس سدھارے

مسافر پردیس میں آخر کب تک رہے، اپنا اچھا برا نام چھوڑ جائے۔

ندوۃ العلماء میں حسب وصیت مولانا مرحوم علی میاں کے ہاتھوں نماز جنازہ کی ادائی کے بعد وطن دریاباد میں حافظ غلام نبی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور اپنے وطن میں اپنے مورث اعلیٰ حضرت آبکش علیہ رحمۃ کے مزار سے متصل مولانا آرام و سکون کی نیند کے مزے لینے لگے۔

مسافر بہت تھک گیا تھا، سو گیا، لیکن اس سونے اور نیند نے کتنے عقیدتمند چاہنے والوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ ●●

عزیزم ! وعلیکم السلام

"محور" میں مجھے میرے عم کا نام پہلی بار
آیا لیکن خواجہ شفیع صاحب بھی صحیح مان رہے ہیں
تو ضرور صحیح ہوگا۔ گو لاگ قلیل الاستعمال ہو
فاروقیہ کا ہائر سکنڈری اسکول اور
پھر کالج بن جانا، اللہ آپ سب لوگوں کو
مبارک کرے۔ والسلام

دعاگو ۔ عبدالماجد

برادر عزیز نعیم اقبال مولانا کے
مداحوں میں ہیں۔ انھوں نے ایک افسانے میں
آنکھ کے دان دینے کی بات پہلی بار لکھی تھی۔
اس پر رسالہ "خیال" میں خوب بحث چلی
تھی۔ اس کے جواب میں نعیم اقبال اس دان
اور آپریشن کی ساری تاریخ تفصیل سے لکھی
تھی لیکن ان کے دل و دماغ میں ایک اور بات
بھی تھی جو انھیں پریشان کئے ہوئے تھی۔
مولانا کو لکھا۔

محترم قبلہ ! السلام علیکم
میں چاہتا ہوں کہ اپنی آنکھیں بینک
(EYE BANK) کی نذر کروں۔ میں یہ
وصیت کر کے چھوڑ جانا چاہتا ہوں کہ میرے
مرنے کے بعد میری آنکھیں نکال لی جائیں
تاکہ دوسرے کے لئے کام آئیں۔
مجھے ایک خیال ستا رہا ہے جس کی
وضاحت چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے
کوئی کا جواب مطمئن کر سکتا ہے تو وہ صرف
آپ کا۔ لہذا آپ کو تکلیف دے رہا ہوں
کہتے ہیں کہ روح کے پرواز کرنے
کے بعد ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی چاہئے جس
سے میت کو کوئی تکلیف ہو۔ کیا اس صورت
میں آنکھوں کا نکالنا، میت کو تکلیف
دینے کے مصداق نہ ہوگا؟ مگر نیک ارادے
اور وصیت کا لحاظ کرتے ہوئے آنکھیں
نکال لینے میں کیا کوئی قباحت ہے؟
براہ کرم تفصیل سے مجھے یہ جواب
دینے کی زحمت فرمائیے کہ کیا میری وصیت
اسلام کے کسی قانون کی خلاف ورزی تو نہ ہوگی؟

خاکسار ۔ نعیم اقبال

۱۳؍جون ۱۹۶۹ء کو مولانا نے اس
خط کا جواب عنایت فرمایا۔

کرم گستر ! وعلیکم السلام
آپ نے سوال سخت کر دیا اور میرے
لئے بصیرت کا دعویٰ لعلہ۔ جن مسائل میں
مجھے اطمینان قلب یا شرح صدر ہو چکا
ان کا جواب بے دھڑک دے دیتا ہوں
جن مسائل میں یکسوئی مجھے خود حاصل نہیں
ان کے بارے میں بہت ہچکچاتا ہوا
تذبذب میں دیتا ہوں۔
یہ مسئلہ بھی اتنا نازک و دشوار مسائل
میں سے ہے کہ موافقت و مخالفت دونوں
میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال میں خ
اپنے لئے تو ایسی وصیت کو پسند نہ کروں گا
اور احتیاط کا تقاضہ یہی ہے
عام علماء نے بھی سرے سے ناجائز
قرار دیا ہے۔ والسلام

دعاگو ۔ عبدالماجد

میرے عزیز ترین دوست محمد منظور ا
سکریٹری مجلس ادب بنگلور سن ۱۹۶۱ء میں
بیمار ہوئے۔ اس بیماری نے دل و دماغ
عجیب و غریب وسوسے پیدا کر دیئے۔
یہ جب مشکل ہو گیا تو مولانا دریابادی کو
لکھا۔ دل و دماغ کی بات رکھی۔ م
نے ۲۹؍مئی ۱۹۶۱ء کو جواب خط

---

۵ (حاشیہ صفحہ کا) پنڈت سندرلال نے ہندی میں ایک کتاب بہ عنوان "حضرت محمدؐ" لکھی تھی۔ جہالت عرب کی ایک مثال د
ہوئے لکھا تھا کہ عثمان نامی ایک شخص ایک مدت کے بعد سفر سے مطمئن لوٹا تو یہ دیکھ کر حیرت
اور بھائی بندوں نے طعنے دیئے کہ گھر میں لڑکی نے جنم لیا اور اب اس قابل ہوئی کہ گھٹنوں گھٹنوں چل
ہے۔ غیرت اور طعنوں تشنیع کا مارا باپ، لڑکی کو زندہ دفن کرنے گڑھا کھودنے لگا، ڈاڑھی کے بالوں میں مٹی
لڑکی نے بڑے پیار سے اپنے ننھے منے نازک ہاتھوں سے مٹی جھاڑ دی۔ یہ دیکھ باپ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ

پروفیسر سید نذیر احمد

خطرات اور وسوسے دور کر دیجئے۔

کرم گستر۔ وعلیکم السلام

جب حقیقت شعوری طور پر بحمد اللہ بدستور قائم ہے تو گستاخی کا یہ وا ہمہ محض ایک وسوسۂ شیطانی ہے۔ اس پر لاحول پڑھ کر اپنے کام میں حسب دستور لگے رہیئے اور اس وسوسے پر اصلاً التفات نہ کیجئے۔ شیطان آپ کے غیر ملتفت پا کر مایوس ہو کر خود ہی خاموش ہو جائے گا۔ اس کی بابت التفات و توجہ کرنا ایک سفلہ کو منہ لگانا اور سر چڑھانا ہے۔

طول طویل تحریر کا مختصر موثر جواب بس یہی ہے۔ ہاں احتیاطاً ضعف اعصاب ضعف قلبی کے طبی علاج جاری رکھیئے۔

والسلام

عبد الماجد

میرے ایک علم دوست، دوست جناب محمد اسحاق صاحب نے ایک دن مولانا مرحوم کی خدمت میں یہ خواہش بذریعہ تحریر پیش کی کہ قرآنی نفسیات پر کوئی کتاب مولانا کے قلم سے نکلے۔ یہ ان پر اور بہت ساروں پر احسان ہوگا۔ اس کام کے لئے آپ سے بہتر کوئی اور موزوں نظر میں نہیں آتا۔ آپ نے اس کا جواب صدق جدید میں مرحمت فرمایا۔ اس کا نفس مضمون کچھ یوں تھا۔ راقم الحروف نے لکھا ہے کہ قرآنی نفسیات پر میں ایک کتاب لکھوں۔ مجھے یقین ہے کہ انسان کو قرآن سے قریب لانے میں نفسیات مدد کرے گی۔ یہ وقت کا اہم ترین اور بہتر کام ہے۔ مگر میری عمر اور میری مصروفیات کی وجہ سے میں یہ کام کرنے سے مجبور ہوں، چنانچہ کوئی صاحب یہ کام کرنا چاہیں تو میں اس کام میں ان کی مدد ضرور کروں گا۔"

اس کے علاوہ کرناٹک کے اکثر ادبا و شعراء اپنے شعری و نثری مجموعے اور مدیران رسائل اپنے رسائل تبصرے کے لئے روانہ کرتے۔ طلباء اپنے مضمونوں و سالناموں کے لئے پیغام کے خواہاں ہوتے۔ یہ ساری باتیں آپ سے عقیدت اور چاہے جانے کی تھیں۔ آپ کی شخصیت ادبی، مذہبی اور صحافتی میدان میں لوہا منوا چکی تھی۔

جنھیں زیادہ چاہا جاتا ہے اُن کے تعلق سے جدا ہونے کی بات نہیں سوچی جاتی۔ آدمی بیمار ہوتا ہے، بیماری کی دوا اور دُعا کے ذریعے چنگا کرنا چاہتا ہے مگر بہر حال اور ایک دن وصال کا معین ہے مولانا پر فالج کا حملہ ہوا۔ ان کے چاہنے اور پڑھنے والوں کے ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھ گئے۔ رو بصحت ہونے لگے۔ ہر ہفتہ بیمار کے قلم سے اپنی بیماری کی باتیں تحریر ہوتیں سچی باتوں کا کالم آپ کے قلم سے آہستہ آہستہ محروم ہونے لگا۔ اخبار سچ (۱۹۲۹ء) سے سچی باتیں منقول ہوتی رہیں۔ پھر آپ کے لائق داماد حکیم عبد القوی صاحب نے اس کالم کو بہت حد تک سنبھال و نبھا لیا۔

ایک خبر صدق جدید میں حکیم عبد القوی صاحب کے قلم سے بہ عنوان "نئی معذوری" چھپی کہ ۱۷ر اکتوبر ۷۶ ۱۹ء کی شب میں مدیر صدق جدید مولانا عبد الماجد دریا بادی اچانک پلنگ سے اُترتے ہوئے گر پڑے اور اس کے باعث ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ہڈی ایک ماہر معالج نے اپنی جگہ بیٹھا کر مناسب بندش کر دی ہے"

اس خبر پر ماتھا ٹھنکا۔ اس عمر میں ہڈی کا ٹوٹنا آسان مگر جُڑنا مشکل تھا۔ کچھ دن بعد ایک پریشان کن خبر نے مایوس کر دیا تنفس کی شکایت بدستور تھی کہ دوبارہ فالج کا بھی حملہ ہوا۔ زبان گنگ، کان سماعت سے خالی دماغ ہوش سے خالی۔ تین دن پہلے بقول حکیم عبد القوی صاحب خدا حافظ تو کہہ ہی دیا تھا پھر بندے کے معبود سے ملنے کی گھڑی آن پہنچی۔ ۶ر جنوری ۱۹۷۷ء پنجشنبہ کا دن صبح سوا چار بجے ۸۵ سال کی عمر پا کر جنت الفردوس سدھارے مسافر پردیس میں آخر کب تک رہے، اپنا اچھا بُرا نام چھوڑ جائے۔

ندوۃ العلماء میں حسب وصیت مولانا مرحوم علی میاں کے ہاتھوں نماز جنازہ کی ادائی کے بعد وطن دریاباد میں حافظ غلام نبی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور اپنے وطن میں اپنے مورث اعلیٰ حضرت آبکشی علیہ الرحمۃ کے مزار سے متصل مولانا آرام و سکون کی نیند کے مزے لینے لگے مسافر بہت تھک گیا تھا سو گیا، لیکن سونے اور نیند نے کتنے عقیدتمند و چاہنے والوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ ●●

اساتذۂ سخن کی اصلاحیں

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

شعر۔ نواب محمد اور خان قلندر
نواب آف کرنول

نہ نازچاہیئے قارون کی طرح زر پہ
کہ بعد بوجھ اٹھانا پڑے وہی سر پہ

اصلاح۔
لگانا جان کو قارون کی طرح زر پر
یہ بوجھ تجھکو اٹھانا ہے ایک دن سر پر

خواجہ صاحب نے "جان" کے ایک لفظ سے مطلع میں جان ڈال دی اور دوسرے مصرع سے تو فصاحت کے دریا بہا دیئے اور لطف یہ کہ مفہوم وہی رہا۔

شعر۔ قلندر
لکھا جو نامے میں احوال درد فرقت کا
تو راستے ہی میں بجلی گری کبوتر پہ

اصلاح:۔
لکھا جو نامے میں احوال بے قراریٔ دل
تو راستے ہی میں بجلی گری کبوتر پہ

بجلی کی مناسبت سے "بے قراری" کا لفظ بنایا گیا جس سے شعر میں خوبی پیدا ہو گئی۔

شعر۔
جو شوق قتل کا قاتل نے مجھ میں دیکھ لیا
کہا پکار کے رکھدو گلے کو خنجر پر

اصلاح:۔
یہ شوق قتل ہے قاتل کو میں نے جب دیکھا
رگیں پکاریں کہ رکھدو گلے کو خنجر پر

جناب قلندر کا شعر مذاق شاعری سے گرا ہوا تھا یعنی معشوق کا یہ کہنا کہ تم خنجر پہ گلا رکھدو اس سے عاشق کے شوق قتل کا ارمان ثابت نہیں ہوتا۔ اصلاح سے یہ عیب دفع ہو گیا۔ اور شعر مزے کا ہو گیا۔ نازک اصلاح دی۔

شعر: قلندر
ہمنشیں رفتہ رفتہ دور ہوئے
ہو گئی ساری انجمن خالی

اصلاح:۔
ہمنشیں رفتہ رفتہ اٹھ گئے سب
رہ گئی آہ انجمن خالی

"دور ہوئے" یہ ایک ٹکڑا مہمل تھا بجائے اس کے "اٹھ گئے سب" کیا خوب بنایا جس سے شعر میں ترقی کے علاوہ معنوی خوبیاں بھی بڑھ گئیں۔ دوسرے مصرعے میں "رہ گئی آہ" یہ ٹکڑا قابل داد ہے۔

شعر۔ عاجز فیروزآبادی
مرے آزار کو نہیں سمجھا
کرتا تشخیص ہے طبیب غلط

اصلاح:۔
مرے آزار کو نہ سمجھا تو
تری تشخیص ہے طبیب غلط

"نہیں" کا لفظ ماضی کے ساتھ نہیں بولتے اس لئے استاد نے "نہ سمجھا تو" بنا کر اس نقص کو دور کر دیا۔ دوسرے مصرع میں تعقید لفظی تھی اس لئے اسے بھی بدل دیا اس اصلاح سے شعر میں بہت سی خوبیاں پیدا ہو گئیں اور جو عیوب تھے رفع ہو گئے۔

شعر۔ سید تلمیذ الحق تلمیذ مرادپوری
نور نبی کے ہم کوئی عاشق نئے نہیں
پروانے اس چراغ کے ہیں ابتدا سے ہم

اصلاح:۔
نور رسول پاک کے عاشق نئے نہیں
پروانے اس چراغ کے ہیں ابتدا سے ہم

ردیف ہم ہے پھر مصرع اول میں ہم ہونا اچھا نہیں دونوں کا مرجع ایک ہے

سعید بن محمد نقش حسن آزاد

خونِ جگر ہونے تک

...نی سے رنگ، رنگ سے خون اور خون
جگر ہونے تک کی بات دلچسپ بھی ہے
...تی بھی اور میرے خیال میں یہ بات دوسرے
مقابلے میں فنِ مصوری سے زیادہ قریب ہے
فنِ مصوری، انسانی جذبات و احساسات
...ار کا سب سے قدیم اور بلند فن سمجھا جاتا
...دا میں جبکہ انسان بے زبان تھا نہ صرف
...ت بلکہ آج اس ترقی یافتہ دور میں بھی دل
...لتوں، محبت کی داستانوں اور خوشی کے
...ے اظہار کا ذریعہ مصوری ہے۔ خواہ یہ
...ن اور داستانیں کسی ملک و قوم یا کسی
...تری سے متعلق ہوں اس طرح مصوری
...یسی بین الاقوامی زبان قرار پاتی ہے۔
...یرطنا ناممکن ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ
...ہذیب و تمدن میں مصوری کو ایک
...ام حاصل ہے۔

اس فن میں مشاہدے کو اور مشاہدے
...است کو جو اولیت و اہمیت حاصل ہے
...سری جس کو حاصل نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ
...شاہدہ، نور کے تابع ہے نور ہے تو سب
...نہ کائنات کا وجود، عدم کے سوا کچھ بھی
...یہی شمسی نور جو صبح سے شام تک اس دنیا
...کو روشن اور منور کرتا رہتا ہے ایک
...ث کے لئے اس نور کا مقام حاصل کر لیتا ہے
...طور پر کسی نے دیکھا اور بے ہوش ہو کر
...ہو گیا اور کوئی پیپل کے درخت کے نیچے
...ہ مہاتما بدھ بن گیا لیکن یہاں ایک بات
...لعہ پھر قابلِ غور ہے۔

جب کسی ایک ہی منظر کی متعدد تصویریں جو کئی حسن کاروں نے بنائی ہوں آپ کی نظروں سے گذریں، اور آپ ان کے خطوط اور رنگوں پر غور کریں تو آپ یقین سے کہہ سکیں گے کہ کون کس حد تک اپنی فنی صلاحیتوں کے مظاہرے میں کامیاب ہوا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کو اگر اکثر تصویریں ردی کی ٹوکری میں ملیں گی تو اکثر ایسی بھی جو تو عجائب گھروں کی زینت ہوں گی ایسی بھی ہوں گی جن کی جانب ایک نظر بھی اٹھانے کو جی نہ چاہے گا اور ایسی بھی جنھیں دیکھ کر سینے سے لگانے کے لئے دل بے قرار ہو جائے گا ـــــ غالباً بات تشنہ رہ جائے گی اگر اسی سلسلے میں اپنی مصوری کے کچھ نمونے نہ پیش کر دوں۔

جی ہاں ۱۹۳۶ء کی بات ہے جب میں اسکول جا رہا تھا کہ راستے میں میری نظر ایک پیکر پہ پڑی اور ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ پیکر کچھ میلا کچیلا سا تھا لیکن اس میں بلا کی کشش تھی، میرے ذہن میں ایک خیال نے انگڑائی لی اور میں نے اُسے بڑھ کر روکا "کہاں جا رہی ہو؟"

"مزدوری کے لئے"

"میرے ساتھ چلو، مزدوری میں دے دوں گا"

اس کی تیوری پہ بل آ گئے اور میں نے فوراً حقیقت کا اظہار کر دیا۔

میں مصور ہوں تمھاری تصویر بنانا چاہتا ہوں زیادہ دیر نہ ہوگی مگر مزدوری دن بھر کی دے دوں گا وہ راضی ہو گئی اور کچھ ہی دیر میں ہم دونوں اسٹوڈیو میں تھے۔

میں نے اُسے وہاں کھڑا کیا کچھ اس طرح کہ اس کا جسم رقص کرتا نظر آئے اس کے بعد میں نے بھرپور نظروں سے اسے ایک بار دیکھا ـــ جھلملاتے تاروں کے بیچ میں مجھے ایک چاند دکھائی دیا۔ یقین مانیئے اُس وقت وہ میلی کچیلی خاتون جس کے رنگ برنگ لباس پہ آئینے ٹکے ہوئے تھے مجھے کافی متاثر کر رہی تھی میرا ہاتھ تھا رنگ اور برش تیار ہی تھے کچھ ہی دیر میں پیامات کی آمد و رفت مثلث کی شکل اختیار کر لی اور دیکھتے دیکھتے وہ عورت ایک لازوال رنگین مسکراہٹ کے ساتھ سامنے آ گئی میرا برش رکا اور وہ مسکرائی ـــ لیکن اب اس کی لازوال مسکراہٹ کے مقابلے میں وہ مسکراہٹ کچھ بھی تو نہ تھی یہ مسکراہٹ لازوال مسکراہٹ، اب بھی آپ کو کسی میوزیم میں ملے گی غالباً آپ اسے دیکھ چکے ہوں گے

(باقی صــــ پر)

اساتذۂ سخن کی اصلاحیں

خواجہ عبدالرؤف عشرت

لکھنوی

شعر۔ نواب محمد اور خان قلندر
نواب آف کرنول

نہ ناز چاہیئے قارون کی طرح زر پر
کہ بعد بوجھ اُٹھانا پڑے وہی سر پر

اصلاح:۔

لگا نہ جان کو قارون کی طرح زر پر
یہ بوجھ تجھکو اٹھانا ہے ایک دن سر پر

خواجہ صاحب نے "جان" کے ایک لفظ سے مطلع میں جان ڈال دی اور دوسرے مصرعے سے تو فصاحت کے دریا بہا دیئے اور لطف یہ کہ مفہوم وہی رہا۔

شعر۔ قلندر

لکھا جو نامے میں احوال درد فرقت کا
تو راستے ہی میں بجلی گری کبوتر پہ

اصلاح:۔

لکھا جو نامے میں احوال بے قراریٔ دل
تو راستے ہی میں بجلی گری کبوتر پر

بجلی کی مناسبت سے "بے قراری" کا لفظ بنایا گیا جس سے شعر میں خوبی پیدا ہوگئی۔

شعر:۔

جو شوق قتل کا قاتل نے مجھ میں دیکھ لیا
کہا پکار کے رکھدو گلے کو خنجر پر

اصلاح:۔

یہ شوق قتل ہے قاتل کو میں نے جب دیکھا
رگیں پکاریں کہ رکھدو گلے کو خنجر پر

جناب قلندر کا شعر مذاق شاعری سے گرا ہوا تھا یعنی معشوق کا یہ کہنا کہ تم خنجر پہ گلا رکھدو اس سے عاشق کے شوق قتل کا ارمان ثابت نہیں ہوتا۔ اصلاح سے یہ عیب دفع ہوگیا۔ اور شعر مزے کا ہوگیا۔ نازک اصلاح دی۔

شعر: قلندر

ہمنشیں رفتہ رفتہ دور ہوئے
ہوگئی ساری انجمن خالی

اصلاح:۔

ہمنشیں رفتہ رفتہ اُٹھ گئے سب
رہ گئی آہ انجمن خالی

"دور ہوئے" یہ ایک ٹکڑا مہمل تھا بجائے اس کے "اُٹھ گئے سب" کیا خوب بنایا جس سے شعر میں ترقی کے علاوہ معنوی خوبیاں بھی بڑھ گئیں۔ دوسرے مصرعے میں "رہ گئی آہ" یہ ٹکڑا قابل داد ہے۔

شعر۔ عاجز فیروز آبادی

مرے آزار کو نہیں سمجھا
کرتا تشخیص ہے طبیب غلط

اصلاح:۔

مرے آزار کو نہ سمجھا تو
تری تشخیص ہے طبیب غلط

نہیں کا لفظ ماضی کے ساتھ نہیں بولتے اس لئے استاد نے "نہ سمجھا تو" بنا کر اس نقص کو دور کر دیا۔ دوسرے مصرع میں تعقید لفظی تھی اس لئے اسے بھی بدل دیا اس اصلاح سے شعر میں بہت سی خوبیاں پیدا ہوگئیں اور جو عیوب تھے رفع ہوگئے۔

شعر: سید تلمیذ الحق تلمیذ مرادپوری

نور نبی کے ہم کوئی عاشق نئے نہیں
پروانے اس چراغ کے ہیں ابتدا سے ہم

اصلاح:۔

نورِ رسول پاک کے عاشق نئے نہیں
پروانے اس چراغ کے ہیں ابتدا سے ہم

ردیف ہم ہے پھر مصرع اول میں ہم ہونا اچھا نہیں دونوں کا مرجع ایک ہے

آئندہ اصلاحیں
حضرت نوح ناروی

خونِ جگر ہونے تک

سید بن محمد نقش حسن کاظم

نور سے رنگ، رنگ سے خون اور خون سے خونِ جگر ہونے تک کی بات دلچسپ بھی ہے اور رنگین بھی اور میرے خیال میں یہ بات دوسرے فنون کے مقابلے میں فنِ مصوری سے زیادہ قریب ہے۔ فنِ مصوری، انسانی جذبات و احساسات کے اظہار کا سب سے قدیم اور بلند فن سمجھا جاتا ہے ابتداء میں جبکہ انسان بے زبان تھا نہ صرف اس وقت بلکہ آج اس ترقی یافتہ دور میں بھی دل کی دھڑکنوں، محبت کی داستانوں اور خوشی کے نغموں کے اظہار کا ذریعہ مصوری ہے۔ خواہ یہ دھڑکنیں اور داستانیں کسی ملک و قوم یا کسی خشکی و تری سے متعلق ہوں اس طرح مصوری ایک ایسی بین الاقوامی زبان قرار پاتی ہے۔ جس کی نظیر ملنا ناممکن ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن میں مصوری کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

اس فن میں مشاہدے کو اور مشاہدے میں بصارت کو جو اولیت و اہمیت حاصل ہے کسی دوسری حس کو حاصل نہیں۔ قصہ یہ ہے کہ ہمارا مشاہدہ، نور کے تابع ہے نور ہے تو سب کچھ ورنہ کائنات کا وجود، عدم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہی شمسی نور جو صبح سے شام تک اس دنیا کی ہر چیز کو روشن اور منور کرتا رہتا ہے ایک آرٹسٹ کے لئے اس نور کا مقام حاصل کر لیتا ہے جسے کوہِ طور پر کسی نے دیکھا اور بے ہوش ہو کر باہوش ہو گیا اور کوئی پیپل کے درخت کے نیچے گوتم سے مہاتما بدھ بن گیا لیکن یہاں ایک بات خاص طور پر قابلِ غور ہے۔

جب کسی ایک ہی منظر کی متعدد تصویریں جو کئی حسن کاروں نے بنائی ہوں آپ کی نظروں سے گذریں، اور آپ ان کے خطوط اور رنگوں پر غور کریں تو آپ یقین سے کہہ سکیں گے کہ کون کس حد تک اپنی مخفی صلاحیتوں کے مظاہرے میں کامیاب ہوا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کو اگر اکثر تصویریں ردی کی ٹوکری میں ملیں گی تو اکثر ایسی بھی جو قومی عجائب گھروں کی زینت ہوں گی ایسی بھی ہوں گی جن کی جانب ایک نظر بھی اٹھانے کو جی نہ چاہے گا اور ایسی بھی جنھیں کلیجے سے لگا لینے کے لئے دل بے قرار ہو جائے گا ——— غالباً بات تشنہ رہ جائے گی اگر اسی سلسلے میں اپنی مصوری کے کچھ نمونے نہ پیش کر دوں۔

جی ہاں ۱۹۳۶ء کی بات ہے جب میں اسکول جا رہا تھا کہ راستے میں میری نظر ایک پیکر پہ پڑی اور ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ پیکر کچھ میلا کچیلا سا تھا لیکن نہ اس میں بلا کی کشش تھی، میرے ذہن میں ایک خیال نے انگڑائی لی اور میں نے اُسے بڑھ کر روکا "کہاں جا رہی ہو؟"

"مزدوری کے لئے"

"میرے ساتھ چلو، مزدوری میں دیدوں گا"

اس کی تیوری پر بل آ گئے اور میں نے فوراً حقیقت کا اظہار کر دیا۔

میں مصور ہوں تمہاری تصویر بنانا چاہتا ہوں زیادہ دیر نہ ہو گی مگر مزدوری دن بھر کی دے دوں گا وہ راضی ہو گئی اور کچھ ہی دیر میں ہم دونوں اسٹوڈیو میں تھے۔

میں نے اُسے وہاں کھڑا کیا کچھ اس طرح کہ اس کا جسم رقص کرتا نظر آئے اس کے بعد میں نے بھرپور نظروں سے اُسے ایک بار دیکھا — جھلملاتے تاروں کے بیچ میں مجھے ایک چاند دکھائی دیا۔ یقین مانیے اُس وقت وہ میلی کچیلی خاتون جس کے رنگ برنگ لباس پہ آئینے ٹکے ہوئے تھے مجھے کافی متاثر کر رہی تھی میرا ہاتھ، رنگ اور برش تیار ہی تھے کچھ ہی دیر میں بیانات کی آمد و رفت مثلث کی شکل اختیار کر لی اور دیکھتے دیکھتے وہ عورت ایک لازوال رنگین مسکراہٹ کے ساتھ سامنے آ گئی میرا برش رکا اور وہ مسکرائی — لیکن اب اس کی لازوال مسکراہٹ کے مقابلے میں وہ مسکراہٹ کچھ بھی تو نہ تھی یہ مسکراہٹ لازوال مسکراہٹ، اب بھی آپ کو کسی میوزیم میں ملے گی غالباً آپ اسے دیکھ چکے ہوں گے

(باقی ص — پر)

لیکن آپ ذرا اس قصے کو پڑھ لیجئے شاید آپ زیادہ محظوظ ہوں۔

اللہ کے نام پر ایک پیسہ یا ایک روٹی کا ٹکڑا بابا اس قسم کے سوال کے ساتھ ہی بازار میں اکثر ہاتھ آپ کے سامنے آئے دن پھیل جاتے ہوں گے لیکن ایک دن میرے سامنے ایک چہرہ آیا۔

زعفرانی ـــ چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھیں اور نیم وا لب ـــ پورا چہرہ تاثرات کا عجیب نقشہ پیش کر رہا تھا۔ میں اس وقت، ایک پینٹنگ ہاوز میں بیٹھا ہوا تھا اور وہاں میرا ساز و سامان اور رنگ تو موجود نہ تھے لیکن پھر بھی میں نے اس فقیر کو ٹھہرالیا اور اپنا کام شروع کر دیا۔ آدھے گھنٹے میں وہ فقیر اپنی پوری شخصیت کے ساتھ میرے کینوس پر موجود تھا میں نے اس فقیر کو ایک روپیہ دیکر رخصت کیا اور اپنے فقیر کو کل ہند نمائش حسن کاری میں بھیج دیا۔ اور اب وہ نیشنل میوزیم کی زینت بنا ہوا ہے۔

تصویروں کو دیکھ کر مصوّر کے متعلق تصوّر قائم کرنا ایک عام بات ہے غالباً آپ نے میرے متعلق بھی کوئی نہ کوئی تصوّر قائم کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن ذرا ٹھہرئیے میں آپ سے ایک بات پوچھ لوں ـ کیا آپ نے مجھے دیکھا ہے؟ یہ سوال یقیناً بے معنی ہو جاتا اگر یہ ٹیلی ویژن ہوتا لیکن یہ تو وہ مقام ہے جہاں سے نہ میں آپ کو دیکھ سکتا ہوں نہ آپ مجھے۔

بہرحال اگر آپ نے مجھے دیکھا ہے تو سوچئے اور نہیں دیکھا ہے تو اتنا سن لیجئے کہ میرے رنگ میں کچھ گہرائی پائی جاتی ہے اور جب میں اپنے گھر میں آئینہ دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میرے مصوّر نے میرے رنگ کو اتنا گہرا کیوں کر دیا لیکن آئینے سے قریب ہی جب میری نظریں دوسری طرف اٹھتی ہیں تو میرے دل و دماغ کو کچھ سکون نصیب ہوتا ہے، ادھر بھی ایک تصویر ہے تین فٹ چوڑی چار فٹ لمبی سعید کی ہے جسے خود سعید نے بنایا ہے۔ یہ تصویر کیوں کر بنی سنئیے۔ ایک روز میں نے آئینہ دیکھا اور وہی سوچ بچار کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ بس میں نے برش اٹھایا اور نہایت ہی دلچسپ اور سریلے رنگوں کے ماحول میں اپنے کو کینوس پر ظاہر کر دیا۔ اس طرح کہ نہ صرف اس میں ایک آرٹسٹ کا کردار نمایاں ہوگیا بلکہ میں کچھ حسین بھی معلوم ہونے لگا جب یہی تصویر نائب صدر ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ملاحظہ فرمائی تو مجھے غور سے دیکھ کر فرمانے لگے۔

"سعید تم سے تو تمھاری یہ تصویر اچھی ہے"

جن حضرات کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے وہ منی آرڈر بھیجکر تجدید کروالیں ـــ

• جواب طلب امور کیلئے مناسب ڈاک ٹکٹ کا آنا ضروری ہے

(ادارہ)

بیان تفصیلات و ملکیت بابتہ
ماہنامہ پونم حیدرآباد
متعلقہ فارم نمبر ۴ دفعہ ۸
پریس اینڈ رجسٹریشن ایکٹ

مقام اشاعت
1/300-7-16۔ اعظم پورہ، حیدرآباد (اے پی)

وقفہ ہائے اشاعت
ماہنامہ

نام طابع و ناشر و ایڈیٹر
ناصر کرنولی

قومیت
ہندوستانی

پتہ
1/300-7-16۔ اعظم پورہ، حیدرآباد (اے پی)

مالک: ناصر کرنولی

پتہ:-
1/300-7-16 اعظم پورہ حیدرآباد ۲۳

میں ناصر کرنولی ذریعہ ہذا اقرار کرتا ہوں کہ میرے علم و یقین کی حد تک مندرجہ بالا تفصیلات صحیح ہیں۔

ناشرہ "پونم" یکم مارچ ۱۹۷۸ء

جنگ کے بعد

علی اصغر

زیتون کی شاخ کہاں ہے
فاختائیں کون سی جھاڑیوں میں
چھپ کے بیٹھ گئی ہیں؛
چڑیوں کے گھونسلے نظر نہیں آتے
دھواں دھواں آکاش کے نیچے
کھلے میدانوں پر چیلیں،
گدھ اور کتے منڈلاتے ہیں
پیٹ بھرے کتوں سے مت پوچھو
کتنی کنواری ہڈیاں باقی رہ گئی ہیں۔!

* * *

ملکہ خورشید

مداوا

وہ تازہ زخم
جو عطیہ تھا میری زندگانی کا
مجھے بے مائیگی میں
ایک گنج شائگاں سے کم نہیں تھا
وہ زخم بے بہا
جو آرزو کا زندگی ہے
تری چارہ گری سے
مندمل ہونے لگا ہے
میں اکثر سوچتی ہوں
تری چاہت کے تقاضے
کہیں بھر دے نہ زخم زندگی کو
مجھے تنہا نہ کر دے
تری مخلص غمگساری
مجھے کب چاہیئے تھی تری چاہت
مجھے کب چاہیئے تیرا مداوا

ورق

آمنہ ابوالحسن

"ممتاز افسانہ نگار محترمہ آمنہ ابوالحسن نے ادھر کچھ عرصہ سے نثری نظمیں لکھنا شروع کی ہیں۔ ماہنامہ "تحریک" اور "سطور" دہلی میں ان کی نظمیں چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں۔ "پونم" کے لئے انھوں نے ایک تازہ نثری نظم "ورق" روانہ فرمائی ہے جسے ہم قارئین کی ضیافت طبع کے لئے پیش کر رہے ہیں۔" (ادارہ)

میری نظر کے ورق ورق پہ
دوستوں کے آٹوگرافس
اور دشمنوں کی تصویریں
ساتھ ساتھ چھپی ہوئی ہیں
اور شعور کی شکلیں
ان راہوں کی طرح
جو تجربوں کی تشنہ گامی سے
کہیں تو پختہ مگر کہیں پہ کٹی پھٹی ہیں
میرے ذہن کی رَو
جب ان اوراق سے گذر کر
اپنے دل تک جاتی ہے
تو دل فوراً یہ کہتا ہے
یہ ایک پلندہ ہی سہی
لیکن اس کو تلف نہ کرو
کہ تشکیل احساس اور تعمیر ذات کا
یہ بھی ایک ذریعہ ہے

●

[illegible]

پُرسہ

(۲۴۔ مارچ ۱۹۷۷ء)

مؤذن کو دُعا دی
آنکھ کھولی
یہ میرے دونوں پاؤں
اور دونوں ہاتھ
کس نے کاٹ ڈالے
میں تصویر نہالی بن کے
قطرے خون کے
ڈھونڈا کیا

... ...

سامنے تھا واش بیسن
اُس کی دونوں ٹونٹیوں سے
خون میرا بہہ رہا تھا
شُکر کا سجدہ کیا
میں نے اپنے آپ کو پُرسہ دیا

●

ہم لوگ

دکن کے لوگ کیسے کم سخن ہیں
وفاداری بشرطِ اُستواری
اُن کا ایماں ہے
وہ اپنے ہاتھ کٹوا کر
حسین قاتل کے دستِ بے ریا کو
چوم لیتے ہیں۔

ڈاکٹر زریشی

تیرے بعد دیکھ کے تجھ کو میں پاگل دیوانوں ہوں
ورنہ تو تجھ سے پیار کرے ہے یہ تو میں بھی جانوں ہوں
تیری فرقت میں اب صحرا صحرا خاک نہ چھانوں ہوں
اب تو گلی گلی میں ساجن روپ ترا پہچانوں ہوں
تب تب اور زیادہ اس کا فرکی یاد ستاوے ہے
جب جب اس کی یاد بھلا دینے کی دل میں ٹھانوں ہوں
وہ مجھ سے بھی کہیں زیادہ غم کا مارا ہوتا ہے
جس کے آگے جا کر اپنے دل کا درد بتانوں ہوں
میر کے رنگ میں آج کہے ہیں تو نے ایسے شعر زریشی
اب تو ہر اک قسم میں تجھ کو اونچا شاعر مانوں ہوں

ڈاکٹر یوسف کمال

طوفاں کو آج ایسے تھپیڑا دینا چاہیئے
پانی پہ اس کا عکس بنا دینا چاہیئے
یوں غرقِ تشنگی ہیں سمندر پرست ہم
صحرا میں کہکشاں کو بہا دینا چاہیئے
سورج کے خواب خواب میں ہے تیرگی کی ڈھال
کیا شب کو اور دادِ رسا دینا چاہیئے
یخ بستہ ہے فضا تو کھلائے گی کیسے گل
آتش بجاں نفس کی ہوا دینا چاہیئے
سمتوں کی سند باد پہ قید اب نہیں کوئی
جیسے ہو کشتیوں کو چلا دینا چاہیئے

CACTUS ۱

غزلیں

ذوقِ اظہار کو کیسے ملتی زباں، میرے ہمراہ تھا سنگِ بے چہرگاں
ڈوب کر گہرے پانی میں لائے گہر جن کے حصے میں آیا تھا عزمِ جواں
میں تعاقب میں رنگوں کے پہنچا کہاں، دورِ حدِ نظر تک نہیں روشنی
روشنی تو کبھی قید ہوتی نہیں اور سورج کی یلغار رکتی نہیں
کوئی بھی دور ہو، کوئی بھی وقت ہو، ظلم دستِ ہنرور پہ ہوتا رہا
اعتبارِ بصیرت بھی جاتا رہا، اپنی آنکھوں پہ بھی اب بھروسہ نہیں
ایسی شاخیں ہیں ہم موسمِ گل میں بھی جن پہ کوئی شگوفہ نہیں کھل سکا
جس عمارت کی بنیاد کمزور ہو، اس کے بام و دَرِ ضعف کا ہم نے کیا
مجھ کو ابرِ رفاقت میسر نہ تھا، میرے سر پہ رہا دھوپ کا سائباں
جن کی فطرت میں آئیں تن آسانیاں، ساحلوں پہ وہ چنتے رہے سیپیاں
ریگ زارِ اُداسی میں لے آئی ہیں مجھ کو یادوں کی کچھ خوشنما تتلیاں
جس کی ہمت ہو بڑھ کر اُسے روک لے عزمِ انساں تو ہے ایک سیلِ رواں
میں ہی پابند نہیں ہوں وہ پہلا بشر جس کی دنیا میں کاٹی گئیں انگلیاں
شہر کا ذکر کیا آج گاؤں میں بھی چھا گئیں بے ضمیری کی تاریکیاں
اب جو ہوگا چمن میں ورودِ خزاں ساتھ جھڑ دیں گی ساری ہری پتیاں
ذوقِ تسکینِ حسنِ نظر کے سوا کس کے کام آتی ہیں کاغذی کشتیاں

بے ضمیروں کی بستی میں مہدی بھلا روشنی کے طلب گار جلتے ہی کیا
لوگ تاریکیوں کے پرستار تھے، ہم بجائے رہے روشنی کی دوکاں

مہدی پرتاب گڑھی

غزلیں

بانو طاہرہ سعید

کسی نے لطف فرمایا تو ہوگا
در دولت پہ بلوایا تو ہوگا
میری بربادیوں پامالیوں کا
فلک نے خود بھی غم کھایا تو ہوگا
خزاں میں بکھرے پتے دیکھنے پر
انہیں میرا خیال آیا تو ہوگا
چمن میں بلبل رنگیں نوا کو
کسی نے میری رلوایا تو ہوگا
انہیں کا فیض غم ہے میرے فن میں
بہت کچھ کھو کے کچھ پایا تو ہوگا
عذاب روح سے اب کیا شکایت
میری قسمت کا سرمایہ تو ہوگا
کسی نے طاہرہ مجھ کو بھلا کر
انوکھے پن سے اپنایا تو ہوگا

قطب سرشار

شمار اس کا تو احباب معتبر میں نہ تھا
وہ ڈوبتا سا جزیرہ تھا بحر و بر میں نہ تھا
صحیفے یوں تو اترتے رہے مگر مفہوم
تلاشنے پہ بھی الفاظ بیشتر میں نہ تھا
وہ آرزوؤں کے ملبے میں دب گیا ہو کہیں
سراغ اس کا تو سیلاب چشم تر میں نہ تھا
یہ اور بات کہ مقصود امتحاں ہو مرا
وگرنہ دانۂ گندم تو ہر شجر میں نہ تھا
دھواں دھواں ہی سہی میں بھی اک حقیقت ہوں
بتا کہ کب میں ترے درد کے شرر میں نہ تھا
میں اپنے آپ سے خائف تھا یہ تو سچ ہے مگر
یہ جھوٹ ہے کہ میں حالات پُر خطر میں نہ تھا
نہ جانے کتنے بلوریں بدن تراش دیئے
وہ شخص جو کبھی ارباب شیشہ گر میں نہ تھا
مری وفا کو خطاؤں کا آئینہ نہ دکھا
غلط کہ میرا چلن فطرت بشر میں نہ تھا
ہمارے نام پہ سرشار حشر کیوں ہے بپا
ہمارا نام تو احباب فتنہ گر میں نہ تھا

شبانہ سحر

خود کو بھلا کے ہم انھیں ڈھونڈیں مگر کہاں
ان کی نظر نظر ہے ہماری نظر کہاں!
جائیں تری تلاش میں شوریدہ سر کہاں
رہتے ہیں اپنے حال سے وہ باخبر کہاں
آنچل کی سرسراہٹیں نغمہ نواز ہیں
ساتھ ان کے جا رہی ہے نسیم سحر کہاں
برگشتہ آپ کیا ہیں زمانہ بھی ہے خلاف
اب ہم گزاریں زندگی مختصر کہاں!
مثل غبار راہ طلب استوار کر
سیکھا ہے اڑتی خاک نے عزم سفر کہاں
ان مست انکھڑیوں کے تصور میں کھو گئے
خود اپنے ہوش میں ہیں مرے چارہ گر کہاں
پہلی سی رسم و راہ شبانہ نہیں رہی!
ہم مٹ گئے مگر انھیں اس کی خبر کہاں

(افسانہ)

لوہے کا پُل

عاتق شاہ

وہ یوں پڑا ہوا تھا جیسے کسی سڑک پر کسی کی جیب سے گرا ہوا بٹوہ ۔ اور جسے ہر آنے جانے والا دیکھتے ہوئے گذر جاتا تھا۔ لیکن کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھے۔ حالانکہ چاہتا تو ہر شخص تھا لیکن احتیاط بھی تو بڑی چیز ہے۔ کون جانے مفت میں دھر لیے جائیں!

میں نے اُسے دیکھا!

اور میری طرح سینکڑوں اور ہزاروں مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں نے اُسے دیکھا۔ دن میں، رات میں، اپنے اپنے کام سے جاتے ہوئے، پھر شام کو تھکے تھکے لوٹتے ہوئے ۔ اُن سبھوں نے جو اس پل پر سے گذرتے ہیں!

صبح صبح میں نے اُسے دیکھا!

لیکن اُس نے مجھے نہیں دیکھا!

لوہے کے پُل پر ہنگامہ تھا ۔ ہر چھوٹا بڑا بھاگا جا رہا تھا۔ بسیں، موٹر کاریں اور اسکوٹروں کی قطار تھی۔ پُل کے دونوں فٹ پاتھوں پر تیز تیز بڑھتے ہوئے اور اُٹھتے ہوئے قدم تھے۔ پھر ایک قدم رُکا ۔ پھر دو ۔ اور تین، چار ۔

لوگ نیچے جھانک رہے تھے:

پُل کے نیچے پانی تھا۔ بہتا ہوا۔ کھیت تھے کنارے کنارے ۔ دھوبی تھے کپڑے پچھاڑتے ہوئے۔ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہی پُرانا منظر تھا جسے لوگ برسوں سے، صدیوں سے دیکھتے ہوئے آرہے تھے۔ البتہ شدید بارش میں لوہے کے پُل کے نیچے پانی جمع ہو کر ایک خوفناک آواز کے ساتھ بہنے لگتا تھا۔ گرمیوں کے آغاز میں پانی کی رفتار کم ہو جاتی تھی اور چند غریب کسانوں کے کھیت لہلہانے لگتے ۔

یہی وہ دو منظر تھے لوہے کے پُل پر سے گذرنے والے ہر شخص نے نوٹ کیا ہے!

میں دوسروں کی پسند کی بات تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اپنی کہتا ہوں ۔ لوہے کا یہ پُل مجھے بے حد پسند ہے اس کی بنیاد میں سیسہ پگھلا کر ڈالا گیا ہے۔ اور اس کی کمانوں کے آہنی حصہ میں لوہے کے موٹے موٹے اسپرنگ ٹھونسے گئے ہیں۔ اس میں بڑی لچک ہے۔ یہ سیکڑ تا ہے پھیلتا ہے ۔ اور چٹنے پر لا طرح کی آواز آتی ہے۔ جیسے کوئی لکڑی کی سیڑھیوں پر پیر پٹکتے ہوئے چڑھ رہا ہو ۔ اتر رہا ہو۔ حالانکہ آواز بجتی ہوئی آنی چاہیے۔ کیونکہ سڑک لوہے کی ہے۔ فرش لوہے کا ہے۔ یہاں کی ہر شے لوہے کی ہے ۔ لیکن آواز ۔

آواز کا تعلق کانوں سے ہوتا ہے۔ آنکھوں سے نہیں ۔ لیکن اس پُل پر سے گزرتے ہوئے کان ہی نہیں متاثر ہوتے بلکہ آنکھ بھی متاثر ہوتی ہے۔ اور وہ بھی گویا بولنے لگتی ہے۔ ایک ایک چیز کو دیکھ کر۔ کیسے کیسے عجیب تماشے نظر آتے ہیں۔ اور کیسی کیسی باتیں سوجھتی ہیں ۔ اس وقت میں جب اس پُل پر ہنگامہ ہوتا ہے۔ اور اس وقت بھی جب رات کے گہرے اندھیرے میں کوئی جذامی بھکاری اپنی ادھ کٹی انگلیوں سے جسم کو کھجاتے ہوئے جماہی لینے لگتا ہے۔ یا اُونگھتا ہوا اپنی آنکھیں پھاڑ کر ہر گذرنے والے کو دیکھنے لگتا ہے کہ کس نے اُس کے آرام کو تباہ کیا۔ اور اُس وقت بھی جب آدمی کے ذہن میں کچھ نہیں ہوتا لیکن اس پُل پر قدم رکھتے ہی سینکڑوں خیالات ذہن کے شفاف چکیلے فرش پر اُبھرنے لگتے ہیں۔ دراصل لوہے کا یہ پُل سوئے ہوئے ذہن، دماغ اور جسم کو دھکے دے کر بیدار کرتا ہے، جگاتا ہے

اس لئے کہتا ہوں کہ لوہے کے اس پُل سے بھی پیار ہے۔ اپنی زندگی کا ہر فیصلہ میں نے اس پل پر سے گذرتے ہوئے کیا ہے۔ کتنی یادیں اور کتنی باتیں اس پل سے وابستہ ہیں!

کیا ہوا بھئی؟

لوہے کے پُل پر لوہے کی ریلنگ کا سہارا لے کر میں نے نیچے جھانکتے ہوئے اس شخص سے پوچھا جو ایک طرح سے گائیڈ کی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اور اپنی انگلی کے اشارے سے بتا رہا تھا کہ وہ دیکھو ـــ وہ ـــ!

[illegible] ـــ آخر ہمیں بھی تو کچھ بتاؤ!

کمال ہے آپ کو نظر نہیں آتا؟

دنیا دیکھ رہی ہے ـــ اجی جناب!

وہ ـــ وہ ـــ دیکھئے وہ ـــ

وہ ادھیڑ عمر کا شخص جو نیکر پہنا ہوا تھا میرے قریب آیا۔ اُس کے بال میل سے رسّی کی طرح بٹے ہوئے تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ بات بات پہ ہنس رہا تھا۔ ہنستے ہوئے اس کے تیس دانت نظر آتے تھے جن پر کتھے کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ باقی دو غائب تھے۔ اُس کے منہ کے کھلتے ہی نظروں کے سامنے ایک ایسا غار آجاتا تھا جس میں دُور دُور تک بڑا خوفناک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

اُس شخص نے ریلنگ پہ جُھک کر اپنے سیدھے ہاتھ کو آگے لے جا کر نیچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، صاحب دیکھئے! اس درخت کے پاس ـــ نظر آیا ـــ

اُس کے پوچھنے اور بتانے کا انداز ایسے ہی تھا جیسے کوئی کسی کو عید کا چاند بتاتا ہے۔ اور بتا کر خوش ہوتا ہے کہ آخر اس نے یہ مہم سر کر لی۔

صاحب! نظر آیا!

میرے کانوں میں اس کی آواز گونجی!

اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے اس شخص نے ہنستے ہنستے میرے ذہن کے فرش پر ایک پٹاخہ سلگا کر پھینک دیا ہے۔ اور اب وہ پھٹنے والا ہے

میں نے دیکھا نیچے ـــ درخت کے پاس ـــ کیچڑ میں ایک بچہ پڑا ہے بچے کا رنگ شربتی گیہوں جیسا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں۔ اور سر پڑا۔ بال گھنے اور سیاہ جو کسی حجام کے اُسترے کی صورت نہیں دیکھے تھے

اسے دیکھ کر مجھے اپنا چار سالہ لڑکا طارق یاد آگیا جسے تاج محل ہاسپٹل کے تمام ڈاکٹر بھی مل کر نہ بچا سکے تھے۔ اور جو موت کے خلاف زندگی کی آرزو میں اتنی زور سے چیخا تھا کہ وارڈ کے در و دیوار ایک ثانیے کے لئے لرز کر رہ گئے۔ پھر مجھے اپنا شہید بھتیجا خالد یاد آگیا جو دس فٹ کی دیوار سے گر کر اس طرح تڑپ اور ابے جان ہو گیا جیسے وہ ہم میں سے کسی کو نہیں جانتا۔ طارق اور صرف خالد کی یاد تھی ان تمام بچوں کی یاد جنھیں میں نے دیکھا تھا۔ قریب سے دُور سے۔ بھولے بھولے گالوں والے صحت مند بچے۔ گورے چٹے۔ سانولے سلونے۔ کالے۔ نمکین۔ پیارے پیارے۔

بچوں کو میرے پاس آنے دو ـــ

مریم کے بیٹے مسیح نے کہا تھا!

کیونکہ بہشت کی حکومت ایسے ہی کی ہے

اور وہ بہشت کیچڑ پر پڑی ہوئی تھی

کیا صاحب نظر آیا آپ کو؟

ایک آواز آئی ـ ایک پٹاخہ چھوٹا۔ اور آنکھوں کے سامنے ایک تیز روشنی چمک کر بجھ گئی۔ اور صبح کے وقت لوہے کے پل پر اندھیرا چھا گیا!

لیکن وہ میرا اپنا طارق، میرا اپنا خالد نہیں تھا۔ کیونکہ وہ بہت چھوٹا تھا۔ بہت ہی چھوٹا۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں والا ـ میں اُس کا چہرہ دیکھ نہیں سکا۔ میں ہی کیا کسی نے بھی اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ کیونکہ وہ اوندھا پڑا ہوا تھا۔ جیسے کوئی سجدہ میں پڑا ہوا دعا کر رہا ہو!

صرف اُس کی پشت، اس کا سر اور ہاتھ پاؤں نظر آرہے تھے اُس کے

سکس کے بارے [illegible] سکتا
پتہ نہیں وہ لڑکا تھا یا لڑکی ۔
لوہے کے پُل کا گائیڈ اُس کے اطراف کھڑے ہوئے افراد کو ضروری معلومات بہم پہنچا رہا تھا ۔ اور کہہ رہا تھا کہ کل شام سے یہ اسی طرح پڑا ہوا ہے ۔
ہی ہی ہی — ! ساتھ ہی وہ ہنسنے لگا ۔
جیسے یہ کوئی بچہ نہ ہوا، ایک تماشہ ہوگیا جو بغیر کسی ٹکٹ کے مفت میں ہر ایک کو دکھایا جا رہا تھا ۔ اور گائیڈ کی ہنسی بڑی تلخ اور چبھتی ہوئی تھی !
یہ سُن کر مجھے بڑا دکھ ہوا ۔ میں نے سوچا کہ آخر وہ بے چارہ معصوم بچہ ننگ دھڑنگ شدید سردی میں آخر رات کیسے گذارا ہوگا ! اور پھر کیا اُسے رات کی بھیانک تاریکی اور سائیں سائیں کرتے ہوئے سناٹے اور بہتے ہوئے پانی کی ڈراونی آواز سے ڈر نہیں لگا ؟
ہر فرد ایک لمحے کے لئے ٹھہرتا اور آگے بڑھ جاتا تھا ۔ میں بھی ایک لمحے کے لئے ٹھہرا ۔ اور ٹھہر کر آگے بڑھ گیا ۔ سب دوڑ رہے تھے روزگار کی چکر میں کہیں نہ کہیں جا رہے تھے ۔ سب ایک ہی ڈور میں بندھے ہوئے تھے ۔ یہ ڈور جو کہیں بھی نظر نہیں آتی تھی ۔ لیکن جو ہر طرف تھی ۔ لوہے کا یہ پل اس کا خاموش گواہ ہے !
لوہے کے پُل پر ہجوم تھا ۔ اور ہارنوں کی گونجتی ہوئی آوازیں تھیں ۔ لیکن میں اُس ہجوم میں جیسے کہیں کھو گیا تھا ۔ ہجوم میں گھل مل کر نہیں ۔ بلکہ ہجوم کے ریلے سے کٹ کر ۔
آخر وہ کس کا بچہ ہے ؟
میرے اندر کے انسان نے پوچھا
اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے وہ دونوں ننھے ننھے ہاتھ کیچڑ سے اُٹھ کر ایک کونپل کی طرح سر اُٹھا کر میرے دل کے قریب آگئے ہیں اور اسے پکڑنا ہی چاہتے ہیں — مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی ۔
ایک لمحے کے لئے رک کر میں نے اندر کے آدمی کو ڈانٹ پلائی ۔ اور کہا
"آخر تم اس کی فکر کیوں کرتے ہو ۔ ہوگا کوئی" !
پھر بھی انسان جو ہوں !
وہ اندر سے تڑپ کر بولا ۔
اچھا تو آپ انسان ہیں ! میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ۔ یہ بات ابھی معلوم ہوئی ۔ ورنہ ہزاروں اور لاکھوں افراد جو روزانہ اس پل سے گذرتے ہیں کیا وہ انسان نہیں ؟
میں ہنسنے لگا !
اندر کے آدمی نے میرے طنز پہ بل کھا کر کہا، میرا مذاق مت اڑاؤ ۔ میں نے ایسی بات تم سے کب کہی ۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا ۔
ہاں ہاں، میں جانتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے تھے ۔ کیا پوچھنا چاہتے تھے ۔ یہی نا کہ اُس کی ماں کون تھی ۔ کون ہے اور وہ ۔ اس طرح اُسے اکیلا چھوڑ کر کیوں چلی گئی ۔ بس ایک تم ہی ہو جو سارے جہاں کا درد سمیٹے پھر رہے ہو ۔ تم ہر بات میں اپنی ٹانگ اڑاتے ہو ۔ اب تک تم نے مختلف طریقوں سے مجھے پریشان کیا ہے ۔ اب تم خاموش رہو ۔ میں تمھاری کوئی بات نہیں سنوں گا
اندر کا آدمی واقعی خاموش ہوگیا !
اور میں لوہے کے پل پر سے اس طرح خاموش گذر گیا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی ۔ لیکن تھکے ہوئے قدموں اور تھکے ہوئے دل کے ساتھ ۔ میری حالت ایسی ہی تھی جیسے کوئی کسی میت کے جلوس میں شرکت کے بعد لوٹتا ہو ۔
دن بھر میں بڑا ڈسٹرب رہا !
اور دن بھر آفس میں اپنی کرسی پہ بیٹھا ہوا ٹائپ رائٹر پہ جھکا ہوا ۔ ٹک ٹک ٹائپ کرتا ہوا اس واقعے کو بھلاتا رہا کہ صبح صبح میں نے کچھ دیکھا ہے ۔
لیکن میرے اندر کا انسان پتہ نہیں کیوں مجھے کچوکے دینے پہ تُل گیا تھا ۔

میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور اندر کے آدمی کی خوشامد کرتے ہوئے کہا۔ اب چھوڑو میرا پیچھا۔ اگر تم یہاں بھی مجھے پریشان کرتے رہو گے تو میں کوئی نہ کوئی لیٹر غلط ٹایپ کر دوں گا۔ اور تم جانتے ہو میرا باس کتنا سخت ہے۔ پہلے ہی مجھے پی۔ اے سے ڈی گریڈ کر کے ٹائپسٹ بنا دیا ہے۔ اگر پھر کچھ گڑبڑ ہوئی تو سمجھو کہ نوکری ختم۔

بہت ڈرپوک ہو ــــ

ہاں بابا! ہوں۔ اب چپ بھی ہو جاؤ۔ اور پھر میرے یا تمہارے سوچنے سے حاصل بھی کیا ــــ بھئی! جس کسی عورت نے اپنا بچہ کھویا ہے وہ یقیناً کسی اخبار میں اشتہار دے کر اسے حاصل کر لے گی۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ اسے ڈھونڈ رہی ہوگی۔

میں اندر کے آدمی کو چپ رہنے کا یہ مشورہ دے ہی رہا تھا کہ باس کے چیمبر سے مجھے شانتا نکلتی ہوئی نظر آئی۔

مس شانتا میرے ساتھ ٹائپسٹ ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دو مہینے کے قلیل عرصے میں اس نے اتنی بڑی چھلانگ لگائی کہ مجھے پیچھے ڈھکیل کر میری جگہ جا بیٹھی ــــ اب وہ باس کی پرسنل اسسٹنٹ ہے۔

وہ میری میز کے قریب سے ہوا کے ایک تیز جھونکے کی طرح گذر گئی۔

مس شانتا کے ہونٹوں پر جمی ہوئی لپ اسٹک جیسے بہہ چکی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں کا کاجل ذرا پھیل گیا ہے یوں لگا جیسے کسی ندی کی کوئی موج جو آگے بڑھ کر سب لے ڈوبے گی!

پتہ نہیں اسے کیا خیال آیا۔ وہ رک گئی۔ اور فوراً لوٹ کر آئی۔ میری میز کے قریب کھڑی ہو کر اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

کیا بات ہے۔ آج تم بے حد پریشان نظر آتے ہو!

میں نے کہا۔ تم ٹھیک کہتی ہو میری پریشانی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ابھی ابھی راستے میں، میں نے دیکھا کہ کسی کی ایک قیمتی شے پڑی ہے۔ اور اب تمہیں دیکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ تمہاری تو نہیں؟

میری؟

وہ جواب تک اپنے پرس کے ساتھ کھیل رہی تھی اچانک چپ ہو گئی۔ اور پھر اس نے بڑی گہری سوچ کے بعد کہا۔ نہیں میری تو کوئی شے گم نہیں ہوئی ہے۔ البتہ یہاں آنے سے پہلے، میرے کمرے میں چوری ہوئی تھی۔ پھر میری تمام ساڑیاں ــــ بلوز ــــ اور پیٹی کوٹ ــــ

چوری ہو گئے! میں نے جملہ پورا کیا۔

ہاں! اس نے بڑی اداسی سے کہا

اور میں ابھی ابھی ان سب کو راستے پر کھلا پڑا ہوا دیکھ کر آ رہا ہوں

سچ! وہ بے وقوفوں کی طرح چلائی!

میں نے کہا ــــ اور کیا۔ تم جا کر دیکھ لو ــــ

پھر جب میں اسے تفصیل سے بات بتائی تو اس نے جھنجھلا کر کہا

یو ایڈیٹ! کیا بکواس کرتے ہو!

پھر وہ اسی طرح ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی، پھسلتی ہوئی اور بہتی ہوئی چلی گئی جیسے آئی تھی

اور میں سوچنے لگا کہ اب مجھے یہ بات کس سے، شانتا، کملا اور سعیدہ بیگم سے کہنی چاہئے کہ ان کی کھوئی ہوئی قیمتی شے لوہے کے پل کے نیچے پڑی ہے۔ جاؤ اور اسے اٹھا لو ــــ

کیونکہ ــــ

بہشت کی حکومت ایسے ہی کا ہے۔
حضرت مسیح نے کہا تھا ●●

افسانہ

کھوٹا سکہ

مس کہکشاں انجم

صبح ہونے میں چند گھنٹے باقی ہیں اور بس چند گھنٹوں کے بعد جدائی کے طویل نو سال سمٹ جائیں گے اور تم یہاں میرے سامنے ہوگے۔ سب کچھ خواب سا لگے گا۔ میں تمھیں نہیں کہہ پاؤں گی کہ تم پھر میرے پاس میرے بنکر آگئے ہو۔؟ دل ابھی تک یقین نہیں کر رہا ہے کہ یہ تمھارا ہی خط آج ملا ہے، تم ہی میرے پاس آنے کیلئے بیقرار ہوگئے ہو۔ تمھیں نو برسوں کے بعد میری یاد اس طرح آئی ہے کہ تم اس دوری کو مٹا کر آنے کے لئے مچل گئے ہو۔ اف۔ ! اس دن کی تمنا میں میں نے کیا کیا سہا ہے، یہ طویل جدائی کے شب و روز دکھ کی چتا میں جل جل کر گزارے ہیں۔

تمھارا خط بار بار پڑھا۔ بار بار روئی ہوں... پتہ نہیں کہاں سے آج پھر آنسوؤں کے طوفان اُمڈ آئے ہیں۔ ورنہ عرصہ سے غم کی آگ میں جل جل کر یہ آنسو بھی سوکھ چکے تھے۔ تمھارے واپس آنے کی خبر نے جیسے ذرہ ذرہ کو خوشیاں بخش دی ہیں۔ امی کی بے نور بوڑھی آنکھوں میں نئی روشنی جاگ پڑی ہے برسوں بعد آج انھوں نے گھر کی جانب دیکھا ہے۔ تمھارا معصوم سا شگفتہ جو تمھارے سامنے توتلی زبان میں باتیں کرنا سیکھ رہا تھا آج دیکھو کتنا طرار ہو رہا ہے۔ اپنے تمام ساتھیوں کو اکٹھا کر کے خوشیوں میں جھومتا رنگین کاغذوں سے گھر کو سجا رہا ہے۔ اور یہ چند ہفتوں والی ننھی سی رعنا۔۔۔۔؟ آج نو برس کی گڑیا بن چکی ہے۔ تمھیں کیا علم ارشی! اس نے اپنے ننھے کمزور ہاتھوں کو اُٹھا اُٹھا کر کتنی بار تمھارے آنے کی دعائیں مانگی ہیں۔ کتنے آنسوؤں کے موتی لٹا لٹا کر تمھارے واپس آنے کی تمنا کی ہے ارشی! تمھیں آنے پر احساس ہوگا کہ جنت ٹھکرا کر تم جنت کے لئے بھٹک رہے تھے۔ پھولوں کو ٹھکرا کر کانٹوں سے دامن بھر رہے تھے۔

سارے دن کے ہنگاموں سے تھک کر سب کے سونے کے بعد میں تمھارا خط ہاتھوں میں لئے اس کھلے دریچہ میں بیٹھی ہوں۔ پل پل کر کے پوری رات یونہی گزر گئی ہے صبح ہونے میں بس تھوڑی سی دیر باقی ہے اور آنے والی صبح تمھیں لیکر آ رہی ہے جس کی آرزو نے مرنے بھی نہ دیا تھا۔ وہ اب آگیا ہے۔ لیکن میرے ساتھی ۔۔۔ یہ کیا بات ہے کہ میرے دل میں کوئی اُمنگ نہیں ہے، کوئی ہلچل نہیں ہے۔ خوش ہوں؟ یہ روح کی گہرائیوں میں خوشی کا جوش نہیں ہے

تمھارے جانے کے بعد امی نے کتنی ہی بار سمجھایا تھا۔ "تو فکر نہ کر دلھن! ارشد ایک نہ ایک دن ضرور تیرے پاس واپس آئے گا۔ مرد چاہے جہاں جہاں بھٹکیں، جس کسی پھول کو چاہیں گلے لگائیں۔۔ آخر میں تھک کر سب چھوڑ کر واپس اپنے گھر ہی آتے ہیں۔" امی کی اس بات کے بھروسہ پر ہی تو یہ جدائی کے ماہ و سال گزر گئے "میرا حق کوئی عورت نہیں چھین سکتی ہے" امی نے یقین دلایا تھا۔

لیکن ارشی ۔۔! آج یہی بات میرے دل میں آگ لگا رہی ہے۔ کیا میرا حق مجھے تم واپس دیدوگے ۔۔؟

جب میں تمھاری بن کر اس گھر میں آئی تھی اور چند سال تمھارے پیار کے سائے میں ہنس کر گزارے تھے تو تم میرے تھے۔ صرف میرے ... ! تم پر، تمھارے پیار پر، تمھاری ہر چیز پر صرف میرا حق تھا.... تمھاری تنہائیوں کی ساتھی، تمھاری خلوتوں کی دولت صرف میں تھی۔ تمھارے گلے سے لگ کر میں سمجھتی تھی کہ اب میں ہر مصیبت سے دور ہوگئی ہوں، مجھ پر ٹوٹنے والا ہر غم تم جھیل لوگے، مجھے ہر طوفان سے بچا لوگے تمھارا ہاتھ تھام کر میں نے دونوں جہاں کا سکون پا لیا ہے۔ یہ ہاتھ میرے [illegible]

میرے اپنے ہیں —

لیکن کل ـــ ؟ کیا کل بھی ایسا ممکن ہوگا ـــ ؟ کل کیا تمہارے گلے سے لگ کر میں یہ بھول سکوں گی کہ تم کہاں کہاں کس کس کو گلے لگا کر آئے ہو ـ کل تمہارا ہاتھ تھام کر یہ احساس کہاں جاگے گا کہ تم صرف میرے ہو۔ تمہارا پیار اچھوتا کہاں رہے گا ـ ؟ ارشی میں کیسے اپنے دل کو یقین دلاؤں کہ میرا حق تم واپس مجھے دے رہے ہو ـــ ؟ کیا تمہاری بیوی ہونے کی حیثیت سے سماجی عزت اور وقار ..... تمہارا گھر تمہاری جائیداد ہی پر میرا حق ہے۔ میں اسی کے نظریہ سے کیسے سوچوں اور مطمئن ہو جاؤں ـ میں تو اپنا حق تمہارا پیار، تمہاری چاہت کو سمجھتی ہوں۔ میں اب کیسے یقین کروں کیسے محسوس کروں کہ تم صرف میرے ہو ـ کبھی تم کو میرے بعد، ثمینہ، نرگس اور کرن نے بھی تو اپنا بنایا تھا، اپنا سمجھا تھا ـ لیکن تم کسی کے بھی نہ بنے ـــ بھونرے بنکر چمن چمن گھومتے پھرے اور آج پھر اپنے دیار میں لوٹ رہے ہو میرے دل میں جانے کیسے کیسے طوفان

اُمڈ رہے ہیں ـ ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ میں تم سے دُور چلی جاؤں ـــ لیکن پھر کیا شجاع اور رعنا کی تقدیر میں ماں باپ کا پیار پانا نہیں ہے ـ آج جیسے میں دوراہے پر بے سہارا کھڑی ہوں ..... ارشی ! میں نے دور کی پروردہ ہوں، جہاں شوہر کو سر تاج نہیں، بلکہ ساتھی مانا جاتا ہے اور جب ساتھی ایک بار غیروں کے طوفان میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا تو پھر اسے ساتھی کیسے مان لوں ؟ تم چاہے اب کتنی محبت، کتنا پیار، کتنی عزت دو لیکن یہ یقین نہیں دے سکتے کہ تم میرے ہو، میرے دکھ درد کے ساتھی ..... ! اب تمہارے ہاتھوں کو تھام کر پیار و چاہت کے نئے جہاں کی تعمیر کا شاید خیال بھی نہیں آ سکتا ـ دل کی تمام اُمنگیں، تمام آرزوئیں، دکھ کی آگ میں جل کر راکھ بن چکی ہیں ـ اب کوئی لگن، کوئی چاہت، کوئی خواہش کا احساس ہی نہیں ہوتا ـ بس ایک سماجی سمجھوتے کے تحت زندگی گزارنا ہوگی ـ خلوص و پیار کا رشتہ نہ ہوگا شوہر بیوی رہیں گے ـ سرتاج اور کنیز کی حیثیت ہوگی، رفیقِ حیات ... دکھ درد کے ساتھیوں کا سا بے لوث بے غرض پیار نہ ہوگا ... ارشی ! میں کس موڑ پر آ گئی ہوں ـ کس راہ کو اپناؤں اب تم میرے لئے ایسا کھوٹا سکہ بن گئے ہو جو انگنت ہاتھوں میں جا جا کر واپس مجھے لوٹا دیا گیا ہے ـ جسے میں رکھ بھی نہیں سکتی اور پھینک بھی نہیں سکتی ہوں ... ! بولو تم ہی بتاؤ ـ ـ میں ان جذبوں کے ساتھ کیسے تمہیں خوش آمدید کہوں ـ ؟ جی میں آتا ہے ابھی اسی وقت گھر چھوڑ دوں ؟ لیکن نہیں ... میں ماں بھی ہوں نا ... میرا شجاع ... میری رعنا آج تک اپنے پاپا کے لئے روئے ہیں ـ کل سے کیا ان کے لئے بھی روئیں ـ ؟

تم باپ تھے اپنی خوشی تمہیں عزیز تھی ـ میں ماں ہوں ـ مجھے بچوں کی خوشی عزیز ہے — کھوٹا سکہ یونہی پڑا تو رہ سکتا ہے

مہوش جویریہ

(مختصر کہانی)

بھیگی پلکوں کی مسکراہٹ

میں کالج کی لائبریری میں بیٹھا اپنے پولیٹیکل سائنس کے نوٹس مکمل کر رہا تھا میرے علاوہ صرف دو لڑکیاں اور تھیں جو سرگوشیوں میں مصروف تھیں۔ میں لکھنے میں منہمک تھا ہلکی سی آہٹ کے ساتھ دو خوبصورت ہاتھ میز پر آ ٹکے اور پھر ایک پرس اور کچھ کتابیں میز پر بکھر گئیں۔ میں نے نگاہیں اٹھائیں، سفید ساڑی میں لپٹی ایک نازک سی لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ لائبریری کا انچارج اونگھ رہا تھا میرے علاوہ وہی دو لڑکیاں تھیں۔ وہ آہستگی سے کرسی کھینچ کر میرے سامنے والی میز پر بیٹھ گئی۔ کچھ بے چین، کچھ پریشان سی، میں بظاہر لکھنے میں مصروف تھا لیکن اس کی ایک ایک حرکت پر میری نظر تھی۔ اس نے جھکی جھکی نظروں سے مجھے دیکھا اور میں جلدی سے میز پر جھک گیا

تھوڑی دیر بعد نظر اٹھائی تو اسے کچھ لکھتا ہوا پایا۔ سر جھکا ہوا تھا پلکیں بار بار جھپک رہی تھیں۔۔۔۔ میں اپنے کام کو بھول کر اس ستارے کو حواس باختہ سا دیکھ رہا تھا جو پلکوں سے ٹوٹ کر اس کی کاپی پر بکھری ہوئی تحریر کی روشنائی کو جگمگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ لکھنے میں مصروف تھی۔ اپنے اطراف پھیلے ہوئے ماحول سے بے خبر!

یکایک اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔۔۔۔ میں بوکھلا گیا۔ اُف۔۔۔۔ اس کی آنکھیں۔۔۔۔ کتنی بے بسی اور کرب تھا ان میں۔ میری بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا نہ جانے کونسا دُکھ ہے اسے کونسی پریشانی ہے۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ وہ کیا لکھ رہی ہے۔ میں نوٹس لکھنا بھول کر نظریں جھکائے ہوئے آنے والے لمحوں کا خیال کر رہا تھا کہ۔۔۔۔ یکایک ایک مدہم سسکی فضا میں گونج کر رہ گئی۔ غیر ارادی طور پر میں کھڑا ہو گیا۔۔۔ اب تو۔۔۔ وہ اور بھی سراسیمہ نظر آنے لگی۔ میں مسلسل اس کا جائزہ لیتا رہا۔ معصوم سا چہرہ کھلتا ہوا رنگ جاذب نظر نقوش کے ساتھ ہونٹ اور ٹھوڑی کے خم بڑے ہی دلکش تھے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور بھیگی پلکوں کے درمیان عجیب سی معصومیت اور خوف کا احساس ابھر رہا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اس کاغذ کو پڑھنے کی کوشش کی جھکا ہوا میز پر رکھا تھا۔ لکھا تھا ساحر۔۔۔ مجھے غلط نہ سمجھنا۔۔۔ تمہیں تمہاری خوشیوں کا واسطہ۔ تمہاری امی کو میں ناپسند ہو گئی ہوں تو۔۔۔۔ ان کے خلاف ۔۔ جانے اور کیا لکھا تھا میں آگے نہیں پڑھ سکا اور میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ "آپ کا نام ——— مریم ہے"!

اس نے پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور جلدی سے کاپی بند کرتے ہوئے گھبرائے ہوئے انداز میں جی۔۔۔ ہاں، کہہ دیا۔ ساحر سے آپ کی مراد، ساحر ندیم سے تو نہیں جو۔۔۔۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے کے لئے ابھی قدم بڑھا ہی رہی تھی کہ میں دوبارہ مخاطب ہو گیا۔ "دیکھئے۔۔۔ آپ مجھے غلط نہ سمجھئے۔۔۔ اگر آپ ساحر ندیم کو جانتی ہیں تو مجھے یعنی ان کے چھوٹے بھائی عامر ندیم کو بھی پہچان جانا چاہئے دیکھئے بھائی جان نے ایک بار آپ کا ذکر کیا تھا۔۔۔ مگر یوں ہی سا۔۔۔۔ پرسوں علم ہوا کہ وہ امی سے آپ کے بارے میں کچھ بات کر چکے ہیں۔۔۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ہماری امی محترمہ نے ان کی پسند کو ناپسند کر دیا ہے۔

اس لڑکی پہ مجھے بڑا ترس آنے لگا تھا کتنی بھولی بھالی نظروں سے اس نے اقرار کیا کہ وہ وہی ہے۔

بھابی جان کی پسند پر میں کھل اٹھا اور میں نے
طے کر لیا کہ ان چاہنے والے مسافروں کو ان
کی منزل تک پہنچا دینا چاہیئے۔
بھائی جان جو امی کے لاڈلے ہونے
کے باوجود بھی کچھ نہ کر سکے۔ اور پرسوں سے
کتنے اداس ہیں۔ انھوں نے بڑے صبر سے
امی کا فیصلہ سنا اور سر جھکا کر چلے آئے۔
مگر میں... میں ان کی اداسی کو پھر سے
مسرتوں سے ہمکنار کر دوں گا... اور پھر
مریم ہے بھی بڑی پیاری یقیناً امی کو پسند
آ جائے گی۔ بھائی جان پر مجھے پورا اعتماد
تھا۔ انہوں نے ہر لحاظ سے پسند کیا ہوگا
میں نے ایک عزم سے سر اٹھایا۔
وہ مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
مگر میں مسکرا دیا" دیکھئے آپ پریشان
نہ ہوں... میں سب کچھ ٹھیک کر دوں
گا... بھائی جان نے مجھ سے کہا نہیں تھا۔
ورنہ میں پہلے ہی کچھ نہ کچھ کرتا ضرور تھا
بہرحال یہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے
اور مجھ پر اعتماد کیجئے... انشاءاللہ وہی
ہوگا جو آپ دونوں چاہتے ہیں۔ نہیں
بلکہ اب ہم تینوں چاہتے ہیں اور... کہیئے
تو یہ خط بھائی جان تک پہنچا دوں۔ یقین
رکھیئے خط میں پڑھوں گا نہیں!
وہ اپنی بھیگی پلکوں سے مسکرا دی۔
اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔
میں آپ کا یہ احسان...!
ا... ر... ے جی نہیں یہ تو
فرض تھا میرا..." میری شرارت ہمک
آئی "کیوں... ہے نا... بھابی"
اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا
چہرہ چھپا لیا۔
میری نگاہوں میں بھابی جان کی میٹھی
میٹھی مسکراہٹ کی ٹھنڈک دوڑ گئی
لائبریری کا انچارج اونگھ رہا تھا۔

●●●

قاتل

(منی کہانی)

● فاروق راہب

اسے قاتل کی تلاش تھی!

وہ اپنی لاش کا ماتم کرنے سے پہلے اپنے قاتل کو ڈھونڈ لینا چاہتا تھا۔

لیکن دل ہلا دینے والے سناٹے کے خطرناک گھیرے میں کوئی آہٹ، کوئی دستک کوئی آواز نہ تھی۔ مگر قاتل کا کوئی نشان یا سراغ نہ ہونے کے باوجود وہ اسے پہچان سکتا تھا۔

پھر قاتل...؟!

وہ سوچ رہا تھا۔

اس کی ماں...!

نہیں! وہ تو عرصہ ہوا اسے چھوڑ کر اپنے ہمسفر کے ساتھ زندگی کے مزے لوٹ رہی تھی۔

اس کا باپ...!

نہیں!! اسے اپنی کمسن بیوی ہی کی دلجوئی سے فرصت کہاں۔

بیوی...!

وہ تو کب کی اپنا نیا ساتھی ڈھونڈ کر اس سے الگ ہو گئی تھی۔

نوکر...!

ارے وہ بیچارے!

دوست...!

نہیں! نہیں! سب معصوم ہیں۔

کوئی کسی کو قتل نہیں کرتا! دراصل ہم سب...

اس نے جھنجھلا کر سر اٹھایا اور چیخ پڑا!

"وہ رہا"

اس کا قاتل سامنے کھڑا تھا۔

اس نے میز سے پیپر ویٹ اٹھا کر اس پر وار کیا۔ زبردست چھناکا ہوا اور اس کا قاتل متعدد ٹکڑوں میں بٹ کر فرش پر بکھر گیا۔

پہلے اس نے چھت شگاف قہقہہ لگایا۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا...

●●

طنزیہ

ہم بھی کچھ کم نہیں

بشیر انور
ایم اے (عثمانیہ)

مشہور اور اہم شخصیتوں کی سوانح پڑھنا ہمارا محبوب مشغلہ ہے۔ (غیر اہم اور گمنام شخص کی سوانح عمری لکھی ہی نہیں جاتی ورنہ ہم اسے بھی پڑھ ڈالتے۔) کسی بھی بڑی شخصیت کی سوانح پڑھنے کے بعد جب ہم موضوع اور اس کے اوصاف کا خود سے موازنہ کرتے ہیں تو ہماری انا کو تسکین ہوتی ہے۔ کیونکہ اس بڑی شخصیت کے بیشتر اوصاف ہم خود میں بھی موجود پاتے ہیں۔ چنانچہ مشہور انگریزی ادیب جانسن کی سوانح عمری پڑھ کر ہمیں معلوم ہوا تھا کہ وہ پیدل چلتے وقت ہمیشہ راستے کے کھمبوں کو ہاتھ لگائے بغیر نہیں گذرتا تھا (کسی سواری میں بیٹھ کر کھمبوں کو چھونا مشکل اور خطرناک کام ہے) ہم نے جو غور کیا تو پتہ چلا کہ یہی عادت ہم میں بھی موجود ہے۔ اور راستہ چلتے ہوئے سامنے یا بازو آنے والی ہر چیز کو ہاتھ لگانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اب انگریزی ادب میں ہمارا کچھ مقام ہو یا نہ ہو، لیکن کھمبے چھونے کی عادت ہم میں اور جانسن میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔

جہاں تک اردو کے بڑے اور مشہور ادیبوں اور شاعروں کا تعلق ہے ان کی بہت ساری خصوصیات اور اوصاف ہم خود میں بدرجہ اتم موجود پاتے ہیں۔ بیکاری، مفلسی، مستی و سرشاری عشق بازی اور اسی قبیل کی جملہ "بازیوں" کے ہم بھی اسیر ہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ حضرت غالب کی سوانح حیات پڑھنے سے پیشتر ہی ہم بھی اپنے ابتدائی شعری سرمایے کو تلف کر چکے تھے۔ کیونکہ غالب کی طرح ہمیں بھی اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی تھی (آئندہ کے تعلق سے تو آنے والی نسلیں ہی بتا سکیں گی کہ ہمارا شعری "متروکہ" کس پایہ کا ہوگا) اس حیرت انگیز مطابقت کے سبب ہم خود کو غالب کا ہم پایہ سمجھتے ہیں۔ (گو کہ قد آوری میں ہم اس "مغل بچہ" کی برابری نہیں کر سکتے۔) دیگر قد آور اردو شعراء میں ہم میر کی طرح سدا آہیں بھرتے رہتے ہیں۔ ناسخ کی طرح روز روز ڈنڈ پیلنے اور غذا کے معاملے میں ان سے دو نوالے آگے ہی ہیں۔ محمد قلی کی طرح پیاریوں سے جی لگانا ہمیں بھی اچھا لگتا ہے اقبال کی طرح ہم بھی کوہ ہمالہ کو بہت ہی اونچا پہاڑ اور آسمان کا ہمسایہ سمجھتے ہیں۔ ساحر کی طرح ہم ابھی تک کنوارے ہیں حفیظ جالندھری کی طرح خود کو ہمیشہ جوان محسوس کرتے ہیں اور منٹو کی طرح طوائفوں کے مطالعے کو ہم بھی ایک سماجی خدمت سمجھتے ہیں۔

ایک غائب دماغ پروفیسر کے تعلق سے ہم نے پڑھا تھا کہ وہ بے خیالی میں چرچ سے دوسروں کی چھتریاں اور ہیٹ اٹھا لاتا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم بھی کئی بار مسجد سے دوسروں کے جوتے اٹھا کر لا چکے ہیں۔ (مسجدوں میں چھتریاں اور ہیٹ دستیاب نہیں ہوتے) اب پتہ نہیں کہ جوتے اٹھا لانے کا یہ فعل ہماری غائب دماغی کا نتیجہ ہے یا حاضر دماغی کا۔؟ ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور فلسفیوں سے ہماری یہ حیرتناک مماثلت جہاں ہمارے نفس کو ایک گونہ اطمینان اور سکون عطا کرتی ہے وہیں اس بات کا غم کھایا جاتا ہے کہ سماج نے ہمیں ابھی تک مستحقہ مقام نہیں دیا ہے مگر سماج کی اس غیر سماجی حرکت سے ہم زیادہ دیر تک دل برداشتہ اور مغموم بھی نہیں رہ پاتے بلکہ یہ سوچ کر خوش ہو جاتے ہیں اور خود کو بہتر اور برتر تصور کر لیتے ہیں کہ سر سید کی طرح ہم پر کبھی کفر کا الزام نہیں آسکا اور نہ غالب کی طرح ہم قمار بازی کی علت میں کبھی پکڑے گئے۔

ہم نے اب تک لغا ذات کا مشاہیر کی شخصیت اور حیات ہی سے موازنہ کیا ہے جبکہ سوانح عمری "حیات اور کارنامے" دونوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ دراصل ہم ہمیشہ سے "شخصیت" کو "کارناموں" پر ترجیح دیتے آئے ہیں۔ کیونکہ "کارنامے" کا بذات خود کوئی وجود نہیں ہوتا ہو سکتا ہے کہ جس بات کو کارنامہ سمجھا جا رہا ہو وہ سرے سے "کارنامہ" ہی نہ ہو۔ ویسے بھی ہم نے بہت کم دیکھا ہے کہ کسی کا کارنامہ اس کی حیات میں ہی "کارنامہ" تسلیم کیا گیا ہو اس طرح جب کارنامے موت کے بعد ہی منظر عام پر آتے ہیں تو پھر ہم اپنی زندگی میں اس کی فکر کیوں کریں؟ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی کارنامے کی بنیاد پر شخصیت کا ابھرنا یقینی نہیں ہوتا البتہ شخصیت قوی یا با اختیار ہو تو اس کے معمولی کام کو بھی کارنامہ بنایا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی سیاست میں اس کی بیسیوں مثالیں مل جاتی ہیں۔ کسی وزیر کے "جلسۂ اعترافِ خدمات" میں شرکت کے بعد ہم سوچتے رہ جاتے ہیں کہ موصوف کی ساری خدمات اور کارنامے اب تک کہاں پوشیدہ تھے جو ان کے وزارت پر فائز ہوتے ہی اچانک منظرِ عام پر آ گئے۔ رہا ادیبوں اور شاعروں کی خدمات کا اعتراف تو یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ داعیِ اجل کو لبیک کہیں یا پھر مالی اعتبار سے اس قابل ہوں کہ اپنی تخلیقات کو زیورِ طباعت سے آراستہ کر سکیں اور جلسۂ اعترافِ خدمات کے سارے اخراجات خود برداشت کر سکیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم "دائمی بقا" کے لئے اپنی موت کا انتظار کر رہے ہوں۔ کیونکہ انسان ساری زندگی میں ایک ہی بار مرتا ہے اور ہم تو اسی دن مر گئے تھے جس دن ہماری ولادت ہوئی تھی۔

سماج کی ناقدری کے ہم اکیلے ہی شاکی نہیں بلکہ بیسیوں دوسرے لوگ بھی اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔ ہمارے ایک قریبی دوست ہماری امانت ہڑپ کر گئے۔ (قریبی دوست سے اتنا تو فائدہ ہونا چاہیئے) جب ہم نے دیکھا کہ اس کی "بازیابی" مشکل ہے تو جھنجھلا کر پند و نصیحت پر اتر آئے اور ایمانداری سچائی اور شرافت کا درس دینے لگے۔ اس پر ہمارے دوست نے اطمینان اور سکون کے ساتھ کسی مشہور شاعر کا ایک شعر غلط سلط پڑھ کر یہ بتانے کی کوشش کی کہ آج کے دور میں اس قسم کے اوصافِ حمیدہ صرف کتابوں میں ملتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تخیلِ فکر، تجربہ اور مشاہدہ میں وہ اور مشہور شاعر دونوں ایک ہی سطح پر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دنیا اس شاعر کی قدر کرتی ہے اور ہمارے دوست کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ہمارے دوست کی اس منطق سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ فلاں مشہور شاعر نے اپنے کلام میں ساری دنیا کو "جھوٹ"، چوری، بے ایمانی اور خیانت کا درس دیا ہے۔ خود شاعر کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لئے ہمیں یا ہمارے دوست کو عالمِ بالا کی طرف کوچ کرنا پڑے گا۔

بعض لوگ تو بڑی شخصیتوں کے ساتھ اپنے تانے بانے ملانے میں اس سے بھی ایک ہاتھ آگے رہتے ہیں۔ اپنے ایک دوست کے ڈرائنگ روم میں ہم نے دیکھا کہ ان کا اور ہٹلر کا فوٹو ایک ہی فریم میں ٹنگا ہوا ہے ہم چکرا سے گئے اور سوچنے لگے کہ آخر ان دونوں میں کیا رشتہ ہو سکتا ہے؟ جب فریم میں لگی ہوئی تحریر پر نظر پڑی تو ساری بات واضح ہو گئی لکھا تھا "عبد الغفور اور ہٹلر۔ ان دونوں نے زندگی میں کبھی ایک دوسرے سے ملاقات نہیں کی" ہم اس تحریر کی صداقت سے تو انکار نہیں کر سکے البتہ یہ سوچنے لگے کہ جب غیر فطری تعلق پیدا کرنا ہی تھا تو انھوں نے ہٹلر ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ دنیا میں بہت سی نیک ہستیاں اور بھی گزری ہیں۔ پھر یہ سوچ کر چپ سے ہو گئے کہ ممکن ہے انھیں ان نیک ہستیوں کے فوٹو نہ مل سکے ہوں۔ اس قسم کی انتہا پسندی کے ہم قائل نہیں ہم تو صرف اپنے شوق کی خاطر بڑے لوگوں کی سوانح پڑھتے ہیں اور ان کے اوصاف اور خصوصیات کا اپنی ذات سے موازنہ کر کے خوش ہو جاتے ہیں کہ ـــ

"ہم بھی کچھ کم نہیں"

ولایتی زعفران

مسز ولیم

ضمیر جعفری

"مسز ولیم" عجب انداز کی خاتون تھی یارو!
کبھی پتھر، کبھی شعلہ، کبھی افیون تھی یارو
اگرچہ جسم کچھ سال میں خاصی گرانی تھی
اگرچہ قد بھی کچھ ترچھا تھا کاٹھی بھی پرانی تھی
گلابی گفتگو میں اب بھی خوشبوئے جوانی تھی
بڑی بی، زندگی سے والہانہ پیار رکھتی تھی
رسیلی آنکھ، تازہ روغنی رخسار رکھتی تھی
ہر انگلی ہاتھ کی ناخن تھی شب خون تھی یارو!
"مسز ولیم" عجب انداز کی خاتون تھی یارو!
جو اس کے واسطے نازک اچھوتے پھول لاتے تھے
ستارے توڑ کر جو اس کے رستہ میں بچھاتے تھے
وہ اس مغرور لیڈی سے عموماً جھاڑ کھاتے تھے
مگر جو اس تلوّن آشنا سے دور رہتے تھے
وہ اس کی مہرباں نظروں سے "موتی چور" بہتے تھے
پیاں کے درد دل کی مرہم و معجون تھی یارو!
"مسز ولیم" عجب انداز کی خاتون تھی یارو!
شب آدینہ جب سرجان نیگ آتے تھے گھر اس کے
کئی ارباب خوش خلوت بھی سنگ آتے تھے گھر اس کے
زر و زیور، جواہر رنگ رنگ آتے تھے گھر اس کے
رومالوں میں "شلنگوں" کے "شتنگ" آتے تھے گھر اس کے
زسرتاپا، خوشی سے سرخ تھی "گل گون" تھی یارو!
"مسز ولیم" عجب انداز کی خاتون تھی یارو!
ابھی دانتوں میں تھیں موتی کی لڑیاں اوچ باندھیاں
ابھی کچھ ساحلی کونجوں کی حسرت تھی نگاہوں میں!!
وہ اس سن میں بھی اک سرو رواں تھی سیر گاہوں میں
محلے بھر کی افواہوں کا ٹیلی فون تھی یارو!
"مسز ولیم" عجب انداز کی خاتون تھی یارو!

(تھامس مور)

انگریزی طنزیہ
نظموں
کا
اُردو منظوم
ترجمہ

میرا چہرہ

مرا چہرہ، اے مرے دوستو
نہ تو چاند ہے نہ گلاب ہے
مگر اے کہ تم
مری خلوتوں کے حبیب، میری جلوتوں کے قریب ہو
مری زندگی کے رفیق ہو! میری چاہ ہو
مری دھڑکنوں کے گواہ ہو!
مرے دوستو! مرے آشناؤ تمہیں کہو!
کہ وہ — "میں جو ہوں"
وہ جو میرا جوہر ذات ہے
کبھی تاب رخ سے جھلک سکا؟
کسی شیشہ گر کی دکان میں کبھی جا سکا یا سما سکا!
کبھی بک سکا، کوئی پا سکا؟
کوئی اس کے دام چکا سکا؟

(ANTHONY EUWER)

ایک انگریزی نظم کا ترجمہ

ضمیر جعفری

(طنزیہ)

اونچی سبز حویلی میں

(ایک میجر جنرل رہتا ہے)

[illegible]

گاؤں سے باہر
مٹیالی، گدرائی بھوربھل
اینٹوں کے اسکول سے ہٹ کر
نیلی سی باریک سی
اک خوابیدہ پگ ڈنڈی کے اوپر
ایک لکیر جو کھیتوں میں بل کھاتی ہے
اک اونچی سبز حویلی میں
اک میجر جنرل رہتا ہے
وہ پہلی بڑی لڑائی میں
لفٹین ہوا، کپتان ہوا
کیا ترچھی ٹوپی رکھتا تھا
جو سیدھی دل میں جا اترے
کیا لش لش کرتی
چار سنہرے بکلس والی پیٹی تھی
خود اس کے اپنے ماتھے پر بھی
ماں کے پیار فروزاں تھے
برما پہنچا، جاپان گیا
اسوان گیا، میلان گیا
تریپولی ـ شط اسمارہ
ہر منظر آنکھوں کا تارا
صحرا چھلنے، ساحل گھومے
موسم پھیکے، چہرے چومے
اسمارا سے ایران گیا
وہ جس پلٹن میدان گیا

دشمن بھی لوہا مان گیا
زخمی بھی ہوا ــــ قیدی بھی ہوا ــــ
جنرل ہو کر ــــ آخر وہ فوج سے گھر آیا
اب کھیتی باڑی کرتا ہے
ہاتھوں میں کھرپا مالی کا
اک خاکی "نکر" ٹانگوں پر
فصلوں کی نلائی کرتا ہے
مٹی کی کھدائی کرتا ہے
لوگوں کی بھلائی کرتا ہے
گھر والی ٹماٹر کھاتا ہے
اور گاتا ہے
ہپ ہپ ہرّے!
ہپ ہپ ہرّے!
تسکین کا دریا بہتا ہے
اس اونچی سبز حویلی میں
اک میجر جنرل رہتا ہے

بالوں پہ سفیدی چھٹکی ہے
کچھ پیٹ کا خطا ابھرا ابھرا
کچھ تھوڑی تھوڑی لٹکی سی
جینے کا مگر دستور وہی
انداز وہی، آواز وہی
اوقات وہی، منشور وہی!

وہ بیٹے فوج میں افسر ہیں
اک میجر پیدل پلٹن کا
اک کرنل کسی رسالے کا
چک لالے میں!
خط آتے ہیں خط جاتے ہیں
(یوں لمحے ساز بجاتے ہیں)
اک ستھرا "شیلف" کتابوں کا
(جھرمٹ انسان کے خوابوں کا)
اور طاقوں میں تصویریں بھی
صف کے جاں باز جیالوں کی
میداں میں مرنے والوں کی
چھوٹے سے "مویشی خانے" میں
اک چوکس کتّا بیٹھا ہے
اک سانڈل گائے تھان بندھی
اک دُبلا مشکی گھوڑا بھی
چائے کے ساتھ پکوڑا بھی
وہ گرم پکوڑے کھاتا ہے
اور گاتا ہے
ہپ ہپ ہرّے!
ہپ ہپ ہرّے!
ان سادہ سے دو لفظوں میں
یادوں کی راس رچاتا ہے
خوابوں کے چاند جگاتا ہے
خوش رہتا ہے
ہر آتے جاتے راہی سے
جو گذرتا ہے وہ کہتا ہے
اس اونچی سبز حویلی میں
اک میجر جنرل رہتا ہے

(ڈم ڈم سے ماخوذ)

محمد اکرام اللہ خان

فلمی دنیا کے شب و روز

(بعد کا پس پردہ)

گذشتہ دنوں خواجہ احمد عباس دو دن کے لیے اڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج میں لکچر دینے کی غرض سے حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ پہلے دن رسمی بات چیت ٹیلیفون پر ہوئی دوسرے دن حسب وعدہ اسٹاف کالج ہوسٹل کے کمرہ نمبر بارہ پر ان سے ملنے گیا۔ معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب لکچر دے رہے ہیں۔ جن صاحب نے یہ بات بتلائی وہ ان کے کمرہ میں بیٹھے ہوئے کسی کام کی نگرانی کر رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے انھوں نے یہی وقت دیا ہے۔ تو جواب ملا کہ وہ مصروف ہیں اور نہ معلوم کب آسکیں گے! ہم نے کہا جناب! لکچر کئی گھنٹوں تک تو نہیں ہوتا جس پر انھوں نے کہا ابھی پرسوں ہی کی بات ہے کہ ۔۔۔ صاحب نے مسلسل دس گھنٹہ تک لکچر دیا ہے۔ ہم نے کہا واقعی! تو کہنے لگے جی ہاں اس میں مبالغہ بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ ان کی اس صاف گوئی پر ہم کو بھی شرارت سوجھی ہم نے پھر ادباً پوچھا کہ جناب کیا یہ لوگ کھڑے ہو کر لکچر دیتے ہیں ۔۔۔ بے شک ۔۔۔ تو پھر وقفہ وقفہ سے شاید اپنی ٹانگیں بدل لیتے ہوں گے بگڑ کر بولے مجھے کیا معلوم ۔۔۔ اب جو ہماری ہنسی چھوٹی تو وہ قہر آلود نگاہوں سے ہمیں دیکھ کر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ اچانک خواجہ صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ صاحب تو اسی عالم میں باہر چلے گئے اور سلام علیک کے بعد عباس صاحب نے پوچھا کیا ہو رہا تھا۔ ہم نے پورا قصہ سنایا وہ بھی بے ساختہ ہنسنے لگے اور کہا کہ یہ صاحب میرے ساتھ نہیں آئے بلکہ اسٹاف کالج ہی میں کسی خدمت پر معمور ہیں۔

ایک طویل عرصہ کے بعد خواجہ احمد عباس سے یہ ملاقات بڑی دلچسپ اور یادگار رہی ۔۔۔ کہنے لگے تمھیں آنے سے پہلے لکھ نہ سکا۔ اسی لئے کل فون کیا تھا کہ تم کو حیرت میں ڈال دوں۔ بازار سے لوٹے تھے کچھ سامان ساتھ تھا جسے صندوق میں رکھ رہے تھے میں نے ان کی مدد کی اور پوچھا کہ اب کیا پروگرام ہے۔ بتلایا کہ ابھی ناگیشور راؤ سے ملنے جانا ہے اس کے اسٹوڈیو پہ جو اس نے بنجارہ ہل پہ بنایا ہے۔ تم بھی ساتھ چلو۔ میں نے پوچھا کیا کام ہے تو کہنے لگے بھئی دراصل میں نے اسٹاف کالج والوں کو لکھا تھا کہ مجھے دو تین دن کے لئے "ایری فلکس" کیمرہ چاہئے کسی سے اس سلسلہ میں بات کر رکھی تھی اور انھوں نے اسے بہت بہتر بات سمجھ کر ناگیشور راؤ سے اپائنٹمنٹ رکھوا دیا۔ اب کسی بھی حال وہاں جانا پڑے گا۔ تین بجنے کے سکریٹری نے کہا کہ چلنا چاہئے اور ہم سب روانہ ہو گئے راستہ میں میری بابت پوچھتے رہے۔ سنا ہے کہ تم کسی صدیقی صاحب کے ساتھ ہو گئے ہو اور سینما بنوا رہے ہو۔ میں نے کہا کہ میں کہاں بنوا رہا ہوں۔ بنا تو وہ رہے ہیں اور میں صرف ساتھ ہوں۔ بہت خوش ہوئے اور اس پروجکٹ کی تفصیلات کو سن کر کہنے لگے "ناگیشور راؤ سے مل کر وہاں چلیں گے"۔ اسٹوڈیو آ گیا ایک چھوٹے سے اور خوبصورت کاٹیج میں ہمیں بٹھایا گیا۔ جب انتظار طویل ہونے لگا تو کہنے لگے کہ بھئی آتے بھی ہیں یا ہم جائیں اور تھوڑی دیر بعد ناگیشور راؤ کسی فلم کی طرح کمرہ میں داخل ہوئے۔ دھوپ کی ٹوپی اتاری اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر سب کو دیکھا اور کہا کہ میں ناگیشور راؤ ہوں۔ ایکٹر بھی ہوں۔ پروڈیوسر بھی ہوں اور اسٹوڈیو کا مالک بھی ہوں لیکن سب سے بڑھ کر ممنون ہوں کہ آپ نے آج اس حقیر کو اپنے قدموں سے نوازا ہے کیا میں تصور میں کبھی سوچ سکتا تھا کہ آپ جیسی عظیم ہستی کے مبارک قدم مجھ تک آئیں گے۔ اس سرفرازی کے لیے میں زندگی بھر آپ کا مشکور رہوں گا۔ اب عباس صاحب کی باری تھی

کہنے لگے کہ یہ عزت بھی میرے لئے کیا کم ہے کہ آپ جیسے عظیم فنکار کے دل میں میرے لیے اتنی محبت ہے۔

ناگیشور راؤ تلگو فلم کے بہت بڑے اداکار ہیں ان کے مکان کے سامنے روزانہ سینکڑوں آدمی ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں اور بقول ان کے عوام میں اس قدر غیر معمولی مقبولیت کی وجہ آج تک خود ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اپنی زندگی کا مختصر سا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ میں نے ایک غریب خاندان میں آنکھ کھولی جسے کبھی پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہوا۔ فلموں میں آنے سے پہلے غربت کی وجہ — فلموں میں آنے کے بعد موٹاپے سے دور رہنے کے لئے اور اب اپنی صحت کی خاطر — غرض زندگی بھر پیٹ بھر کھانے کو نہ ملا۔ کبھی انتہائی غربت کا شکار تھے اور آج دولت کی زیادتی کی پریشانی سے دوچار ہیں لوگوں کی محبت ہے کہ ۵۵ برس میں بھی ہیرو کے روپ میں مسلسل گوارا کئے جا رہے ہیں۔ اب اسٹوڈیو بنا لیا ہے جسے گذشتہ سال جناب فخرالدین علی احمد مرحوم نے افتتاح کیا تھا اداکار ہونے کے ساتھ ساتھ کئی رائس مل اور فیکٹریوں کا مالک تھا اور اب فلم اسٹوڈیو کا بھی مالک ہو گیا ہوں۔ کہیں مدرسے اور کہیں دوا خانے چلا رہا ہوں اپنے پیدائشی مقام پر ایک کالج بھی بنا دیا ہے اور ابھی بہت کچھ کرنے کی تمنا ہے اس لئے کہ ہمارے ملک میں غربت بہت ہے اور غربت کیا ہوتی ہے اس کا مجھے بہتر تجربہ ہے۔

دو گھنٹے بعد جب ہم اسٹوڈیو سے نکلے تو عباس صاحب کہنے لگے یہ فرق ہے ہمارے ہندی اور تلگو فلم والوں میں۔ ہندی فلم والوں کے پاس خوشامد کے دربار لگے رہتے ہیں جس سے گھٹن سی ہوتی ہے اور یہاں دیکھو سادگی اور احساس برتری سے دور ایسا انسان جو آج بھی بھوک اور مفلسی کے دور ماضی کو نہیں بھولے۔ راستہ میں پوچھنے لگے بھئی بتاؤ مہدی حسن کیسے رہے سنا ہے کہ بہت اونچے اونچے ٹکٹ تھے۔ ہم نے کہا ہاں سننے والوں میں اتنے آدمی تھے کہ آہ و واہ کی آواز کا فرق محسوس ہی نہ ہوتا تھا۔ پھر کہنے لگے صابری برادران کیسے رہے ہم نے کہا کہ وہ سب سے مزے میں رہے جی کھول کر لوگوں سے داد لی۔ بمبئی میں بھی یہی حال تھا آج کل ایک اور قوال بمبئی میں موجود ہیں عزیز میاں جو اپنے نام کے آگے ایم اے لکھتے ہیں۔ پھر میں نے کہا سنا ہے آپ اپنی فلم نکسلائیٹ ورنگل کے کسی مقام پر بنانے والے ہیں۔ عباس صاحب نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا "بالکل نہیں" میں تو بس دو تین دن حیدرآباد کی سڑکوں پر شوٹنگ کرنے والا ہوں اپریل یا مئی میں اب ہم لوگ تلنگ روڈ پر تھے اور عباس صاحب سے یہاں وہاں موجود لوگوں کا تعارف کروا رہا تھا۔ یہ ہیں صدیقی صاحب آرکیٹیکٹ اور فرحین ۷۰ ایم ایم کے بنانے والے یہ ہیں جیلانی ہیرک اور یہ جو ادھوری تعمیر نظر آ رہی ہے وہ ہے فرحین ۷۰ ایم ایم۔ ایک آرکیٹیکٹ کا تصور اور ان دیوانوں کا خواب... جس کی تعمیر میں زندگی بھر کے منصوبوں، ارادوں اور ارمانوں کی تکمیل چھپی ہوئی ہے۔ ساری تفصیلات کو سن کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے بھئی ہماری خواہش ہے کہ اس سینما میں ایک بک اسٹال ضروری ہے ہم نے کہا آپ کی خواہش سر آنکھوں پر لیکن ہماری استدعا ہے کہ اس بک اسٹال کا افتتاح خود آپ ہی کے ہاتھوں ہونا چاہئے۔ اور پھر عباس صاحب فرحین کے افتتاح کے موقعہ پر آنے کے وعدہ کے ساتھ مسکراتے ہوئے ہم سب سے رخصت ہو گئے ●●

فلمی ڈائری

پانچ سال میں ایک بار جب لوک سبھا یا اسمبلی کے انتخابات کا زمانہ آتا ہے تو ہمارے فلمی ستارے اپنی عام فلمی و غیر فلمی مصروفیت سے ہٹ کر ملک کی سیاست کے تعلق سے بھی سوچتے ہیں اور بعض فلمی ستارے تو اپنی پسند کی سیاسی جماعت کی انتخابی مہم میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ گذشتہ لوک سبھا کے انتخابات میں چند ایک مشہور فلمی ستاروں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر جنتا پارٹی کی تائید کی تھی قسمت کے ستارے بھی عروج پر تھے اس لئے ان فلمی ستاروں کا سب کچھ بچ گیا اور جنتا پارٹی نے انتخابات جیت لئے۔ اب جب اسمبلی کے انتخابات کا زمانہ آیا ہے تو بہت سے سیاسی نیتا فلمی ستاروں سے ربط پیدا کر رہے ہیں اور ان کی مدد کے خواہاں ہیں۔ اور سیاسی جماعتوں کا تو پتہ نہیں لیکن جنتا پارٹی سے ہاتھ ملانے کے لئے تو کوئی فلمی ستارہ تیار نہیں۔ جنتا پارٹی کا جو خوبصورت تصور ان فلم والوں کے ذہن میں تھا وہ بہت بھیانک صورت میں ان کے سامنے آیا ہے۔ جنتا پارٹی کے بجٹ سے یہ لوگ بری طرح مایوس ہوئے ہیں۔ پھر جنتا پارٹی نے پہلے ہی میں اضافہ کیا اور اب ہزار اور پانچ ہزار روپئے کے نوٹوں کی منسوخی۔ ایسی صورت میں جنتا پارٹی کے لیڈروں کے مسکراتے چہرے انھیں متاثر نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ مسکراہٹ ستمگر کے ہونٹوں پر ہے۔

★

نہاتا کی فلم "قصہ کرسی کا" کو اور "نیاز اور نماز" کو مہاراشٹرا کی حکومت تفریحی ٹیکس سے مستثنیٰ کرنے پر غور کر رہی ہے چین سنہا کی فلم "سفید ہاتھی" کو مہاراشٹرا، دلی، گجرات اور ناگالینڈ میں تفریحی ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

★

باسو چٹرجی کی فلم "کھٹا میٹھا" جہاں بھی ریلیز ہو رہی ہے ڈسٹری بیوٹرس کا منہ میٹھا کر رہی ہے۔ کامیابی کے میٹھے پھل کا مزہ لوٹنے میں "پالی ڈور" کمپنی بھی ڈسٹری بیوٹرس سے پیچھے نہیں ہے۔ ویسٹ انڈیز سے اس فلم کے دس ہزار لانگ پلے ریکارڈس کا آرڈر وصول ہوا ہے۔ اتنا بڑا ایک آرڈر آج تک کسی فلم کے ریکارڈس کے لئے نہیں آیا۔ اس اعتبار سے یہ فلم "شعلے" اور "امر اکبر انتھونی" سے بھی بازی لے گئی ہے پچھلے ہفتے چین کی سالگرہ کے موقع پر ڈریملینڈ سنیما جہاں یہ فلم چل رہی ہے چینی باشندوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ اس فلم میں ایک چینی کردار ہے "کانگ فو" جسے رنجیت چودھری نے ادا کیا ہے

★

راجیش کھنہ کا نام ہمیشہ اخبارات اور رسالوں کی سرخیوں کی زینت بنتا رہا ہے جب اس کی فلمیں جوبلی مناتیں اس وقت بھی اور جب یکے بعد دیگرے فلاپ ہوتیں تب بھی۔ لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ اس کے نام نے مستقل شہرت اختیار کر لی ہے۔ بمبئی یونیورسٹی کے "بی۔ اے" کورس کی ایک درسی کتاب میں راجیش کھنہ پر ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے راجیش کھنہ کی شخصیت کی مقناطیسی کشش اس کتاب میں راجیش کھنہ کے ساتھ جن عظیم تاریخی ہستیوں کا ذکر ہے ان میں شیکسپیر، ڈی، ایچ۔ لارنس، الڈس ہکسلے، میکسم گورکی، جے بی کرپلانی اور جے۔ پرکاش نارائن شامل ہیں۔ ہم راجیش کھنہ کو مبارکباد دیتے ہیں اور ساتھ ہی بمبئی یونیورسٹی کے متعلقہ ارباب مجاز کی تعریف کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔!

★

فلم "فلاپ" ہو جائے تو بیچارہ فلمساز صرف اپنا سر پیٹ کر رہ جاتا ہے لیکن بمبئی کے ایک فلمساز کو اپنی بدقسمتی کا جواب عدالت میں دینا پڑ گیا۔ پونے کے ایک ڈسٹری بیوٹر نے ایک فلاپ فلم

کے ہدو ڈیوسر کے خلاف تعزیری مقدمہ دائر کردیا ہے کہ اسے دھوکا دیا گیا۔ اس نے اس سلسلے میں حالی مشیر اور اس کے ایجنٹ کے خلاف بھی مقدمہ دائر کردیا ہے جنھوں نے اسے بمبئی سرکٹ کے لئے یہ فلم لینے کی ترغیب دی تھی۔

★

سیجنے نے بھگوان گڈوانی کی مشہور کتاب "ٹیپو سلطان کی تلوار" کے حقوق خرید لئے ہیں۔ وہ اس پر ایک عظیم الشان فلم بنانا چاہتے ہے جو ۷۰ ایم ایم میں ہوگی اور ہندی اور انگریزی میں ایک ساتھ بنائی جائیگی

★

امرت نہاٹا نے دستور ہند کی دفعہ ۳۲ کے تحت اپنی فلم "قصہ کرسی کا" کی گمشدگی کے سلسلے میں حکومت ہند پر سپریم کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ اس نے مطالبہ کیا ہے کہ اسے اُس فلم کے پرنٹ فوراً واپس کئے جائیں یا پھر معاوضہ کے طور پر ۱۷ لاکھ ۵۰ ہزار روپئے ادا کئے جائیں۔

★

آئی۔ ایس جوہر ہماری فلمی دنیا کے ایک پڑھے لکھے، تجربہ کار اور ذہین ہدایت کار و فلمساز ہیں۔ ملک میں جب کبھی سیاسی ہنگامہ یا طوفان اٹھتا ہے وہ اسے فلمانے سے یہ کبھی نہیں چوکتے۔ انھوں نے جوہر اینڈ محمود ان گوا بنائی پھر جے بنگلہ دیش بنائی اور اب حال میں شریمتی اندرا گاندھی کے دور کے فیملی پلاننگ کے پس منظر میں "نس بندی" بنائی۔ یہ فلم بعض مقامات پر تو باکس آفس پر اچھی جا رہی ہے لیکن کچھ شہروں میں بُری طرح فلاپ ثابت ہو رہی ہے جوہر اس فلم میں "بوسے" کا ایک سین رکھنا چاہتے تھے لیکن سنسر نے اس کی اجازت نہیں دی۔ ویسے اب سنسر شپ کے نئے اصول اور قواعد کے تحت ہندوستان میں "بوس و کنار" کی اجازت دی گئی ہے بشرطیکہ فلم کی کہانی کے پس منظر میں اس کی واقعی ضرورت ہو۔ ظاہر ہے کہ "نس بندی" کوئی سنجیدہ فلم نہیں ہے اور اس میں بوسے کا سین بھی "ضرورت" سے زیادہ تفریح کی خاطر ٹھونسا گیا ہوگا۔ ابھی حال ہی میں ایک کناڈا فلم میں بوسے کے سین کی اجازت دی گئی ہے اور اس طرح یہ پہلی ہندوستانی فلم ہے جس نے سنسر شپ کے نئے اصولوں سے استفادہ کیا ہے۔ یہاں اس دلچسپ حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ٹامل ناڈو کے چیف منسٹر مسٹر ایم۔ جی۔ رامچندرن نے کہا ہے کہ وہ چیف منسٹر ہوتے ہوئے بھی فلموں میں کام کرنا پسند کریں گے اور انہوں نے فلموں میں بوسہ بازی کی شدید مخالفت کی ہے

★

ایمرجنسی کے خاتمے کے بعد "راجن کیس" کے انکشاف نے سارے ہندوستان میں ایک سنسنی کی لہر دوڑا دی تھی اور جس کے نتیجے میں کیرالا کے چیف منسٹر کو استعفیٰ دینا پڑا تھا اس واقعہ پر ملیالم میں ایک فلم بنائی گئی ہے سنسر نے بہت سے حصوں کو کاٹنے کے بعد اس فلم کی نمائش کی اجازت دے دی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارا سنسر سیکس یا جنس کے معاملے میں ذرا آزاد خیال ہے لیکن سیاست کے معاملے میں نہایت احتیاط سے کام لے رہا ہے۔ چنانچہ نہاٹا نے جب اپنی سیاسی فلم "قصہ کرسی کا" دوبارہ بنائی تو انھیں بھی سنسر سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے سلسلے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سنسر شپ کا یہ پالیسی تماشائیوں کے لئے مسئلہ اس لئے نہیں بن سکی کہ وہ فلموں میں سیاست کو نہیں سیکس کو دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

★

سبھاش گھئی نے "کالی چرن" بنائی جو باکس آفس پر ہٹ ثابت ہوئی۔ اب سبھاش گھئی کی ایک اور فلم "وشوا ناتھ" ریلیز ہوئی ہے جو باکس آفس پر بے حد کامیاب ثابت ہو رہی ہے۔ یہ ایک مشہور وکیل کی داستان ہے جس میں شترو گھن سنہا اور رینا رائے کے علاوہ پریم ناتھ اور پران نے بھی کام کیا ہے۔ فلم کے قانونی مشیر وینکٹیشورن جو بمبئی کے ایک مشہور وکیل ہیں اس فلم کی کہانی کے پس منظر کے محرک تھا۔ سبھاش گھئی اب گوتم اندر گوبند بنا رہے ہے

چند اس حقیقت سے تو سب لوگ واقف ہیں کہ کرمانی جمنی اور وشواناتھ مشہور کرکٹ کھلاڑی ہیں لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہوں کہ گوتم فٹبال کے اور گوبیندا ہاکی کے چمپئین ہیں۔ مگر سبھاش گھئی کی فلموں کے ناموں کی کھلاڑیوں کے ناموں سے مطابقت محض ایک اتفاق ہے۔

★

آئی۔ ایس۔ جوہر نے اپنی فلم "نس بندی" کی کل ہند نمائش کے موقعہ پر بہت سے اخباروں اور فلمی رسالوں کو خط لکھا کہ وہ اس کی فلم پر تبصرہ نہ کریں۔ آئی۔ ایس جوہر کا خیال ہے کہ ہمارے صحافی ہندوستانی فلموں کے تعلق سے بے حد جانب داری برتتے ہیں اور آئی ایس جوہر کی فلموں کو تو وہ خصوصیت سے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ آئی ایس جوہر کا خیال ہے کہ وہ قانونی طور پر اس قسم کا مطالبہ کر سکتا ہے کیونکہ وہ فلموں کو "آرٹ" نہیں بزنس سمجھتا ہے اور بزنس پر کسی بھی قسم کی تنقید کو روکنے کا اسے قانونی حق حاصل ہے۔

Registered with the Registrar of Newspaper Registered No. 8285/64

ISE 6 Phone: 52957

POONAM URDU MONTHLY

Office: Azampura, Hyderabad-500024 Editor: Nasir Kurnooli, M. A.

پونم کا خاص نمبر

> > ۱۹ء کے منتخب افسانوں کی دستاویز ہوگا
یہ جاذب نظر شمارہ

ان اہم تخلیقات پر مشتمل ہوگا جن کے خالق ہیں

عصمت چغتائی ۔ احمد ندیم قاسمی ۔ قرۃ العین حیدر ۔ رام لال ۔ غیاث احمد گدی

سہیل عظیم آبادی ۔ جیلانی بانو ۔ اقبال متین ۔ واجدہ تبسم ۔ جوگندر پال

عاتق شاہ ۔ قاضی عبدالستار ۔ بانو قدسیہ ۔ آمنہ ابوالحسن ۔ [illegible] شمید

بلراج ورما ۔ عابد سہیل ۔ اکرام جاوید ۔ رتن سنگھ ۔ ہاجرہ مسرور

اقبال مجید ۔ ابراہیم شفیق ۔ احمد یوسف ۔ فرخندہ لودھی

عفت موہانی ۔ آغا بابر ۔ کاشی [illegible] اور دوسرے متوقع فنکار

ان میں اکثر وہ فن کار ہیں جن کا نام لیئے بغیر اردو فکشن

کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی

قیمت — اور دیگر [illegible] میں — مینیجر

April 1978

Price : 1-25

اشاعت کا چودھواں سال
جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت
علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

پونم

جلد (۱۴)
شمارہ (۴)
اپریل ۱۹۷۸ء

زرِ سالانہ (۱۵) روپے
لائبریریز کے لئے (۲۰) روپے
بیرونی ممالک سے (۲۵) شلنگ

ایڈیٹر:
ناصر کرنولی ایم اے عثمانیہ

خط و کتابت کا پتہ:
نیجر ماہنامہ پونم 16-7-500/1
اعظم پورہ، حیدرآباد ۲۴---۵۰۰

مطبوعہ: دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

فہرست

روشن مستقبل

آندھرا پردیش شیڈولڈ ٹرائبس کارپوریشن۔ گریجن کوآپریٹیو کارپوریشن۔ گریجن ڈیولپمنٹ ایجنسی اور انٹگریٹیڈ ٹرائبل ڈیولپمنٹ ایجنسی کی تشکیل کی بدولت ریاست آندھرا پردیش جائز طور پر یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ قبائیلیوں کی ترقی کے لئے ایک مستحکم ادارہ جاتی بندوبست فراہم کرنے کے معاملے میں وہ ملک کی اولین ریاست ہے۔

یہ ریاست اس بات پر فخر کرسکتی ہے کہ اس نے پہاڑوں کی آغوش میں پرورش پانے والے اپنے باشندوں کو ایک نیا معاشی نظام عطا کیا ہے۔ تیسرے منصوبے میں قبائیلی بہبود کے لئے اخراجات کی گنجائش ۸۰ر۱ کروڑ روپیہ تھی جو بڑھ کر پانچویں منصوبے میں ۶۵ر۴۵ کروڑ روپیہ ہوگئی ہے۔

منصوبہ جاتی اسکیمات، زراعت، افزائش مویشیان، برقی، چھوٹی آبپاشی اور تعلیم سے متعلق سرگرمیوں پر مرکوز ہیں۔ آج ایسی طاقتیں فعمتمند ہیں جو ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ قبائیلیوں کو ان کی اپنی دقیانوسی دنیا سے نکالکر تابناک ماحول میں لایا جارہا ہے۔

ایک روشن مستقبل ان کے انتظار میں ہے

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

DIPR 37/77-78

LETTER NO: ADVT/C4/APRIL-78-1520 Dt 23-3-78

نذرِ وطن

پروفیسر شورؔ
جامعۂ کراچی

"خاص برائے پرچم"

طرب زارِ ہندوستاں چھوڑ آئے
زمیں پہ ہم اک آسماں چھوڑ آئے

کسی بزمِ زہرہ جبیناں سے نکلے
کوئی شہرِ رامش گراں چھوڑ آئے

سوادِ نگاراںِ گل پوش بھولے
عبادت گہِ قدسیاں چھوڑ آئے

کسی کافرستانِ خوباں سے اُٹھے
کوئی کعبۂ گُل رخاں چھوڑ آئے

ملائک کے جھکتے ہیں سر جس زمیں پر
وہ سجدہ گہِ کافراں چھوڑ آئے

فرشتوں کے جلتے ہیں پر جس فضا میں
وہ گلیاں، وہی آستاں چھوڑ آئے

جہاں ہر تبسّم ہے نقدِ دو عالم
وہ بازارِ زنّاریاں چھوڑ آئے

فریبِ حرم کھا کے زنّار توڑا!
کئی بُت کدے نوحہ خواں چھوڑ آئے

کُھلے کے کُھلے رہ گئے کچھ دریچے
کئی بامِ افسانہ خواں چھوڑ آئے

کسی دستِ سیمیں سے دامن چھڑایا
کسی آنکھ کو خونچکاں چھوڑ آئے

عزیزوں سے عہدِ وفا توڑ بیٹھے
غمِ دوستاں رائیگاں چھوڑ آئے

کئی ساز سلگے، کئی جام دہکے
چراغوں سے اُٹھتا دھواں چھوڑ آئے

دھڑکتے رہے جن سے دل مہ وشوں کے
وہی زمزمے نیم جاں چھوڑ آئے

گریباں کے پُرزے کہاں لے کے جاتے
فضاؤں میں کچھ دھجیاں چھوڑ آئے

ہم اک نادمیدہ سویرے کی خاطر
تجلّی کا سیلِ رواں چھوڑ آئے

سوادِ وطن کی مقدس جبیں پر
جمالِ مہ و کہکشاں چھوڑ آئے

لپکتی ہوئی بجلیوں کو صدا دی
سرِ شاخِ گل آشیاں چھوڑ آئے

تلاطم کی جانب بڑھے مسکرا کر
کناروں پہ خود کشتیاں چھوڑ آئے

گھٹن ہے یہ وادئ غربت میں جیسے
حدودِ زمان و مکاں چھوڑ آئے

صدا کس کو دیں، آہ کس کو پکاریں
کہاں تجھ کو عمرِ رواں چھوڑ آئے

یہ عالم ہے اب خامشی کا کہ جیسے
بہت دور تابِ بیاں چھوڑ آئے

وفا نالہ کش، دوستی نوحہ خواں ہے
تجھے جب سے ہندوستاں چھوڑ آئے

ہمارے منصوبوں کو کامیاب ہونا چاہیئے

ہمارے پانچسالہ منصوبوں کا مقصد فیصلہ کن انداز میں ملک کے مستقبل کی تشکیل جدید عمل میں لانا ہے۔ برسوں سے ہمارے منصوبے ملک کی معاشی ترقی کی رفتار کو تیز سے تیز کرتے آرہے ہیں۔ آندھرا پردیش میں قومی تعمیری سرگرمیوں پر ان منصوبوں نے پائیدار اثرات مرتب کئے ہیں۔

معاشی ترقی کے معاملے میں پانچواں منصوبہ سب سے زیادہ امید افزا ثابت ہوا ہے۔ منصوبے کے تحت اخراجات کی گنجائش سال ۱۹۷۳-۷۴ میں ۹۲ کروڑ روپیے تھی جو بڑھ کر ۱۹۷۴-۷۵ میں ۱۴۸ کروڑ روپیے، ۱۹۷۵-۷۶ء میں ۲۰۳ کروڑ روپیے، ۱۹۷۶-۷۷ء میں ۲۹۸ کروڑ روپیے اور ۱۹۷۷-۷۸ء میں ۳۸۳ کروڑ روپیے ہوگئی ہے۔ اندازہ ہے کہ سال ۱۹۷۸-۷۹ میں منصوبے کے تحت فراہم کی جانے والی گنجائش ۴۸۷ کروڑ روپیوں تک پہنچ جائے گی۔ اس طرح سال ۱۹۷۸-۷۹ میں منصوبہ جاتی اخراجات کی رقم پورے چوتھے منصوبے کی رقم کے تقریباً مساوی ہوجائے جو ۴۹۹ کروڑ روپیے تھی۔ پانچویں منصوبے کی پوری مدت کے دوران ۱۴۸۰ کروڑ روپیے سے زائد رقم خرچ ہوگی جو چوتھے منصوبے کے اخراجات سے تین گنا زیادہ ہے۔

ہمارے منصوبوں کی کامیابی کی صورت میں ہی

عوام خوشحالی سے ہمکنار ہوسکتے ہیں

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش ۔ حیدرآباد

LETTER NO : ADVT/C4/APRIL-78 . 1526 dt 23-3-78 DPR 38/77-78

حالی کا تنقیدی شعور

رشید الدین

اردو ادب میں حالی کی شخصیت بڑی پہلو دار ہے۔ وہ ایک شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ مصلحِ قوم بھی ہیں اور مجتہدِ عصر بھی۔ روایتی اور گھسی پٹی ڈگر سے ہٹ کر انھوں نے جو غزلیں لکھیں اور جدید موضوعات پر جو نظمیں سپرد قلم کیں وہ اردو شاعری کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ نثر میں انھوں نے سوانح نگاری کی بنا رکھنے کے علاوہ تنقید نگاری کی بھی نیو ڈالی۔

ان کا "مقدمہ شعر و شاعری" جدید تنقید کی سب سے پہلی کڑی ہے۔ انھوں نے اپنے دیوان کا جو دیباچہ یا مقدمہ "شعر و شاعری" کے عنوان سے لکھا تھا اس کا مقصد محض اس زمانے کے عوام اور خواص کو جدید رجحانات سے آگاہ کرنا اور انھیں ان کی مروجہ روش سے ہٹا کر جدید شاعری کے لئے تیار کرنا تھا لیکن ایسا کرتے ہوئے انھوں نے نادانستہ طور پر اردو میں تنقید کی بنیاد ڈالی اور ایک شاعر ہوتے ہوئے اردو کے سب سے پہلے نقاد کا تاج اپنے سر پر رکھا۔

لفظ تنقید نقد سے مشتق ہے جس کے معنی تولنا، جانچنا، پرکھنا ہے۔

ادب میں ایک صنف ہے جس میں شعری و نثری تخلیقات کو کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ اس کے چند مسلمہ اصول ہوتے ہیں۔ صرف ذاتی پسند ناپسند کی بنا پر کسی تخلیق کی صرف مذمت تنقید نہیں کہلا سکتی بلکہ تنقید ان دونوں سے الگ ہوتی ہے اور اس میں غیر جانبداری کے ساتھ کسی تخلیق کا جائزہ شرطِ اولین ہے۔

تنقید کی ابتدا یونان سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد اہل روما کا نمبر آتا ہے پہلے علماء کے فیصلے اٹل سمجھے جاتے تھے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں علوم و فنون کی ترقی کی وجہ سے تنقید علماء کی گرفت سے آزاد ہوئی۔ اس کے بعد فنِ تنقید نے بے حد ترقی کی۔ اردو میں تنقید یورپ سے آئی۔ بعد میں اردو تنقید پر مارکسی تنقید کا زبردست اثر پڑا۔ مارکس کے نزدیک زندگی جدلیاتی تنقید ہے اور ادب کو بھی یہی ہونا چاہئے کیونکہ ادب زندگی کی تنقید ہے۔

اردو تنقید کی ابتداء ارادتاً نہیں کی گئی بلکہ یہ ایک امر اتفاقی ہے اور اس کا سہرا ایک شاعر کے سر جاتا ہے جس نے اپنی شاعری کی وکالت کرتے ہوئے نادانستہ طور پر اردو میں تنقید کی ابتدا کی۔ حالی نے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھتے ہوئے قدیم اردو شاعری کی جو برائی کی تھی اور شاعری میں جدید رجحانات کی جو ستائش کی تھی اس نے بڑی شہرت حاصل کی اور اس زمانے میں اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ اس وقت زیادہ تر اس کی مخالفت کی گئی لیکن اچھے لوگوں نے اس کا اچھا اثر بھی قبول کیا۔ بعد میں زمانے نے اس پر مہرِ صداقت ثبت کر دی اور یہ مقدمہ علیٰحدہ کتابی صورت میں شائع ہوا اور آج تک شائع ہوتا آ رہا ہے اور زبان و ادب کے طالب علم اس سے اپنے شعور و آگہی میں اضافہ کرتے [illegible]

سوال یہ ہوتا ہے کہ آخر حالی نے اپنے مقدمہ میں کیا لکھا تھا۔ حالی نے دراصل اپنے مقدمہ میں پہلے شاعر [illegible] کوچہ میں قدم رکھنے [illegible] دیئے تھے اور آخر میں اس زمانے کی مروجہ اصناف سخن، غزل، رباعی، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی وغیرہ کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا تھا اور بتایا تھا کہ ان اصناف کو نئے زمانے کے لحاظ سے کس طرح برتنا چاہئے۔

حالی کا خیال تھا کہ شاعری کے کوچہ میں اس شخص کو قدم رکھنا چاہئے جس کی فطرت میں قدرت نے شاعری کا ملکہ

ودیعت کیا ہو ورنہ تمام کوششیں اور کاوشیں رائیگاں ہو جائیں گی۔ ان کا خیال تھا کہ یوں تو ہر فن اور ہر پیشہ میں کمال حاصل کرنے کے لئے فطری مناسبت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن شاعری میں یہ کچھ زیادہ ہی درکار ہے۔

حالی اس خیال کے حامی تھے کہ شاعری میں جہاں تک ممکن ہو سکے حقیقت اور راستی پر نظر رکھنی چاہئے اور رنگ گل سے بلبل کے پر نہیں باندھنے چاہئے۔ ان کا خیال تھا شاعر بننے کے لئے سب سے پہلے استعداد اور پھر نیچر کا مطالعہ اور اس کے ساتھ کثرت سے اساتذہ کا کلام دیکھنا اور اگر میسر آئے تو ان لوگوں کی صحبت سے مستفید ہونا جو شعر کا صحیح ذوق رکھتے ہوں۔

ضروری ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے نیچرل شاعری کا وہ باب لکھ دیا ہے جو اردو تنقید میں خاصہ کی چیز ہے۔ بالہای بار انھوں نے مذہب کے اثرات کو اس کے ذریعہ اردو میں روشناس کرانے کی کوشش کی۔ حالی نے صاف طور پر لکھا ہے کہ شاعری میں مبالغہ، جھوٹ، بہتان، افتراء، خوش آمد، بے معنی ادعا، بے جا تعلی، الزام تراشی، لایعنی شکوہ، بے محل باتیں اور اسی قسم کے خیالات سے جو راستی اور صداقت کے منافی ہیں بچنا چاہئے۔

حالی کا خیال تھا کہ شاعری میں زبان کو صفائی اور درستگی کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے صنائع بدائع پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے محاورہ اور روزمرہ کا فرق بتایا ہے۔ ضرب المثل اور تلمیح کی وضاحت کی ہے آج ہمیں ان کے یہ بیانات از کار رفتہ معلوم ہوں گے لیکن اس زمانے میں اس کی بڑی ضرورت تھی بلکہ ایک لحاظ سے آج بھی ہے

حالی کا یہ بھی خیال تھا کہ جب تک دل میں جذبہ یا احساس خود بخود جوش نہ مارے، شاعری کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے اس بارے میں مختلف لوگ مختلف رد عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ شاعری جذبہ کا اظہار بھی ہو سکتی ہے اور فکر کا بھی۔ تو بھی۔ جہاں تک جذبات و احساسات کا تعلق ہے جوش ضروری ہے تاکہ شاعر کی طبیعت میں خود بخود تحریک پیدا ہو۔ لیکن خیال و فکر کی شاعری وقتی تحریک کی محتاج نہیں ہوتی۔ تاہم حالی سے اتنا اتفاق ضرور کیا جا سکتا ہے کہ ولولہ شاعری کو جادو بیانی عطا کر سکتا ہے۔

ویسے تو حالی نے اپنے مقدمہ میں اس زمانے کی مروجہ تمام اصناف سخن پر اظہار خیال کیا ہے لیکن غزل چونکہ اس زمانے کی سب سے زیادہ مروجہ اور مقبول صنف تھی اس لئے حالی نے سب سے زیادہ اس کے بارے میں لکھا ہے۔ ان کے دور تک پہنچتے پہنچتے غزل مخصوص مضامین کے لئے مختص ہو کر رہ گئی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب غزل گو شعراء کے لئے نہ مواد ہے اور نہ اسلوب۔ اسی لئے حالی نے بطور خاص کہا تھا کہ غزل کو بہ اعتبار مضامین اور خیالات جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہئے۔ حالی ساحل پر کھڑے ہو کر ڈوبنے والوں کو بچانے کا طریقہ بتلانے والے مصلح نہیں تھے بلکہ وہ خود دریائے شاعری کے شناور تھے۔ اسی لئے خود انھوں نے اپنی غزلوں میں اپنے ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات اصلاح کے جوش میں انھوں نے غزل کے نام سے ایسے اشعار لکھ دئیے ہیں جو غزل سے زیادہ نظم کے ہو سکتے تھے مثلاً :-

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

عام طور پر ایسی ہی غزلوں کو سامنے رکھ کر لوگوں نے نئی غزل کا مذاق اڑانے کی کوشش کی لیکن ہمیں یہ بھولنا چاہئے کہ حالی ماہی نہیں تھے میں مختلف طریقے آزمارہے تھے اس لئے سپاٹ اور پھیکے اشعار کا بھی سرزد ہو جانا لازمی تھا۔ لیکن بعض غیر معمولی عمدہ تغزل کے شعر نئے خیالات اور نئے اسلوب کے ساتھ انھوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ یہی کامیاب غزلیں ہیں جنھوں نے اردو غزل کو بندگلی سے نکالا اور اقبال کے لئے نئی غزل کی زمین فراہم کی۔ غزل کے سلسلہ میں حالی نے یہ بھی کہا تھا کہ چونکہ اس کا پیمانہ مختصر ہوتا ہے اور بات دو مصرعوں میں مکمل ادا کرنی ہوتی ہے اس لئے سادگی اور صفائی کی اس میں

زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور یہ سادگی اور صفائی مشق و مزاولت کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ حالی نے اس زمانے کے شعراء سے گل و بلبل کی شاعری چھوڑنے کی التماس کی تھی تو وہ انھیں بہت ناگوار گزری تھی۔ حالی نے اپنا مقدمہ ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

"اب ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں اس کی نسبت یہ امید رکھنا کہ ہمارے دیرینہ شاعر جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھا ہوا ہے اس مضمون کی طرف التفات کریں گے یا اس کو قابل اعتنا سمجھیں گے محض بے جا ہے اور یہ خیال کرنا بھی فضول ہے کہ جو کچھ اس میں لکھا گیا ہے وہ سب واجب التسلیم ہے۔ البتہ ہم کو اپنے نوجوان ہم وطنوں سے جو شاعری کا چسکا رکھتے ہیں اور زمانے کے تیور پہچانتے ہیں یہ امید ہے کہ وہ شاید اس مضمون کو پڑھیں اور کم سے کم اس قدر تسلیم کریں کہ اردو شاعری کی موجودہ حالت بلاشبہ اصلاح یا ترمیم کی محتاج ہے۔ ہم نے اپنی ناچیز رائیں جو اس مضمون میں شاعری کی اصلاح کے تعلق سے ظاہر کی ہیں تو ان میں سے ایک رائے بھی تسلیم نہ کی جائے لیکن اس مضمون سے ملک میں ایک خیال پھیل جائے کہ فی الواقع ہماری شاعری اصلاح طلب ہے تو ہم سمجھیں گے کہ ہم کو پوری کامیابی حاصل ہوئی ہے کیونکہ ترقی کی پہلی سیڑھی اپنے تنزل کا یقین ہے"

مقدمہ کے اختتام سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں حالی کا روئے سخن زیادہ تر نوجوانوں سے تھا اور اس زمانے کے نوجوانوں ہی نے ان کی بات دھیان سے سنی۔ حالی کے تنقیدی شعور کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں بھی خوب سے خوب تر کی جستجو کارفرما تھی۔ حالی اپنے زمانے کے سماجی، معاشی اور ثقافتی حالات سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ سیاسی حالات سے بھی مطمئن نہیں تھے لیکن اس معاملہ میں وہ مجبور تھے۔ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اتنا بڑا غدر ناکام ہو چکا تھا اور انگریزوں کی جڑیں ہندوستان میں اور مضبوط ہو چکی تھیں۔ اس لیے انھوں نے سوچا کہ جو چیز بس میں نہیں اس کے لیے کوشش کرنا فضول ہے۔ البتہ جو چیز ممکن ہے اس کے لئے مقدور بھر سعی کرنی چاہئے۔

حالی پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ تنقید کے تعلق سے انھوں نے اپنے خیالات مغرب سے چرائے ہیں۔ یہ ان کے اپنے خیالات نہیں تھے۔ حالی کو انگریزی نہیں آتی تھی یہ ایک مسلم امر ہے البتہ عربی اور فارسی میں ان کی استطاعت قابل رشک تھی۔ پھر انھوں نے ذہن رسا پایا تھا۔ اس لئے جو بات اچھی ہوتی اسے فوراً اپنے ذہن و شعور سے تاڑ جاتے تھے۔ یہاں بھی یہی معاملہ ہوا۔ اپنے دلوان کا مقدمہ لکھنے بیٹھے تو انھوں نے اس زمانے کی مروجہ شاعری پر اعتراض کیا۔ اور اس میں تبدیلی کی ضرورت پر زور دیا۔ یہی بعد میں تنقید کا درجہ اختیار کر گئی۔ اب اس میں حالی کا کیا قصور ہے۔

ویسے یہ تو ماننا پڑے گا کہ حالی ایک ذہین آدمی تھے اور زمانے کی نبض پہچانتے تھے۔ ان میں اچھے اور برے کی تمیز کا مادہ خوب تھا اور اسی چیز نے انھیں اردو کا پہلا [illegible] تنقید نگار بنا دیا۔ ظاہر ہے ان کے مقدمے میں بہت سی خامیاں بھی ہوں گی لیکن اردو کی پہلی تنقیدی کوشش ہونے کی وجہ سے ہمیں انھیں نظر انداز کر دینا چاہئے۔ ویسے اس میں آج بھی بہت سی کام کی باتیں ملتی ہیں ـــ ●●

اساتذۂ سخن کی اصلاحیں

حضرت نوح ناروی

شعر:۔ مشتاق قریشی بنگلوری

وہ حیا ہیں کیا حیا اپنے رہیں محروم دید
وہ بھی کیا پردے میں ہے وہ جو سرِ محشر اٹھے

اصلاح: وہ بھی کیا حسرت ہیں حسرت نکلے جو مرنے کے بعد
وہ بھی کیا پردے میں پردہ جو سرِ محشر اٹھے

مصرعہ اولیٰ کی ترمیم سے مضمون مصرعہ ثانی قوی ہوگیا اور دونوں مصرعے برابر کے ہوگئے۔

شعر:
حشر نظارہ بنا ان کی خودآرائی کا
بخت کیا جاگ اٹھا چشمِ تماشائی کا

اصلاح:۔
بے طرح شوق ہوا ان کو خودآرائی کا
بخت کیا جاگ اٹھا چشمِ تماشائی کا

مصرعہ اولیٰ کی ترمیم سے مطلع خوب ہوگیا۔

شعر:۔ غضب ہے تم نے جسے پائمال کر ڈالا
وہ ایک دل تھا تمہارے خیال کے قابل

اصلاح:۔ رہِ ستم میں جسے پائمال کر ڈالا
وہ ایک دل تھا تمہارے خیال کے قابل

پہلے مصرعہ میں "تم نے" بیکار تھا جب کہ دوسرے مصرعہ میں "تمہارے" موجود ہے اس لئے استاد نے "رہِ ستم میں" ٹکڑا بڑھا کر حشو دور کر دیا۔

شعر:۔
انھیں تو بارِ نظر ہو رہا ہے سامنے رہنا
نگاہِ شوق کرتی ہے تقاضا دیکھتے جاؤ
وہ کہتے ہیں تمہیں ہر وقت کیوں دیکھا کرے کوئی
نگاہ [illegible] کرتی ہے تقاضا دیکھتے جاؤ

شاگرد کے پہلے مصرعہ کو دوسرے مصرعہ سے ربط نہ تھا اس لئے استاد نے ایسا نفیس مصرعہ لگا دیا کہ جس سے شعر میں لطفِ زبان پیدا ہوگیا۔

شعر:۔
ٹھہر جاؤ ذرا جی بھر کے مجھکو دیکھ لینے دو
اگر بالیں سے جاؤ میرا مردہ دیکھتے جاؤ

اصلاح:۔
ذرا ٹھہرو کوئی لحظہ میں اب میں مرنے والا ہوں
اگر بالیں سے جاؤ میرا مردہ دیکھتے جاؤ

چونکہ اصل مصرعہ میں مرنے کا ذکر نہ تھا اس لئے پہلا مصرعہ ترمیم کیا گیا "اب میں مرنے والا ہوں"۔ اس جاندار ٹکڑے کی کیا داد دی جائے۔

شعر:۔
وہ ابھی کم سن ہیں آتے آتے آئے گا خیال
میری حسرت کیا ہے میرا مدعا کیا چیز ہے

اصلاح:۔
وہ ابھی کم سن ہیں آتے آتے آئے گی سمجھ
میری حسرت کیا ہے میرا مدعا کیا چیز ہے

یہاں "خیال" کا محل نہ تھا "سمجھ" کا لفظ استاد نے بہت سمجھ کے رکھا ہے جس کی جس قدر داد دی جائے کم ہے۔

شعر:۔
ہوش ہے کچھ بے خبر ایسے خبر اس کی نہیں ہم کو
متاعِ ہوش مستی میں کدھر رکھ دی کہاں رکھ دی

اصلاح:
جوانی کا زمانہ ہے نہیں اس کی خبر ہم کو
متاعِ ہوش مستی میں کدھر رکھ دی کہاں رکھ دی

بے خبری کا مصرعہ اولیٰ میں کوئی ثبوت نہ تھا اس لئے "جوانی کا زمانہ ہے" یہ ٹکڑا رکھ دیا گیا۔ بالعموم جوانی میں بے خبری کا عالم رہا کرتا ہے۔

شعر: جفا پر کی جفا صیاد ظالم نے اسیروں پر
قفس کے سامنے لا لا کے شاخِ آشیاں رکھ دی

اصلاح:۔
نیا ظلم یہ صیاد نے ڈھایا اسیروں پر
قفس کے سامنے ہی لا کے شاخِ آشیاں رکھ دی

پہلے مصرعے میں "ظالم" کی ضرورت نہ تھی اور دوسرے مصرعہ میں "لا لا کے" غلط تھا کیونکہ شاخِ آشیاں تو صرف ایک ہی ہے اس لئے دونوں مصرعوں میں ترمیم کی گئی۔ دوسرے مصرعہ میں "ہی" کا لفظ قابلِ داد ہے۔

آئندہ اصلاحیں
حضرت نظام قادری بدایونی

محسن علی

"رِند کے رِند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی"

(اُردو کے مشہور ادیب اشفاق حسین صاحب مرحوم کی یاد میں)

میرے لئے یہ بات ایک حادثہ سے کم نہیں کہ میں اشفاق صاحب کا یارِ غار بنتے بنتے بچ گیا لیکن دوست بہرحال بننا پڑا، وہ بھی ایسا کہ اُن کے بڑے ہی دلچسپ زمانوں میں اُن کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہوتا اور ہر دوسرے تیسرے لمحے کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی کہ دونوں قہقہے لگاتے۔ اس دوستی میں جو بات زیادہ حائل تھی تھی اور کسی بات کو حد سے تجاوز کرنے سے روک دیتی تھی وہ ہمارا خاندانی رشتہ تھا۔ اشفاق صاحب میرے حقیقی چچا زاد بھائی تھے اور طُرفہ یہ کہ بہنوئی بھی، لیکن عمروں کا تفاوت ایسا تھا کہ ایک عرصۂ دراز تک ہم ہوتا۔ وہ میرے بزرگ بنے رہے۔ وہ بھی ایسے بزرگ حاذق کہ کبھی میری طرف نظر اُٹھا کر دیکھا بھی تو اس طرح جیسے احسان کر دیا۔

اُن کی زندگی کا وہ سکندری دور تھا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے گریجویٹ کو فاتحِ عالم سے کم درجہ نہیں دیا جاتا تھا اور انہوں نے تو شہنشاہی کی طرف قدم بڑھایا تھا۔ یعنی ریسرچ اسکالر بن گئے تھے۔ لیکن سکندری کا اصلی راز تو یہ تھا کہ وہ جامعۂ عثمانیہ کے اُس رسوائے زمانہ گروہ سے گہرا تعلق رکھتے تھے جس میں وہ شمشیر و تفنگ نواز شخصیتیں شامل تھیں جن کو تاریخِ دکن جانے کب تک مخدوم، وہ بر ہیکشی، میر حسن، عاقل علی خاں، شہاب الدین جیسے روشن ناموں سے یاد کرتی رہے گی۔

اُس دور میں اشفاق صاحب نہ نیچا بیٹھتے تھے نہ نیچا دیکھتے تھے۔ خصوصاً خاندانی احوال میں۔ اُف جب وہ اپنے گاؤں جاتے تو گاؤں کے ہر چھوٹے بڑے کو خبر ہو جاتی کہ طیلسانِ عثمانیہ آ رہے ہیں۔ راستے پر گاؤں کے لوگ باگ اُن کا درشن کرنے کے لئے گھروں سے نکل پڑتے۔ پھر اُن کے اپنے اور گاؤں کے سب سے اونچے اور وسیع مکان میں اُن کی آؤ بھگت بہ حیثیت مہمان ہوتی۔ بڑوں سے مختصر سلام ہو جاتا، چھوٹوں کو تو خاطر ہی میں نہ لاتے۔ پھر اُن کے لئے مکان کے بالائی حصے میں ایک کمرہ مخصوص ہو جاتا۔ وہیں سے اُن کی زندگی میں اس "گوشۂ عافیت" کی بنیاد پڑی، جو عمر بھر اُن کے ساتھ لگا رہا۔ انہی دنوں میں خاندان کے چھوٹے بڑوں نے مل کر خلوص اور محبت کے ساتھ زندگی بھر کے لئے اُن کا "حقِ انفرادیت" اور "حقِ خود ارادیت" تسلیم کر لیا۔ پھر سب نے بصد ادب و احترام اُن کو "حقِ آرام طلبی" اور "حقِ اعزازِ خصوصی" کے نام کی دو سندیں حوالے کر دیں جو پھر دورِ حیات میں اُن کے پاس ٹکسالی سکۂ رائج الوقت کا حکم رکھتی تھیں۔

وہ اُن دنوں شہر میں پڑھتے اور اُن کی اہلیہ گاؤں میں رہتیں۔ شوہر کے جوان چہرے پر چھائی ہوئی سالوں کی علمیت سے بار بار مرعوب ہوتیں اور اُن پر وارے نیارے ہوتیں۔ شوہر کی "ہاں" اور "نا" دونوں پر سرِ تسلیم خم کرنا اپنا پیدائشی فرض سمجھتیں۔ محترمہ کی شخصیت کی عظمت یہی ہے کہ اس فرض کو اپنی "آہ" اور "واہ" کے ساتھ ہمیشہ اس طرح نبھایا کہ نہ کسی نے اُن کی آہ سنی نہ واہ ــــ اُن کے تیار کئے ہوئے بڑے ہی لذیذ کھانوں پر کبھی شوہر خوش ہو جاتے اور اُن کی بات پر کوئی دلچسپ

بات کر لیتے تو محترمہ دلنوں شوہر کے حق میں رطب السان ہو جاتیں اور شوہر حیدرآباد چلے جاتے ۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب اشفاق صاحب دکن ریڈیو سے وابستہ ہو گئے جو یادر منزل خیریت آباد میں واقع تھا. تو وہ وہیں قریب ہی ایک مکان میں رہنے لگ گئے۔ وہ وہاں تنہا رہتے تھے۔ پھر میں بھی اُن کے ساتھ رہنے لگا۔ وہیں مجھ پر نئے راز فاش ہونے لگے۔ یوں تو اُن کو اردو کے ایک اچھے افسانہ نویس کی حیثیت سے اُن دنوں کافی شہرت مل چکی تھی لیکن یہ بھی راز مجھ پر وہیں کھلا کہ وہ ایک رندِ بلانوش کی حیثیت سے بھی شہر بھر میں کافی مشہور تھے۔ بزم رنداں میں در آنے والا ایک خاندانِ مشائخین کا وہ پہلا نمائندہ تھے (یہ اُن دنوں ایک بڑی بات تھی)

کچھ عرصے کے لئے یوسف ناظم، آج کے مشہور مزاح نگار، بھی آکر اُس گھر میں رہنے لگے۔ پھر کچھ دنوں کے لئے عاقل علی خاں نے بھی بسیرا کیا۔ کبھی وجد آتے اور اپنے سحر انگیز ترنم میں اپنا کلام سنانے لگتے اشفاق صاحب داد دینے دیتے پھر کبھی اچانک میکش آتے، بیٹھتے اور چلے جاتے اور بھی بہت سی ادبی اور غیرادبی شخصیتیں آتی تھیں اور ہر شخصیت اپنی جگہ تیس مار لگتی تھی۔ اُن کے عثمانین مذاق، حاضر جوابی

لیا ہے۔ ادبی مزاج اور شاعرانہ چھیڑ چھاڑ۔ اُن سب باتوں میں جو بات زیادہ نمایاں لگتی تھی وہ تھی اشفاق صاحب کی کم سخنی اور اُن کے بلند قہقہے ۔

اشفاق صاحب ایک ہال نما کمرے میں رہتے تھے۔ اس میں قسمت کا مارا ایک صوفہ سیٹ بھی تھا جو اُن کے ادبی دوستوں کی غیرادبی ہاتھا پائی کو برداشت کرتا، آہ کرتا اور چپ ہو جاتا ایک اور سائز آرم چیئر تھی جو آپ اکثر ریلوے ویٹنگ روم میں دیکھتے ہیں۔ وہ اسی کرسی پر بیٹھے یا لیٹے رہتے۔ جب تنہا ہوتے تو اُس ماحول میں بڑے ہی گمبھیر اور سنجیدہ نظر آتے جیسے ایک صحرا میں تنہا ایستادہ یا کسی ڈرائنگ روم میں سجا ہوا CACTUS۔ اُن سے قریب ہی ایک بک شلف تھا جو اشفاق صاحب کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔ بک شلف کچھ اس طرح کتابوں سے ٹھنسا ہوا تھا کہ اشفاق صاحب کبھی کوئی نئی کتاب لے آتے تو بک شلف کانپنے لگتا اور چیخ پڑتا۔ "رحم۔ اب اور سکت نہیں" اُس بک شلف سے میری ایک عجیب یاد وابستہ ہے۔ بس ایک رازِ سربستہ جو یونہی مجھ پر کھل گیا تھا۔ میں اشفاق صاحب کی مشہور تصنیف "اختر کی ڈائری" کی تلاش میں تھا۔ اُس وقت اُس ہال میں سوائے میرے اور کوئی نہیں

تھا۔ جب میں نے شلف ٹٹولنا شروع کیا تو اچانک ایک مڑا تڑا خط میرے ہاتھ لگ گیا جو اشفاق صاحب کی تخلیقات کے انبار میں پڑا ہوا تھا۔ میں سمجھا اُن کی کسی تخلیق کا مسودہ ہے ۔ بس یونہی بنا کسی اشتیاق کے وہ خط کھولا، وہ ایک جوابی خط تھا جو اشفاق صاحب نے لکھا تھا ۔ مخاطب کے لئے صرف ایک ہی لفظ استعمال کیا گیا۔ "بی بی" ۔ یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے خدا کرے وہ "بی بی" آج بھی بقیدِ حیات ہوں اور اپنے پوتوں، نواسوں کے ساتھ مگن ہوں۔ اُس وقت میں نے اُس خط میں القاب جو دیکھے تو میری زبان سے نکلا۔ " پکچر ا ش۔ لیکن خط کی تحریر میں جس رومانی تلذذ، زبان کی چاشنی اور ایک ادیب کے جذبات رنگین کے اظہار کی توقع تھی، وہ دھری کی دھری رہ گئی۔ تحریر کا ہر لفظ بتاتا تھا کہ اشفاق صاحب دراصل ایک سفید ریش بزرگ ہیں، بڑے مولانا ہیں کہ مخاطب کو مسلسل نصیحت کر رہے ہیں کہ "ہر غلط ترغیب سے بچو" اور ماں باپ کی مطیع رہو، ماں باپ سے بغاوت کرنا گناہِ کبیرہ ہے جس کی سزا دوزخ کی آگ ہے" وہ ایک ایسا لمحہ تھا کہ غلط ترغیبات کے مارے میرے دماغ نے اُس رندِ بلانوش کے بارے میں جو اندازے لگائے تھے، اُن پر اُس کے اصل کردار کی ایک جھلک نے ایسی کاری ضرب لگائی کہ آج بھی میرا زخم میرے پاس محفوظ ہے ۔ وہ خط میں نے اپنے پاس محفوظ کر لیا اور اُن

اُن کے بک شلف میں اُن کے مشہور زمانہ مقالے "مقام اقبال" (جو بعد میں کتاب کی شکل میں چھپی) کی تلاش کرنے لگا۔

اشفاق صاحب اور شہر حیدرآباد

دونوں ایک دوسرے سے کچھ اس طرح وابستہ تھے کہ ایک عرصہ دراز تک انھوں نے یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کیا کہ حیدرآباد کی حدود سے باہر بھی وہ تہذیب ہے، تمدن ہے جو اُن کو بے پناہ مرغوب ہے۔ جب اُن کو حیدرآباد سے جلاوطنی کا حکم ملا، حیدرآباد سے جالندھر تبادلہ ہوا تو اُن کے چہرے کا رنگ بدل گیا لیکن جب وہ جالندھر میں کچھ دن گذار کر دلّی وغیرہ گھوم پھر کر چھٹیوں پر کچھ دن کے لئے حیدرآباد آئے تو مجھ سے ملے تو پہلی بات انھوں نے یہ کہی۔ "اس حیدرآباد کے ماحول نے تو مجھے تباہ و برباد کر دیا تھا" مجھے وہ بدلے ہوئے نظر آئے چہرے پر تازگی تھی، رنگت نئی نئی لگتی تھی۔ اُن کا ذہنی ماحول ہی بدل گیا تھا۔ پہلے جن سے بات تک نہیں کرتے تھے اُن سے قریب ہو کر ملے۔ کھل کر بات کرنے لگے — میں نے کہا — ع

"نکل وطن سے کہ غربت میں ہے اور کیفیت"

تو انھوں نے کہا "ہاں۔ ہاں۔ یہ بات صحیح ہے۔"

جب تک اشفاق صاحب حیدرآباد سے باہر نہیں گئے تھے۔ میرے لئے وہ ایک بند کتاب بنے رہے اور جسے میں کبھی چوری چھپے پڑھ لیتا تھا۔ لیکن اس طرح کہ اس کتاب کو پڑھنے کا اشتیاق اور بڑھ جاتا تھا۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ وہی کتاب انھوں نے اس طرح کھول دی کہ خود بیٹھے اس کے صفحات کے صفحات مجھے پڑھ کر سناتے اور میرے ذوق و اشتیاق کی تسکین ہوتی رہتی۔ اُن دنوں جب کبھی اُن کی کوئی تخلیق کسی پرچے میں چھپ جاتی اُس کی ایک کاپی میرے پاس بھیج دیتے۔ حسب مقدور میں اپنی رائے لکھتا اور تخلیق کے مختلف پہلوؤں پر تحسینی انداز میں روشنی ڈالتا تو بہت مسرور ہوتے۔

کچھ اتفاقات ایسے بھی ہوئے کہ ایسے زمانے میں جبکہ انھوں نے اردو ادب سے ایک قسم کا بن باس لے لیا تھا تو اُس دوران اُن کو کچھ مضامین لازماً لکھنے پڑے جو وقفوں وقفوں سے چھپتے رہے۔ مخدوم کی موت پر۔ سعادت علیخاں کی موت پر۔ سجاد ظہیر کی موت پر — وہ مضامین بڑے ہی معیاری تھے اور اپنی آپ مثال — لیکن میری اہلیہ نکہت نے اُن مضامین کو پڑھ کر جس خیال کا اظہار کیا تھا وہ یہ تھا۔ "خدا کرے اشفاق بھائی کوئی مضمون نہ لکھیں۔ اُن کے مضمون لکھنے پر جی گھبراتا ہے — لکھتے ہیں تو صرف کسی دوست کی موت پر — " جب یہ رائے میں نے اشفاق صاحب کو سنائی تو انھوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا — "واہ گورے صاحب قبلہ۔ (میری اہلیہ اپنے خاندان میں گورے صاحب کے نام سے مشہور ہیں)۔ اشفاق صاحب اس نام پر بہت محظوظ ہوتے اور لفظ 'قبلہ' کا اضافہ یہ کہتے ہوئے کیا کرتے تھے کہ لکھنؤ کے نواب اگلے دنوں میں انگریزوں کو گورے صاحب قبلہ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

اشفاق صاحب کے سارے محبان خاص واقف ہیں کہ اُن کے کردار کا ایک وصف خاص تھا۔ گالی دینا۔ جس کو وہ گالی دیدیتے وہ یہ جان کر محظوظ ہو جاتا کہ چلو اشفاق صاحب نے اپنے خلوص سے مجھے بھی نوازا۔

اُن کے بہت سارے بے تکلف احباب اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اشفاق صاحب کی گالی اُن کے خلوص و محبت کا ایک گلدستہ ہوتی تھی جو وہ بڑی ہی فراخ دلی سے اکثر اپنے ملنے والے کو پیش کر دیتے۔ جو بھی اُن سے گالی سن لیتا۔ اپنی اہمیت پر ناز کیا کرتا۔ وہ ایسے شخص کو کبھی گالی نہیں دیتے جسے وہ پسند نہیں کرتے تھے۔

اشفاق صاحب کی گالیوں کا دائرہ اثر بھی اس قدر وسیع تھا کہ اُن کے اس وصف خاص کی داد، وقت کی بڑی بڑی شخصیتوں نے بھی دی ہے۔

مجھ سے انھوں نے ایک بار کہا۔ دلّی کی ایک محفل خاص میں سجاد ظہیر، سعادت علی خاں، فیض اور اُن کے علاوہ دوسرے کئی احباب تھے۔ اشفاق صاحب فیض سے اس محفل میں پہلی بار ملے تھے۔ اشفاق صاحب

بیٹھک میں آتے تو خلوص کے پھول جھڑنے لگے۔ محفل گرم ہونے لگی۔ بجائے اشعار کے احباب، اعلیٰ پائے کی گالیاں سُننے لگے بعد میں اشفاق صاحب نے کہا۔ "اس وقت فیض مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ خیر گذری میں فیض سے مخاطب نہ ہو سکا۔"

یہ بات بھی اشفاق صاحب نے مجھے بتائی کہ جب وہ دِلّی میں تھے، حضرت جوشؔ کے ساتھ اُن کی ایک شام گذری تھی۔ جوشؔ جب پاکستان کو لوٹ گئے تو وہاں سے اپنے ایک دوست کے نام انھوں نے لکھا۔ "تمھارے اس گالی دینے والے اشفاق کو سلام کہنا۔"

وہ کوئی رکشا والا ہو یا کوئی بڑا افسر، بڑا شاعر ہو یا فنکار، قریبی دوست ہو یا رشتہ دار، اشفاق صاحب نے ہر ایک کو گالی سے نوازا۔ گالی تو سبھی دیتے ہیں، غصے میں یا تضحیک کے انداز میں، لیکن اشفاق صاحب کی گالی سُن کر بے ساختہ ہنسی آجاتی تھی۔

وہ اپنی ذات کی حد تک جسمانی محنت کے قطعی قائل نہیں تھے۔ خواہ اُن کے ہر چھوٹے بڑے نے اُن کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے تھے کہ خواہ وہ کوئی تقریب ہو یا ماتمی ماحول یا کوئی سا موقع ہو، وہ کوئی چھوٹا سا جھونپڑہ ہو یا بڑی سی حویلی، مقام کی گنجائش کے مطابق اُن کے لئے ایک علیٰحدہ موزوں گوشۂ عافیت، تلاش کر نکالا جائے گا اور اُن کے لئے انتظام رہائش اس طرح ہوگا کہ اگر وہاں بہت ساری مسہریاں ہوں تو اُن میں سے جو سب سے اچھی ہوگی وہ اُن کے لئے مختص ہوگی اور اگر کسی جگہ صرف دو ہی دریاں دستیاب ہوتی ہیں تو اُن دو میں سے ایک پوری اُن کو ملے گی اور وہ بھی جو اچھی ہوگی اور دوسری ہوگی سب کے لئے۔ اس پر بیٹھ کر وہ بڑی ہی سُرخروئی سے فیصلہ کریں گے۔ "اس پر میں سوؤں گا اور تم سب مل کر اس ایک دری پر سونا۔ بہرحال ہر موقع پر کسی آرام دہ مقام پر اس آمرانہ انداز میں قابض ہو جاتے جیسے خزانے پر سانپ۔ پھر سب سے کہتے۔ "ارے دیوانو، لطفِ حیات اٹھانے کے لئے فراست کی ضرورت ہوتی ہے۔" اور خوب ہنستے۔ گرمیوں کے زمانے میں اگر کسی وقت ٹھنڈے پانی کی قلت ہوگی اور کسی صراحی میں تھوڑا سا پانی بچ رہا ہو تو ایک دوڑ لگا کر آپ اُس پر قابض ہو جائیں گے اور کہیں گے۔ "یہ میرا ہے" یہ صراحی اپنے قریب رکھ لیں گے اور جب دوسرے پانی کی تلاش میں سرگرداں رہیں گے تو مسکرا مسکرا کر سب کو دیکھیں گے اور کہیں گے۔ "بس تھوڑی ہی دیر میں نل میں پانی آجائے گا۔ یا پھر کہیں گے۔ "تم سب کاہل ہو۔ جاؤ کہیں سے پانی لے آؤ۔" اُن کی یہ ادائے خاص مجھے بہت پسند تھی۔ بجائے اُن کو خود غرض کہنے کے جب میں کہتا۔ "آپ تو اہلِ غرض ہیں" تو پھر صراحی پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہتے۔ "واہ۔ کیا موزوں اصطلاح نکالی ہے۔"

ٹھنڈے پانی کی صراحی پر ایک بات یاد آگئی۔

۱۹۶۴ء کی بات ہے۔ میں کلکتہ میں تھا اور وہ کٹک میں۔ ایک دن صبح ہی صبح میں کٹک پہونچ گیا۔ باہر اُن کی نئی نویلی کار کھڑی تھی اور اس میں سامان رکھا جا رہا تھا۔ میں جو وہاں غیر متوقع پہونچ گیا تو بہت خوش ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ سنبل پور جانے کی تیاریوں میں ہیں جہاں وہ دوسرے دن ایک ریڈیو اسٹیشن کا افتتاح کرنے والے تھے۔ مجھے اپنے ساتھ لے لیا۔ مسز اشفاق یعنی میری بہن بھی ساتھ تھیں۔

سارا اڑیسہ تپ رہا تھا۔ صبح کے نکلے جب ہم شام میں چھ بجے سنبل پور سرکٹ ہاؤس پہونچے تو سب سے پہلے ہم کو ٹھنڈے پانی کی تلاش ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ریفریجریٹر میں صرف تین بوتلیں ہیں اور الکٹرسیٹی بند ہے۔ اُن تین بوتلوں کا پانی صراحی میں بھر لیا گیا۔ سرکٹ ہاؤس کے ورانڈے میں شام کے چھ بجے بھی ہر طرف

جیسے انگیٹھیاں جل رہی تھیں۔ ہم لوگ بار بار پانی پی رہے تھے۔ جب صراحی میں پانی خطرے کے لیول تک پہونچ گیا تو اشفاق صاحب نے جھپٹ کر صراحی اپنے قبضے میں لے لی۔ اور مجھ سے جو اُن کا مہمان تھا اور میری بہن سے جو اُن کی شریکِ حیات تھیں کہا۔ "تم لوگ کہیں سے پانی کا بندوبست کر لو۔" بہرحال جوں توں کر کے وقت گذارا۔ کھانا کھایا۔ سرکٹ ہاوز کے بیرے نے کہیں سے تھوڑے سے پانی کا بندوبست کر دیا۔ رات ہوگئی۔ اندر کمروں میں سونا تو ناممکن تھا۔ کھلے وراندے میں سونے کی ٹھہری۔ وہ بھی فرش پر۔ بستر لگ گئے اُف رے وہ فرش کی تپش ایسے لگتا تھا کہ وراندے کا فرش نہیں۔ بھٹی ہے اشفاق صاحب ہیں کہ بار بار "ہائے" "ہائے" ہم نیک بندوں کو اور دوزخ! کہتے اور صراحی پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتے۔ باجی، جو زندگی میں ہمیشہ ہی صبر و برداشت کا نمونہ بنی رہیں، چپ تھیں لیکن میری تڑپ کو دیکھ کر بے تاب لگ رہی تھیں۔

قریب ایک بجنے کو آ گیا۔ میں سویا نہیں تھا ادھر اشفاق صاحب کے بستر کے پاس اب کچھ خاموشی چھا گئی تھی۔ مسافر کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ایسے میں باجی نے مجھ سے دبی آواز میں کہا ــــ "اٹھو"۔ میں فوراً اپنے بستر سے الگ ہو گیا۔ باجی نے میرا بستر ایک طرف ہٹا دیا اور اٹھ کر اشفاق صاحب کے بستر کے پاس چلی گئیں۔ صراحی پر اشفاق صاحب کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ ہمت کر کے باجی نے صراحی اٹھالی اور سیدھے میرے پاس آئیں اور فرش پر جہاں میرا بستر لگا تھا سارا پانی انڈیل دیا تاکہ فرش ٹھنڈا ہو جائے۔

باجی کی حرکت پر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ میری ہنسی پر اشفاق صاحب چونک پڑے اور جو دیکھا کہ صراحی غائب ہے تو اچانک چیخ پڑے "ہائے مار ڈالا" طیش میں اُٹھ بیٹھے اور اُس پر جب یہ دیکھا کہ پانی پورا فرش پیے ہے تو دونوں ہاتھ فضا میں اٹھا دیئے اور کہا ــ خدا تم دونوں کو غارت کرے۔ آمین۔

اشفاق صاحب سے ڈھیر سی بے تکلفی ہونے کے باوجود مجھے اُن کی بزرگی کا اتنا پاس ضرور تھا کہ اُن کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ اور وہ بھی بڑے ہی خسروانہ انداز میں یہ رسم نبھاتے رہتے۔ سنبل پور ہی سے ہم ہیرا کُنڈ ڈیم دیکھنے جا رہے تھے کار میں میں اور باجی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور آنجناب اگلی سیٹ پر۔ سنبل پور کی بستی سے جب ہم کچھ دور نکل آئے تو مجھے احساس ہوا کہ میرے سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔ اشفاق صاحب تو مسلسل سگریٹ پینے والے اور وہ بھی بڑے ہی مزے لے لے کر۔ اُن کو اس طرح دھواں اڑاتا ہوا دیکھا تو میری طلب بھی تیز ہوگئی۔ میری بے چینی کو باجی نے بھانپ لیا اور کہا۔ "تم بھی پیو۔ وہ سامنے دیکھ رہے ہیں۔"

میں نے اشارے سے کہا کہ میرے سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔

باجی نے مجھ سے کہا۔ "تم ذرا کھڑکی سے باہر دیکھتے رہو۔" پھر انھوں نے فوراً اشفاق صاحب کا شانہ تھپتھپایا۔

اشفاق صاحب نے کہا ــ "کیا ہوا۔؟"

"ایک سگریٹ دیجیے" باجی نے کہا

"سگریٹ! کیوں؟"

"یہ پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" باجی نے کچھ اونچی سرگوشی میں کہا۔

اشفاق صاحب نے بنا پیچھے پلٹے۔ اپنے الٹے ہاتھ سے ایک سگریٹ اپنے شانے پر رکھ دیا جسے باجی نے فوراً کھینچ لیا اور سگریٹ مجھے دیتے ہوئے اشفاق صاحب سے کہا۔ "پیچھے پلٹ کر مت دیکھنا۔"

اشفاق صاحب نے کہا ــ "ہوں"

میں نے پھر باجی سے سرگوشی میں کہا۔ "ماچس بھی نہیں ہے۔"

باجی اس بار اشفاق صاحب سے ذرا سرخروئی سے مخاطب ہوئیں۔ "ذرا ماچس دیجئے۔" جواب میں اشفاق صاحب نے ماچس پیچھے اچھال دی۔ پھر جب تک میں سگریٹ پیتا رہا اشفاق صاحب اسی طرح بیٹھے رہے جیسے قبلہ رُو نماز میں مصروف ہوں۔ ۔ میں سگریٹ پیتا رہا۔ وہ بیٹھے رہے

ود بزرگی یوں دھنوئیں میں اڑتی رہی۔

اگر اشفاق صاحب کے ہاتھ میں قلم جہاں آجاتا تو سب سے پہلے جو کام وہ کرتے وہ یہ ہوتا کہ دنیا بھر کے سائنس دانوں اور ڈاکٹروں کی ایک بڑی کانفرنس منعقد کرتے اور سب سے کہتے۔ "میں آپ لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ جو کچھ آپ سے ہو سکتا ہے کیجئے لیکن تمباکو نوشی کو بے ضرر بنا دیجئے تاکہ جینے کا صحیح لطف آسکے"

وہ بہت ہی یقین سے کہتے

SMOKING IS MYFIRST LOV

جس کثرت سے وہ سگریٹ پیتے، اتنا ہی اپنے سگریٹ سے وہ لطف اندوز ہوتے۔ ان کو سگریٹ پیتے ہوئے دیکھئے تو خواہش جاگتی کہ چلو ہم بھی جینا سیکھ لیں اور اس طرح سگریٹ پئیں۔ ہر قسم کا سگریٹ پیتے۔ بڑے بڑے سگار۔ گاؤں کے چپٹے۔ وقت پڑ جائے تو بیڑیاں۔ یا پھر کبھی پابندی سے حقہ۔ اور پھر شخصیت بھی ایسی ٹھاٹھ کی کہ پائپ پیتے تو شان بڑھ جاتی۔

سحر خیزی کی عادت تھی۔ صبح کی خنکیوں میں ایک ساتھ دو کپ گرم گرم چائے پیتے اور ساتھ ہی سگریٹ کے کش لیتے جاتے اور پھر پُر سکون انداز میں اپنی مخصوص کرسی پہ نیم دراز ہو کر مطالعہ کرنے لگتے۔ اور صبح طلوع ہوتی رہتی۔ صبح اس طرح ہوتی اور شام!! ... "کاش شام کا دوسرا نام شراب ہوتا، بس اپنی رنگینیوں کے ساتھ خود بہ خود آجاتی۔ وہ بھی شام کی طرح مفت"

خرچ کے معاملے میں وہ دوسروں کی حد تک جس قدر محتاط تھے، اپنی ذات کی حد تک اتنے ہی فضول خرچ۔ ویسے بوقتِ حاجت انھوں نے دام درم سبھوں کی، خواہ اپنے ہوں یا غیر ہوں، برابر مدد کی۔ خرچ تو وہ بہرحال کرتے لیکن بتاتے وہ بڑے محتاط ہیں۔ حیدرآباد میں ہم دونوں کو ایک رشتہ دار کے پاس جانا تھا جن کا گھر بہت دور تھا۔ ٹیکسی لی، یہ طئے تھا کہ جو بھی کرایہ ہوگا دونوں مل کر ادا کریں گے۔ جب ٹیکسی فراٹے بھرنے لگی اشفاق صاحب چپ تھے میں نے ذرا اُن کی طرف دیکھا تو ہنسی آگئی۔ اُن کی نظر ٹیکسی کے میٹر پہ تھی۔ انھوں نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ میں نے بھی میٹر کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں چپ ہوگئے۔ لیکن گاڑی کی آواز سے زیادہ تیز میٹر کے چلنے کی آواز آرہی تھی، کھنک، کھنک، کھنک ہم دونوں پتہ نہیں کیا سوچ رہے تھے۔ سفر تمام ہوا، ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے بعد اشفاق صاحب نے جھلا کر کہا۔ "اُف، دنیا کی سب سے ذلیل ترین سواری ٹیکسی ہوتی ہے۔ ٹیکسی کی رفتار سے زیادہ تیز اُس کا میٹر چلتا ہے اور اُن دونوں سے زیادہ تیز ہمارا دل دھڑکنے لگتا ہے"

کسی سے ملتے جلنے میں وہ بہت زیادہ تکلف کے قابل نہیں تھے۔ راست گوئی، راست بازی اور کچھ کھلاپن اُن کو بہت پسند تھا۔ اُن سے ملنے میں کوئی بہت زیادہ اداب و اخلاق برتتا تو کچھ اُلجھن سی محسوس کرتے یا پھر ملنے والے کے آداب کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ نواب ملک یار جنگ کے صاحبزادے رضی الدین جو میرے بہت ہی عزیز دوست اور ہم زلف ہیں اپنی خصوصیات کے باعث ہر کسی کے ملنسار آدمی ہیں۔ اُن کے پاس لوازمِ حیات میں سانس لینے کے بعد جس چیز کا نام آتا ہے وہ میٹھا کھانا۔ اشفاق صاحب کو اُن کی یہ حرکت محیر العقال لگتی تھی۔ ایک بار رضی الدین اشفاق صاحب سے ملنے آئے۔ اشفاق صاحب سے ملتے ہوتے سارے آداب ملحوظ رکھے۔ بالکل سکڑے سکڑائے بیٹھے رہے۔ اشفاق صاحب کی باتوں کا جواب صرف 'جی ہاں' اور 'جی نہیں' کہہ کر دیتے رہے۔ میٹھا پیش ہوا بھی تو جب تک اشفاق صاحب سے اجازت نہیں لی، چکھا نہیں۔ ملاقات کے بعد جب کہ آداب بجا لاتے ہوئے اشفاق صاحب سے رخصت ہوئے تو کچھ لمحوں بعد میں نے اشفاق صاحب سے کہا۔ "دیکھئے آداب و تکلفات میں کس طرح جکڑا ہوا تھا یہ نواب زادہ۔" تو اشفاق صاحب نے فی الفور کہا۔ "ارے یہ تو ان کا پیدائشی جرم ہے جس کی سزا وہ عمر بھر بھگتے رہیں گے۔"

قابلِ دید ہوتے تھے اشفاق صاحب جب اُن کی کسی سے ٹھن جاتی یا کسی پر اُن کو

طیش آجاتا۔ کسی نے اُنکا کوئی نقصان کر دیا ہو یا انہیں دکھ پہونچایا ہو یا کوئی یہ چاہتا ہو کہ اشفاق صاحب اُن سے دشمنی کریں۔ اشفاق صاحب کی زبان بند ہو جاتی اور وہ ٹہلنے لگتے۔ وہ بھی اس طرح کہ کسی کی اُن پر نظر نہ پڑے۔ مقابل کوئی چھوٹا ہو یا بڑا۔ کمزور ہو یا طاقت ور یہ اپنے آپ کو کچھ اس قدر بے یار و مددگار محسوس کرتے کہ ہائے، ہائے، لڑائی کا موقع آگیا ہے، لیکن بوقتِ شمشیر زنی دست ندارد۔ سامانِ حرب سے محروم فنِ سپہ گری سے ناواقف، لیکن اپنے اندر ہی اندر لڑ رہے ہیں۔ اپنے حریف سے نہیں، اپنے آپ سے۔ فطرت میں بسی ہوئی ادبیت اور فنکاری نے، صحبتِ مے اور محفلِ یاران نے اُن سے وہ دشمنی کی تھی کہ اُن کو وہ انسان ہی بننے نہیں دیا جو کارزارِ حیات میں خصومت یا جذبۂ انتقام سے لیس ہوتا ہے۔ اُن کے فطری مرکبات نے اُن کو ایک فن کار یا سمجھئے ایک انسانِ دِگر بنا دیا تھا جو زندگی کی شاہراہِ عام سے ذرا ہٹ کر چلتا ہے اور رہروؤں کا ہجوم اُسے حسرت سے تکتا ہے۔

ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا۔

"مخدوم اِن دِنوں مجھ سے بگڑا ہوا ہے"۔

میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے یہ ایک بڑی ہی رنگین محفل کی بات ہے جس کا اہتمام شہر کی ایک حسین و جمیل خاتون نے کیا تھا جو مخدوم کی شخصیت اور شاعری کی بڑی رسیا ہیں۔ شہر کی اور بھی نامور شخصیتیں اُس محفل میں شریک تھیں، اشفاق صاحب اور مخدوم صاحب بھی تھے۔ دورِ مے چلا اور ذکرِ حافظ و غالب چھڑ گیا حافظ کے ایک شعر کی شرحیں ہونے لگیں بس اسی دوران کوئی ایسی بات ہوگئی کہ مخدوم صاحب، اشفاق صاحب سے بگڑ بیٹھے۔ محفل برخواست ہونے کے بعد احباب نے گاڑی میں چلنے کے لئے کہا بھی تو پیدل چل دیئے۔ یہ ساری باتیں بتاتے ہوئے اشفاق صاحب مجھے کچھ بے چین سے نظر آئے جیسے چاہتے ہوں کہ مخدوم کو ایک اچھی سی گالی دے دیں تاکہ اُن کے پیار کا اظہار ہو جائے۔

پھر چند ہی دنوں میں ادبی رسالے "صبا" میں عمر خاں صاحب کا ایک دلچسپ مضمون چھپا جس کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ خان صاحب نے اپنے عالیشان مکان کے پُر فضا باغ میں ایک رات ایسی محفل سجائی تھی جو یاروں کا یادگار بن گئی۔ اُس محفل میں سبھی تھے۔ مخدوم، میر حسن، اشفاق، سعادت علی خاں اور بھی یار تھے۔ چاندنی کی ٹھنڈک میں سکاچ کی ٹھنڈک سب کا خون گرما رہی تھی اور جب رات زیادہ روشن ہوگئی تو سب نے دیکھا۔ بہتی سکاچ میں مخدوم اور اشفاق، دونوں کے دل مادر زاد ننگے نہا رہے تھے اور دُھل کر پوتر ہوگئے تھے۔

مخدوم، اشفاق، اشفاق، مخدوم

اکثر لوگ اکثر اوقات پر یہ دو نام ساتھ ساتھ لیتے تھے، دونوں ایک دوسرے کے لنگوٹیا یار تھے، اور سچ مچ ایک حمام کے ننگے۔ دونوں کالے کلوٹے۔ دونوں گاؤں والے۔ دونوں شہر میں آکر ایسے مہذب بنے کہ حیدرآباد کی تہذیب کو دونوں نے نئی تقدیر دے دیا۔ شہزادے اِن دونوں کی شہزادگی کے گرویدہ ہوگئے۔ دونوں آگے بڑھے تو مخدوم نے نعرہ لگایا "مشرق" اشفاق نے نغمہ لگایا "شاعرِ مشرق" — مشرق، مخدوم کا ہوگیا اور اشفاق کا شاعرِ مشرق — پھر اپنی عملی زندگی میں دونوں ایک دوسرے سے یہاں وہاں ملتے بچھڑتے رہے —

ایک دن میرے کتہ گوڑم کے مکان میں مخدوم صاحب آگئے۔ اُن دنوں اشفاق صاحب اپنے کاروبار سے تھک کر کچھ دیر میرے ہاں سستا رہا تھے۔ معلوم ہوا کہ مخدوم صاحب اور راج بہادر گوڑ صاحب کتہ گوڑم آئے ہیں۔ مزدوروں کے لئے۔ اُس شام دونوں میرے ہاں مدعو تھے۔

(باقی [illegible])

وقار خلیل

حدیثِ خواب

جاگتی آنکھوں نے پلکوں سے لکھے
کتنے ہی افسانے جنوں کے
خواہشیں رنگین برقی قمقمے ایسی
جھلا جھل ریشمی ملبوس مہکیں اور نظر خیرہ
پلک جھپکیں کہ پھوڑ ائیں سر دل کو!
جنبشِ لب سانحہ ٹھہرے؛
فقیہہِ شہر کا کچھ بھی نہ بگڑے، خود اپنی خیر!
مصلحت کی طاق میں جلتا دیا لرزاں

.... مگر تم، یوں نہ کرنا
ہاں، اگر کچھ حوصلہ ہے کر گزرنا
بے نہایت رات، افسانے بہت
نقدِ جاں لٹنے کا اندیشہ تو ہے
زندگی کرنے کا جذبہ اس قدر افزوں
کہ جیسے
سمندر پھیلتا جائے
مگر کشتی، تلاطم آشنا کشتی
بہے تو یوں بہے گرداب سے ہو کر
کہ ساحل خیر مقدم کو بڑھے، ہر فاصلہ سمٹے
...
یہ سب کیا ہے حکایت ہی حکایت
اور افسانہ ہی افسانہ
ر ق ی ق ت یہاں بھی تنہا ہے:
حدیثِ خواب کیا پوچھیں
چلو اچھا ہوا، اس واہمے سے تو نکل آئے
ہم بھی تم بھی اور وہ بھی،
کس سلیقے سے نکل آئے

سید احمد شمیم

پندارِ شکستہ

آنکھیں بند کئے
ہونٹوں پر مہرِ سکوت لگائے
اپنے آپ میں سمٹا ہوا
میں سوچ رہا تھا
اب مجھ میں الوہیت کے اوصاف
پیدا ہو چکے ہیں
—— لیکن آج میں چیخنا چاہتا ہوں
چیخ نہیں سکتا..
سینے میں آگ چھپائے
اندر ہی اندر
جل پگھل رہا ہوں
...
آخر فضا میں تحلیل ہو جاؤں گا!

○

مظہر محی الدین

محاصرہ

ہاتھ میں
طاق میں
میز پر
شیلف میں
بس کتابیں، کتابیں، کتابیں ہی تھیں
ایک دن
یک بہ یک
ایک محفل سجی
شادیانے بجے
زندگی
زندگی کے چمن زار میں
اپنا پہلا مبارک قدم جب رکھی
کتنی کلیاں کھلیں
کتنے تارے اُگے
ناگہاں!
چند سورج بھی پیدا ہوئے
سورجوں کی تپش رنگ لاتی گئی
زندگی کا چمن زار مرجھا گیا
میں جھلستا گیا
میں جھلستا گیا
آج بھی سارے سورج ہیں گھیرے ہوئے
مجھ کو جلنے سے چھٹکارا ممکن نہیں
ان کتابوں کا رکھوالا کوئی نہیں

○

(نظم)

اپنی تلاش میں...

[illegible]

...بھی ڈھونڈیں، کہاں چھپے ہیں ہم؟
...ٹھکانا، لگائیں کچھ تو پتا
...ہے اور آسمان دور تو کیا
...ملا ہوا ہے سمندروں کی طرح
...کر اتارا زمیں بسانے کو
...خاک ہمیں ماورا بنانے کو
...کون ہے فاراں کی چوٹیوں پہ کھڑا!
...کون ہے طائف میں خون میں ڈوبا
...و صداقت کا درس دیتا ہوا
...کون ہے زخموں سے چور چور بدن
...ہے کیوں، کس کے خون میں ڈوبی
...ہے لٹا قافلہ اسیروں کا
...ست جہاں کو پیام حق دیتا!
...کھوج میں محلوں کو کون چھوڑ چلا
...ذات کا عرفان دے رہا ہے کون
...نگ کے میداں میں روئے لاشوں پہ؟
...امن کا پیغامبر بنا ہے کون؟
...را! ایک مسیحا نفس صلیب لئے
...ن کا صدقہ اتارتا جائے
...پنے زمیں کو سنوارتا جائے
...او وفا کی رکھ گیا کوئی
...موں کے بن باس میں بھی ہے شاداب
...کا پرچم بلند کرتا ہوا
...مقصد ہستی بتا رہا ہے کیسے
...یہ ارجن کو دے رہا ہے کون؟
...ا بھٹک بھی رہا ہے کون؟
...ان میں ...

وہ دیکھو، دینِ الٰہی کے خواب میں ڈوبا ہوا
تلاش کرتا ہوا ستیم، شیوم، سُندرم
تلاشِ ذات، تلاشِ خدا، تلاشِ خودی
گیان مارگ پہ صدیوں سے چل رہے ہیں ہم
یہ درس گاہوں سے ذہنوں کو نور ملتا ہوا
جفا شعار جہاں کو شعور ملتا ہوا
زمیں پہ آج چمکتا ہے علم کا سورج
قلم کے نور سے روشن ہیں آگہی کے چراغ
یہ گیان، دھیان، ریاضت کی مختلف راہیں
فضائیں سنتوں کے بھجنوں سے ہو گئیں سرشار
یہ خانقاہیں، یہ درگاہیں، صوفیوں کے مزار
ہر ایک دل سے مٹائیں کدورتوں کے غبار
کبیرؒ و نانکؒ و چشتیؒ، نظامؒ و قطبؒ و فریدؒ
بڑا بنا بن کے یہ مندر دیا سنگم و جمن
یہ کاشی، گوکل، متھرا، یہ دیوی اور گیر
سکونِ قلب کی دولت لٹاتے درس گئی
سکون کی کھوج میں صدیوں کے قافلے گزرے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

یہ سیلِ شور بہا لے گیا صدا دل کی!
خلا میں گوشۂ راحت تلاش کرتا ہے
جفا پرست محبت تلاش کرتا ہے
یہ ویتنام، عرب، قاہرہ، ہیروشیما
یہ زر پرستوں کے مابین طاقتوں کی جنگ
ورق ورق پہ لکھی داستان ہیبت کی
یہ ایٹموں کی توانائی بھی ہے کیا خطرہ
خدا زمانے کی ہر شئے پہ قادرِ مطلق!
چلو کہ فکر و عمل سے سراغ پانا ہے
چلو کہ ذات کے صحرا میں منزلیں ڈھونڈیں
چلو کہ چلنا ہی اک شرط ہے سفر کے لئے
حصولِ منزلِ عرفاں ہے مقصدِ ہستی
چلو کہ خود کو وہاں ڈھونڈیں جس جگہ ہیں ہم
[illegible]
صدائے حق میں چھپی اپنی ہی صدا ہیں ہم!!

وقار خلیل

حدیثِ خواب

جاگتی آنکھوں نے پلکوں سے لکھے
کتنے ہی افسانے جنوں کے
خواہشیں رنگین برقی قمقمے ایسی
جھلاجھل ریشمی ملبوس مہکیں اور نظر خیرہ
پلک جھپکیں کہ پھوڑ ڈالیں سر دلوں کو!
جنبشِ لب سانحہ ٹھہرے:
فقیہِ شہر کا کچھ بھی نہ بگڑے، خواجگی حیراں
مصلحت کی طاق میں جلتا دیا لرزاں

.... مگر تم، یوں نہ کرنا
ہاں، اگر کچھ حوصلہ ہے کر گزرنا
ہے نہایت رات، افسانے بہت
نقدِ جاں لُٹنے کا اندیشہ تو ہے
زندگی کرنے کا جذبہ اس قدر افزوں
کہ جیسے
سمندر پھیلتا جائے
مگر کشتی، تلاطم آشنا کشتی
بہے تو یوں بہے گرداب سے ہو کر
کہ ساحل خیر مقدم کو بڑھے، ہر فاصلہ سمٹے
...
یہ سب کیا ہے حکایت ہی حکایت
اور افسانہ ہی افسانہ
ع ق ی ق ت یوں بھی تنہا ہے:
حدیثِ خواب کیا پوچھیں
چلو اچھا ہوا، اس ملبے سے تو نکل آئے
ہم بھی تم بھی اور وہ بھی،
کس سلیقے سے نکل آئے

سید احمد شمیم

پندارِ شکستہ

آنکھیں بند کئے
ہونٹوں پر مہرِ سکوت لگائے
اپنے آپ میں سمٹا ہوا
میں سوچ رہا تھا
اب مجھ میں الوہیت کے اوصاف
پیدا ہو چکے ہیں
—— لیکن آج میں چیخنا چاہتا ہوں
چیخ نہیں سکتا..
سینے میں آگ چھپائے
اندر ہی اندر
جل پگھل رہا ہوں
...
آخر فضا میں تحلیل ہو جاؤں گا!

○

مظہر محی الدین

محاصرہ

ہاتھ میں
طاق میں
میز پر
شیلف میں
بس کتابیں، کتابیں، کتابیں ہی تھیں
ایک دن
یک بہ یک
ایک محفل سجی
شادیانے بجے
زندگی
زندگی کے چمن زار میں
اپنا پہلا مبارک قدم جب رکھی
کتنی کلیاں کھلیں
کتنے تارے اُگے
ناگہاں!
چند سورج بھی پیدا ہوئے
سورجوں کی تپش رنگ لاتی گئی
زندگی کا چمن زار مرجھا گیا
میں جھلستا گیا
میں جھلستا گیا
آج بھی سارے سورج ہیں گھیرے ہوئے
مجھ کو جلنے سے چھٹکارا ممکن نہیں
ان کتابوں کا رکھوالا کوئی نہیں

○

(نظم)

اپنی تلاش میں...

نظیر قریشی

خود کو بھی ڈھونڈیں، کہاں چھپے ہیں ہم؟
ہے اپنا ٹھکانا، لگائیں کچھ تو پتا
ن تنگ ہے اور آسمان دور تو کیا
پھیلا ہوا ہے سمندروں کی طرح
نے ہم کو اتارا زمیں بسانے کو
ہے خاک ہمیں ماورا بنانے کو
یکھو! کون ہے فاراں کی چوٹیوں پہ کھڑا؟
یکھو! کون ہے طائف میں خون میں ڈوبا
ر خیر و صداقت کا درس دیتا ہوا
دیکھو! کون ہے زخموں سے چور چور بدن
لا سرنگوں ہے کیوں، کس کے خون میں ڈوبی
اں چلا ہے لٹا قافلہ اسیروں کا
ں پرست جہاں کو پیامِ حق دیتا!
ں کی کھوج میں محلوں کو کون چھوڑ چلا
ں کو ذات کا عرفان دے رہا ہے کون
ون جنگ کے میداں میں روئے لاشوں پر؟
ں میں امن کا پیغامبر بنا ہے کون؟
دیکھو! ایک مسیحا نفس صلیب لئے
حیات کا صدقہ اٹھاتا جائے
دے اپنے زمیں کو سنوارتا جائے
ر کو راہِ وفا کی دکھا گیا کوئی
کون جسموں کے بن باس میں بھی ہے شاداب
ہا یہ نیکی کا پرچم بلند کرتا ہوا
کون مقصدِ ہستی بتا رہا ہے کیسے؟
ل کا درس یہ ارجن کو دے رہا ہے کون؟
دریدی کی عصمت بچا رہا ہے کون؟
کرن وان میں سب کچھ لٹا گیا اپنا

وہ دیکھو، دینِ الٰہی کے خواب میں ڈوبا ہوا
تلاش کرتا ہوا ستیم، شیوم، سندرم
تلاشِ ذات، تلاشِ خدا، تلاشِ خودی
گیان مارگ پہ صدیوں سے چل رہے ہیں ہم
یہ درس گاہوں سے ذہنوں کو نور ملتا ہوا
جفا شعار جہاں کو شعور ملتا ہوا
زمیں پہ آج چمکتا ہے علم کا سورج
قلم کے نور سے روشن ہیں آگہی کے چراغ
یہ گیان، دھیان، ریاضت کی مختلف راہیں
فضائیں سنتوں کے بھجنوں سے ہوگئیں سرشار
یہ خانقاہیں، یہ درگاہیں، صوفیوں کے مزار
ہر ایک دل سے مٹائیں کدورتوں کے غبار
کبیر و نانک و چشتیؒ، نظامؒ و قطبؒ و فریدؒ
برندابن کے یہ مندر، دیا سنگھ و جین
یہ کاشی، گوکل، متھرا، یہ دیوی اور تکبیر
سکونِ قلب کی دولت لٹاتے درس عمل
سکون کی کھوج میں صدیوں کے قافلے گذرے
ہوس پرستوں پہ راہ طلب طویل ہوئی
یہ زر، زمین، زن و عیش کے ہیں دیوانے
دلوں کو چین کہاں، محفلوں میں، میلوں میں
مشینی دور نے دل کا سکون لوٹ لیا
صدا کے گھنگھرو بھی ساکت فضاؤں میں کھوئے
ہر ایک چہرہ یہاں اجنبی سا لگتا ہے

یہ سیلِ شور بہا لے گیا صدا دل کی!
خلا میں گوشۂ راحت تلاش کرتا ہے
جفا پرست محبت تلاش کرتا ہے
یہ ویتنام، عرب، قاہرہ، ہیروشیما
یہ زر پرستوں کے مابین طاقتوں کی جنگ
ورق ورق پہ لکھے داستان ہیبت کی
یہ ایٹموں کی توانائی بھی ہے کیا خطرہ
خدا زمانے کی ہر شئے پہ قادرِ مطلق!
چلو کہ فکر و عمل سے سراغ پانا ہے
چلو کہ ذات کے صحرا میں منزلیں ڈھونڈیں
چلو کہ چلنا ہی اک شرط ہے سفر کے لئے
حصولِ منزلِ عرفاں ہے مقصدِ ہستی
چلو کہ خود کو وہاں ڈھونڈیں جس جگہ ہیں ہم
چھپے ہوئے ہیں دلوں میں سکوں کا نور لئے
صدائے حق میں چھپی اپنی ہی صدا ہیں ہم!!

○

خیرات ندیم

سازش ہے بہاروں کی وطن ٹوٹ رہا ہے
مسموم فضاؤں میں چمن ٹوٹ رہا ہے

خانوں میں ہے تقسیم وفاؤں کی حرارت
تقدیس محبت کا چلن ٹوٹ رہا ہے

اک حرفِ تسلی بھی گراں لگتا ہے مجھ کو
کیا وقت ہے ہر بات پہ من ٹوٹ رہا ہے

اس طرح ہے حالات کا برتاؤ کہ جیسے
دھرتی پہ بلاؤں کا گگن ٹوٹ رہا ہے

بدلے ہوئے تیور کی طرح آج کا لہجہ
کیا بات ہے اندازِ سخن ٹوٹ رہا ہے

جذبوں کی گذرگاہ میں جب اپنے قدم تھے
دیکھا تو یہ تنہائی کا بن ٹوٹ رہا ہے

اُسلوب کی ان تازہ ہواؤں کی بدولت
تخلیق کا معیارِ کہن ٹوٹ رہا ہے

افکار کے سینے میں ہے وہ کرب کا عالم
اظہار سے لفظوں کا بدن ٹوٹ رہا ہے

یوں تجربہ پابند نہیں پھر بھی بتادوں
فن کار بیکار انھیں گے فن ٹوٹ رہا ہے

کیا ہم میں نہیں عشق کی دیوانگی باقی
کیوں سلسلہ دار و رسن ٹوٹ رہا ہے

بیتاب پیلی بھیتی

کوئی شکوہ نہ کسی سے بھی گلا کرتے ہیں
ہم تو ہر حال میں بس خوش ہی رہا کرتے ہیں

پیکرِ جور و جفا جور و جفا کرتے ہیں
خوگرِ عشق و وفا عشق و وفا کرتے ہیں

اپنی تو شان نرالی ہے الگ ہیں سب سے
کوئی جب زخم لگائے تو دُعا کرتے ہیں

دل سے ہم گھڑتے نہیں کوئی کبھی افسانہ
کچھ اگر کہتے ہیں تو سچ ہی کہا کرتے ہیں

مصلحت اور سیاست سے نہیں ملتے ہم
جس سے ملتے ہیں تو بس دل سے ملا کرتے ہیں

سب گزر جاتے ہیں گھٹ جاتے ہیں تھم جاتے ہیں
جو بھی طوفان زمانے میں اٹھا کرتے ہیں

تم نے سو بار کسوٹی پہ کسا ہے ہم کو
راہ کیسی بھی ہو ہم ساتھ دیا کرتے ہیں

مسکراہٹ سے بکھر جاتی ہے صبحِ صادق
بات وہ کرتا ہے تو پھول جھڑا کرتے ہیں

راہ میں سب ہی تو رہبر نہیں ملتے بیتاب
دھوکا دینے کو بھی کچھ لوگ ملا کرتے ہیں

رونق دکنی سیمابی

عُذر خواہی حقیقت کے بہانے چاہوں
وہ جو بیگانۂ عنواں ہیں، فسانے چاہوں

کربِ ماضی سے عبارت نہ سہی مستقبل
حال ہی حال ہو جس میں وہ زمانے چاہوں

دھڑکنیں کیفیتِ درد کی غمّاز بھی ہیں
زیر و بم نغموں کا سمجھوں تو ترانے چاہوں

روح اور تن کا نہ ہو جائے کہیں فاصلہ دور
اجنبی شہر میں محفوظ ٹھکانے چاہوں

لمس سے جس کے ہو گیرائی خاطر حاصل
دورِ آشوب میں وہ خواب سہانے چاہوں

بے نیازی کی کھنک، سادہ مزاجی کی چھنک
ہوں جو حاصل تو یہ انمول خزانے چاہوں

جدّتِ طبع میری داد طلب ہے رونق
لاکھ ہوں گیت نئے، راگ پرانے چاہوں

غزلیں

اسلم شیخ (ملتان، پاکستان)

ہر ادا دوست ہے اسی دشمن غمخوار کے ساتھ
جس نے آزار دیا لذتِ آزار کے ساتھ

میری مٹی بھی رہی دوشِ ہوا پر رقصاں
میں بھی برباد ہوا ہوں بڑے معیار کے ساتھ

کتنی ظلمت ہے ترے کوچے کے باہر اے دوست
کتنے سورج ہیں ترے سایۂ دیوار کے ساتھ

حادثہ یہ بھی کئی بار نظر سے گزرا
جسم تحلیل ہوئے سکوں کی جھنکار کے ساتھ

صحنِ گلشن بھی ہے مخمور فضا بھی مخمور
زندگی کھیل رہی ہے ترے میخوار کے ساتھ

وقت کے سانچے میں ڈھلتی گئی دنیا اسلمؔ
ہم مگر چل نہ سکے وقت کی رفتار کے ساتھ

سید شاہ نصیر الدین بسملؔ

سرِ منصور نے جب دار سے باتیں کی ہیں
عشق نے عشق کے معیار سے باتیں کی ہیں

ہجر میں قصۂ غم کون سناتا کس کو
آپ اپنے لبِ اظہار سے باتیں کی ہیں

بارہا آپ کے وعدوں کا بھروسہ کر کے
میں نے اکثر در و دیوار سے باتیں کی ہیں

دامنِ گل میں رلا ہے اسے رہنے کو مقام
اس لئے ہم نے ہر اک خار سے باتیں کی ہیں

کچھ بھی ہو اس نے تکلم کا شرف تو بخشا
کم سے کم تلخیٔ گفتار سے باتیں کی ہیں

خاکِ پا بن کے چلا ہوں ترے پیچھے پیچھے
یوں تیری گرمیٔ رفتار سے باتیں کی ہیں

کیا بتاؤں دلِ اغیار پہ کیا کیا گزری
میں نے بسملؔ جو کبھی یار سے باتیں کی ہیں

عکس

اسدؔ مرزاپوری

ڈھونڈتے دیر و حرم میں کیوں تری تنویر ہم
دل کے آئینہ میں پاتے ہیں تری تصویر ہم

ہو گئے ہیں کس قدر پابستۂ تقدیر ہم
خواب ہی سے مانگتے ہیں خواب کی تعبیر ہم

ذوقِ آزادی! بتائیں کیا مآلِ آگہی
خود پہن لیتے ہیں اپنے پاؤں میں زنجیر ہم

خالقِ تقدیر! یہ بھی اک سزا سے کم نہیں
خود کو سمجھیں گے کہاں تک بندۂ تقصیر ہم

انقلابِ وقت نے پہنچا دیا کس موڑ پر
ہر قدم پر دیکھتے ہیں جشنِ دار و گیر ہم

کیا خبر تھی، برق ہے پروردۂ دامانِ گل
ورنہ کیوں کرتے چمن میں آشیاں تعمیر ہم

آئینہ بن جائے گی یہ اہلِ محفل کے لئے
رنگ تم بھرنا بنا لیتے ہیں اک تصویر ہم

یہ سفر کتنا حسیں ہے کیا باتیں کیا کہیں
زندگی کی راہ میں دلدار تم دلگیر ہم

ایک نقشِ معتبر کی طرح تو دیں گے سدا
لوحِ دوراں پر ہیں اپنے خون کی تحریر ہم

شامِ غم دل کو جلا کر شمع کی صورت اسدؔ
ظلمتوں کو کر رہے ہیں روکشِ تنویر ہم

آخری لڑکی

ابراہیم جلیس

ابراہیم جلیس مرحوم برصغیر کے ایک ممتاز صحافی اور طنز نگار ہی نہیں تھے بلکہ ان کا شمار اردو کے اچھے افسانہ نگاروں میں بھی ہوتا تھا جس کی تصدیق زیرِ نظر افسانے سے ہو سکتی ہے (ادارہ)

فریدہ دنیا کی پہلی اور آخری لڑکی تھی جو امجد سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئی تھی۔

اور پھر فریدہ کی شادی ہو گئی۔

بڑی دھوم دھام سے۔

لیکن فریدہ کا دولھا امجد نہیں تھا

پھر امجد کو عورت کی محبت کسی شکل میں بھی نہیں ملی۔ وہ ساری دنیا گھوم آیا تھا۔ وہ ایک جہازراں کمپنی میں معمولی کلرک سے جہاز کے کپتان کے عہدے تک ترقی کر گیا تھا۔

پہلے وہ ایک شکستہ جہاز کی طرح زندگی کے متلاطم سمندر میں ہر طرف ہچکولے کھاتا رہا اور بالآخر وہ سچ مچ کے جہازوں میں سمندر سمندر سفر کرنے لگا۔ اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔ گھر تو وہ ہوتا ہے جس میں کسی چاند سے چہرے کی چمک ہو، چوڑیوں کی کھنک ہو اور زلفوں کی مہک ہو۔

دنیا عورتوں سے پٹی پڑی ہے۔

لیکن کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا میں ایک بھی عورت نہیں ہے امجد کو کبھی ملک ملک، شہر شہر، ان گنت عورتیں ملیں لیکن عورت کی محبت کسی شکل اور کسی رشتے میں بھی نہیں ملی۔

نہ ماں کی محبت، نہ بہن کی محبت، نہ بیوی کا پیار اور نہ بیٹی کی محبت۔ وہ پیدائش ہی کے دن مامتا سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ جیسے دنیا کی دہلیز پر پیدا ہوا تھا ادھر اس کی ماں دنیا سے نکل گئی۔

اس کی صرف ایک ہی بڑی بہن تھی وہ واقعی نورجہاں تھی، اسماً بھی اور رسماً بھی۔ نورجہاں قسم کی کوئی لڑکی جوان ہونے کے بعد دو تین کمروں والے چھوٹے غریب گھرانوں میں دیر تک رہ ہی نہیں سکتی۔

بہت زیادہ خوبصورت عورتوں کے دنیا میں صرف دو ہی ٹھکانے ہوتے ہیں مرمریں محل یا پھر بازار کے دونوں طرف دکانوں جیسے کھلے کمرے جانے نورجہاں کہاں چلی گئی تھی! کسی مرمریں محل میں یا کسی چور بازار کی کوٹھی میں یا پھر کھلے بازار کے کوٹھے پہ ـــ !! یا قبر میں زمین کے اندر یا جنت یا دوزخ میں آسمان کے اوپر؟

امجد تو صرف اتنا ہی جانتا ہے کہ ایک صبح امجد کی سوتیلی ماں نے چودہ سالہ اور کھلی کلی نورجہاں کے زور سے دو تین تھپڑ مارے تھے اسے ناشتہ بھی نہیں دیا تھا۔ اور وہ سسکتی بلکتی اسکول تو چلی گئی پھر واپس نہیں آئی۔

اتنی بڑی دنیا ایک چودہ سالہ ننھی سی لڑکی کو نگل لے تو کیا پتہ چل سکتا ہے۔!؟

اس پرانی آدم خور دنیا نے تو خدا کے مقربین خاص پیغمبروں، یونان و مصر اور روما جیسی بڑی بڑی سلطنتوں، نمرود، شداد، فرعون، سکندر اور چنگیز جیسے ارضی خداؤں تک کو ہڑپ کر لیا۔ تو گلی قاسم جان کے ایک معمولی ہیڈ کلرک کی چودہ سالہ ننھی لڑکی کا کہاں سراغ لگ سکتا تھا۔

امجد ماں کی محبت کے علاوہ بہن کے پیار سے بھی بچھڑ گیا۔

عورت کی محبت نہیں بلکہ عورت کی نفرت کی آگ سے وہ شروع ہی سے جھلس رہا تھا وہ عورت اس کی سوتیلی ماں تھی اس کے ڈر نے امجد کو بچپن ہی سے ڈرپوک بنا دیا تھا وہ سہما سہما بڑا ہوتا جا رہا تھا۔

اپنے چھوٹے سوتیلے بھائی کے لئے ماں اور باپ دونوں کی بے تحاشہ محبت اور اور اپنے لئے ان کی نفرت کا موازنہ کرتے کرتے اس میں بڑا شدید احساسِ کمتری بھی پیدا ہو گیا تھا۔

ڈرپوک اور احساس کمتری میں مبتلا بچوں کی صحت خراب ہونے لگتی ہے۔ ان کی نشوونما بھی صحیح طریقے پر نہیں ہوتی۔ خراب صحت اور خراب نشوونما آدمی کو بدصورت یا کم ہمت بنادیتے ہیں اور وہ زندگی کے کسی بھی حملے کا جم کر مقابلہ نہیں کرسکتے فوراً بھاگ کھڑے ہوتے ہیں

ایک دن امجد بھی بھاگ کھڑا ہوا۔

اس دن کسی قومی رہنما کے مرنے پر اسکول آدھے دن ہی سے بند ہوگئے تو تیرہ سالہ امجد گھر لوٹ گیا۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا اس نے دیکھا کہ اس کی سوتیلی ماں غسل خانے کے بجائے صحن کے نلکے کے نیچے بیٹھی نہا رہی ہے سوتیلی ماں نے اسے دیکھ کر شور مچا دیا۔

اچھا تو تو اس لئے اسکول سے بھاگ کر آیا ہے۔ ٹھہر آنے دے اب اپنے ابا کو۔

اس دن اس کا باپ کب گھر آیا۔۔؟

اسے کیسے معلوم ہوسکتا تھا اسے تو سینکڑوں میل دور ریل کے ایک ڈبے میں ایک ٹکٹ بابو نے بلا ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں پکڑ رکھا تھا ایک ادھیڑ عمر کے مرد نے پلے سے جرمانہ بھر کر اسے چھڑا لیا تھا۔

وہ ادھیڑ عمر مرد ماسٹر نور محمد تھے جو ویک فیلڈ گنج لدھیانہ کے ہائی اسکول میں انگریزی کے ماسٹر تھے۔ امجد کو پاکر ماسٹر نور محمد کی بیوی بھی خوش ہوئیں۔ وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھیں۔

اب امجد سچے ماں اور باپ کے رشتوں میں جکڑ گیا تھا کیونکہ ماسٹر نور محمد اور ان کی بیوی دونوں اسے بیٹے کی طرح ہی چاہتے تھے۔

ماں نہ سہی، ماں کی طرح ۔۔ باپ نہ سہی، باپ کی طرح۔۔ بیٹا نہ سہی، بیٹے کی طرح ۔ یہ بھی تو رشتے ہی ہیں نا؟

ماسٹر نور محمد کے گھر میں غریبی اور تنگدستی کا اندھیرا بڑا ہولناک ہوتا اگر وہاں علم کا چراغ نہ جل رہا ہوتا۔

اس گھر میں، علم کے اجالے میں امجد کو اب دنیا کچھ کچھ صاف نظر آنے لگی۔ بالخصوص رشتوں کا جال اس کی نظروں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ بڑا گنجلک جال، بڑا پیچ پیچ ۔۔ جس میں ہر انسان دوسرے سے بری طرح جکڑا ہوا تھا۔

امجد اپنے باپ اور سوتیلی ماں سے رشتے تڑا کر بھاگ نکلا تھا دنیا میں انسان اکیلا تو ہرگز نہیں رہ سکتا۔ تھوڑی ہی دور جانے کے بعد وہ ماسٹر نور محمد سے بیٹے اور شاگرد کے رشتے میں جکڑ گیا۔ کبھی کبھی ماسٹر نور محمد کی بیوی امجد سے گھریلو نوکر کی طرح پیش آتی تو ماسٹر نور محمد اپنی بیوی کو بری طرح ڈانٹ دیتے۔ وہ چیخ پڑتے ۔۔

"نیک بخت۔ کتنی بار تجھ سے کہا کہ دنیا کے سب انسان برابر برابر ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کا آقا اور کوئی کسی کا نوکر نہیں ہوتا، خبردار ۔۔ اس بچے کو کبھی یہ محسوس نہ ہونے دینا کہ یہ ہمارا نوکر ہے۔ یہ بھی ہمارا بیٹا ہے نوکر نہیں۔"

ماسٹر نور محمد نے سچ مچ اپنے بیٹے کی طرح امجد کو خوب پڑھایا لکھایا امجد ہونہار ذہین تھا اور اس پر ماسٹر نور محمد جیسے چراغ کا اجالا ۔ امجد سارے صوبے میں بی۔ ایس سی کے امتحان میں فرسٹ کلاس فرسٹ پاس ہوا۔ ملک کے اخبارات میں اس کی تصویریں شائع ہوئیں۔

ماسٹر نور محمد چاہتے تھے کہ اب امجد کوئی بڑا افسر بن جائے لیکن امجد کے پاس نہ تو روپیہ تھا اور نہ کسی بڑے آدمی سے رشتہ داری۔ حتیٰ کہ ایک دن تو اچانک ماسٹر نور محمد سے بھی اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

ماسٹر نور محمد اسکول سے واپس آئے سینے میں کچھ تکلیف سی محسوس کی۔ ادھر امجد ڈاکٹر کو بلانے دوڑا ادھر وہ خالق حقیقی سے جاملے

ان کا مرض الموت یہ تھا کہ وہ بہت اچھے آدمی تھے۔ بہت اچھے آدمیوں کو دنیا کی ہر بڑی نعمت کم کم ملتی ہے۔ رزق ۔ روزگار، خوش حالی حتیٰ کہ عمر بھی کم ۔

ماسٹر نور محمد کے سالے چودھری عشق محمد بمبئی کی ایک جہاز راں کمپنی میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ پرانی وضع کے بے حد ایماندار آدمی اور مالکان کے چہیتے۔ انھوں نے اپنی بیوہ بہن کو بمبئی بلوا لیا اور مالکان سے کہہ سن کر امجد کو بھی ایک جہاز کا جونیئر افسر مامور کرا دیا

ابھی دنوں جہاز پر صرف ایک میٹرک پاس لڑکے کا تقرر سینئر افسر کی اسامی پر ہوا۔ امجد کو برا لگا کہ وہ بی ایس سی

فرسٹ کلاس تو جونیئر افسر اور وہ نووارد میٹریکولیٹ سینئر افسر ۔ لیکن چودھری خوشی محمد نے اسے سمجھایا ۔

" بیٹا ۔ تو اس سے زیادہ پڑھا لکھا سہی ۔ اس سے کمتر اس لئے ہے کہ وہ مالکان کا رشتہ دار ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ امیر ہے اور تو غریب !

امجد تلملا اٹھا ۔ اس کے کانوں میں ماسٹر نور محمد مرحوم کی گرجتی آواز گونجنے لگی

" بچو ۔ اس دنیا میں سب انسان برابر برابر ہیں ۔ نہ کوئی امیر نہ کوئی غریب نہ کوئی گورا نہ کوئی کالا ، نہ کوئی اعلیٰ نسل کا نہ کوئی ادنیٰ نسل کا ، نہ کوئی ولایتی ، نہ کوئی ایشیائی ، نہ کوئی غلام ، نہ کوئی آقا "

امجد لرز کر رہ گیا ۔ وہ اپنے محسن ، اپنے باپ سے بھی زیادہ محسن ، ماسٹر نور محمد کو بھلا کیسے جھوٹا سمجھے　چنانچہ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا ! وہ بھی سچ تھا بالکل سچ ۔

پھر امجد کو اس جہاز پر کام کرتے اور ملک ملک کی سیر کرتے چار برس بیت گئے اب امجد کے کیپٹن بننے کا موقع نکل آیا تھا لیکن ایک دن اسے بتایا گیا کہ کوئی رام چندر نامی شخص جہاز کا کیپٹن بن کر آ گیا ہے وہ بھی امجد سے کم تعلیم یافتہ اور کم تجربہ کار تھا ۔ امجد نے مالکان سے احتجاج کرنا چاہا تو اس کے نئے دوست اور ہمراز انور نے اسے مشورہ دیا ۔

[illegible]

کی ہے ، تو مسلمان سے ترقی تو ہندو ہی کو ملے گی ۔"

امجد مارے غصے کے کھول گیا ۔

سوتیلی ماں اور بیٹا ، مالک اور نوکر امیر اور غریب ــــ اور اب ہندو اور مسلمان !

صرف رام چندر اور امجد ہی ہندو اور مسلمان نہیں تھے ۔ ہمالہ کے دامن میں کوئی تیس کروڑ رام چندر اور دس کروڑ امجد اور بھی تھے اور ان میں نفرت اتنی بڑھی اتنی بڑھی کہ تیس کروڑ رام چندر تو ہندوستان میں رہ گئے اور دس کروڑ امجد اپنے نئے وطن پاکستان چلے آئے ۔

پاکستان میں بھی امجد کو ایک جہاز راں کمپنی میں ملازمت مل گئی اور قابلیت اور تجربے کی وجہ سے وہ ایک جہاز کا کپتان بن گیا ۔

اب امجد کو زندگی کی ساری نعمتیں مل گئی تھیں ــــ بڑی تنخواہ ، بڑا بنگلہ بڑی کار اور دنیا بھر کی سیر کے لئے ایک بڑا جہاز ۔ لیکن اس کے باوجود اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے کچھ بھی تو نہیں ملا ہے ۔

صرف اس کے اطراف سمندر متلاطم نہیں تھا بلکہ اس کے اندر بھی ایک طوفانی سمندر موجزن تھا ۔ جوانی کی بھرپور دھوپ میں اس کا سارا وجود تپ رہا تھا ۔ اب اسے کسی سایۂ زلف کی بڑی شدت سے تلاش تھی ۔ اب وہ چاہتا تھا کہ اسے روز

[illegible]

اس کے آگے پیچھے عورتوں کا ہجوم لگا لیکن اسے ایسی لڑکی کی تلاش تھی جس آنکھوں میں اسے صرف اپنا چہرہ نظر آئے روپیہ ، بنگلہ اور کار نظر نہ آئے ۔

دنیا عورتوں سے بھری ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود صرف ایک عورت بھی نہیں

اہلِ غرض اور اس کے دوست ا کے سامنے ہر روز رشتوں کے ڈھیر لگا دیتے

ایک بار ایک لڑکی اسے اتنی پسند کہ اس نے اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہ لڑکی کے والدین بھی آمادہ ہو گئے ۔ شاد کی تیاریاں بھی مکمل ہو گئیں ۔ شادی ۔ صرف دو دن پہلے ہندوستان سے لڑکی نانی بھی آ گئیں اور اسی شام باہر بینڈ با ایک دم رک گئے ۔ اور اندر ڈھولک گیت ادھورا ہی خاموش ہو گیا ۔

نانی بی اڑ گئی تھیں ۔

اوں ہوں ــــ اوں ہوں ۔ ہم نہیں ۔ لڑکا تو سید نہیں ہے ــــ ! "

لڑکی کا باپ ایک سچا مسلمان پکا پاکستانی تھا ۔ اس نے بڑی بی کو ہر طور پر سمجھانے منانے کی کوشش کی کہ لڑکا مسلمان ہے ، پاکستانی ہے لیکن اگلے وقت کی بڑی بی ٹس سے مس نہ ہوئیں ۔

اس کے بعد ایک اور اچھا رشتہ ہاتھ آیا ، لیکن اب لڑکے اور لڑکی کا تفاوت آڑے آیا ۔

[illegible]

رہتا تھا اور لڑکی لالوکھیت میں ـــ !

امجد کے ہمراز دوست الوند نے کہا

"یہ شادی ہوگی اور ضرور ہوگی"۔

لیکن امجد کچھ ایسا دل شکستہ اور مایوس ہوگیا تھا کہ پھر وہ سمندر سمندر بہنے لگا، شہر شہر آوارہ ہوگیا۔

روم کے مختصر قیام کے دوران ایک اطالوی دوشیزہ اس کی زندگی میں داخل ہوئی وہ دوشیزہ اس کو اپنے ماں باپ سے ملانے لے گئی۔ امجد کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ اندر گئی اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد امجد نے اس کے باپ کی گرجدار آواز سنی ۔

"نو نو نو ـــ سرٹنلی ناٹ۔ تم ایک یوروپی لڑکی ہو۔ تم ایک ایشین سے کیسے شادی کرسکتی ہو۔ نو نو نو......"

وہ لڑکی جب امجد کے لئے باہر ڈرائنگ روم میں آئی تو ڈرائنگ روم خالی تھا۔

امجد کے اطراف بھی سمندر تھا اور آنکھوں میں بھی سمندر ـــ

اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ عورت کو بھول جائے گا۔ کوئی شخص جب کسی چیز کو، بالخصوص اپنی محبت کو ہرگز نہیں بھول سکتا تو وہ ایسا ہی تہیہ کرتا ہے کہ وہ اسے بھول جائے گا۔

چنانچہ عورت کو بھولنے کی یاد کو ہر لمحہ تازہ رکھتے ہوئے کہاں کہاں گھومتا ہوا وہ ایک شام سان فرانسسکو پہنچا۔ اسے

سیدھے وہ شہر میں چلا گیا اور مارکیٹ روڈ پر ایک اچھے سے ریستوران میں داخل ہوگیا وہ اپنی میز پر بیٹھا رہا، بیٹھا رہا، کوئی ویٹر اس کے پاس نہ آئی حالانکہ اس کے اردگرد کی میزوں پر اس کے بعد آنے والے گاہکوں نے کھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ امجد کو بڑا غصہ آیا وہ اٹھا اور سیدھے کاونٹر پر پہنچا لیکن ریستوران کی لیڈی انچارج نے برا منہ بنا کر کہا ـ

"سوری جنٹلمین ـــ وی ڈونٹ سرو ٹو کلرڈ پیپل"۔

اگر وہ عورت نہ ہوتی تو شاید امجد کھانے کے بجائے اسے ہی کچا چبا جاتا۔

سوتیلی ماں۔ بیٹا.... آقا، نوکر .... امیر، غریب.... ہندو مسلمان... شیعہ سنی.... ہندوستانی پاکستانی.... پی ای سی ایچ ایس لالوکھیت.... یوروپی، ایشیائی.... گورا کالا.... پھر بھی پیغمبروں سے لے کر فلسفیوں تک اور فلسفیوں سے لے کر ماسٹر نور محمد تک سب ہی یہی کہتے چلے گئے ہیں کہ ـــ سب انسان برابر برابر ہیں۔ نہ کوئی آقا نہ کوئی غلام، نہ کوئی امیر نہ کوئی غریب ـ نہ کوئی کالا....

امجد اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے بیٹھے ہنس پڑا لیکن اس کی ہنسی ادھوری رہ گئی۔

کیونکہ اس کے سامنے فریدہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ وہ کچھ اداس اور روہانسی نظر آرہی تھی

فریدہ اس کے دفتر کی استقبالیہ کلرک تھی اور عام استقبالیہ کلرک لڑکیوں کی طرح خاصی قبول صورت اور خوش لباس تھی۔ امجد دل ہی دل میں اسے چاہتا تھا لیکن فریدہ کے آگے حال دل بیان کرنے کی ہمت اس میں اس لئے نہیں تھی کہ ایک بار اسی دفتر کے ایک ادھیڑ عمر کے ہیڈ کلرک نے فریدہ سے اظہار عشق کیا تھا تو فریدہ نے امجد کے پاس اس کی تحریری شکایت پیش کی تھی کہ۔

"میں شیخ حفیظ کو اپنے باپ کے برابر سمجھتی ہوں اور انھیں بھی مجھے اپنی بیٹی کی طرح...."

اس کے آگے امجد اس لئے کچھ نہیں پڑھ سکا تھا کہ امجد بھی تو شیخ حفیظ کی عمر کا ہو رہا تھا۔

امجد نے فریدہ کو یوں اداس اور روہانسی دیکھ کر پوچھا۔

"کیوں کیا پھر شیخ حفیظ نے تم سے کوئی بدتمیزی کی ہے؟"

فریدہ نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں ۔ میرے والدین میری شادی کرنا چاہتے ہیں"۔

امجد نے روتے ہوئے دل اور ہنستے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

"یہ ـــ یہ ـــ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے"۔

"لیکن ..."

لیکن کے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اس نے ایک چٹھی امجد کی میز پر رکھ دی اور تیزی سے مڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

فریدہ کے چلے جانے کے بعد امجد نے وہ چٹھی کھولی۔ لکھا تھا۔

میرے ماں باپ جس نوجوان سے شادی کرنا چاہتے ہیں میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میں اب آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ گزشتہ کئی دنوں سے آپ کے لئے میرے دل میں ایک آگ سی بھڑک رہی ہے مجھے ڈر ہے کہ یہ آگ ..."

امجد نے یوں محسوس کیا جیسے اس آگ کی حدت نے اس کی ساری بصارت سلب کر لی ہے۔ وہ آگے کچھ نہ پڑھ سکا۔ اور اب آگے پڑھنا بھی کیا تھا۔

امجد کا دل خوشیوں سے لبالب بھر گیا وہ گھبرانے لگا کہ کہیں خوشیوں سے اس کا دل پھٹ نہ جائے۔

محبت کے معاملے میں بدقسمت کسی قریب المرگ مرد کو کسی عورت کی آنکھوں میں پیار کی ہلکی سی آنچ بھی محسوس ہو تو پھر وہ ازسرنو جی اٹھتا ہے پھر دنیا میں لوٹ آتا ہے۔

امجد نے یوں محسوس کیا جیسے آج سے اس کی زندگی کا آغاز ہوا ہے اور آج ہی تو دنیا کا پہلا دن ہے۔

مرد اور عورت کی زندگی اسی دن سے شروع ہوتی ہے جس دن ان کے دل کے محرابوں میں محبت کا پہلا چراغ جل اٹھتا ہے۔ اس سے پہلے تو زندگی صرف تمہید ہوتی ہے۔ صرف سانسوں کی آمد و رفت۔ صرف دن اور رات کا طلوع و غروب۔

اصل زندگی کا نقاب تو محبت کے چراغ کا اجالا ہٹاتا ہے۔

جو پیار فریدہ کے جسم میں چھپا ہوا تھا اور جو پیار آپ ہی آپ اس کے جسم سے چھلک پڑا تھا۔ اس کے لئے تو امجد پانچوں براعظم اور ساتوں سمندر پھلانگ آیا تھا اور اسی پیار کا پھول اس کے اپنے آنگن میں مہک رہا تھا۔ امجد کی خوشی جیسے کائنات کی سرحدوں سے بھی آگے پھیل گئی تھی اور امجد اس وقت تصور کے بازاروں میں فریدہ کے لئے ہیرے موتی سونے چاندی کے جگمگ زیورات، زرق برق کپڑے اور جیسے دنیا کی ہر چیز خرید رہا تھا۔

شادی کی تاریخ لے لی فریدہ نے بھی ہاں کر دی تھی۔

لیکن پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔

لڑکی "ہاں" کہتی ہے اور ماں باپ "نہیں"۔ ابا ماں اڑ گئی تھی۔ واہ — وہ مہاجر — ہم مقامی — یہ بیاہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا —"؟

فریدہ کا باپ امجد کے سامنے اپنی مجبوری ظاہر کر دیا تھا۔

انسان، مسلمان، پاکستان یہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن یہ بھی تو ایک مجبوری ہے نا۔ ذرا آپ ہی سوچئے نا "آپ مہاجر۔ ہم مقامی۔

اور پھر فریدہ کی شادی ہو گئی

لیکن فریدہ کا دولہا امجد نہیں تھا۔

امجد اپنے ہمراز دوست انور کے ساتھ شاہراہ قائد اعظم کے فٹ پاتھ پہ کھڑا تھا سامنے سے بینڈ باجوں تاشوں، نفیریوں کے درمیان سرخ سرخ گلابوں سے سجی ڈھکی ایک لمبی چمکیلی امپالا میں فریدہ سرخ گھونگٹ میں سرنگوں اپنے دولہا کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ امجد کا دل بھر آیا تو انور نے بغیر سوچے سمجھے یوں اوٹ پٹانگ ڈھارس دی۔

"یار امجد — ہمت سے کام لو! یہاں نہ اگر نہیں تو وہاں تمہیں حور تو ضرور ہی ملے گی

امجد بڑے مایوس شکست خوردہ لہجہ میں کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "کیا پتہ میرے دوست وہ حور بھی یہ کہہ دے کہ "میں جنتی، تم دوزخی!"

امجد پھر اس بازار میں لوٹ گیا۔ جہاں کوئی مرد نہ بدصورت ہوتا ہے نہ بدقسمت نہ کالا نہ گورا، نہ مسلمان نہ پاکستانی، نہ ایشیائی نہ یوروپی، نہ غریب نہ امیر، نہ آقا نہ نوکر، نہ محبوب ..... "نہایت بےباکی سے مسکراتے ہوئے جب اس عورت نے امجد سے پوچھا۔

"سیب کھاؤ گے؟"

تو امجد نے یوں محسوس کیا جیسے وہ ابھی ابھی زمین پہ نازل ہوا ہے اور دنیا ازسرنو آباد

حمید سہروردی

(جدید کہانی)

مورتی

شاید اُس نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ جس راستہ پر گامزن ہے۔ وہی راستہ اس کی منزل کو لے جانے والا ہے۔ کبھی کبھی دھن بھی تھکا دینے والی کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

چلتے چلتے وہ ایک درخت کے سایہ میں کچھ دیر آرام کی خاطر رک گیا ابھی وہ بیٹھنے ہی والا تھا کہ اُس نے وہاں ایک عجیب و غریب مورتی دیکھی۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ کچھ دیر حیرت و استعجاب کا مجسمہ بنا کھڑا رہا۔ اپنے حواس کو مجتمع کیا۔ اور مورتی کے ایک ایک پہلو کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر وہ ہر وقت ایک ہی خیال پر آ کر رک جاتا۔ مسلسل ایک گھنٹہ کے غور و فکر کے بعد بھی کوئی مجموعی خیال تک رسائی نہیں ہو سکی۔ پھر اُس نے سوچا۔ شاید وہ بہت تھک چکا ہے۔ پھر کچھ دیر وہیں ایک پتھر پر بیٹھا رہا۔ اور گزشتہ دن کے ایک ایک لمحہ پر فکریت کے پردوں پر اپنی ہی کہی ہوئی باتوں پر روشنی ڈالی۔ ہر وقت اُسے لگا کہ وہ خوابیدہ ماحول کے پیروں میں بغیر رسّی اور بغیر زنجیر کے ہی بندھا ہوا ہے۔ وہ اسی سعی میں لگا رہا کہ خوابیدہ ماحول کے پیروں پر کلہاڑی مارے۔ پر اس کے نزدیک یہ فعل عذاب کے مترادف تھا۔

وہ وہاں سے اُٹھا۔ اور مورتی کے قریب آ کر غور سے دیکھنے لگا۔ مورتی کے ایک ایک حصّہ پر ہاتھ پھیرنے لگا مورتی کے ہاتھ کی دھول صاف ہو گئی۔ پھر اس کے مختلف حصّوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ روشنی کی ایک کرن مچلتی پھسلتی ہوئی نظر آئی۔ اپنی دستی سے مورتی کی تمام دھول صاف کیا۔

اُس نے دیکھا کہ مورتی کے چہرے کے پتھر کے ٹکڑے ریگِ رواں کے مانند، زمین پر گر کر، مٹی میں مل چکے تھا۔ وہ مٹی کو اپنے ہاتھ کی اُنگلیوں سے کریدنے لگا۔۔۔

تاریخ کا ایک باب گذر چکا تھا۔

اب لاحاصل، اس کی نظروں میں لٹو کی مانند گھومنے لگی۔ مگر تجلی کی شعاعوں سے آنکھیں چکا چوند ہونے کے احساس میں غرق ہوتی ہوئی دکھائی دیں۔ مورتی کے ہاتھ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے لگا۔ تحریر صاف صاف پڑھی نہیں جا رہی تھی۔

" ملن... نجات... دوش... لوٹ ...نروان.... پراچین کال... جیون ... برہما... واسی.... حروف... کیا ہو گا۔ ؟ حروف ہی حروف کوئی مطلب نہیں.... ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ؟

وہ جھنجھلا اٹھا۔ اپنے سر کو جھٹکا۔ پھر مورتی کو غور سے دیکھنے لگا۔ مورتی کے سر پہ نام لکھا ہوا تھا۔ نام اس کے ذہن کے نہاں خانوں سے اُچک اُچک کر زبان پر آنے کی کوشش کر رہا تھا پھر برف کے پہاڑوں کی مانند، ذہن کے خانوں میں ہی پھیلتا اور پھسلتا چلا گیا۔

وہ صرف مورتی کو ہی دیکھتا رہتا تو ٹھیک تھا۔ اب اُس نے ایک نظر درخت کے اوپری حصّہ پر ڈالی۔ درخت کی شاخیں خم ہو کر زمین کو دیکھ رہی تھیں۔ اور پیڑ پر ایک گرگٹ رنگ بدل کر اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ خوف زدہ ہو کر وہاں سے دُور ہٹ گیا۔

دو قدم پیچھے کی طرف ہٹا۔ کبوتر۔ گھائل جسم کے ساتھ پرواز کی چاہ میں اِدھر اُدھر دیکھتا۔ دور تاحدِ نظر سراب تک نہیں تھا۔ پھر وہ ایک قدم آگے بڑھا اور کبوتر کو ہاتھ میں لیے۔ کچھ دیر بیٹھا رہا۔ یوں لگ رہا تھا کہ کبوتر کا خون اس کی آنکھوں میں چلا آ رہا ہے۔ کچھ نہ

کرنے کا احساس بغلگیر تھا۔

وہاں کوئی آدم زاد نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اتنا ہی پیدا کر دہ ہمت کے سہارے آگے بڑھا۔ مورتی کو ہاتھ میں اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر حسب سابق ناکام رہا۔ یوں لگا کہ مورتی اس کے احمقانہ فعل پر ہنس رہی ہے

اچانک اس کو دھیمی دھیمی اور میٹھی میٹھی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اور خوشبوؤں کا احساس بھی جاگزیں تھا۔ اس نے مورتی کی آنکھیں تلاش کیں۔ اور آنکھوں کی جگہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ مورتی کی آنکھیں پہلے ہی سے پھوڑ دی گئی تھیں۔ اور مورتی کا نام، جو اس کے سر پر لکھا ہوا تھا۔ ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔

وہ مورتی کے سامنے دو زانو بیٹھا رہا — اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بس ایک سناٹا تھا۔ آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ان آوازوں کی زبان سمجھنے میں ناکام رہا۔ درخت کی شاخیں اور ٹہنیاں، ایک سم اوپر کی طرف اٹھ گئیں۔ صرف آسمان، اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ یہاں سے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔

مگر کس طرف —؟

راستے مسدود ہو چکے تھے۔ اطراف برف پھیل کر جم چکی تھیں۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا۔ "مجھے کہاں جانا ہے" اور اس کی نظر مورتی پر پڑی۔

مورتی پہ، پھر سے دھول جم چکی تھی —●

حقیقت

(منی کہانی)

از
س۔ علی نقی

اور پھر جب پھول نے بھونرے سے پوچھا کہ تم کیسے بھونرے ہو جب مجھے صرف سونگھتے ہو لیکن چومتے نہیں تو بھونرے نے جواب دیا قدرت نے مجھے چومنے کی صلاحیت عطا نہیں کی۔ یہ سنتے ہی پھول نیچے کانٹے پر گر پڑا۔

فلمی ڈائری

مارچ کے دوسرے ہفتے میں رشی کپور کی نئی فلم "نیا دور" ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں رشی کپور نے ایک بار پھر قابلِ رشک اداکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی ہفتے رشی کپور کی ایک اور بڑی فلم "آخری جام" کا مہورت ہوا جسے موہن کمار بنا رہے ہیں اور اسی ہفتے بمبئی میں "ہم کسی سے کم نہیں" کی سلور جوبلی ہوئی۔ آخری جام کی مہورت کے موقعہ پر "سن اینڈ سینڈ" میں ایک شاندار پارٹی ترتیب دی گئی۔ جس میں فلم ساز و ہدایت کار ناصر حسین کے علاوہ رشی کپور کی گولڈن جوبلی فلم "لیلا مجنوں" کی ہیروئن رنجیتا نے بھی شرکت کی۔ اتفاق سے "آخری جام" کی ہیروئن رامیشوری اور رنجیتا دونوں پونا انسٹیٹوٹ میں ایک ساتھ ٹریننگ حاصل کر چکی ہیں اس مہورت پارٹی میں کئی مشہور فلمی شخصیتیں بھی شریک تھیں جن میں راجکپور، سنیل دت نرگس اور جے۔ اوم پرکاش کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ امر اکبر انتھونی کی ہنگامہ خیز کامیابی کے باوجود، رشی کپور آج کل "ملٹی اسٹار" فلموں میں کام کرنے سے گریز کر رہا ہے۔ من موہن دیسائی کی ملٹی اسٹار کاسٹ فلم "غضب" کے بارے میں رشی کپور نے بتایا کہ اس فلم میں کام کرنا اس نے اس لئے قبول کیا ہے کہ ایک تو وہ من موہن دیسائی کی صلاحیتوں کا معترف ہے اور دوسرے اسے اس فلم میں ایسا رول دیا گیا ہے جس میں وہ اپنی اداکاری کا بے پناہ مظاہرہ کر سکتا ہے۔

★

رنجیتا کی پہلی فلم "لیلا مجنوں" نے ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں سلور جوبلی یا گولڈن جوبلی منائی۔ "لیلا مجنوں" کے بعد تماشائیوں کے ذہن سے رنجیتا کا نام اوجھل ہوتا جا رہا تھا کہ اس نے اب اپنی نئی فلم "آنکھوں کے جھروکوں سے" میں انتہائی متاثر کن اداکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکھ ٹنڈن نے کہا کہ رنجیتا نے اس فلم میں انتہائی غیر معمولی جذبات نگاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ راجشری فلمز کی یہ فلم باکس آفس کے جھروکے سے کیسا مظاہرہ کرتی ہے۔ ویسے رنجیتا، بی۔ آر چوپڑہ، تاراچند برجاتیہ اور وجے آنند کی فلموں کے لئے معاہدہ کر چکی ہے۔

★

رمیش سپی کی ملٹی اسٹار کاسٹ فلم "شان" کی شوٹنگ انتہائی پابندی اور تیزی سے ہو رہی ہے۔ پچھلے مہینے جوہو کے ایک شاندار بنگلے پر امیتابھ بچن، ششی کپور، سنیل دت اور شتروگھن سنہا نے "شان" کی شوٹنگ میں حصہ لیا۔ رمیش سپی نے بتایا کہ تمام بڑے آرٹسٹوں سے انہیں پورا پورا تعاون مل رہا ہے۔ لڑائی کے بعض اہم سین کی شوٹنگ فلم کی دوسری یونٹ کسی اور مقام پر کر رہی تھی۔ رمیش سپی نے بتایا کہ وہ اپنے اس عظیم شاہکار کو باکس آفس پر کامیاب بنانے کی پوری پوری کوشش کر رہے ہیں۔ کیونکہ آج کل فلمساز صرف باکس آفس کی کامیابی کے سہارے ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ "شان" آئندہ سال اپریل میں نمائش کے لئے پیش کر دی جائے گی۔

★

حکومت نے نئے بجٹ میں پبلسٹی کے اخراجات پر بعض پابندیاں عائد کر دی ہیں جس کی وجہ سے بڑے بڑے صنعت کاروں کے ساتھ ساتھ فلم سازوں کو بھی پریشانی لاحق ہو گئی ہے۔ حال ہی میں ایک تقریب میں ایک مشہور فلم ساز نے بتایا کہ آئندہ وہ اپنی سالگرہ نہیں منائے گا لیکن اپنے ہیرو اور ہیروئن کی سالگرہ ضرور منائے گا کیونکہ اس طرح فلم کی پبلسٹی تو یقیناً ہوگی لیکن یہ اخراجات پبلسٹی کے بجٹ میں شامل نہیں ہوں گے بلکہ فلم کے بجٹ میں شمار کئے جائیں گے

★

بمبئی کے "ڈرائیو۔ ان" تھیٹر میں بچوں کے لئے ایک کھیل کا میدان بھی ہے تاکہ بچے اگر فلم میں دلچسپی نہ لے رہے ہوں تو کھیل کود میں دل بہلائیں۔ یہاں بچوں کی نگرانی کرنے والوں کا بھی انتظام ہے

★

"برننگ ٹرین" کی شوٹنگ کے لئے ریل کے جو کوچس استعمال کئے جارہے ہیں وہ اصلی ٹرینوں کے کوچس سے زیادہ خوبصورت اور آرام دہ ہیں۔ اس سیٹ پر بی۔ آر۔ چوپڑہ کو کوئی ۱۵ لاکھ روپیے صرف کرنے پڑے ہیں۔ فلم کی پوری لاگت تقریباً ڈھائی کروڑ روپیہ سے اوپر جارہی ہے۔

★

نئے سنسر بورڈ میں کئی فلمی صحافی شامل ہیں مثلاً بکرام سنگھ فیروز رنگون والا، اروند کمار اور سدھیر نندگاؤنکر۔ اس سنسر بورڈ نے پچھلے مہینے 'دیو آنند کی دیس پردیس اور راجکپور کی ستیم شیوم سندرم دیکھی۔

★

ہماری فلم انڈسٹری کی سالانہ آمدنی ۲۲ کروڑ ہے جس میں سے ۵۰ فیصد ٹیکسوں کی صورت میں حکومت لے لیتی ہے ۲۵ فیصد سینما گھروں کے مالکین کو چلا جاتا ہے اور دس فیصد ڈسٹری بیوٹرس کے حصہ میں آتا ہے۔ اس طرح ۹۵ فیصد آمدنی جانے کے بعد صرف ۵ فیصد آمدنی پروڈیوسر کو ملتی ہے جو لاکھوں روپیہ صرف کرکے فلم بناتا ہے اور نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔

★

ونود کھنہ اور دھرمیندر ستمبر ۷۸ تک "بک" ہوچکے ہیں اور روزانہ دو شفٹ میں کام کررہے ہیں۔ امیتابھ بچن ان سے صرف ایک قدم آگے ہے۔ وہ روز تین شفٹ میں کام کررہا ہے۔

★

فلموں کی موسیقی پر ریسرچ کرنے والے ایک صاحب نے بڑا دلچسپ انکشاف کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ موتھ آرگن کا ہماری فلموں کی کامیابی میں بڑا ہاتھ رہا ہے۔ جن فلموں میں بھی موتھ آرگن استعمال کیا گیا وہ باکس آفس پر ہٹ ثابت ہوئیں۔ مثلاً گرہستی، دوستی، وقت، آرادھنا، دوست، یادوں کی بارات" اور روٹی، وغیرہ

★

عالیہ انتخابات میں شریمتی اندرا گاندھی نے ثابت کردیا کہ ان کی مقناطیسی شخصیت کا سحر آج بھی جنوبی ہند میں باقی ہے۔ کرناٹک، آندھرا پردیش اور مہاراشٹرا میں کانگریس (آئی) کی حکومتوں کے قیام کے ساتھ یہ توقع ہو چلی ہے کہ یہ ریاستیں امیرجنسی کے فائدوں اور ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام پر بنائی جانے والی فلموں کو ٹیکس کی چھوٹ دیں گے۔ اب دیکھئے کتنے فلمساز اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کی ہمت کرتے ہیں۔

★

کمال امروہی نے اپنی شاہکار فلم پاکیزہ کو دس سال میں مکمل کیا تھا۔ وہ گزشتہ تین سال سے "رضیہ سلطان" بنارہے ہیں کچھ دنوں تک اس فلم کی شوٹنگ رکی رہی تھی تو وہ لوگ سوچنے لگے تھے کہ شائد یہ تاریخی فلم ایک بار پھر کمال امروہی کی تاریخ کو دہرائے گی۔ لیکن پچھلے چند دنوں سے "رضیہ سلطان" کی مسلسل شوٹنگ ہورہی ہے اور یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ فلم بہت جلد تکمیل کے مراحل سے گذر جائے گی۔ اس فلم کے ایک گیت کی صدا بندی جیسے ندا فاضلی نے لکھا ہے۔ ۸ مارچ کو محبوب ریکارڈنگ تھیٹر میں ہوئی ہے۔ اس فلم کی موسیقی خیام ترتیب دے رہے ہیں۔

★

راجیش کھنہ کا "مجنوں" جس کی مہورت بڑے ہی شاندار پیمانے پر منائی گئی تھی جسے کمال امروہی ڈائریکٹ کررہے تھے اور جس کی کہانی کے بارے میں راہی معصوم رضا اور کمال امروہی کے درمیان ایک تنازعہ کھڑا ہوگیا تھا۔ اب تک زیر تکمیل

باقی ۳۲

بے لاگ فلمی تبصرے

از۔ تماشائی

کھٹا میٹھا

باسو چیٹرجی کی فلمیں نہ صرف صاف ستھری اور معیاری ہوتی ہیں بلکہ باکس آفس پر کامیاب بھی ثابت ہوتی ہے اور اس اعتبار سے باسو چیٹرجی نے اپنا ایک انفرادی مقام بنالیا ہے۔ باکس آفس کی کسوٹی پر پچھلے سال کے کامیاب ترین ہدایت کاروں میں من موہن دیسائی کے بعد باسو چیٹرجی کا نام آتا ہے۔ راموایناسیپی کی فلم کھٹا میٹھا "باسو چیٹرجی کی اپنے انداز کی فلم ہے جس میں کامیاب فلموں کا روایتی مسالہ" مار دھاڑ "، تشدد، جنس اور بڑے فن کاروں کی چمک دمک کچھ بھی نہیں لیکن اس کے باوجود عام تماشائی ہر جگہ اس کا پُرجوش خیرمقدم کررہے ہیں۔ باسو چیٹرجی' ہدایت کے علاوہ کہانی' منظر نامہ اور مکالموں کے بھی ذمہ دار ہیں۔ لیکن ہدایت کاری کے اعتبار سے وہ زیادہ ذہین اور فنکار نظر آتے ہیں۔ کہانی کا بنیادی خیال ایک ترکی فلم "OUR FAMILY" سے لیا گیا ہے۔ لیکن "کھٹا میٹھا" کسی صورت میں بھی ترکی فلم کی نقل نہیں کہی جاسکتی کیونکہ یہ ہندوستانی سماج کے پس منظر کی پیداوار ہے۔

اس تفریحی فلم میں پہلی مرتبہ پارسی کردار کو پیش کیا گیا ہے لیکن پارسی معاشرے کی حقیقت آمیز عکاسی کی قطعاً کوشش نہیں کی گئی۔

کہانی کے خط و خال سننے سے پہلے ایک چھوٹا سا لطیفہ سنیئے۔ یہ لطیفہ کہانی کے بنیادی خیال کی بڑی حد تک تصویر کشی کرتا ہے۔ امریکہ میں اکثر و بیشتر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کی زندگی کا ایک چوتھائی حصہ طلاق لینے اور یکے بعد دیگرے دوسری شادیاں کرنے میں گزر جاتا ہے ایک بیوی نے بچوں کی دھما چوکڑی سے تنگ آکر شوہر سے شکایت کی کہ میرے بچے اور تمہارے بچے ملکر ہمارے بچوں کو مار رہے ہیں۔ "کھٹا میٹھا" کی کہانی اس شکایت کے نصف حصے پر ختم ہوجاتی ہے جس میں "میرے بچے" اور "تمہارے بچے" تو موجود ہیں لیکن "ہمارے بچوں" کا سوال شاید اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ یہاں "فیملی پلاننگ" پر حکومت نہیں قدرت مجبور کردیتی ہے۔ ہومی مستری (اشوک کمار) ایک کارخانہ میں فورمین ہے۔ چونکہ بیوی کا انتقال ہوچکا ہے اس لئے اُسے نہ صرف اپنے چار بچوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے بلکہ نوکری کے بعد باورچی خانہ کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا ساتھی سونی بھائی (ڈیوڈ) اسے ۶۰ سال کی عمر میں شادی کرنے کا مشورہ دیتا ہے اور ساتھ ہی ایک رشتے کی پیش کش بھی کرتا ہے۔ یہ رشتہ ہے نرگس سیٹھنا (پرل پدمسی) کا جس کے خود تین بچے ہیں۔ ایک لڑکی اور دو لڑکے۔ اِدھر نرگس کو بھی ڈیوڈ کی بیوی شادی کے لئے مجبور کرتی ہے اور بہرکیف یہ شادی ہوجاتی ہے۔ شادی کے بعد ہومی مستری اپنے تین بڑے ایک چھوٹے بچے کو لے کر نرگس کے گھر منتقل ہوجاتا ہے۔ اب یہ گھر "میرے بچوں" اور "تمہارے بچوں" کا دنگل بن جاتا ہے۔ سوتیلے بھائیوں کی یہ تلخی و رنجش اس وقت ختم ہوتی ہے جب نرگس کی بڑی بیٹی فیرنی (بدیتی گنگولی) کی شادی کی گھڑی آتی ہے۔ ہومی مستری اپنے کارخانے کے سپروائزر دارا (دیون ورما) سے اپنی سوتیلی بیٹی کی شادی طے کردیتا ہے اور اس طرح فیرنی اپنے خوابوں کے شہزادے امیتابھ بچن کی بجائے دیون ورما پر قناعت کرلیتی ہے اس شادی کے ساتھ گھر کا طوفان تو ختم ہوجاتا ہے لیکن کہانی ابھی ختم ہونے نہیں پاتی۔ اس مرکزی کہانی کے ساتھ ایک ذیلی کہانی بھی چلتی ہے۔ یہ کہانی ایک

ودیا ہیں جنھوں نے ابتدائی فلموں میں ہی اپنی لاجواب اداکاری سے انڈسٹری میں مستقل مقام بنالیا ہے۔

" دلہن وہی جو پیا من بھائے " اس ادارے کی حالیہ فلم ہے جس کا نام بھی بڑا ہے اور درشن بھی بڑے ہیں۔ یہ ایک بڑے باپ کے بڑے بیٹے کی کہانی ہے جو محض ایک اتفاق کی وجہ سے یہ جان لیتا ہے کہ ہمدردی کیسے عزت میں اور عزت سے کس طرح محبت میں تبدیل ہوتی ہے اور پھر وہ پھول بیچنے والی ایک معمولی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ جو ہمدردی، خدمت، بے نیازی، قربانی اور ایثار و محبت کا پیکر ہے۔ تارا چند برجاتیہ کی نئی دریافت رامیشوری معمولی ناک نقشہ والی نوخیز کلی ہے جس کو پھول بیچنے والی ایک غریب معصوم، یتیم اور بے سہارا لڑکی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے مقابل پریم ناتھ کا خوبرو لڑکا پریم کشن ہے جو فلم میں ایک کروڑپتی سیٹھ (مدن پوری) کا لڑکا بنتا ہے۔ جو اپنے باپ کے کاروبار میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا جو ہوٹلوں میں کھاتا ہے، کلبوں میں گھومتا ہے اور اپنی گرل فرینڈ سے لپٹ لپٹ کر ملتا ہے۔ اس کے باوجود مزاج کے اعتبار سے اتنا سعادت مند ہے کہ بار بار نہ صرف اپنے دادا کے بلکہ فیملی ڈاکٹر فریدہ (افتخار) کے پاؤں چھوتا رہتا ہے۔ ہیرو اپنی حیثیت اور مشاغل کے لحاظ سے اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ ہی شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔

جو نہ صرف جوان اور خوبصورت ہے بلکہ تعلیم یافتہ ہے اور سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے، ہوٹلوں میں کھانے اور کلبوں میں ناچنے کی صلاحیتیں بھی رکھتی ہے یہ اور بات ہے کہ اس کی اور اس کی ماں (ششی کلا) کی نظریں پریم سے زیادہ بیمار سیٹھ کی دولت پر ہیں کہ کب بڈھا مرے اور پھر ساری جائیداد اور دولت پر ان کا قبضہ ہو جائے۔ دونوں ماں بیٹیاں ساری فلم میں اپنی چھاتیاں کھولے شعلۂ جوالہ بنی پھرتی ہیں کہ یہ مردوں کی کمزوری ہے۔

پھر کہانی یوں چلتی ہے کہ سیٹھ جی کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور انھیں اپنی موت کا یقین ہو جاتا ہے۔ ان کی شدید خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کا اکلوتا پوتا شادی کے لئے تیار ہو جائے اور وہ مرنے سے پہلے ایک بار اپنی بہو کی صورت دیکھ لیں۔ فرمانبردار اور سعادتمند ہیرو فنی اپنی گرل فرینڈ کو فون کرتے ہیں کہ فوری آکر اپنے ہونے والے دادا سسر کو اپنی صورت دکھائے۔ لیکن وہ اتفاق سے سری نگر گئی ہوئی ہوتی ہے جہاں اتفاق سے برفباری کا طوفان آیا ہوا ہے اسی لئے وہ کئی دن تک سری نگر سے نہیں نکل سکتی۔ ظاہر ہے کہ سیٹھ جی اپنی موت کا انتظار کر سکتے ہیں لیکن موت برفباری ختم ہونے کا انتظار نہیں کر سکتی۔ اپنے دادا کی آخری خواہش کی تکمیل کے لئے پریم مجبوراً ایک پھول بیچنے والی لڑکی کمّو کو اپنی ہونے والی دلہن بنا کر دادا کے سامنے پیش کرتا ہے سیٹھ جی کمّو کی موہنی صورت اور اس کے سگھڑ پن، اس کی خدمت، اس کے گن اور سادگی دیکھ کر مرنے کا پروگرام ترک کر دیتے ہیں اور اپنی ہونے والی بہو کو اتنا چاہنے لگتے ہیں کہ اس کی کچھ دیر کی جدائی بھی انھیں شاق گزرتی ہے یہاں تک کہ وہ گھر کی ساری چابیاں اس کے حوالے کر دیتا ہے اور سیف کھولنے کا کوڈ تک اسے بتا دیتے ہیں پھر کشمیر میں برفباری ختم ہو جاتی ہے اور اصلی ریٹا وارد ہو جاتی ہے یہاں کا حال دیکھ کر وہ اور اس کی ماں کمّو کو سیٹھ جی کی نظروں سے گرانے اور انہیں حقیقت سے واقف کرانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ سیٹھ جی حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود بھی اپنی سالگرہ کی پارٹی میں کمّو اور پریم کی منگنی کا اعلان کرتے ہیں اس پر پریم بھڑک اٹھتا ہے کیونکہ اس نے کمّو کے تعلق سے ایسی کوئی بات سوچی بھی نہیں تھی وہ بغاوت کر بیٹھتا ہے اور اپنا گھر بار سب کچھ تیاگ کر ریٹا کے ہاں چلا جاتا ہے۔ لیکن ریٹا اور اس کی ماں اس پر واضح کر دیتے ہیں کہ بغیر مال، دولت اور جائیداد کے شادی اور عشق کا چکر چلنے والا نہیں۔ تب پریم پر یہ راز کھلتا ہے کہ ریٹا اس سے نہیں بلکہ اس کی جائیداد سے محبت کرتی ہے دوسرے یہ کہ اس کے دل میں کمّو سے پیار کی چنگاری عرصہ سے سلگ رہی تھی جو اب بھڑک اٹھی ہے پھر کہانی کے کلائمکس میں وہ شہر چھوڑ کر جاتی ہوئی کمّو کو ٹرین سے اتار کر شریک زندگی کی حیثیت سے قبول کر لیتا ہے اور گھر لاتا ہے

(بقیہ صفحہ ...)

پیوند سی لگتی ہے لیکن ٹاٹ کا پیوند اس لئے معلوم نہیں ہوتا کہ خود اصل کہانی ریشم جیسی نہیں ہے۔ نرگس کا ٹڑ کا فیروز (راکیش روشن) ایک دولت مند باپ (پردیپ کمار) کی بیٹی زرین (بندیا گوسوامی) سے محبت کرتا ہے اور روایتی محبت کی کہانی کی طرح یہاں بھی دولت مند باپ اس محبت کا دشمن ہے۔ وہ پہلے تو فیروز کو دھمکی دیتا پھر پٹوا تا ہے زرین یہ سب کچھ برداشت نہیں کر پاتی۔ وہ اپنا گھر چھوڑ کر فیروز کے یہاں آجاتی اور اس سے شادی کر لیتی ہے دولت مند باپ کے غصہ کی آگ اور بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ ہونی مستری کو کسی طرح نوکری سے نکلوا دیتا ہے اور پھر ان لوگوں کو اپنا گھر بھی چھوڑنا پڑتا ہے مصائب کا یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوتا ہے جب ہونی مستری زرین کے باپ سے دوچار ہوتا ہے اور دوچار جذباتی اور گرماگرم مکالمے جھاڑ دیتا ہے۔

کہانی کا مرکزی خیال بڑی حد تک جدت پسند اور قابلِ تعریف ہے لیکن باسو چیٹرجی نے کہانی کے تفریحی پہلو کو نظر میں رکھتے ہوئے اکثر مقامات پر حقیقت پسندی سے صرف نظر کیا ہے۔ مگر ایسا کرتے ہوئے انھوں نے تماشائیوں کو مسکراہٹوں اور قہقہوں سے نواز نے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہدایت کار کی حیثیت سے تو باسو چیٹرجی کامیاب رہے ہیں لیکن یہی بات ان کے منظر نامہ اور مکالموں کے تعلق سے نہیں کہی جاسکتی۔ مکالمے اور بھی خوبصورت اور کافی مزاحیہ ہوسکتے تھے لیکن ہدایت کار نے واقعاتی مزاح پیدا کرنے کی زیادہ کوشش کی ہے۔ اداکاری کے اعتبار سے تین نام پوری فلم پر چھائے دکھائی دیتے ہیں اور وہ ہیں اشوک کمار، دیون ورما اور پرل پدمسی۔ پریتی گنگولی جو فلم میں اشوک کمار کی سوتیلی بیٹی بنی ہے۔ اشوک کمار کی حقیقی بیٹی ہے اور اس نے اپنے کردار کو جاندار بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بندیا گوسوامی کا مختصر سا رول کیا ہے لیکن اپنے رول کو اثرانگیز بنانے کی پوری کوشش کی ہے ہیما کی نوجوانی کی تصویر تو وہ اب بھی ہے لیکن ہیما کے فن کا عکس بننے میں اُسے ابھی کچھ دن اور لگیں گے۔ راکیش روشن نے FILL UP THE BLANK سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ ماسٹر راجو نے خوب صورت کام کیا ہے۔ دوسرے اداکاروں میں ڈلوڈ اور پردیپ کمار کے نام قابل ذکر ہیں۔ نوجوان اداکاروں میں رنجیت چودھری نے KARATA کی پریکٹس کرتے ہوئے تماشائیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ گلزار کے گیت خوب صورت ہیں لیکن راجیش روشن کی موسیقی اتنی دلکش نہیں ہے کہ مجموعی طور پر معقولیت کی سطح کو چھو سکے۔ ویسے ایک دوگانے کسی حد تک مقبول ہو رہے ہیں۔ اے کے بیر کی عکاسی اوسط درجے کی ہے۔

بہ حیثیت مجموعی "کھٹا میٹھا" ایک ہلکی پھلکی تفریحی فلم ہے۔ منہ کا مزہ بدلنے کے لئے دیکھی جاسکتی ہے اب یہ آپ کے لئے کھٹی ثابت ہوگی یا میٹھی آپ کے ذوقِ دید پر منحصر ہے ——●

دلہن وہی جو پیا من بھائے

مشہور فلم ساز ادارے راجشری پروڈکشن اور اس کے کرتا دھرتا تاراچند برجاتیہ چھوٹے بجٹ کی بڑی فلمیں بنانے کا ریکارڈ رکھتے ہیں جو جوبلی تو مناتی ہی ہیں اس کے علاوہ ان میں ایسی سادہ اور پُرکار باتیں ہوتی ہیں جو سیدھے تماشائیوں کے دلوں میں اتر جاتی ہیں۔ مدھر سُریلی، کانوں میں رس گھولتی ہوئی موسیقی کے ساتھ مناظر کی خوبصورتی و شادابی ذوقِ نظارہ کے لئے فرحت انگیز سامان فراہم کرتی ہے۔ حالیہ دور میں بنائی گئی ان کی فلمیں "گیت گاتا چل" "چت چور" اور "دلہن وہی جو پیا من بھائے" اس کی مثال ہیں۔ ان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی ہر فلم میں کسی ایک نوخیز اور باصلاحیت حسینہ کو ہیروئن بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ساریکا، زرینہ وہاب اور اب رامیشوری، تاراچند برجاتیہ کی

فلمی اسٹار فلموں کے دور میں جو مار دھاڑ، بے سر و پا کہانی، ہیجان انگیز کیبرے اور بے تکے گانوں کی بھرمار کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ نئے اداکاروں کو لے کر ایسی خوب صورت با مقصد اور کامیاب فلمیں بنانا صرف تارا چند برجاتیہ کا ہی حصہ ہے۔ دلہن وہی جو پیا من بھائے کی زیادہ تر شوٹنگ آؤٹ ڈور مناظر کے پس منظر میں کی گئی ہے۔ سیٹھ جی کا شاندار خوبصورت محل، اس کا باغ، آؤٹ ہاؤس، کا ٹیچ وغیرہ بڑی خوب صورتی سے دکھائے گئے ہیں۔ رویندر جین کی موسیقی معیاری ہے۔ گانے کم ہیں لیکن موقع کی مناسبت سے ہیں۔ لیکھ ٹنڈن کی ہدایت کاری منجھی ہوئی ہے فلم کے بعض ٹکڑوں کو انہوں نے بڑی نفاست سے فلمایا ہے۔ ایک حادثہ میں کمّو بے ہوش ہو جاتی ہے۔ پریم صرف انسانی ہمدردی کے ناطے اس کے ننگے بدن کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہے یہیں سے اس کے دل میں پیار کی ٹھنڈی ٹھنڈی آگ سلگنے لگتی ہے جو بعد میں شعلہ بن جاتی ہے ڈاکٹر فرید کے گھر میں عید ملاقات کی تقریب اور وہاں کمّو کی غزل سرائی، کمّو کا گھر کی بہو بن کر رہنا۔ پھر اس بات کا احساس کہ یہ سب کچھ ناٹک ہے اور اسے صرف ایک کٹھ پتلی بنا دیا گیا ہے۔ یہ سارے مناظر بڑی خوبصورتی سے فلمائے گئے ہیں۔ اداکاری میں مدن پوری، افتخار اور ششی کلا جیسے سینیر اداکاروں پر تبصرہ غیر ضروری ہے۔ نئی اداکارہ رامیشوری نے

حیرت انگیز طور پر عمدہ باقی اداکاری کی ہے اور اپنے چہرے کے تاثرات سے بیشتر نازک موقعوں پر جان ڈالدی ہے۔ اس کے چہرے کی ساخت بھی کچھ ایسی ہے جسے سنجیدہ بنانے میں اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ پریم کشن کی اداکاری بس غنیمت ہے اور اسے اس میدان میں ابھی بہت دور جانا ہے۔

مختصر یہ کہ دلہن وہی جو پیا من بھائے "بہت اچھی" فلموں میں ایک خوبصورت اضافہ ہے —●●

(از بشیر انور)

بقیہ :۔ فلمی ڈائری

حالات کا شکار ہے اور اس کی تکمیل کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔

★

"پریم بجھارن" کے ایک آٹھ منٹ کے گیت کی ریکارڈنگ میں ۲۱ گھنٹے لگ گئے۔ ساحر کے لکھے ہوئے اس گیت کی موسیقی رویندر جین دے رہے ہیں اور یہ رویندر جین کا پہلا گانا ہے جو اسٹیریو فونک ساؤنڈ پر ریکارڈ کیا گیا ہے

Printed at INTEKHAB PRESS

Registered with the Registrar of Newspaper Registered No. 8285/64

E - 5 Phone :

POONAM URDU MONTHLY

ice : Azampura. Hyderabad-500024 Editor : Nasir Kurnooli, M.A.

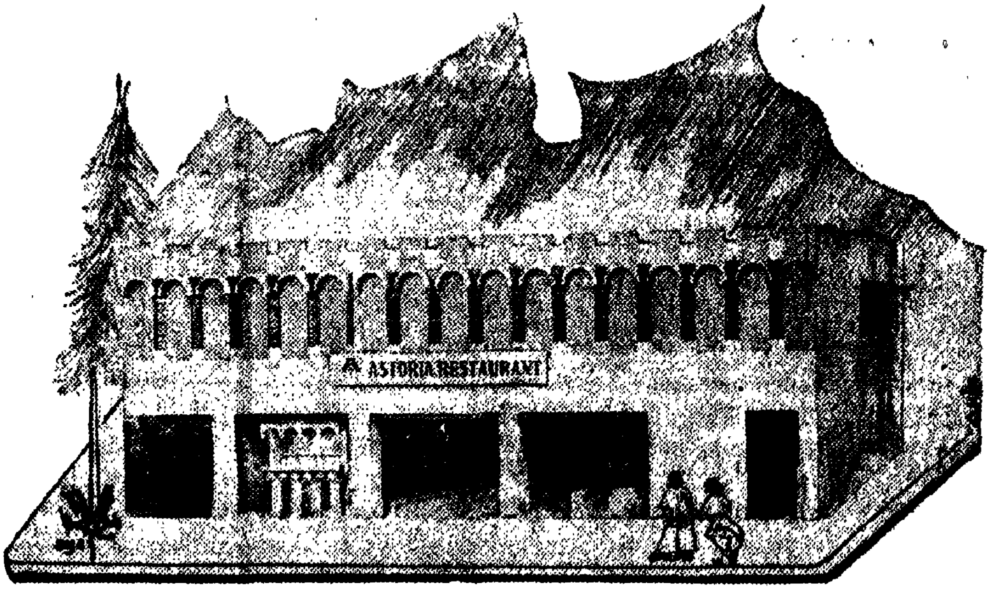
ASTORIA RESTAURANT

Inauguration

by

Mr. AHMED SHAREEF

Minister for Wakf & Relief & Rehabilitation



on Monday, 17th April, 1978 at 10-00 a. m.

opp : Reserve Bank of India, Secretariat Road, Hyderabad

Centre for : MOGULAI DISHES

فیض احمد فیض سے انٹرویو
اندرون صفحات پر

May, 1978

Price : 1-25

ترتیب

اشاعت کا چودھواں سال
جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت
علمی، ادبی، اور تہذیبی ماہنامہ

پونم

جلد (۱۴)
شمارہ (۵)
مئی ۱۹۷۸ء

زرِ سالانہ (۱۵) روپے
لائبریریز کے لئے (۲۰) روپے
بیرونی ممالک سے (۲۵) شلنگ

ایڈیٹر:
ناصر کرنولی ایم اے عثمانیہ

خط و کتابت کا پتہ:
منیجر ماہنامہ "پونم" 16-7-300/1
اعظم پورہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴

ماہنامہ پونم میں شائع ہونے والے تمام مضامین میں نام، واقعات، کردار اور مقامات فرضی ہوتے ہیں۔ ان سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی جس کے لئے ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی ——

مطبوعہ:
دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

کُل ہند اعزاز کے لائق

عام طور پر ہندوستان کا غلہ گودام کہلانے والی ریاست آندھرا پردیش فاضل غذائی اجناس پیدا کرنے والی ریاست ہے۔ اس کا شمار ہندوستان کی ان ریاستوں میں ہوتا ہے جو کثیر ترین مقدار میں چاول پیدا کرتی ہیں۔

ہمارے یہاں چاول کی کثیر پیداوار دینے والے تخموں کو کاشت کاروں میں مقبول بنانے کی مستعدی کے ساتھ مساعی کی گئی ہیں۔ ان مساعی کے نتیجے میں کثیر پیداواری اقسام والے تخم جیسے "جیا" "سونا" "رتنا" "جگناتھ" اور "آر بی ۱۹۳" وغیرہ آج کاشت کار برادری میں پہلے سے کہیں زیادہ مقبول و پسندیدہ ہیں۔

سال ۷۸-۱۹۷۷ء کے دوران میں زرعی پیداوار کو بڑھانے کے لئے متعدد تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ خریف اور ربیع دونوں موسموں میں کاشت کاروں کو فراہم کردہ دوسری اعانتوں کے علاوہ ۵۸ر۴۲ کروڑ روپے قلیل مدتی قرض کے طور پر تقسیم کیے گئے۔

ہماری ریاست نے ہمہ گیر اہمیت والے غذائی محاذ پر جو ممتاز اور نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں وہ کُل ہند اعزاز کے لائق ہیں۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ

آندھرا پردیش حیدرآباد

DIPR: 1/78-79 LETTER No: 1745

فاروق خالد

فیض احمد فیض سے انٹرویو

س :۔ آپ شاعری میں کن شخصیات سے متاثر ہوئے ہیں ؟

ج :۔ میرے کلاسیکی اساتذہ شاعری میں سعدی سے لے کر غالب تک کا نام آتا ہے ۔ اور میرے اپنے معاصرین علامہ اقبال، حسرت موہانی اور اے ایس بخاری ہیں۔ جن سے میں بے حد متاثر ہوں ۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، اور صوفی تبسم کی شاعری سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔

س :۔ آپ اپنی شاعری میں کس رجحان کی طرف نسبتاً زیادہ مائل ہیں ؟

ج :۔ جو چیز اپنی سمجھ کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے اور آس پاس کی ترجمانی کرتی ہو اُسے اپنے شعروں میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔

س :۔ شعر و ادب میں آفاقی قدریں کیسے محفوظ رہ سکتی ہیں ؟

ج :۔ وقتی قدریں اور آفاقی قدریں مقامی قدریں یا وفاقی قدریں۔ ان کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ ہر دور کو مختلف حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کا تعلق معاشرے سے بھی ہوتا ہے۔ اور باقی دُنیا سے بھی ۔ چنانچہ وہ ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں ۔ ایک آدمی اگر اپنے معاشرے کو سمجھنے کا شعور نہیں رکھتا تو وہ باقی دنیا کو نہیں سمجھ سکتا۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں ایک دوسرے سے ملی ہوتی ہیں ہمیں معاشرے میں پھیلی ہوئی ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو جن کی بظاہر کوئی حقیقت نظر نہیں آتی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے ۔ اگر ان رشتوں کے بارے میں آپ کا شعور صحیح ہے تو آفاقی قدریں محفوظ رہ سکتی ہیں ۔ اور یہی ادب دیرپا ہوگا ۔

س :۔ کون سے ادب کو دوام حاصل ہوتا ہے ؟

ج :۔ وہ ادب دیرپا ہوتا ہے جس کی حقیقت کا معیار وقت کا دھارا متعین کرے ۔ اس میں شعور کا اس طریقے سے عمل دخل ہو کہ ہم حقائق کو مستقل انسانی ارتقائی عمل کے ساتھ منسلک کریں۔ ہر دور میں ایک ہنگامی حقیقت بھی جنم لیتی ہے لیکن وہ ماضی اور مستقبل کے ساتھ مربوط نہ ہونے کی وجہ سے کوئی دیرپا تاثر نہیں چھوڑتی۔ ہر اچھا ادب ہم عصر ہوتا ہے، ہنگامی نہیں ہوتا ۔

س :۔ ہنگامی ادب سے آپ کیا مراد لیتے ہیں ۔؟

ج :۔ وہ ادب جس کا معاشرے کی بنیادی حقیقتوں کے ساتھ کوئی گہرا تعلق نہ ہو ۔ ہنگامی اور عارضی ادب کہلاتا ہے

س :۔ موجودہ دور میں ہنگامی ادب وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ نئی نسل کے ادیب ہنگامی ادب میں مقیّد ہو کر رہ گئے ہیں؟

ج :۔ ادیبوں کے بارے میں کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ ہر دور میں قد آور ادیب بھی ہوتے ہیں۔ اور غیر پختہ ادیب بھی ۔ یہ درست ہے کہ اس دور میں نا پختہ اور شہرت پسند ادیب بھی بہ کثرت پیدا ہو گئے ہیں لیکن ایسے ادیب جلد ہی وقت کے دھارے کے ساتھ بہہ جاتے ہیں۔ آج کے دور میں ہنگامی ادب کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ دور ہی ہنگامی ہے۔ اس میں ادیبوں کا کچھ قصور نہیں ہے۔ آج کے دور میں جو ادیب اپنے آپ کو بچا سکیں گے اور آفاقی قدریں قائم رکھ سکیں گے وہ بلاشبہ کندن بن کر نکلیں گے ۔

س :۔ آپ کے نزدیک ایک ادیب کی بنیادی ذمہ داریاں کیا ہیں ؟

ج :۔ ایک ادیب کی ذمہ داریاں وہی ہیں جو ایک انسان کی ہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ معاشرے میں باشعور ہے۔ چنانچہ نسبتاً باقی افراد کے ادیب کو بالغ نقطۂ نظر رکھنا چاہیئے ۔ چونکہ اُس کے الفاظ لوگوں تک

پہنچتے ہیں اس لئے اُس کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اُس پر فرض عاید ہوتا ہے کہ اُس کی تحریر نیکی اور پاکیزگی کی طرف مائل کرے۔ انسان دشمنی اور خود غرضی کا درس نہ دے۔

س :۔ بعض ادیبوں کی تحریریں بہت عمدہ ہوتی ہیں لیکن وہ خود اُن اوصاف سے بعید ہوتے ہیں۔ کیوں؟

ج :۔ اس لئے کہ وہ بھی اُسی معاشرے کے افراد ہیں جس طرح معاشرے میں پھیلے ہوئے باقی لوگ بدی کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اُسی طرح ایک ادیب بھی گمراہی کے راستے پر گامزن ہو سکتا ہے۔

س :۔ نئے ادیب اور نئی نسل کو آپ کیا پیغام دیں گے؟

ج :۔ آدمی کی اپنی ذات اتنی اہم نہیں جتنے کہ انسانیت کے تقاضے ہیں۔ انسانیت کو جو مسائل درپیش ہیں انھیں حل کرنے کی کوشش کریں۔ ●●

★ ۱۹۷۸ء فیض احمد فیض کی شاعری کی گولڈن جوبلی کا سال ہے۔ فیض نے ۱۹۲۸ء میں شاعری شروع کی اور اب ان کی مشقِ سخن کے ۵۰ سال مکمل ہو رہے ہیں۔ اس موقعہ پر ادارۂ پونم فیض کی خدمت میں پُرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہے

★ پونم کے آئندہ شمارے میں مرزا ظفر الحسن کا خصوصی مضمون "فیض سوئے دار چلے" قارئین کی ضیافتِ طبع کیلئے پیش کیا جائے گا۔ (ادارہ)

نذرِ فیض

● ڈاکٹر غیاث صدیقی

سرِ وادیٔ سینا
لن ترانی

نہیں بالکل نہیں
جبیں پہ قطرے محنت کے
چراغِ صبحِ یزداں
متاعِ علم و فن کا خامۂ انگشت
خونِ دل میں آلودہ
زباں زنجیر کے حلقوں میں گویا
گلوئے عشق تک
دار و رسن کی نارسائی
ترے قامت کا اندازہ
فلک بھی کر نہ پایا

○

غزل
(نذرِ فیض)

محمد منظور احمد

ہر دور میں انعام لئے بے بصری نے — موتی ہی لٹائے ہیں یہاں دیدہ وری نے
وہ جس نے ستاروں پہ بھی ڈالی ہیں کمندیں — برباد کیا اس کو فقط خود نگری نے
اک شہرِ غزل 'صاف' نگاہوں کے ہے آگے — پہنچایا یہاں تک تو ہے، شوریدہ سری نے
ہر مرحلۂ غم سے جو ہنستے ہوئے گزرے — اعجاز دکھایا ہے یہ صاحب نظری نے
الزام کسی پہ نہیں، بربادیٔ دل کا — وارفتہ کیا تھا ہمیں وحشت اثری نے

اک سوزشِ پنہاں سے تڑپتے رہے منظور
سمجھا ہی نہیں اس کو کبھی چارہ گری نے

○

دوسری و آخری قسط

محسن علی

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

(اُردو کے مشہور ادیب اشفاق حسین صاحب کی یاد میں)

اُن دنوں دراصل اشفاق صاحب اور مخدوم صاحب دونوں کی زندگی کا شام ہو رہا تھی۔ سرِ شام جب مخدوم صاحب اور گوڑ صاحب پہونچنے والے تھے تو اشفاق صاحب نے تیلی مہری کے پاجامے پر خاص حیدرآبادی شیروانی پہنا اور پاؤں میں چپڑھا دیں۔ کنگھی کرنے کے بعد ایک بڑا اسنگار چلا یا ایسا لگا کہ حیدرآباد قدیم کی ایک تہذیبی شام میں شرکت کے لئے وہ تیار ہو گئے ہیں۔ جہاں ایک سُبک رو محفلِ شعر و نغمہ کا اہتمام ہوا ہو۔ مخدوم صاحب اور گوڑ صاحب آ گئے۔ اشفاق صاحب نے اُن کا خیرِ مقدم اس طرح کیا کہ تینوں نے ایک ساتھ قہقہے لگائے۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے گھر کا چھوٹا سا ڈرائنگ روم پھیل کر کوٹھی دیکمیں کا لج کا دربار ہال بن گیا ہو۔ ہر طرف چاندنیوں کا فرش، مدھم مدھم قمقمے۔ ہر طرف موگرے کی لڑیاں ۔ بھینی بھینی خوشبو، شامِ غزل میں گائی جانے والی مخدوم کی غزل سے پھولوں کے ہار، پھولوں کے گجرے شام پھولوں کی، رات پھولوں کی

اشفاق صاحب سے مخدوم صاحب ملے تو کھِل اُٹھے۔ نظم پر نظم اور غزل پر غزل سُنانے لگے گوڑ صاحب چپ چاپ داد دے رہے تھے اور کچھ یاد کر رہے تھے۔ لیکن اشفاق صاحب تڑپ رہے تھے اور سینہ سہلا رہے تھے۔ جیسے سینے میں کوئی پھانس سی تھی۔ وہ آہ کرتے اور تڑپ اُٹھتے۔ لیکن آتشِ سیال نے جب ان کے سینے کو اور بھڑکا دیا اور یادِ رفتہ نے اور تڑپایا تو مخدوم صاحب پر انھوں نے اپنے خلوص کی بوچھاڑ کر دی اور ہر شعر پر یوں داد دینے لگے۔

واہ مخدوم (گالی)
آہ مخدوم (گالی)

مخدوم صاحب نے اچانک مجھ سے کہا دیکھا محسن، اُتر گئی بدمعاش کی شیروانی۔ ننگا ہو گیا۔

ایک قہقہہ لگاتے ہوئے اشفاق صاحب نے کہا۔ "ارے تیری شاعری تو صرف ننگوں، بھوکوں کی مرہونِ منت ہے۔" مجھ سے کہا۔ "چلو بھوک لگی ہے۔ اِسے ڈنر کھلائیں گے"

ڈرائنگ روم سے جب ہم سب باہر نکل رہے تھے تو مخدوم صاحب اور اشفاق صاحب پیچھے ٹھہر گئے اُن سے ایک قدم آگے میں تھا۔ دروازے کے پاس ہی دیوار پر ایک کیلنڈر تھا جس پر ایک خوبصورت الھڑ لڑکی کی نیم عریاں تصویر تھی۔ مخدوم صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی ہی شوخ عثمانین سرگوشی میں اشفاق صاحب سے پوچھا۔ "کون ہے رہے یہ؟"

اشفاق صاحب نے جو اُس کا سوپر عثمانین جواب دیا (وہ یہاں لکھنے سے قاصر ہوں) مخدوم صاحب ہنستے ہنستے لوٹ گئے اور اشفاق صاحب کو انھوں نے دبی آواز میں ایک ٹھیٹ حیدرآبادی گالی دے دی۔

کھانے کے بعد بھی ۱۲ بجے تک محفلِ شعر گرم رہی۔ مخدوم صاحب کو اس قدر کھلا ہوا میں نے بہت کم دیکھا تھا۔ جب رات ڈھلنے لگی تو مخدوم صاحب اور گوڑ صاحب رخصت ہوئے پہاڑی کے ڈھلوان پر اُترتی ہوئی اُن کی کار کی

سُرخ روشنیوں کو اشفاق صاحب دیر تک دیکھتے رہے ۔

اشفاق صاحب نے ڈھیر سی کتابیں پڑھی ہوں گی ۔ ناول، کہانی، شاعری، فلسفہ، تاریخ، مذہب ہر موضوع اسی انہماک سے پڑھتے ۔

جن دنوں میرے پاس مقیم تھے بولے ۔ " ہائے بس، یہی پہاڑی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہوں (ان دنوں موسم خوشگوار تھا) بہت ہی اچھے سگریٹ ہوں، وقت پر گرم گرم چائے، شام میں روز شراب ایک گوشۂ عافیت اور ڈھیر سی کتابیں، بس ـــ " مطالعے کے تعلق سے اُن کو صحیح معنوں میں پیٹو کہا جا سکتا ہے ۔ وہ سنگ ہو یا سنگ ریزہ سب ہضم ۔ بلاشبہ اُن کے پاس علم کا ایک بہت بڑا خزانہ تھا جسے وہ بالکل کال کوٹھری کی طرح ہمیشہ بند اور محفوظ رکھتے ۔ نہ کبھی بے وجہ کسی سے بحث کی ۔ نہ تبحرِ علمی کا اشارۃً ہی کبھی اظہار کیا ۔ کہیں کبھی ایسی نوبت ہی آگئی جہاں فریقین بری طرح کسی مسئلہ پر بحث میں گتھم گتھا ہو گئے ہوں تو بڑی ہی سنگدلی سے بس اتنا دخل دے دیا کہ ایک حکم سنا دیا ۔ " یہ بات صحیح ہے ۔ یہ بات غلط ہے ۔ " اور اپنے فیصلے کی تصدیق کے لئے بہ کمال بخالت کسی برگزیدہ کتاب کا حوالہ دے دیا جیسے سب کو فیض پہونچا رہے ہوں اور چپ ہو گئے ۔

اپنے ایک خط میں مجھے لکھا کہ مجھے سلیکشن گریڈ مل گیا ہے اور بمبئی تبادلہ ہو گیا ہے ۔ آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے ڈائرکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد بمبئی کے جگمگاتے ماحول میں اُن کی زندگی بڑی دلچسپ مصروفیتوں میں گذر رہی ۔ پابندی سے مجھے لکھا کرتے ۔ " آج گورنر کے ہاں ڈنر ہوا ۔ بیرونی سفرا کے ساتھ ابرلسے انٹر کانٹیننٹل میں شام گذر رہی ۔ فلم فیر کے ایوارڈ فنکشن میں بڑا دلچسپ وقت گذرا ۔ کرشن چندر سے اُن کے گھر پر ملاقات ہوئی ۔ وقت کی واحد شخصیت ہے ۔ کرشن اور سلمیٰ صدیقی کے ساتھ کچھ وقت گذرا ۔ آج مجروح نے سکاچ پلائی ۔ وہ اپنے خلوص سے مجروح کر دیتا ہے ۔ کل بیدی آئے تھے ۔ اتنے بڑے آدمی اور یہ سادگی ۔ سردار جعفری کے ساتھ کچھ وقت گذرا، بڑا ہی جید آدمی ہے ۔ کمال امروہی نے آکر پاکیزہ کے ٹکٹ دیئے ۔ انگلینڈ ورسز انڈیا کرکٹ میچ گورنرز پویلین میں بیٹھ کر دیکھا ۔ (کاش تم آجاتے) سرکاری مہمان کی حیثیت سے گوا جانا پڑا ۔ راستہ میں پانی کے جہاز کا سفر، اُف وہ مناظرِ قدرت، رات کے وہ جگمگاتے رنگ اور ناؤ نوشی ـــ

ان الف لیلوی مصروفیتوں کو چھوڑ کر عید کیلئے حیدرآباد آئے اور مجھے بھی بلا کر بتایا کہ گاؤں جانا ہے ۔ اُن کے والد مرحوم کی برسی کی فاتحہ کے لئے ۔ ایک بڑا قافلہ گاؤں کی طرف روانہ ہوا ۔ دورانِ سفر میں وہ آل انڈیا ریڈیو کے ایک سال بعد ریٹائر ہونے والے ڈائرکٹر اشفاق حسین صاحب نہیں لگتے تھے ۔ وہ تو بالکل عثمانیہ یونیورسٹی کے ہونہار اور کھلنڈرے طالب علم نظر آتے تھے ۔ نہ جانے کونسی یادیں ایک ایسا ولولہ بن گئی تھیں کہ ہر لمحہ ایک قہقہہ بن کر کھل اٹھتیں ۔ گاؤں پہونچے تو اپنے اسی بلند و وسیع آبائی مکان میں جس کا تین چوتھائی حصہ تاریخ کی نذر ہو گیا تھا وہ فوراً ایک گوشۂ عافیت پہ قابض ہو گئے ۔ شام میں فاتحہ ہوئی ۔ یہ ہمارا خاندانی قبرستان ہے جہاں اشفاق صاحب کے والدِ مرحوم سید افضل حسین صاحب بھی محوِ استراحت ہیں ۔ قریہ کی مسجد میں جب سب نمازِ عصر کے لئے جماعت میں کھڑے ہوئے تو اشفاق صاحب غائب ۔ مجھے یقین تھا جناب جل دے گئے ۔ اقبال کے مردِ مومن کی تفہیم کرنے والا مومن اپنے خدا کے حضور آنے کے لئے شرما گیا ۔ بعد نماز قریہ میں ختمِ قرآن ہوا ۔ ایک عجیب منظر تھا جو میرے نظروں نے دیکھا ۔ جب سب اپنا اپنا پارہ لیکر پڑھنے لگے، تو وہ خود ایسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے جہاں اور بھی پارے رکھے تھے وہ بار بار میری طرف دیکھ رہے تھے ۔ اُن کی آنکھیں صاف مجھ سے کہہ رہی تھیں ۔ " تم سمجھتے ہو میں قرآن پڑھنا نہیں جانتا ؟ میں نماز نہیں پڑھتا میں مذہب سے دور ہوں ؟ " اسی طرح میری طرف دیکھتے ہوئے اُن کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آئی اور نظریں جھکا کر انھوں نے ایک پارہ اٹھا لیا ۔ جب وہ قرآن پڑھنے لگے تو جوابی نظروں سے مجھے دیکھ " دیکھا میں قرآن پڑھ رہا ہوں ۔ "

میرے ذہن میں اُن کی جو ایک تصویر تھی وہ تجریدی بن گئی۔ ختم قرآن کے بعد سلام ہوا سب کھڑے ہوئے سلام پڑھ رہے تھے۔ اشفاق صاحب بھی کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے جو دیکھا اُس پر مجھے یقین نہیں آیا۔ لیکن یقین کرنا پڑا۔ لوگ سلام پڑھ رہے تھے اور اشفاق صاحب زار و قطار رو رہے تھے اُن کا سارا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اُن بھیگی ہوئی آنکھوں سے بھی وہ مجھے پوچھ رہے تھے " کیا سمجھتے ہو تم مجھے"۔

قبرستان سے نکل کر پھر ہم اپنے گھر آئے سارے گاؤں والوں کو اُس دن کھانا کھلایا گیا کھانے کے بعد اشفاق صاحب کا لڑکپن عود کر آ گیا۔ ہمارا آبائی گھر پھر قہقہوں سے گونجنے لگا دوسرے دن ہم سب گاؤں سے واپس ہوئے۔

ریٹائر ہونے کے بعد بمبئی سے جب حیدرآباد آ کر بس گئے تو تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ ابو الکلام آزاد اکیڈیمی میں اُردو انسائیکلوپیڈیا کے اسسٹنٹ چیف ایڈیٹر مقرر ہو گئے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی آخری تصنیف میں بُری طرح گتھ گئے۔ اُن کی آخری تصنیف بھی اقبال پر ہی تھی، جو " اقبال اور انسان " کے نام سے آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی کی طرف سے شائع ہوئی۔

" اقبال اور انسان " کی رسم اجرا تھی۔ اُردو ہال میں اہتمام ہوا تھا۔ اُسی دن میں حیدرآباد پہونچا۔ جانے کس شدت سے اپنے گھر پر وہ میرے منتظر تھے جیسے ہی انھیں معلوم ہوا کہ میں آ گیا ہوں۔ اپنے ڈریسنگ روم سے باہر آ گئے اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک ہاتھ میں نِک ٹائی کی نامکمل گرہ تھی اور دوسرے ہاتھ میں " اقبال اور انسان " کا ایک نسخہ۔ میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا اور کتاب میرے ہاتھ میں تھما دی۔ اور مسکراتے ہوئے اپنی ٹائی کی گرہ باندھنے لگے میں نے کہا۔ " مبارک " تو انھوں نے بڑے ہی کھُردُرے انداز میں کہا۔ " ٹھہرو " فوراً ڈرائینگ روم میں جا کر اپنا کوٹ پہنا اور مجھ سے کہا۔ " بس اب آدھ گھنٹے میں ہم کو اُردو ہال پہونچنا ہے۔ " میں نے کہا۔ " چلیے " تو کہنے لگے۔ " چلیے نہیں "

اِدھر آؤ ۔ وہ فوراً اپنے گھر کے صحن کے ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ (تحریر اُن کا ذوقِ اول تھا اور تحریر کے وہ غازی تھے لیکن تقریر کے شہید۔) مجھ سے کہا۔

" میں مقرر ہوں اور تم ۔ سامعین "

میں ہنس پڑا تو کہا۔ " جناب صدر و معزز حاضرین ۔ میں ۔ ۔ ۔ " انھوں نے پوری طرح حفظ کی ہوئی تقریر مجھ " سامعین " کو سنا ڈالی۔ اُن کی شستہ تقریر سے بھی میں مرعوب ہو گیا۔ پھر بھی انھوں نے اپنی عدم اعتمادی کو چھپاتے ہوئے مجھ سے پوچھا تقریر تو لگتی ہے نا " میں نے کہا۔ " تقریر تو اپنی جگہ تقریر لگتی ہے لیکن کمال تو یہ ہے کہ آپ مقرر لگتے ہیں۔ ساری تقریر "ACTION Packed" ہے یہ سُن کر فوراً پاپ بلا لیا۔

اُردو ہال پہونچے۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ اُن کو ڈائس پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر مجھے بار بار یہی گمان ہو رہا تھا کہ بجائے دوسروں کی تقریروں پر دھیان دے سکے وہ اپنی ہی تقریر کا ریہرسل کر رہے ہوں گے۔ اللہ اللہ کر کے وہ وقت امتحان آ گیا۔ تقریر کرنے وہ کھڑے ہوئے۔ پُل صراط پر قدم رکھا۔ تھوڑی دیر میں ساری محفل تالیوں سے گونج اُٹھی۔ بس میں ہکا بکا رہ گیا۔ اشفاق صاحب کے چہرے پر اب وہ سکون تھا جو ایک بڑے طوفان کے بعد سمندر پر چھا جاتا ہے۔ صدر جلسہ جناب گوپال ریڈی صاحب تقریر سے بے حد متاثر ہوئے۔ رسم اجرا ادا ہوئی۔ اور جب محفل برخواست ہوئی تو سارے احباب نے اشفاق صاحب کو گھیر لیا۔ سب سے مل کر عمر خان صاحب کی گاڑی میں وہاں سے نکل گئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اُن کے ایک کرنل دوست نے بڑی سادہ لوحی سے پوچھا۔ " بھئی اشفاق ، اِن دنوں جو اقبال ڈے منائے جا رہے ہیں۔ تم اُس میں تقریر کیوں نہیں کرتے؟ " اشفاق صاحب نے ایک مزیدار قہقہہ لگایا اور کہا۔

" ارے وہ اقبال ڈے والے میرے گھر کے چکر کاٹ رہے ہیں مگر میں اُن کے ہتھے نہیں چڑھوں گا۔ "

گھر پہونچنے کے بعد میں نے اشفاق صاحب سے کہا۔ " جواب نہیں آپ کی تقریر کا۔ ریہرسل کی ہوئی تقریر کا پورا نصف عمل غائب تھا لیکن پھر بھی تقریر کا تاثر مکمل۔ " واہ ۔ یہ بات سنتے ہی اپنے مخصوص انداز میں تڑپ

اُٹھے اور بلند آواز میں بولے۔ "خدا کی قسم جواب نہیں سامعین"۔ کیا چور پکڑا ہے اور کیا نکتہ نکالا ہے"۔ اتنے خوش ہوئے کہ اقبال اور انسان کا وہ مبارک نسخہ میرے حوالے کر دیا جو گوپال ریڈی صاحب نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے اُن کو پیش کیا تھا۔ وہ قیمتی عطیہ میرے پاس محفوظ ہے۔

اقبال اور انسان کے بعد اور کوئی تصنیف اُن کے زیر تحریر نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو اُن کی صحت نہ گرتی — ایک دن ایسا لگا گرم ہوا کا ایک جھونکا آیا اور گذر گیا۔

اشفاق صاحب اور میں سڑک پر ساتھ چل رہے تھے۔ انھوں نے کہا "میں چل نہیں سکتا۔ میرا سانس پھول جاتا ہے۔" اب مسلسل اُن کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں نے بہت سارے شبہات کا اظہار کر دیا تھا اور خصوصاً کینسر کا۔ لیکن اُن کو یقین نہیں تھا۔

کچھ دنوں بعد میرے پاس خط آیا۔ "میں بمبئی جا رہا ہوں، اپنا چیک اپ کروانے کے لئے" میں اُن کی تاریخ روانگی پر حیدرآباد پہونچ گیا۔ وہ صبح کی فلائیٹ سے بمبئی جانے والے تھے۔ میں ۷ بجے صبح پہونچ گیا۔ وہ حسب معمول نہانے کے بعد ٹہل رہے تھے۔ عرصہ سے یہ اُن کا معمول تھا کہ نہانے کے بعد گھر ہی میں تیز تیز ٹہلتے اور ٹہلتے ہوئے کوئی وظیفہ پڑھتے رہتے۔ پھر ڈاکٹروں کی بتائی ہوئی مختصر سی ورزش کرتے۔ اُس دن بھی انھوں نے یہ معمول پورا کیا۔ میں اُن کے بیڈروم میں کھڑا تھا۔ وہ میرے قریب آئے۔ مسکرا پڑے اور پھر اس طرح ڈرائنگ روم میں گھس گئے جیسے مجھ سے اور سبھی سے کوئی چیز چھپانا چاہتے ہوں۔ اس وقت پہلی بار اُن کی عجیب و غریب آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں ہوا ہو گیا تھا میری ہمت نہیں ہوئی کہ جھانک کر اس کمرے میں دیکھوں — وہ قبلہ رو کھڑے ہوئے تھے اور دست دعا اٹھا کر رو پڑے تھے۔ "بس میرے اللہ رحم کر دے۔ مجھے اس موذی مرض سے بچا لے۔" پھر وہ فوراً اُس کمرے میں آ گئے جہاں میں کھڑا تھا۔ اُن سے میں نظریں ملا نہ سکا۔ بس اس طرح بات کی جیسے میں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ تب وہ ناشتہ کرنے لگے تو میں نے اُن کو چھیڑنا شروع کیا۔ "بھئی کیا بات ہوئی۔ آپ تو دو گھڑی میں بمبئی پہونچ جائیں گے۔" "واہ" انھوں نے کہا۔ "یہ قسمت والوں کی بات ہے۔ تم کو معلوم ہے، میں گورنر کا مہمان رہوں گا اور راج بھون میں ٹھہروں گا۔ اور ٹاٹا انسٹیٹوٹ میں میرا چیک اپ ہوگا۔"

بیگم پیٹھ ہوائی اڈے پر اُن کو رخصت کرنے کے لئے سبھی آئے تھے۔ اُن کے احباب، رشتہ دار۔ میں بھی تھا۔ جب ہم نے اُن کو خدا حافظ کہا تو انھوں نے پلٹ کر اپنے دونوں بیٹوں کو دیکھا۔ لگا اشفاق صاحب کی آنکھوں سے پلکیں غائب ہیں۔ بس سرخ لکیریں سی نظر آئیں۔

میں واپس سنگاریڈی آ گیا۔

بمبئی میں دوسرے ہی دن اُن کو میڈیکل رپورٹ مل گئی۔ تشخیص تھی شش کا کینسر۔ مجھے اطلاع ملی، جی دہل کر رہ گیا۔ ایک گڑگڑاتی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔

"میرے اللہ مجھے اس موذی مرض سے بچا لینا"

بڑی ہی حقیقت پسند طبیعت پائی تھی۔ اب ساری حقیقتیں اُن کے سامنے عیاں تھیں۔ مرض تھا، مرض کا انجام تھا — ایک ٹھوس حقیقت — اُسے قبول کر لیا اور چپ ہو گئے۔ نہ کسی کی ہمت افزائی پر کان دھرا نہ کسی کا دلاسہ قبول کیا۔ بس چپ ہو گئے اور بڑی ہی تیزی سے منزل کی طرف چل پڑے۔

میں پہونچا۔ دیکھا تو محسوس ہوا، میرے اپنے دست و پا میرے پاس نہیں۔ کوسوں میل دور سے انھوں نے مجھے دیکھا۔ جانے کن گہری کھائیوں سے ایک مسکراہٹ لے آئے۔ جواب میں ایک بڑی ہی وزنی مسکراہٹ کا بوجھ مجھے سہنا پڑا۔ میری مسکراہٹ کو دیکھ کر ایک من وزن اُٹھانے کے انداز میں بہ مشکل اپنا ایک ہاتھ اپنے ہونٹوں تک لے گئے اور دو انگلیاں اپنے ہونٹوں پر رکھ کر اشارہ کیا۔

"ایک سگریٹ" مجھے ایک دھکا سا لگا۔ میں نے ہمت کر کے کہا "نہیں، سگریٹ نہیں مل سکتا۔"

اُف کس تیزی سے اُن کے ایک ہاتھ میں جنبش ہوئی اور زبان سے یہ الفاظ نکل پڑے۔

"GET OUT"

میں غیب اُٹھ رہا تو پھر ہاتھ کے اشارے

سے کہا ـــ " بس ایک "

جانے کتنا کڑوا کسیلا تھا وہ جذبۂ ترحم جو میں نے اس وقت اپنے سینے میں ایک درد کی شکل میں محسوس کیا۔ اُن کی پسند کا ایک سگریٹ پیش کیا۔ گھڑی بھر کے لئے اس طرح اُن کی آنکھیں روشن ہوگئیں ۔ لگا اب وہ اُٹھ کر بیٹھ جائیں گے اور مجھے سُنانا شروع کردیں گے کہ اُن کے اندر سے کونسی کونسی چیزیں نکال دی گئی ہیں اور اب کیا کچھ وہاں باقی رہ گیا ہے جس طرح اصرار کرسکتے تھے کیا اور سگریٹ جلالیا۔ وہ سگریٹ پیتے رہے اور آدھا سگریٹ جلنے تک شاید اپنے لڑکپن میں چھوڑے ہوئے گاؤں سے بمبئی کے آخری سفر تک کا فاصلہ طئے کرلیا ۔ تمباکو نوشی وہ طویل سفر تھا اور اُس کی منزل وہ مرض تھا ـــ آدھا سگریٹ بجھا کر تکیئے کے نیچے رکھ لیا مستقبل کے لئے ـــ اس وقت میری نظر اُن کے کمرے میں رکھی لاتعداد کتابوں پر پڑی ۔ فلسفہ، تاریخ، ادب، شعر و حکمت ـــ کلفر الحسن کی " ذکر یار چلے " (جس میں اشفاق صاحب اور مخدوم صاحب ساتھ ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے) کتابیں ہی کتابیں ـــ اف وہ ایک ادھ جلا سگریٹ اور اُسی سے بھی زیادہ جلا ہوا وہ لاغر و لاچار ـــ سرتاپا مجسم

مشکل سے کچھ دن گذرے ہوں گے اطلاع ملی کہ اشفاق صاحب کا انتقال ہوگیا بے نام اللہ کا ـــ یہ کیا قدرت کا انتظام تھا، میں سوچتا ہی رہ گیا کہ ہم سب خاندان کے چھوٹے بڑوں نے مل کر بہ صد خلوص و پیار اُن کو " حق آرام طلبی اور حق اعزازِ خصوصی " کے نام کی جو دو مہریں اُن کے حوالہ کی تھیں وہ آج بھی سکۂ رائج الوقت کا حکم رکھتی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کی طرح آج بھی " قطعۂ صالحین " میں ایک باعزاز " گوشۂ عافیت " پر اشفاق صاحب قابض ہوگئے ۔

مجھے یاد آیا ، سجاد ظہیر نے سعادت علی خان کو ایک رات بطور تحفہ ایک شعر دیا تھا وہی شعر سجاد ظہیر کی موت پر اشفاق صاحب نے لکھا تھا اور آج وہ شعر پھر اپنے آپ کو دہرا رہا ہے ؎

ہم بیخودانِ محفلِ تصویر اب گئے
تم بیٹھے انتظار ہمارا کیا کرو

ـــــ(●)ـــــ

اساتذۂ سخن کی اصلاحیں

حضرت خواجہ غلام نظام الدین قادری بدایونی

شعر: مداح پھپوندوی
ہمیں تو پوچھنا یہ ہے جگر کے رونے والوں سے
بتائیں تو سہی یہ کیوں ملے تھے خوش جمالوں سے

اصلاح:
ہمیں یہ پوچھنا ہے دل جگر کے رونے والوں سے
یہ کیا سمجھے تھے آخر کیوں ملے تھے خوش جمالوں سے

پہلے مصرع میں دل کا لفظ بڑھایا اور دوسرے مصرع میں "یہ کیا سمجھے تھے آخر" بنایا جس سے مطلع کی شان ہی کچھ اور ہو گئی

شعر:
اُدھر وعدہ قیامت کا لبوں پر رہ گیا آ کر
اِدھر اٹھ کر قیامت رہ گئی عاشق کے نالوں سے

اصلاح:
زباں تک آتے آتے رہ گیا وعدہ قیامت کا
قیامت اٹھتے اٹھتے رہ گئی عاشق کے نالوں سے

مصرع اولیٰ کی ترمیم سے "رہ گیا" کا ثبوت قوی ہو گیا دوسرا مصرع بھی پہلے مصرع کی مناسبت سے بنایا گیا جس سے شعر میں سلاست و روانی آ گئی "قیامت اٹھتے اٹھتے رہ گئی" کیا خوب لطف محاورہ ہے

شعر:
تم نے نگاہ ڈالتے ہی دل اڑا لیا
اب اور ہوگا اس سے زیادہ کمال کیا

اصلاح:
تم نے نگاہ ڈالتے ہی دل اڑا لیا
ہوگا اب اور اس سے زیادہ کمال کیا

مصرعۂ ثانی میں لفظوں کے الٹ پھیر سے شعر میں زور بڑھ گیا اور جو ہلکی سی تعقید تھی وہ بھی رفع ہو گئی۔

شعر:
اب وعدۂ وصال پہ یہ قیل و قال کیا
یہ تیرے اختیار میں ہے یہ محال کیا

اصلاح:
اب وعدۂ وصال پہ یہ قیل و قال کیا
جو تیرے اختیار میں ہے وہ محال کیا

اصل مصرع میں "یہ" کی تکرار بدنما تھی اور چونکہ پہلے مصرعے میں لفظ "اب" ہے اس لئے دوسرے مصرعے میں "جو" کی ضرورت ہوئی۔

شعر:
چھیڑ تو دیکھو اگر ہوتا ہوں میں سائل کبھی
وہ یہ کہتے ہیں کہ کوئی دوسرا گھر دیکھیے

اصلاح:
چھیڑ تو دیکھو اگر ہوتا ہوں میں سائل کبھی
ہنس کے فرماتے ہیں کوئی دوسرا گھر دیکھیے

"ہنس کے فرماتے ہیں" کے ٹکڑے نے شعر کی شوخی میں اضافہ کر دیا۔

شعر:
جو آئے ہو تو بیٹھو اک ذرا ٹھہرو ذرا دم
یہ جلدی کس لئے ہے جب تمہیں ہے اپنے گھر جا

اصلاح:
اب آئے ہو تو بیٹھو اک ذرا ٹھہرو ذرا دم
یہ جلدی کیوں ہے آخر آپ کو ہے اپنے گھر جا

پہلے مصرع میں "اب" خوب بنایا اور دوسرے مصرعے کو بھی صاف کر کے شعر کو آئینہ کر دیا

شعر: مطلب پھپوندوی
آغاز عشق ہوتے ہی انجام ہو گیا
پڑتے ہی ان کی آنکھ مرا کام ہو گیا

اصلاح:
آغازِ عشق ہوتے ہی انجام ہو گیا
پہلی نظر میں ان کی مرا کام ہو گیا

"پہلی نظر میں" بنا کے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اب یہ مطلع بے نظیر ہو گیا۔

شعر: خرد دہلوی
مجھ کو نہ ملے داد وفا روزِ جزا بھی
کہہ دو کہ مکہ جائیں گے ہم پیشِ خدا بھی

اصلاح:
ہاں ہاں نہ ملے داد وفا روزِ جزا بھی
کہہ دو کہ مکہ جائیں گے ہم پیشِ خدا بھی

مصرع اولیٰ میں "ہاں" کی تکرار نے ایک خاص لطف کر دیا

آئندہ: حضرت تمنا لکھنوی کی اصلاحیں

جرم محمدآبادی

شکوہ کرنے کو بھی گلا سمجھے　　کیا کہا ہم نے آپ کیا سمجھے
دردِ دل دردِ آشنا سمجھے　　جس پہ بیتی نہ ہو وہ کیا سمجھے
خامشی کو بھی التجا سمجھے　　خوب تم میرا مدعا سمجھے
بدگمانی کا کیا علاج کروں　　وہ محبت کو بھی خطا سمجھے
ابتدا ہی ہو جس کی لامحدود　　کیا کوئی اس کی انتہا سمجھے
سادگی کہیئے یا فریبِ شوق　　راہزن کو بھی رہنما سمجھے
ہائے مجبوریاں محبت کی　　زہر کھانے کو بھی دوا سمجھے
بے غرض کون جان دیتا ہے　　خوب تم معنیٔ وفا سمجھے
جرم دامن جھٹک کے وہ بولے
جائیے آپ سے خدا سمجھے

سعید شہیدی

آج تکمیلِ غم ہو گئی　　آنکھ ان کی بھی نم ہو گئی
چارہ سازی نہ فرمائیں آپ　　دل کی تکلیف کم ہو گئی
خون جب آرزو کا ہوا　　آرزو محترم ہو گئی
وہ مسلسل نگاہوں میں ہیں　　سادگی بھی ستم ہو گئی
مجھ کو اپنا پتہ مل گیا　　فرصتِ بیش و کم ہو گئی
جب ہوئی بے نیازِ سحر　　شامِ غم شامِ غم ہو گئی
آپ جب سامنے آ گئے　　روشنی کتنی کم ہو گئی
میکدہ میں جو پہنچے سعید
میکشی محترم ہو گئی

مہدی پرتاب گڑھی

اس کی آنکھوں کا مر گیا پانی
حیف سر سے گذر گیا پانی
خشک دریاؤں میں ہے ریت ہی ریت
برف پگھلی کدھر گیا پانی
جب بھی برسا ہے ابرِ احساسات
سارے کمرے میں بھر گیا پانی
میرا گھر تھا نشیب کی جانب
کس طرف سے گذر گیا پانی
پردۂ ابر میں ہوا روپوش
دھوپ سے کتنا ڈر گیا پانی
اس کی آنکھیں تو جھیل جیسی تھیں
بدلا موسم اتر گیا پانی
سوندھی سوندھی سی بو ہے مٹی میں
معجزہ پیش کر گیا پانی
زندگی ہے اِدھر اُدھر دیکھو
جس طرف سے گذر گیا پانی
میں ہوں اس سیپ کی طرح مہدی
جس سے بچ کر گذر گیا پانی

غزلیں

غزلیں

ڈاکٹر نریش

ناحق ہے گلہ ہم سے بے جا ہے شکایت بھی
ہم دوڑ کے آجاتے، آواز تو دی ہوتی

توہینِ محبت ہے اظہارِ تمنا بھی
بہتے ہوئے اشکوں نے ہم کو یہ نصیحت دی

رو دے کہ ابھی ہنس دے یا ہنستے ہوئے رو دے
اک طرفہ تماشا ہے عاشق کی طبیعت بھی

آئینہ دکھاتا ہے کم بخت یہ دل مجھ کو
اللہ رے دل ٹوٹے جنبش کوئی ایسی بھی

گو ترکِ تعلق کو اک عمر ہوئی لیکن
سینے میں سلگتی ہے اک یاد کی چنگاری

احساس کی شدت بھی انسان کی دشمن ہے
اے کاش نریش ان سے الفت ہی نہ کی ہوتی

قطب سرشار

انھیں شعور کی فکرِ رسا کی حد کہیئے
میں نا سمجھ ہوں مجھے حرفِ ناملد کہیئے

مسابقت تو جبلت کا اک تقاضہ ہے
منافقت کی وضاحت کو ہی حسد کہیئے

قدِ نگاہ بھی چھوٹا، بدن کی قامت بھی
صدائے مہر و وفا کو دراز قد کہیئے

وہ دل جو درد کے احساس سے معرّا ہے
اُسے لغاتِ محبت میں لاولد کہیئے

پناہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں وہ جو لفظوں میں
انھیں حیات نہیں کشتۂ خرد کہیئے

ملکہ خورشید

ہم پہ نظرِ کرم اگر ہوتی
راہ مشکل نہ اس قدر ہوتی

اُن کے پہلو میں بھی جو دل ہوتا
آہ اپنی نہ بے اثر ہوتی

ہر سو میرے جنوں کے چرچے ہیں
کاش ان کو بھی کچھ خبر ہوتی

بے خودی نے یہ راز کھولا ہے
بات ہرگز نہ مشتہر ہوتی

رونقیں سب تمہارے دم سے ہیں
تم نہ ہوتے تو کیا سحر ہوتی

میری رسوائی تیری خاطر کاش
تیری نظروں میں معتبر ہوتی

ناظمہ ناہید

نہ پوچھ حال ترے بعد لالہ زاروں کا
کہ رنگ ہو گیا پھیکا حسیں بہاروں کا

ڈبو نہ دیں کہیں کشتی، دل یہی میری
کچھ اعتبار نہیں مجھ کو ان کناروں کا

کھلے ہیں پھول چمن میں بہار آئی ہے
جو تو نہیں تو کروں کیا میں ان بہاروں کا

یہ مانا کہ نہیں سکتے انھیں کبھی رسوا
خیال چاہیئے ان کو بھی بادہ خواروں کا

گھٹا بھی چھائی ہے اور رقص میں ہیں پیمانے
نہیں بہلتا مگر دل یہ میگساروں کا

وفا کی اُن سے ہو ناہید اور کیا امید
جو جانتے ہی نہیں درد غم کے ماروں کا

آمنہ ابوالحسن

آج کا عنوان

فکر کے خوش آنند راستے سے
ایک خوبرو خیال
میرے ذہن میں یوں آیا
جیسے دروازے پر کوئی دوست آیا ہو
خوش ہوا سواگت کو تو کوئی نظر نہ آیا
میں نے آواز دی
کیا بات ہے یار۔ رُک مت جاؤ۔ اندر آؤ مگر
میرے کہے کا جواب نہ آیا
آؤ۔ آ بھی جاؤ۔ میں پھر بولا
چائے وائے پی لینا
تھوڑی سی گپ لگا کر پھر ہم یہ سوچیں گے
زندگی کے عنواں کتنے
بندگی۔ پائندگی۔ تابندگی
جینے کے ہیں نام کیا کیا
پر جب کوئی بولا ہی نہیں تو میں گھبرایا
پلیز یار ــــ
مہندر۔ انتیانہ۔ ہری کانتا۔ کرپا سنگھ
جو کوئی ہو، جب آئے ہو تو آ بھی چکو
خاموشی ــــ
ہیں ــ! کوئی آتا کیوں نہیں
ہلا، اٹھا۔ بڑھ کر میں نے باہر جھانکا

کیا کوئی دوست نہیں دروازے پر؟
تو پھر یہ آہٹ کیسی
اُف!
میں ٹھٹکا سہما۔ میں کانپا
سانپ ــــ
جس کی بابت سُنا بہت تھا
کیا اب یہ میرے گھر تک بھی آگیا ہے
میری آواز اور میرے دوستوں کے درمیان
سمجھ گیا۔ ہر شخص سہما سہما کیوں ہے
اسی موذی کا ڈر ہے شاید
جو آج بھی ہر آدمی کے ذہن کی چوکھٹ پہ
بغیر کچھ بولے کھڑا ہوا ہے
اور راستہ بند ہے
خوشی مفقود۔ فکر مسدود
ملک مکان۔ دوستی۔ جان پہچان
کچھ بھی شاید زندہ نہیں
صرف ڈر ہے زندہ
آج کا عنوان

★ ★ ★

ترقی و کامرانی کا مرکز

گذشتہ برسوں کے دوران میں اس ریاست کو تیز رفتاری کے ساتھ صنعتیانے کے لئے جو پُر زور مہم چلائی گئی ہے اس کے نتیجے میں ابندھیاچل کے جنوب میں واقع آندھرا پردیش ترقی و کامرانی کا مرکز بن گیا ہے ریاستی صدر مقام حیدرآباد میں اور اس کے اطراف و اکناف میں مرکزی شعبے کے تحت بہت سے پر وقار صنعتی اداروں کے قیام کے باعث ہندوستان کے صنعتی نقشے میں اس ریاست کی روز افزوں اہمیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

اپنے ماضی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ۱۹۵۶ میں ہمارے یہاں صرف ۴۵ بڑی اور اوسط صنعتیں تھیں جن میں مصروف سرمایہ کی کل مقدار ۴۳ کروڑ روپیے تھی۔ اب صنعتی یونٹوں کی تعداد ۱۵۰ ہو گئی ہے اور ان میں مصروف سرمائے کی مقدار ۶۲۰ کروڑ روپیے تک پہنچ گئی ہے۔ چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔

سورج کی کرنوں سے روشن سرزمین دکن میں واقع ریاست آندھرا پردیش ایسے صنعت کاروں کو جو یہاں کے پسماندہ اور قبائیلی علاقوں میں نئی نئی صنعتیں قائم کرنا چاہتے ہیں وسیع اقسام کی ترغیبات کا پیشکش کرتی ہے۔ سال ۷۹-۱۹۷۸ کے سالانہ منصوبے میں صنعتوں کے لئے ۱۱ر۵۴ کروڑ روپیوں کی متاثر کن گنجائش فراہم کی گئی ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

آندھرا پردیش　　　حیدرآباد

DIPR 2/78-79　　　　LETTER NO: 1745

مفت خوراک

• ترجمہ : آمنہ پروین صدف

PAULIN P. SMITH کی کہانی "THE PEOPLE NEXT DOOR" کا ترجمہ

ایولن بڑی مہارت اور چابکدستی سے سلائیاں چلا رہی تھی۔ اس کی گود میں پڑا اون کا گولا کبھی ایک طرف لڑھک جاتا کبھی دوسری طرف۔ اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر اس کا شوہر ایڈ اخبار کے مطالعہ میں منہمک تھا۔ سلائیوں کی ہلکی سی کھٹ کھٹ کے علاوہ کمرے میں کسی قسم کی آواز نہیں تھی۔ وہ دونوں ہی خاموشی سے اپنے اپنے کام میں مگن تھے۔ مگر یہ خاموشی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ ایڈ نے ایک خبر پڑھ لینے کے بعد کسی دوسری دلچسپ خبر کی تلاش میں اخبار کے صفحہ پر نظریں دوڑاتے ہوئے ایولن سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تمہارے یہ نئے پڑوسی کیسے ہیں ایولن ان سے کوئی تعلقات ہوئے یا نہیں۔"؟

"ٹھیک ہی ہیں۔" ایولن نے گود میں پڑے ہوئے اون کے گولے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

کل صبح جب لان میں ٹہل رہی تھی تو اس وقت پڑوسن سے چند منٹ تک میری رسمی سی گفتگو ہوئی تھی وہ لوگ کیلیفورنیا سے آئے ہیں، وہ ایک عام سی عورت ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

"گذشتہ شام میری بھی اس سے مختصر سی ملاقات ہوئی تھی وہ واقعی ایک عام سی مگر قدرے اچھی عورت ہے۔"

"کیا تم اس سے ملے تھے؟" ایولن نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! لیکن تمھیں دل میں کسی شبہے کو جگہ دینے کی ضرورت نہیں۔ تم خود بھی اس کے اچھے ہونے کا اعتراف کر چکی ہو۔"

"میں کیوں شبہ کروں گی۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ اس کی دوستی تمہارے لئے بہتر رہے گی کبھی کبھی اس کے ساتھ ٹہلنے کے لئے نکل جایا کرو۔ اس کی رفاقت میں تمھیں اپنی سوچوں سے نجات مل جائے گی۔"

"میری اس سے بات چیت نہیں۔ جب وہ کپڑے دھو کر سکھانے کے لئے لان میں آتی ہے تو چند منٹ کے لئے ملاقات ہو جاتی ہے۔"

"گڈ! تمہارے لئے یہ بھی کافی ہے۔ کچھ دیر کے لئے تو دھیان بٹ جاتا ہے۔" ایڈ نے تفصیلی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ایولن نے ایک بار پھر اون کے گولے کی طرف دیکھا اور سلائیاں چلاتے ہوئے بولی۔

"جب وہ لان میں دھلے ہوئے کپڑے ٹانگنے کے لئے آتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی ناگوار فرض ادا کر رہی ہو، اور جب وہ تار پر ٹنگی ہوئی قمیصوں پر کلپ لگاتی ہے تو بالکل یہی محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی کے پیٹ میں چھرا گھونپ رہی ہو۔"

"یو!" ایڈ نے تیز لہجے میں کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا مگر ایولن اس کی طرف توجہ دیئے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"وہ ایسا ہی کرتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اسے بہت زیادہ قمیصیں دھونی پڑتی ہوں۔ پوری چودہ قمیصیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہر روز دو قمیصیں شاید اس کے شوہر کو صاف ستھری قمیص پہننے کا فوبیا ہے۔"

ایڈ نے صفحہ پلٹنے کے بہانے اخبار کھڑکھڑاتے ہوئے اس کی توجہ ہٹانے کی خاطر کہا۔

"ایو! تمھیں ایسی چیزوں کو ذہن میں جگہ نہیں دینی چاہئے۔ تمھیں کسی کے کاموں میں کسی قسم کا فوبیا یا اعصابی ابتری تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ چیزیں تمہارے لئے نقصان دہ ہیں۔ تمہارا نیروس بریک ڈاؤن ہونے کے بعد تو تمھیں ایسی باتوں کو ذہن میں جگہ ہی نہیں دینی چاہئے۔"

ایولن کے ذہن میں اب بھی وہ قمیصیں گھوم رہی تھیں، جو اس کی پڑوسن کو روزانہ دھونی پڑتی تھیں وہ پھر اس کی طرفداری کرتے ہوئے بولی۔

"ممکن ہے وہ ہر ہفتے اتنا ڈھیر ساری قمیصیں دھوتے اور انھیں استری کرتے کرتے تھک چکی ہو اور اب وہ ان سے تنگ آ چکی ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ یہ قمیص دھو کر ٹانگتے وقت کلپیں

اس انداز میں لگاتی ہو جیسے اس کے سینے میں خنجر گھونپ رہی ہو۔"

"ایولن! اتنے عرصہ بعد تمہاری حالت بمشکل سنبھل سکی ہے۔ تمہارے اعصاب ابھی ان چھوٹی چھوٹی الجھنوں کو بھی برداشت نہیں کر سکتے اس لئے تمہیں ان باتوں سے احتراز کرنا چاہیئے۔"

"مجھے افسوس ہے ایڈ"! وہ پھر اون کا گولا اُٹھاتے ہوئے بولی۔ "میں اپنے ذہن کو الجھنوں سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہوں۔"

"وہ ایک اچھی لڑکی ہے" ایڈ نے اخبار سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ "کیا اس نے تمہیں بتایا کہ اس کا شوہر کیا کام کرتا ہے۔؟"

"وہ سیلزمین ہے۔" ایولن نے سلائیاں کھٹ کھٹاتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ ہوٹلوں کو کٹلری کا سامان فراہم کرنے کا کام کرتا ہے۔"

"اب تو تمہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ سیلزمین کو ہمیشہ صاف ستھرا رہنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دن میں دو مرتبہ قمیصیں بدلتا ہے۔"

"کیا واقعی؟" ایولن اب تک بنے ہوئے سوئیٹر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ صرف گرے کلر کی اون اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس میں کسی اور رنگ کی اون سے کوئی نمونہ ڈال دینا چاہیئے۔ غالباً سرخ رنگ اس مقصد کے لئے ٹھیک رہے گا۔ دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ دوبارہ ایڈ سے مخاطب ہو کر بولی۔

"کیا تم نے اسے کبھی دیکھا ہے؟"

"نہیں اور تم نے؟" جواب دیتے ہوئے ایڈ اپنی عینک اتار کر صاف کرنے لگا۔

"میں تقریباً ہر روز ہی اسے دیکھتی ہوں۔ وہ تمہارے جانے کے کچھ ہی دیر بعد گھر سے نکلتا ہے اس کی کار ہمارے کیبن کی عقبی کھڑکی کے نیچے ڈرائیو وے میں کھڑی ہوتی ہے۔ وہ ٹھیک اسی وقت گھر سے نکلتا ہے جب میں کھڑکی کے قریب سنک میں برتن دھو رہی ہوتی ہوں۔"

"وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ میرا مطلب ہے حلیہ قد کاٹھ وغیرہ" ایڈ اخبار کا اسپورٹس کا صفحہ کھولتے ہوئے بولا۔

"وہ بہت لمبا اور دبلا پتلا سا آدمی ہے۔ اس کا منہ بھی چاقو کے پھل کی طرح پتلا سا ہے۔ وہ ہمیشہ خاکستری رنگ کی پتلون پہنتا ہے اور جب چلتا ہے تو بالکل سانپ کی طرح لگتا ہے۔ جیسے کوئی خاکستری رنگ کا سانپ رینگ رہا ہو۔"

"ایو! تم نے پھر اس قسم کی باتیں شروع کر دیں۔" ایڈ کے لہجے میں برہمی تھی۔

"اوہ! مجھے خیال نہیں رہا تھا۔ میرا خیال ہے اب مجھے سو جانا چاہیئے۔" وہ کہتے ہوئے اُٹھ گئی۔

اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر وہ چند لمحوں تک کھڑکی کے سامنے کھڑی رہی۔ پڑوس کے مکان میں روشنی نظر آ رہی تھی ایک کھڑکی کی زرد سی روشنی کی مستطیل نظر آ رہی تھی۔ بستر میں گھس کر اس نے ایک خواب آور گولی کھائی اور اس کے چند سیکنڈ بعد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

ہر صبح وہ پاوڈر کے جھاگ والے پانی میں پلیٹیں دھوتے ہوئے اپنے پڑوسی کو گھر سے نکلتے ہوئے دیکھتی۔ وہ دروازے سے نکل کر معمول کے مطابق تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کار تک آتا پہلے لمبا بریف کیس، جس میں کٹلری کے نمونے بھرے ہوتے کار میں رکھتا پھر خود اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ جاتا۔ وہ ایک دُبلا پتلا طویل قامت آدمی تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش چاقو ہی کی طرح تیز اور تیکھے تھے۔ آنکھوں پر غلاف سے چڑھے ہوتے تھے۔

وقتاً فوقتاً عقبی لان میں آنے کی وجہ سے ایولن اب اس عورت کے بارے میں بھی کچھ کچھ جاننے لگی تھی، وہ بھی اپنے شوہر کی طرح لمبے لمبے قدم اٹھا کر چلنے کی عادی تھی۔ لان میں وہ صرف دھلے ہوئے کپڑے سکھانے کے لئے ہی آتی تھی سب سے پہلے وہ ایک میلے کپڑے سے تار صاف کرتی پھر بالٹی میں بھرے ہوئے کپڑے ایک ایک کر کے تار پر لٹکانے لگتی اسے شاید خود کلامی کی عادت تھی۔ کیونکہ اس دوران اس کے لب مسلسل حرکت کرتے رہتے چہرے پر عام طور پر برہمی کے تاثرات ہی نظر آتے۔

ایولن اس کی اس عادت بھی اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ کبھی رات کو جب ایولن اپنی خواب گاہ میں ہوتی تو اسے پڑوسی کے مکان سے تیز تیز باتوں کی آواز آتی۔ ان باتوں کا مفہوم تو وہ نہ سمجھ سکتی۔ لیکن اُسے یہ اندازہ قائم کرنے میں دشواری نہ ہوتی کہ میاں بیوی میں کسی قسم کا جھگڑا ہو رہا ہے۔ ان آوازوں میں کبھی دردناک سسکیوں کا بھی اضافہ ہو جاتا، لیکن اس نے ایڈ کو کبھی یہ بات نہیں بتائی کیونکہ وہ اس سے وعدہ کر چکی تھی کہ اپنے دماغ کو بلاوجہ ادھر اُدھر کی باتوں میں نہیں اُلجھائے گی

کار دو روز سے ڈرائیو وے میں کھڑی تھی۔ اس دوران ایولن کو اپنا پڑوسی بھی دکھائی نہیں دیا تھا جو ایک مقررہ وقت پر روزانہ صبح گھر سے روانہ ہو جایا کرتا تھا۔ اس نے ایڈ سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ چہرے کے سامنے سے اخبار ہٹاتے ہوئے تشویش آمیز لہجے میں بولا۔

"تمہیں وہاں جاکر معلوم کرنا چاہئیے، ممکن ہے وہ دونوں بیمار ہوں اور انھیں کسی قسم کی امداد کی ضرورت ہو"

"نہیں۔ میں وہاں نہیں جانا چاہتی۔"

"کیوں؟ تم اس عورت سے کئی بار مل چکی ہو۔ اب اگر تم اس کی خبر گیری کو نہ جاؤ گی تو کتنی بری بات ہوگی۔" ایڈ نے اخبار سے نظریں ہٹا کر ایولن کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ممکن ہے وہ اسے مداخلت بیجا تصور کرے؟" ایولن نے اون کا گولا اٹھاتے ہوئے کہا۔

ایڈ کے چہرے پر ان پڑوسیوں کے لئے ہمدردی کے تاثرات کچھ اور گہرے ہوگئے۔ وہ ایولن کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میرا خیال ہے وہ ایسا نہیں سوچے گی بلکہ عین ممکن ہے کہ میرے خیال کے مطابق وہ دونوں بیمار ہوں اور تمہارے وہاں جانے کو قدر اور شکر گزاری کی نگاہ سے دیکھیں"

ایولن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی سلائیاں کھٹ کھٹاتی رہی۔

اگلے روز عقبی لان میں پڑوسن سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ ان کے مکان پر گہری خاموشی تھی اور ایولن کا زیادہ وقت اپنے پڑوسیوں کی ٹوہ لیتے ہوئے گزرا۔ لیکن اسے کوئی ہلکی سی آواز تک سنائی نہ دی۔

اس سے اگلے دن وہ عورت لان میں نظر آئی۔ اس کے چہرے پر برہمی کے تاثرات معمول سے کچھ زیادہ ہی تھے۔ وہ دھلے ہوئے کپڑے تار پر اس طرح لٹکا رہی تھی جیسے کوئی ناگوار فرض ادا کر رہی ہو۔ قمیص پر کلپ لگاتے ہوئے تو بالکل یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کے پیٹ میں چھرے گھونپ رہی ہو۔

ایولن چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی لان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والے جنگلے کے قریب آگئی اور دونوں ہاتھ جنگلے پر ٹکاتے ہوئے اس عورت سے مخاطب ہوئی۔

تمہارے شوہر کی کار دو تین روز سے ڈرائیو وے پر کھڑی ہے۔ کہیں بیمار ہ ... میں نے سوچا کہیں ....

پڑوسن پہلے تو اس نامکمل جملے کا مفہوم نہ سمجھ سکی مگر جب اس کے ذہن میں یہ بات آئی تو اس نے پہلے ڈرائیو وے پر کھڑی ہوئی کار اور پھر ایولن کی طرف دیکھا۔

"وہ دورے پر گیا ہوا ہے" اس نے اپنی برہمی پر قابو پاتے ہوئے کہا اور ہونٹوں کو زبان کی نوک سے تر کرنے لگی۔ "اسے ایک کنونشن میں شرکت کرنا تھی۔ کار میں طویل سفر کرنے کی بجائے اس نے ٹرین پر جانے کو ترجیح دی اور کار میرے استعمال کے لئے چھوڑ گیا ہے۔"

"اوہ! مجھے تشویش تھی کہ وہ کہیں بیمار نہ ہوگیا ہو۔" ایولن نے نرمی سے کہا۔

"نہیں! وہ بیمار نہیں۔ وہ بالکل بیمار نہیں ہے۔" اس عورت نے جواب دیا اور اپنے ہونٹوں کو زبان سے تر کرتی ہوئی جلدی سے مڑ کر خالی بالٹی اٹھانے کے لئے جھک گئی اور پھر ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی مکان میں داخل ہوگئی۔ وہاں کھڑی ایولن نے محسوس کیا تھا کہ مکان میں داخل ہونے کے بعد اس نے دروازہ مقفل کر لیا تھا۔

ہمارا پڑوسی شہر کے باہر گیا ہوا ہے۔ اس رات ایولن نے ایڈ کو بتایا۔

"آخر تم وہاں چلی ہی گئیں۔" ایڈ مسکرایا

"میں ان کے گھر نہیں گئی تھی، عقبی لان میں اس عورت سے ملاقات ہوگئی تھی اور آج سہ پہر وہ کار پر کہیں باہر گئی تھی۔" ایولن نے بتایا۔

ایڈ اخبار درست کرتا ہوا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا

"وہ زیادہ دیر گھر سے باہر نہیں رہی تھی اور جب وہ واپس آئی تو کار میں دو بڑے کتے بھی تھے۔"

"کیا واقعی؟" ایڈ نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! دو بہت بڑے کتے" ایولن ہاتھ کے اشارے سے بتاتے ہوئے بولی۔ "اس نے کتوں کو عقبی لان میں اسی رسی سے باندھا تھا جس پر وہ دھلے ہوئے کپڑے سوکھنے کو ڈالا کرتی ہے"

"ہوسکتا ہے وہ اپنے شوہر کی عدم موجودگی

میں اکیلی ڈر رہی ہو اور رکھوالی کے کتے لے آئی ہو۔" ایڈ بولا۔

"ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو۔" ایولن نے جواب دیا اور اُٹھ کر خوابگاہ میں آگئی۔

وہ اپنے بریک ڈاؤن کے بعد گزشتہ کئی ماہ سے رات کو سونے کے لئے خواب آور گولیاں استعمال کر رہی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس عادت کو ترک کرنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ اور اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ ان گولیوں کے استعمال کے بغیر بھی وہ سو سکتی ہے۔ چنانچہ آج اس نے خواب آور گولیوں کی شیشی پلنگ کے تکیے کے نیچے سے اٹھا کر دُور میز پر رکھ دی اور سونے کے لئے لیٹ گئی۔ لیٹے ہوئے اس کا ذہن پڑوسیوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ بڑے بڑے کتے اور ڈراتھو سے پیر دوں سے کھڑی ہوئی کار — وہ عورت — کار — کتے عورت۔

وہ اپنی خیالوں میں اُلجھی رہی۔ جب بہت دیر تک نیند نہ آسکی تو بستر سے اُٹھ کر نیم تاریک کمرے میں ٹہلتی ہوئی کچن کی طرف نکل آئی۔ اور کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو کر ساتھ والے مکان کی طرف دیکھنے لگی جو خاموشی اور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کھڑکی کے فریم پر ہتھیلیاں ٹکا کر آگے کو جھک آئی اور مکان کے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اسے پڑوسی کے عقبی لان میں ایک جگہ روشنی کا معمولی سا دھبہ دکھائی دیا۔ وہ غور سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ فاصلہ زیادہ اور روشنی مدھم ہونے کے باعث اسے کچھ دکھائی تو نہ دیا لیکن اس طرف سے ابھرنے والی عجیب و غریب آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کتے کچھ کھا رہے ہیں ساتھ ہی ان کی ہلکی ہلکی غرانے کی آوازیں بھی اُبھر رہی تھیں لیکن کچھ دیر بعد یہ آوازیں معدوم ہوگئیں۔ شاید کتوں کا پیٹ بھر گیا تھا اس کے چند ہی سیکنڈ بعد روشنی گردش کرتی ہوئی مکان کی طرف بڑھ گئی اور عقبی دروازے میں غائب ہوگئی۔

ایولن اس کے بعد بھی کتنی دیر تک کھڑکی میں کھڑی اس مکان کی طرف دیکھتی رہی لیکن جب کوئی سن گن نہ ملی تو خواب گاہ میں آکر بستر پر لیٹ گئی۔ میز کی طرف ہاتھ بڑھا کر شیشی اٹھائی۔ ایک گولی نکال کر منہ میں ڈالی اور اس کے چند سیکنڈ بعد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

ایولن نے ایڈ کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا۔ لیکن کئی روز تک وہ یہ دیکھتی رہی کہ اس کی پڑوسن کتوں کو باقاعدگی سے سیر کرانے کے لئے شام کے وقت گھر سے باہر لے جاتی اور واپس آکر انہیں کپڑے ٹانگنے والی رسی سے اس طرح مضبوطی سے باندھ دیتی کہ وہ اپنے آپ نہ کھل سکیں۔ اور تقریباً آدھی رات کے وقت جبکہ ہر سو تاریکی اور سناٹا ہوتا وہ انہیں کچھ کھلاتی۔

ایولن نے خاص طور سے یہ بات نوٹ کی تھی کہ جس روز وہ کتوں کو لے کر آئی تھی اس دن ان کے پیٹ اندر کو دھنسے ہوئے تھے جیسے کئی روز سے بھوکے ہوں۔ دور سے ان کی پسلیاں بھی صاف نظر آرہی تھیں لیکن اب موٹے تازے ہوگئے تھے۔ وہ دن بھر پڑے اونگھتے رہتے کبھی ان کے بھونکنے کی آواز بھی نہیں سنی گئی تھی البتہ جب وہ انہیں آدھی رات کو خوارک دیتی تو چپڑ چپڑ کی آواز کے ساتھ ان کے منہ سے غراہٹیں بھی سنائی دیتیں۔

ایولن نے یہ بات بھی نوٹ کی تھی کہ اب اس کی پڑوسن پہلے کی طرح روزانہ کپڑے نہیں دھوتی تھی۔ نہ ہی اب اسے لان میں دُھلی ہوئی قمیص ٹانگتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

آخر ایک روز جب ایولن سے ضبط نہ ہوسکا تو اس نے ایڈ سے اس کا تذکرہ کر ہی دیا۔ ایڈ نے چند لمحوں تک سوچنے کے بعد پوچھا۔ "وہ اپنے شوہر کے بارے میں کیا بتاتی ہے؟ اس کا کنونشن کافی طوالت اختیار کرتا جا رہا ہے۔"

"وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ اسے تو کتوں کی تفریح کرانے اور آدھی رات کو انہیں خوراک کھلانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔" ایولن نے جواب دیا۔

"ایو! کیا تم اب اس سے زیادہ بات چیت نہیں کرتیں؟" ایڈ نے اخبار رکھتے ہوئے کہا۔

"اب اس کا موقع نہیں ملتا۔"

ایولن سلائیاں مضبوطی سے تھام کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "اب وہ کپڑے ٹانگنے کے لئے بھی لان میں نہیں آتی میرا خیال ہے کہ اب وہ کپڑے یا قمیص دھوتی ہی نہیں ۔۔۔ وہ صرف کتوں کو کھولنے یا باندھنے کے لئے لان میں آتی ہے"

"یہ تو بہت افسوس کی بات ہے میں تو سوچ رہا تھا کہ تمھیں کمپنی مل جائے گی اور تم اس کے ساتھ گھوم پھر کر اپنا وقت گزار لیا کرو گی۔"

"نہیں۔ میں اس کے ساتھ تفریح کے لئے جانا کبھی پسند نہیں کروں گی۔" ایولن نے اون اور سلائیاں میز پر رکھتے ہوئے کہا اور اٹھ گئی۔

وہ مزید کوئی بات کئے بغیر خواب گاہ میں چلی گئی۔ اس وقت کتے بالکل خاموش تھے۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد ان کی ہلکی سی غراہٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ شاید انھیں بھوک لگ رہی تھی۔ ایولن خواب گاہ سے نکل کر کچن کی کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ کتوں کے قریب ہی روشنی کا ایک مدھم سا دائرہ نظر آرہا تھا اور کتوں کی تیز چیر چیر اور غراہٹوں کی آواز اب پہلے سے کچھ واضح ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد مدھم سی وہ روشنی حرکت کرتی ہوئی مکان کے عقبی دروازے میں غائب ہوگئی اور کتوں کی غراہٹ بھی معدوم ہوگئی۔ ان کے پیٹ بھر چکے تھے

ایولن کا سوئیٹر تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ بھورے رنگ کا یہ سوئیٹر بہت ہی بھدا لگ رہا تھا اور اس میں سرخ رنگ کا نمونہ تو اور بھی بدنما نظر آرہا تھا۔ وہ سوئیٹر کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

"وہ آج کتوں کو کار میں بٹھا کر کہیں لے گئی۔"

"کیا واقعی؟" ایڈ نے اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔

"اور جب وہ واپس آئی تو اکیلی تھی، کتے اس کی کار میں نہیں تھے۔ وہ گھر میں زیادہ دیر نہیں رکی۔ اس نے خود سوٹ کیس کار میں لادے اور دوبارہ واپس چلی گئی۔ اس کے بعد لوٹ کر نہیں آئی۔"

"ممکن ہے اسے بھی کہیں شہر سے باہر جانا پڑ گیا اور اس سے پہلے وہ کتوں کو کہیں چھوڑ آئی ہو۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی۔"

"ہو سکتا ہے یہ جگہ اسے کرائے کے لحاظ سے بہت مہنگی پڑتی ہو" ایڈ نے عینک اتار دی اور اس کے شیشے صاف کر کے دوبارہ احتیاط سے ناک پر جماتے ہوئے بولا

"اور کتوں کا خرچ بھی تو کم نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے ان دونوں کتوں کے اخراجات بھی اس کی برداشت سے باہر ہوں۔"

ایولن نے سوئیٹر کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور اسے تہہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کتوں کے اخراجات؟" وہ ایڈ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں ایسا نہیں سمجھتی۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ تین روز تک کتوں کو بہترین خوراک مہیا کرتی رہی ہے اسے ایک سینٹ تک خرچ کرنا نہیں پڑا۔"

ایڈ نے اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس طرح پھونک کر اس کی طرف دیکھا جیسے بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن ایولن اپنی خواب گاہ میں جا چکی تھی۔ ●

افسانہ

الاؤ

قدیر زماں

..... اور پھر اُس نے اپنے کو ایک ایسے جزیرہ میں محسوس کیا جس پر چند آدم خور ہستیوں کی حکمرانی تھی۔ جزیرہ کے بیچوں بیچ ایک بڑا وسیع الاؤ تھا۔ جس میں ہر وقت آگ جلتی رہتی... جزیرہ کے حکمرانوں کے لیے یہ مقدس آگ تھی کیوں کہ یہ جب بھی جزیرہ سے روانہ ہوتے پہلے اس الاؤ کے سامنے دوزانو ہو کر زمین بوس ہوتے اور اسی طرح جب اپنے کاروبار سے لوٹتے تو تب بھی اپنی عورتوں کے پاس جانے سے پہلے وہ الاؤ سے ہو کر گذرتے اور اُسی طرح الاؤ کے سامنے دوزانو ہو کر زمین بوس ہوا کرتے۔ لیکن کبھی کبھی یہ آدم خور جب کچھ آدمیوں کو شکار بنا کر لاتے تو اُس وقت زمین بوس ہونے کے بجائے اپنے شکار کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے الاؤ کے چند پھیرے کرتے۔ اُن آدمیوں کی پیشانیوں پر مقدس راکھ ملتے اور لکڑی کی چند چھوٹی چھوٹی چوکور تختیوں کو اُن کے گلوں میں لٹکاتے پھر انھیں بھی اُن آدمیوں میں شامل کر دیتے جن کے گلوں میں پہلے ہی سے تختیاں لٹکی ہوتیں۔

— اُس کے گلے میں بھی ایک ایسی ہی لکڑی کی تختی لٹکی ہوئی تھی۔ ان تختیوں پر کچھ نشان کندہ تھے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ یہ نشان سلسلہ نمبر ہیں کیونکہ ان نشانیوں کو دیکھ کر ہی انھیں باری باری سے چُنا جاتا۔ اُس نے فی فو (FIFO) کا سسٹم کہیں پڑھا تھا — فرسٹ اِن فرسٹ آؤٹ — یعنی جو پہلے آئے گا وہ پہلے جائے گا — یہ آدم خور اُسے جاہل اور اَن پڑھ ہی لگتے لیکن فی فو کے طریقہ کار سے خوب واقف تھے اور اپنے شکار کو مقدس آگ پر بھونے سے پہلے اُن کا سلسلہ نشان دیکھ لیا کرتے تھے۔ اس طریقہ کار سے وہ ایسے وقت مکرتے جب اُن کے کسی مقدس تہوار یا سماجی تقریب کا موقع ہوتا۔ اس موقع پر چنا ہوا آدمی زیادہ جوان، زیادہ تنومند اور زیادہ خوبرو ہوتا۔

بہت دن ہو چکے تھے اُس کی باری ابھی نہیں آئی تھی۔ محروس لوگوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی..... جب بھی کسی آدمی کو کھانا ہوتا تو جزیرہ کے آدم خور ان تمام انسانوں کو یکجا کرتے انھیں الاؤ کے پاس لے جاتے۔ اُس وقت اُن کا سردار بھی موجود ہوتا۔ اُس آدمی کو چن لیا جاتا جس کی باری ہوتی۔ پھر باقی لوگوں کو گروپس کی شکل میں اُن کے قیدخانوں کو واپس کر دیا جاتا.....

الاؤ کے پاس وہ جب بھی لایا جاتا وہاں پڑی ہوئی انسانی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کو دیکھ کر اُسے متلی ہونے لگتی۔ کبھی کبھی اُس کا جی چاہتا کہ اُس کی باری جلد ہی آجائے تو اچھا ہے۔ لیکن اُس سے پہلے لائے گئے اور بھی لوگ تھے اور اُن تمام لوگوں نے اپنی بقا کا ایک دوسرا راستہ بھی نکال لیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے ساتھ مقیّد عورتوں کو آپس میں بانٹ لیا اور بچے جننے لگے — تہوار اور تقریب کے موقعوں پر کبھی کبھی اِن بچوں کو بھی چن لیا جاتا—

اس دفعہ الاؤ کے قریب پہنچ کر اُس نے کھوپڑیوں کو دیکھا تو اُسے زیادہ ہی متلی ہونے لگی تھی— آج اُس کی باری تھی لیکن نئے لائے جانے والے انسانوں میں سے ایک ایسا مرد بھی تھا جس نے اپنے سر اور داڑھی کے بال کبھی نہیں کٹوائے تھے — وہ مرد سارے آدم خوروں کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا اور تمام محروس انسانوں کے تجسس کا ذریعہ بھی — آتے ہی اُس نے تقریر شروع کی :-

"ہم لوگ ان آدم خور ہستیوں کے مقابلہ میں سوگنا، ہزار گنا بڑھ کر ہیں۔ ذرا ہمت کریں تو ہم ان پر قابو پا سکتے ہیں"۔

محروس انسانوں میں سے ایک تجربہ کا

نے آگے بڑھ کر کہا

"ہم لوگ نہتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں سارے کے سارے الاؤ میں ڈال کر بھون دیئے جائیں گے"

لیکن دوسرے نے کہا

"ہم لوگوں کو کسی بھی طرح باری باری سے ان آدم خوروں کا نوالہ بننا ہے۔ خوف و ہراس سے گھٹ گھٹ کر مرجانے کے بجائے یہ بہتر ہے کہ ہم مقابلے میں ڈٹ کر مریں۔"

تیسرا سب میں تجربہ کار تھا۔

اُس نے کہا۔

"ہم کبھی بھی کامیاب نہ ہوسکیں گے ہم لوگ تعداد میں بہت زیادہ ہیں اس لئے ہمارے اختلافات بھی بہت ہیں۔ آدم خور ہستیوں کی تعداد کم ہی نہیں بلکہ ان سب کی پالیسی بھی ایک ہی طرح کی ہے۔ اس لئے ان ہی کی کامیابی یقینی ہے۔"

لیکن وہاں چند ایسے آدم خور پہنچ گئے جو سپاہیوں کے فرائض انجام دیتے تھے۔ پھر مروسیں ہی میں سے چند نے مقرر کی طرف اشارہ کیا۔

"یہی ہے وہ جو ہم سب کو اکسا رہا تھا۔"

سپاہیوں نے سیٹیاں بجائیں اور آناً فاناً سارے آدم خور وہاں جمع ہوگئے سب کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ اور نیزوں کی نوک پر انھیں ہانک کر الاؤ کے قریب لایا گیا۔ سردار بھی پہنچ چکا تھا۔

سردار کے نائب نے بڑھ کر مقرر کی گردن کو دبوچا اور اُسے بالوں سے گھسیٹتا ہوا سردار کے قدموں پر ڈھکیل دیا۔

ایک سپاہی نے لوہے کی دو سلاخوں کو الاؤ میں رکھ دیا تاکہ جیسے ہی وہ گرم ہوجائیں انھیں مقرر کی آنکھوں میں پھیر دیا جائے ۔۔۔ ان سلاخوں کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں سکڑنے لگیں تھیں اور وہ خوف کھانے لگا کہ آنکھیں اسی طرح سکڑتی رہیں تو مرنے سے پہلے وہ اپنے ہمکتے ہوئے ننھے کو کیونکر دیکھ سکے گا۔ ...... اسی ننھے نے رات بھر اس کی نیند حرام کی تھی۔۔ اُسے ضد تھی کہ وہ ماں کی آغوش سے نکل کر باپ کی آغوش میں جائے گا اور جب اُسے باپ کی آغوش میں سلا دیا جاتا تو وہ ماں کی چھاتیوں کے لئے بلبلا اٹھتا۔۔۔۔

لیکن سردار نے ایک دوسرا ہی حکم دیا۔ اُس کے اشارے سے ان سلاخوں کو الاؤ سے نکلوا دیا۔

اُس کی حیرت میں اضافہ ہونے لگا۔۔

.... اُسے سردار کا دوسرا حکم سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن بات جلد ہی واضح ہوگئی جب سردار کے حکم پر دہکتی ہوئی سرخ سلاخوں کو زمین پر پھینک دیا گیا اور اُس کے بجائے سیسہ کو پگھلا کر مقرر کے کانوں میں ڈال دیا گیا۔ سردار شاید یہی کہہ رہا تھا۔

"اسے دیکھتے رہنے دو ۔۔۔ اس کی آنکھوں سے ہمیں اس قدر اندیشہ نہیں ہے جتنا اس کے کانوں سے ہے۔"

پھر وہ مقرر چیختا چلاتا رہا لیکن خود اُس کی آواز اُسے سنائی نہ دیتی تھی اور جب وہ اپنی آواز کو سننے سے قاصر ہوگیا تو اُس نے بولنا بند کر دیا اور چپ ہوگیا ۔۔۔

اُس آدمی کو جب یوں ہی گمان ہوگیا تھا کہ آج وہ اپنی باری سے بچ جائے گا۔ آدم خور حکمرانوں کو جب مقرر سے کوئی اندیشہ باقی نہ رہا تو اُس کی باری آنے تک کے لئے اُسے چھوڑ دیا گیا ۔۔۔

اب وہی آدمی ان کے نیزوں کی نوک پر تھا جس کی آج باری تھی اور اُس نے دیکھا کہ آج الاؤ کے شعلوں کی آگ ذرا تیزی سے اُس کی طرف لپک رہی ہے

—(●)—

آصف بابا

(افسانہ)

شمع جو بجھ گئی

شہر کی آبادی سے تین میل دور اونچے مسطح پُر فضا مقام پر آم، امرود، نیلگری اور سنکیسر کے پیڑوں سے گھری، اجڑی ہوئی اس دو منزلہ ویران کوٹھی کو دیکھ کر آج بھی تھوڑی دیر کے لئے سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ دنیا کی یہ جھوٹی شان و شوکت، یہ دو روزہ چمک دمک کا ماند پڑ جانا لازمی ہے۔

وہ کوٹھی جہاں دن رات خوشیوں کی شہنائیاں بجتیں، جہاں ہر روز محفل سخن گرم رہتی۔ راج بہادر کی زندگی کے بعد بھی گائتری دیوی نے اس روایت کو زندہ رکھا۔ وہ کوٹھی جس کی رنگ برنگی کانچ کی شیشوں والی کھڑکیوں سے چھن چھن کر دور دور تک بکھرنے والی روشنی گائتری دیوی کی زندگی کے بعد ختم ہو گئی تھی۔

وہ شہنائیاں، وہ محفلیں، وہ چہل پہل ختم ہو چکی تھی اور آج بھی اس نیلی کوٹھی کے کھنڈروں کو بھوت بنگلے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے پتہ نہیں اس اجڑی ہوئی کوٹھی کا کوئی دور کا وارث ہے بھی یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ بیس سال پہلے اس نیلی کوٹھی کا مالک سوتیل کمار تھا جو ... کے جگر کا ٹکڑا تھا کے بعد یہ اکلوتی اولاد نصیب ہوئی تھی۔ شادی کے ٹھیک تیس سال بعد۔

کوٹھی کے سامنے بنایا گیا خوبصورت لان جس کے اب ہلکے سے نقوش تک نہیں ملتے۔ اجڑی ہوئی کوٹھی کے اطراف کھڑے اونچے اونچے نیلگری اور سنکیسر کے درخت کوٹھی سے کچھ فاصلے پر لگایا ہوا آم اور امرود کا اجڑا ہوا باغ، نیلگری کے درختوں کے پیڑوں میں بنائی ہوئی پھولوں کی کیاریاں جو اب ناپید ہیں۔ اور ان کیاریوں کے اطراف آہنی خار دار جالی جس کے اندر خوشنما کروٹن کے بجائے آج جنگلی پھولوں کی حکمرانی ہے لان کے درمیان بنایا ہوا خوبصورت ہشت پہلو چھوٹا سا سنگ سیاہ کا حوض اور اس کا فوارہ جس کے منہ سے نکل کر نکلنے والی چنچل دھاریاں ہمیشہ کے لئے دب چکی ہیں۔ وہ تمام چیزیں جو اس کوٹھی کے احاطہ میں بیت گذری ہوئی داستان کی اجڑی نشانیاں ہیں۔ سوچتا ہوں تو لگتا ہے کل کی بات ہے۔

گائتری دیوی نے دھوم دھام سے اپنے اکلوتے بیٹے سوتیل کمار کا بیاہ رچایا۔ ایک ماہ تک شہنائیاں بجیں، غریبوں کو کھانا کھلایا گیا، کپڑے تقسیم ہوئے، دان دھرم ہوا۔ لیکن شادی کے کچھ عرصے بعد وہ اپنا سارا راج پاٹ اپنی بہو نیلو کے ہاتھ سونپ کر پرلوک سدھاریں۔ اپنی بوڑھی آنکھوں سے وہ سب کچھ نہ دیکھ سکی جو اُن کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ نیلو کی بھری گود، کوٹھی کا ننھا منا جانشین۔

ماں کی موت کے بعد سوتیل اپنی خاندانی روایات کو جلا نہ دے سکا۔ وہاں محفل سخن کے بجائے شراب اور کباب کی محفلیں جمنے لگیں۔ رقص ہونے لگا۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ بات کوٹھی سے باہر نکل کر ہوٹلوں کے دائروں میں پہنچ گئی۔ جہاں رقص و موسیقی کی محفلیں ہوتیں کاک ٹیل پارٹیاں ہوتیں نجانے کیا کیا ہوتا۔ لیکن ایک نیک نام خاندان کی بدنامی کے لئے یہی کیا کم تھا۔

نیلو گائتری دیوی کی زندگی میں بہو بن کر آئی لیکن بعد میں وہ محض جبنی کھلونے کے ایک کھلونے سے زیادہ نہ تھی۔

وہ سوچ میں غرق صوفے پر نیم دراز بالائی منزل کی وسیع کھڑکی سے جس میں بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے تھے۔ شہر کی جگمگاتی ہوئی روشنیوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ خیالات میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ اُسے کمرے میں روشنی کرنے کا بھی ہوش نہ رہا۔

لیکن ایسا نہیں، وہ ان اندھیروں میں ڈوب جانا چاہتی تھی۔ وہ ان اندھیروں میں کھو جانا چاہتی تھی۔ اُسے ان اندھیروں سے پیار ہو گیا تھا۔ اُسے روشنی سے نفرت سی ہو گئی تھی بلکہ اُس کی گہری سوچ کسی زبردست حادثہ کا پیش خیمہ لگتی تھی۔ جان پڑتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

آسمان ٹوٹ پڑے گا یا بھونچال آجائے گا یا زمین پھٹ جائے گی۔ یا خود پکار اُٹھے گی یہ دنیا ایک سراب ہے ایک دھوکہ ہے ایک فریب مسلسل ہے۔

نیلو زندگی سے بیزار موت کی آغوش میں ابدی نیند سوجانا چاہتی تھی۔ پر موت کے خونخوار پنجے اُس تک نہیں پہنچ رہے تھے۔ وہ مرنا چاہتی تھی۔ فریبی دنیا اُسے جینے پر مجبور کررہی تھی۔ اُس کے دل کی بے چینی نے اُسے وہاں بیٹھنے نہ دیا وہ اُٹھ کر بیڈروم کی طرف چلی گئی۔ نا چاہتے ہوئے دل سے اُس نے بجلی کا راڈ جلایا جس کی کیوری روشنی میں اُس کا مرجھایا ہوا چہرہ اُلجھے ہوئے بال، متجسس نگاہیں صاف دکھائی پڑرہی تھیں۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے دیوار میں نصب ایک کانچ کی الماری کی طرف بڑھی۔ کچھ ہی لمحے بعد اُس کے ہاتھ میں ایک البم تھا جس پر جابجا ہلکے سرخ و سبز رنگ کے بے ترتیب چھوٹے بڑے دائرے بنے ہوئے تھے اُس کی آنکھیں امڈ آئیں شدت غم کے طوفان سے اُس کے ہونٹ کپکپا اُٹھے۔

ایک انجانے خوف ایک سرد آہ کے ساتھ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے البم کھولا۔ اشک آلود آنکھوں سے ایک ایک تصویر کو دیکھتی رہی۔ اُن میں اُس کی ابتدائی زندگی کی بے جان نشانیاں تھیں۔ گذرے ہوئے لمحات کا کاغذی سرمایہ تھا۔ عرصہ پہلے اُس نے انتہائی خوشی کی گھڑیوں کی تصویر کے روپ میں جکڑ لیا تھا۔ تصویریں آج بھی مسکرا رہی تھیں،

لیکن آج وہ اُس کی اُجڑی ہوئی زندگی پر قہقہہ لگا رہی تھیں آج اُن تصویروں کی حقیقت اُس کے نزدیک کاغذ کے سیاہ سپید چمکدار ٹکڑوں سے زیادہ نہ تھی۔ آج پھر کوئی اُس کے دل کو مسل رہا تھا۔ آج پھر کوئی اُس کے سینہ میں سیسہ پگھلا رہا تھا۔

نیلو ___ نیلو ایک کرخت آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی اور البم شلف میں رکھتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

اپنی طرف آتی ہوئی نیلو کو دیکھ کر سونیل نے کہا۔ بڑی دیر لگادی بھئی تم نے کب سے بُلا رہا ہوں۔

کام میں اُلجھ گئی تھی دیر ہوگئی۔ کہیے کیا بات ہے۔ اُس نے آتے ہی مدھر آواز میں کہا۔

میرا براؤن کلر کا سوٹ اور ٹائی تو لانا شلف کی چابیاں ٹیبل پر دھری ہیں۔

نیلو کے سوٹ لانے تک وہ قدآدم آئینے میں اپنے قد وخال کا بھرپور جائزہ لیتا رہا جانوروں کی تہہ سدھی کی سپنس ٹانک جسم پر اچھی طرح لی۔ چہرے کو بار بار تولیہ سے صاف کرتا رہا۔ اتنے میں نیلو سوٹ لیے اُس کے سامنے تھی۔

اوہ تھینکیو۔ اُس نے سوٹ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

نیلو کی شیریں آواز نے سونیل کو نیلو کی طرف متوجہ کیا۔ کہاں جارہے ہیں آپ رات کھانے پر جلد آئیے گا میں آپ کا انتظار کرونگی

نا۔ نا کھانے پر میرا انتظار مت کرنا میں کرسمس پارٹی میں جارہا ہوں راکسی ہوٹل

مجھے آنے میں دیر ہوگی۔

پھر بھی جلدی آئیے نا مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے نیلو نے التجا کی۔

کوشش کروں گا۔ سونیل نے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے کہا۔

پھر اُس نے آخری بار آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھا اس خیال سے کہ کہیں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔ پوری طرح مطمئن ہوکر وہ ڈریسنگ روم سے باہر نکل گیا۔ برآمدے میں کچھ دیر کے لئے رُکا۔ پھر اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور تیزی سے پورٹیکو میں ٹھہری ہوئی فیروزہ کلر کی مورس کار کی طرف بڑھ گیا۔ کار کے گداز گدوں پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کیا کار دھیرے دھیرے پورٹیکو سے رینگتی ہوئی لان کے پہلو سے گذر کر باہر نکل گئی۔

نیلو کار کے عقبی شیشے کے اسکرین سے اُس کار کے مالک کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ایک مجسمہ کی طرح کھڑی تکتی رہی۔ یہاں تک کہ کار اُس کی نگاہوں سے نشیبی علاقے کے ایک موڑ پر غائب ہوگئی۔

نیلو کے اچھے حسن سلوک کے باوجود سونیل کا بجھا بجھا پن، اُکھڑا اُکھڑا پن اُس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا۔ جس روز سے نیلو کوٹھی میں بہو بن کر آئی تھی اُسی روز سے سونیل کی نگاہیں اُسے کچھ کھوجتی ہوئی دکھائی پڑتی تھیں جیسے اُسے کسی قیمتی ہیرے کی تلاش ہو۔ وہ اپنے خیالات کے صحرا میں بھٹک رہی تھی۔

کیا میں اُنھیں پسند نہیں؟ کیا گائتری دیوی کا فیصلہ غلط تھا؟ کیا میری تمنائیں آرزوئیں جو

عرصہ سے مرے دل میں دبی ہوئی چنگاری کی طرح، کیا اسی طرح بجھ جائیں گی۔ کیا میں ہمیشہ اسی طرح سلگتی رہوں گی؟ خوشیوں کے لئے ترستی رہوں گی؟ طرح طرح کے سوالات اُس کے دل اور دماغ میں یکے بعد دیگرے گردش کرتے گئے۔ یکایک اُس کے قدم غیر ارادی طور پر دوسری گیلری کی طرف اُٹھ گئے۔ اُسے پرانی وضع کی کاؤنسل کار باہر نکالنے میں دیر نہ لگی۔ کار تیزی سے کوٹھی کے احاطے سے نکل کر شہر کی جانب چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کار راکسی ہوٹل کے عظیم پورٹیکو میں جا رکی۔ اور وہ لانبے لانبے قدموں سے ہوٹل کے وارنڈے سے ہوتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

حال رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا۔ پتنگی ہرئیے مختلف ڈیزائنوں میں مختلف رنگوں میں جا بجا لہرا رہے تھے۔ ہر طرف چہل پہل تھی گہما گہمی تھی۔ عورتیں زرق برق لباسوں میں اِدھر اُدھر آجا رہی تھیں کرسمس کی مبارکبادیاں لی اور دی جا رہی تھیں۔ تحفے تحائف ایک دوسرے کو پیش کئے جا رہے تھے۔ ایک طرف سانتا کلاز کو خوبصورت طریقے سے سجایا گیا تھا۔ کرسمس ٹری بے شمار رنگین بلبوں سے مزین تھا جو اسٹیج پر بڑے ہی اہتمام سے رکھا ہوا تھا۔ ان روشنیوں کے ماحول کی رنگینی میں مزید اضافے کی غرض سے دھیمی آواز میں مغربی موسیقی بجائی جا رہی تھی۔ غرض کہ ہوٹل کے ہال میں ایک ہنگامہ بپا تھا لیکن کوئی اس ہنگامہ سے دور تاریک گوشوں میں اپنے دل کو ٹٹول رہا تھا۔ اپنی ہار جیت کے فیصلے کا منتظر تھا۔ اُس کی بے چین نظریں کسی کے تعاقب میں تھیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اُس نے ناچتے ہوئے دل سے ایک کرسی کا سہارا لیا۔ جو ہال سے بہت دور تھا اور یہ حصہ کچھ نیم تاریک سا تھا۔ ویٹر کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر اُس نے ایک کافی کا آرڈر دیا اور خیالات کے تانے بانوں کو گڈ مڈ کرتی رہی۔

کافی صاحب۔ ویٹر نے کافی کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے کہتے ہوئے اُس نے پیالی کو اپنی طرف کھینچ لی اور ٹیبل پر رکھی شکر دانی سے ایک چمچ شکر کافی کی پیالی میں ڈال کر ہلا دیا۔ اور پیالی کو اُٹھا کر اپنے نازک نازک ہونٹوں سے لگا لیا۔ ابھی کافی کے دو چار گھونٹ بھی حلق سے نہ اُترے تھے کہ کسی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ آواز جانی پہچانی تھی۔ نیلی کی نگاہیں اُس آواز کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ وہ اسی منظر کے انتظار میں تھی۔ ٹیبل پر ہی اُس نے بیرے کو ٹپ کے ساتھ بل ادا کیا اور محو نظر رہ ہوئی۔

HAPPY CHIRSMAS TO YOU DARLING ROSY بڑی دیر لگا دی تم نے آنے میں یہ سونیل کی آواز تھی۔

اوہ تھینکیو۔ ذرا میک اپ میں دیر ہو گئی سویٹ۔ وہ سرخ سرخ اسکرٹ میں قیامت خیز لگ رہی تھی۔ اور ساتھ ہی اُس نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا تم اکیلے ہی آئے ہو نیلو کدھر ہے!

اُس کی طبیعت خراب ہے۔ سونیل نے غلط کہہ دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسے ساتھ لا کر تماشہ بن جائے۔ اس مستی بھرے رنگین ماحول کے شرابی پیالوں میں زہر گھولا جائے ہال یکایک آرکسٹرا کی سریلی دھنوں میں ڈوب گیا۔ بے شمار جوڑوں نے ہوٹل کے چکنے فرش پر باہم تھرکنا شروع کیا۔ روزا اور سونیل نے بھی ماحول کا ساتھ دیا وہ بھی محو رقص ہو گئے۔ وہ دو جان ایک قالب کی طرح چپکے ہوئے جام رقص نوش فرما رہے تھے داد عیش دے رہے تھے۔ کسی کا دل فرط مسرت سے لبریز تھا کسی کا دل زہر میں بجھے ہوئے تیروں سے گھائل ہو رہا تھا آج کسی کی ہار اور کسی کی جیت ہوئی تھی۔ کسی کو دل کا درد تو کسی کو درد کا مسیحا۔

ناچتا ہوا ہر ایک جوڑا اُس کو منہ چڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا اور کہہ رہا تھا.... دیکھو ہم کتنے خوش نصیب ہیں۔ زندگی اسی کا نام ہے آؤ ہمارے سنگ ناچو۔ اُس کا سر چکرا گیا سارا ہال گھومتا ہوا محسوس ہوا آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ یہ سب برداشت نہ کر سکی اور تقریباً دوڑتے ہوئے ہوٹل کے ہال سے باہر نکل آئی۔ کار آن واحد میں ہوٹل کے احاطے کو اپنے پیچھے چھوڑ گئی۔ رات کا ایک بج گیا تھا کار فراٹے بھرتی ہوئی کوٹھی کی سمت جا رہی تھی۔ رفتار کا کانٹا ۹۰ میل کے ہندسے سے بھی آگے نکل گیا تھا راستہ بھر اُس کے کانوں میں ہوٹل کی آوازیں گونجتی رہیں۔ ہلو روزی ڈارلنگ بڑی دیر لگا دی تم نے۔ زندگی اسی کا نام ہے آؤ ہمارے سنگ ناچو۔ ناچو ناچو....

کار ایک زوردار آواز کے ساتھ کوٹھی کے پورٹیکو میں آ رکی۔ کار سے نکل کر وہ دوڑتے ہوئے بیڈروم میں چلی گئی، اور اپنے وجود کو دھڑام سے پلنگ پر گرا دیا۔ اُس کا دل چیخ چیخ کر رونا چاہتا تھا۔ آج وہ سب کچھ صاف کہہ دے گا۔ سب کچھ

پردہ
پس
پردہ

محمد اکرام اللہ خان

فلمی دنیا کے شب و روز

آپ کو اس بچہ کا لطیفہ تو یاد ہوگا جس کی استانی نے ایک دن کلاس میں بتایا تھا کہ بچو! تمھیں معلوم ہے کہ ایک نوجوان نے صبح صبح ناشتہ سے پہلے دریائے گنگا کو تین مرتبہ عبور کیا تھا۔ بچہ نے حیرت سے پوچھا تین مرتبہ ــ! ہاں اس میں حیرت کی کیا بات ہے ایک اچھے تیراک کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بچہ نے مسکرا کر کہا نہیں میڈم میں سوچ رہا ہوں کہ آخر چوتھی مرتبہ وہ کیوں نہ آیا تاکہ اپنے کپڑے جو کنارے پر اُتار رکھے تھے پہن سکے۔ بچوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے انھیں کوئی بات سمجھانا وہ بھی فلموں کے ذریعے بڑا ہی مشکل کام ہوتا ہے۔ ہندوستان میں صرف بچوں کے لئے فلم بنانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ کہانی کو دلچسپ بنانے کی کوشش میں فلم اتنی بور ہو جاتی ہے کہ سینما ہال میں بیٹھے ہوئے بچے فلم ختم ہونے پر روشنی کے ساتھ جگائے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنے گھروں کو واپس جا سکیں۔ عموماً ایسی تصویروں میں ایسے گانے گوائے جاتے ہیں جو بھارت ماتا کی شان میں ہوا۔ گاندھی۔ نہرو اور شاستر کا فلاش بیک کے ساتھ حب الوطنی کا ڈھول پیٹا جاتا ہے۔ یہ سب غالباً اس لئے کیا جاتا ہے کہ ہمارے آج کے بچوں کو کل کے نوجوانوں کا تربیت مل سکے اور وہ بڑے ہو کر گاندھی۔ نہرو یا شاستری جیسے بن سکیں لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آج کا بچہ کل کے جوان سے زیادہ ہوشیار اور سمجھدار بھی ہے اور اسی لئے بچوں کی فلمیں بڑوں کا مذاق اڑاتی ہوئی ایسی غیر مانوس ہو جاتی ہیں جیسے انھیں ہندوستان کے تصوری بچہ کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہو۔

بہت دن پہلے میں نے عصمت چغتائی کی ایک فلم دیکھی تھی جو انھوں نے صرف بچوں کیلئے بنائی تھی مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ یہ فلم آخر بڑوں کو کیوں نہیں دکھائی گئی مجھے یقین ہے کہ اگر یہ فلم کمرشیل طریقہ پر ریلیز ہوتی تو شاید سلور جوبلی کر جاتی۔ خواجہ احمد عباس نے بھی بچوں کے لئے ایک دو فلمیں بنائیں۔ "منا" اور "ہمارا ہندوستان"۔ پہلی فلم منا ہندوستان بھر میں اتنی مقبول ہوئی کہ ایک دو جگہ پر سلور جوبلی ہی منا ڈالی اور دوسری فلم کو خود پنڈت نہرو نے دیکھ کر اتنا پسند کیا کہ انھوں نے فلم سازوں سے عباس کے اسٹائل میں فلم بنانے کی پُرزور اپیل کی۔ پھر دو ایک فلم سازوں نے اس میدان میں قدم رکھا اور ناکامی کا منہ دیکھنے کے بعد ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی۔

اب ایک عرصہ بعد گلزار نے بچوں کے لئے ایک فلم بنائی ہے "کتاب" جس میں نہ تلقین ہے نہ نصیحت اور نہ بڑی بڑی باتیں بلکہ اس تصویر میں انھوں نے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ پڑھنے سے جی چرانے والے بچے آخر کیوں ایسا کرتے ہیں۔ ان کا گھریلو ماحول اور ان کے لئے کی جانے والی لاپرواہی یا دلچسپی کے پس منظر میں وہ کتاب سے جی کیوں چراتے ہیں۔ گلزار کا یہ تجربہ بہت ہی کامیاب ہے ننھے منوں کے منہ سے چھوٹی چھوٹی باتیں اتنی پیاری ادا سے کہلوائی گئی ہیں کہ واہ واہ معصومیت کی بولتی تصویروں کو اس خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے کہ انھیں دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچے بعض وقت اپنے بڑوں کی نقل اتارتے ہیں ان کی باتیں بغیر سمجھے ہوئے ان ہی کے انداز میں کر جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسکول کے ماسٹر صاحب کی شادی ہوئی اور دوسرے دن بچوں نے بلاک بورڈ پر ماسٹر صاحب کے لئے یہ سوال تیار رکھا تھا ــ کہیئے ماسٹر صاحب سہاگ رات کیسی کٹی کچھ مزا

آیا۔ ماسٹر پریشان کہ یا اللہ یہ بچوں کو کیا ہوگیا۔ کس طرح یہ چھوٹے چھوٹے بچے بڑے بڑوں کے کان کاٹنے لگے۔ بچوں کو علم نہیں تھا کہ انھوں نے کیا لکھا ہے اور اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ غرض اسی طرح کی دلچسپ باتوں کو ملا کر گلزار نے ایک بہت ہی اچھی تصویر بنائی ہے جو ہے تو بچوں کے لئے لیکن ہر اس شخص کو یہ فلم دکھائی چاہئے جو بچوں کا باپ کہلاتا ہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ آج مجھے بچوں کی فلموں کی کیا سوجھی۔ تو صاحب کیا کروں آج کل فلمی دنیا کے حالات کچھ عجیب و غریب ہوگئے ہیں۔ چار سال سے مشہور صحافی اور ادیب جناب راز داں صاحب ایک فلم بنا رہے ہیں اور فلم ہے کہ ختم ہی نہیں ہونے پاتی۔ یہ فلم انھوں نے اس وقت شروع کی تھی جب سادھنا اور وحیدہ رحمان کا بول بولا تھا اور شاید فلم ریلیز ہوتے ہوتے یہ دونوں یا تو فلموں سے غائب ہو جائیں گی یا ماں اور نانی کے رول کرنے لگیں گی۔ فلم کی تاخیر کا سبب راج کمار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس بد دماغ اداکار نے اپنی شان دکھانے کے لئے ایک غریب صحافی کے صبر کا امتحان لینے کا فیصلہ کیا ہے ان کا جھگڑا فلم سازوں کی کونسل میں بھی پیش ہو چکا ہے لیکن نتیجہ صفر۔ کہا جاتا ہے کہ راج کمار قدم قدم پر راز داں کے لئے دردِ سر بن گیا ہے بحیثیت پروڈیوسر جب وہ کسی خاص منظر ہیں۔ راج کمار سے کچھ کرنے کو کہتے ہیں تو راج کمار کچھ اور ہی کر بیٹھتا ہے قتیل شفائی کا مشہور گیت "ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں" خود قتیل شفائی کی خواہش پر محمد رفیع سے گوایا جانا چاہئے۔ لیکن راجکمار کا اصرار ہے کہ یہ گیت نئے گلوکار یسوداس سے گوایا جائے۔ آخر یہ ہندوستانی اداکاروں کا دماغ اتنا کیوں خراب ہوگیا ہے اور کیوں ان کے اتنے نخرے اٹھائے جاتے ہیں۔

بقول کمال امروہی "راجکمار بہت اچھا دوست رہے گا بشرطیکہ آپ اسے اپنی کسی فلم میں نہ لیں۔ اب بتائیے بیچارے راز داں اس فلم کا کیا کریں جو ایک بد مزاج اداکار کے ہاتھوں تباہ ہو رہی ہے۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ امیتابھ بچن نے دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس لئے کہ دلیپ صاحب کی بے جا مداخلت اسے گوارا نہیں تھی۔

دھرمیندر سے پٹنے کے بعد اب فلمی صحافی بھی کچھ درست ہوتے نظر آرہے ہیں انھیں ڈر ہے کہ آئندہ کوئی اور ہیرو دھرمیندر کی سی حرکت کا اعادہ نہ کر بیٹھے۔

موسمی چیٹرجی کو گھر یاد آجائے تو وہ شوٹنگ کے دوران بلا کچھ کہے واپس چلی جاتی ہے۔ یہی حال ریکھا کا بھی ہے آج کل ہمارے فلم ساز اداکاروں کی مزاج داریاں برداشت کرتے کرتے نہ جانے کیوں درباری مسخرے بنتے جا رہے ہیں ؟!

بقیہ:- "شمع"

یہ اُس کا فیصلہ تھا۔

تم کیا جانو سونیل میری زندگی میں کتنا خلا ہے تم چاہو تو اُسے پُر کرسکتے ہو۔ تم چاہو تو میری گھور اندھیری راہوں کو روشن کرسکتے ہو۔ لیکن تم ایسا نہیں کرسکتے۔ کبھی نہیں کرسکتے سونیل۔ کبھی نہیں تو پھر میری راہوں سے روشنی چھین کر مجھے اندھیروں میں دھکیلنے کا تمھیں کیا حق تھا۔

آج میں سب کچھ پوچھوں گی۔ سب کچھ کہہ دوں گی۔ لیکن وہ کچھ نہ پوچھ سکی کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ بے زبان گڑیا کی طرح خاموش رہی۔ کسی نے اُس کے لب سی دیئے تھے۔ کسی نے اُس کی زبان گونگی کر دی تھی۔ اُس نے سوچا یہ سب بیکار ہے بے سود ہے۔ اُس کے فیصلے نے نیا موڑ لیا۔ اُس نے اپنے ارمانوں کی ارتھی کو اپنے ہی ہاتھوں جلا کر خاکستر کر دینا مناسب سمجھا۔ اور اُس اندھیری اور بھیانک رات میں کوٹھی سوگ کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی۔ لومڑیوں اور کتوں کے رونے کی صدائیں فضا میں گونجنے لگیں۔

کمرے کا خاموش ماحول اچانک سسکیوں میں ڈوب گیا۔ اور اسی لمحہ ایک زوردار دھماکہ ہوا اندھیری گھٹی گھٹی سی سسکیاں ایک کربناک چیخ بن کر ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئیں۔

بیڈروم کا ٹیوب بدستور جل رہا تھا لیکن بجھی ہوئی شمع سے اٹھتا ہوا دھواں ایک دودھیا لکیر بناتا ہوا فضا میں کہیں غائب ہوگیا۔

***

بے لاگ فلمی تبصرہ　　　از:- تماشائی

فلم جادو ٹونا

آپ جادو ٹونا، بھوت پریت وغیرہ پر یقین کریں یا نہ کریں لیکن اس بارے میں بعض ایسے مشاہدات ہیں جن کی کوئی سائنسی توجیہہ نہیں کی جاسکتی انکار بھی نہیں کیا جاسکتا اس کی وجہ وہ حقیقت ہے جسے مشہور مفکر ویل ڈیوران نے یوں بیان کیا ہے کہ آج تہذیب و سائنس کی اس حیرت انگیز ترقی کے باوجود قدرت کے ان گنت راز ایسے ہیں جو انسانی فہم و فکر سے بالاتر ہیں۔ فلم کی ابتداء میں انہی خیالات کا اظہار خود کلامی کی صورت میں خوبصورت مکالموں کے ذریعے کیا گیا ہے ویسے آپ نے وہ مشہور پراسرار لطیفہ تو سنا ہوگا کہ ریل کے ایک ڈبے میں صرف دو مسافر سفر کر رہے تھے۔ رات کی تاریکی میں ایک مسافر نے دوسرے سے دریافت کیا کہ کیا وہ بھوت پریت میں یقین رکھتا ہے۔ دوسرے مسافر نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "نہیں" اور پھر اس نے پہلے مسافر سے وہی سوال کیا کہ کیا وہ بھوت پریت میں یقین رکھتا ہے پہلے مسافر نے بھی بڑی متانت سے جواب دیا "بالکل نہیں" اور اس جواب کے ساتھ ہی ایک لمحہ کے اندر پہلا مسافر ہوا میں تحلیل ہوگیا۔ اب دوسرے مسافر کی سنجیدگی غائب ہو چکی تھی اور خوف و دہشت کے ساتھ بھوت پریت کا تصور غالب آچکا تھا۔ اس فلم میں بھی فلم کے ہدایت کار، عکاس اور اسکرین پلے رائٹر نے آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد روح نہ صرف موجود رہتی ہے بلکہ انتقام کی آگ میں جلتی رہتی ہے اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتی جب تک انتقام پورا نہیں ہو جاتا۔ روی کانت ناگیش کی یہ کوشش بڑی حد تک دلچسپ و کامیاب ہے لیکن کہانی کا مرکزی خیال راوی ناگیش کا نہیں ہے جیسا کہ بتایا گیا ہے بلکہ BLATTY کے BEST-SELLER ناول "EXORCIST" سے لیا گیا ہے جسے اسی نام سے فلمایا بھی جا چکا ہے۔ روی ناگیش نے کہانی کے ماحول و کرداروں کو ہندوستانی رنگ روپ دینے کی پوری کوشش کی ہے۔

کہانی امیر چند (پریم چوپڑہ) سے شروع ہوتی ہے جو اپنی دو بیٹیوں ورشا (رینا رائے) اور ہرشا (بے بی پنکی) کے ساتھ شہر سے اپنے آبائی گاؤں آرہا ہے راستے میں ایک دیہاتی اسے روکتا ہے۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے گاؤں کی روایت کے مطابق پیپل کے ایک پرانے پیڑ کو پرنام کرنے کے لئے کہتا ہے۔ لیکن امیر چند کے لئے گاؤں کی دنیا ماضی بن چکی ہے۔ وہ شہر کا رہنے والا ہے۔ پڑھا لکھا اور روشن خیال ہے۔ اس لئے وہ اور اس کی بیٹی ورشا اس غریب دیہاتی کی توہم پرستی کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس کی بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہیں سے ایک سیاہ بلی آپ کو آنے والے خوفناک واقعات سے خبردار کر دیتی ہے۔ دوسرے دن صبح جب ہرشا اپنی بڑی بہن ورشا کے ساتھ سیر کے لئے نکلتی ہے تو ایک تتلی کا پیچھا کرتے ہوئے گاؤں کے باہر ایک پراسرار حویلی میں جا پہنچتی ہے۔ یہاں ایک بیمار آدمی اسے دوا پلانے کے لئے کہتا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر دوا کی شیشی جیسے ہی کھولتی ہے، شیشی میں بند روح آزاد ہو کر اس پر وارد ہو جاتی ہے اور وہ بیمار آدمی غائب ہو جاتا ہے۔ یہ ہے کہانی کی ابتدا۔ آگے چل کر آپ کو بتایا جاتا ہے کہ یہ روح گاؤں کے کسی دولت مند پنالال کی ہے جسے اس کے ساتھیوں نے دولت کے لالچ میں قتل کر دیا تھا۔ اب وہ معصوم لڑکی پر وارد ہو کر اپنے قاتلوں سے بدلہ لینا چاہتی ہے۔ ہرشا کے دادا اور ان کے (کنھیالال اور [illegible] مصرا) اس بات کو

جانب جاتے ہیں کہ لڑکی پر ضرور کسی بدروح کا اثر ہوا ہے اور وہ اس کا علاج سادھو بابا (پریم ناتھ) سے کروانا چاہتے ہیں۔ لیکن امیر چند اور ورشا کو ان باتوں میں کوئی یقین نہیں ہے وہ پہلے گاؤں کے ایک ڈاکٹر کو بلواتے ہیں جس کے ساتھ ایک عجیب و غریب حادثہ ہوتا ہے یعنی ہرشا دورے کی حالت میں ڈاکٹر کا ہاتھ مروڑ دیتی ہے اس کے بعد امیر چند اپنی بیٹی کو شہر لے آتا ہے۔ یہاں مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر کیلاش (فیروز خان) اس کا علاج کرتا ہے۔ ہرشا پر خون دیکھتے ہی دورہ پڑتا ہے یا دوسرے معنوں میں اس پر روح وارد ہو جاتی ہے اور وہ اس حالت میں عجیب و غریب حرکتوں کی مرتکب ہوتی ہے۔ بلکہ اپنے تین قاتلوں میں سے دو کا کام تمام کر دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی انسپکٹر سجانی گوڈین (اشوک کمار) کا کردار سامنے آتا ہے جو قتل کی ان وارداتوں کی تحقیقات کرتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر کیلاش ہرشا کے نفسیاتی مرض کی گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے ورشا کی زلفوں کے پیچ و خم میں الجھ جاتا ہے۔ اس طرح اچھی خاصی پر اسرار اور سنسنی خیز کہانی کے ساتھ عام ہندوستانی فلمی کہانی بھی شروع ہو جاتی ہے ان دونوں کہانیوں کا انجام بھی حسب ہندوستانی انداز میں ہوتا ہے یعنی ہرشا کا علاج آخر کار گاؤں کے سادھو بابا کرتے ہیں اور ڈاکٹر کیلاش اپنے فن کی مہم میں ناکام اور من کی مہم میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر کیلاش ہرشا کا علاج ۔۔۔

(SPLIT PERSONALITY) کے مرض کی بنیاد پر کرتا ہے لیکن ہرشا کا کردار نفسیاتی کم اور آسیب زدہ زیادہ لگتا ہے کیونکہ کسی بھی نفسیاتی مریض سے مافوق الفطرت حرکتیں سرزد نہیں ہوتیں۔ پنالال کی روح انتقام کے سلسلے میں پہلے دو قتل ہرشا کی مدد سے کرتی ہے جبکہ تیسرے قتل سے ہرشا کا تعلق نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں پہلے دو قتل میں ہرشا کو معمول بنانے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ فلم میں جہاں بہ حیثیت مجموعی آسیب روح اور توہم پرستی کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہیں جدید سائنس کو مکمل طور پر رد نہیں کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر کیلاش کی PSYCHO CHEMOTHERAPY اس لئے اثر نہیں کرتی کہ ہرشا دوا استعمال نہیں کرتی۔ ہرشا کی آواز اس لئے ٹیپ نہیں ہو سکتی کہ ریکارڈر میں کچھ خرابی ہوتی ہے۔ سادھو بابا جب ہرشا کا علاج کرتے ہیں تو کیلاش اسے بھی CRUDE PSYCHIC TREATMENT قرار دیتا ہے۔ اس طرح روی ناگیش نے بھوت پریت اور آسیب و روح کے فلسفے کے ساتھ ساتھ نفسیات و سائنس کو بھی نبھایا ہے اور ایک ساتھ دو کشتیوں میں سفر کرتے ہوئے کنارے پر پہنچنے کی کامیاب کوشش کی ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ "باکس آفس" ان کے لئے کنارہ ثابت ہوتا ہے کہ منجدھار ـــــ کیونکہ فلم کی ابتدائی رپورٹ کچھ زیادہ امید افزا نہیں ہے۔

فلم کی ہدایت اور اسکرین پلے کسی حد تک اطمینان بخش ہونے کے باوجود روی ناگیش خود اپنے میدان میں یعنی عکاسی میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔ پریم چوپڑہ نے اپنے رول کو حقیقت سے قریب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بے بی بھنگی نے اپنے کردار کو خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ رینا رائے خوبصورت لگتی ہے لیکن خوبصورت اداکارہ نہیں لگتی۔ فیروز خان کا کردار ایک مشہور PSYCHIATRIST وماہر کی حیثیت سے مکمل اور بھرپور نہیں ہے لیکن پھر بھی فیروز خان نے اس کردار کو کسی حد تک جاندار بنانے کی کوشش کی ہے۔ اشوک کمار نے اپنے مختصر رول کو کافی دلچسپ بنایا ہے۔ دوسرے اداکاروں میں پریم ناتھ اور کنھیا لال قابل ذکر ہیں۔ مہمان اداکاروں کے طور پر رمیش دیو کے این۔ سنگھ اور جیون اپنے اپنے رول میں تماشائیوں کو متاثر کرتے ہیں۔ عزیز قیسی کے مکالمے فلم کے مجموعی تاثر کو برقرار رکھنے میں اہم ترین رول ادا کرتے ہیں ہیمنت بھونسلے کی پس پردہ موسیقی موزوں و مناسب ہے لیکن گانے بھرتی کے لگتے ہیں جو فلم کی رفتار کو سست کرتے ہیں۔ اس کے برعکس فلم "بیس سال بعد" وغیرہ کی طرح گانوں سے ماحول کو پر اسرار بنانے میں مدد لی جا سکتی تھی۔ اس خصوص میں ہدایت کار اور موسیقار دونوں ناکام ہیں۔ عزیز قیسی کی ایک

بقیہ سلسلہ صفحہ ۳۲ پر

فلمی ڈائری

خواجہ احمد عباس کی فلم "نکسلائٹس" کی رسم مہورت ۱۴ اپریل کو بمبئی کے "قلمی شہر" میں انجام پائی۔ متن چکرورتی نے پستول داغتے ہوئے مہورت کا شاٹ دیا۔ وی۔ پی۔ ساٹھے نے کلیپ دیا اور کملیشور نے کیمرے کا سوئچ دبایا۔ خواجہ احمد عباس نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے رمن کھنہ، امتیاز، جلال آغا اور امجد خان کے ساتھ ساتھ نئے اداکاروں سدھارتھا، سنیل ہری، شکیل فاروقی اور سجاتا مہتا کو بھی اس فلم کی کاسٹ میں شامل کیا ہے۔ اس فلم کی شوٹنگ نکسل باری میں بھی ہوگی۔ جہاں سے یہ تحریک شروع ہوئی تھی۔ عباس صاحب اس سال کے ختم تک شوٹنگ مکمل کر لینا چاہتے ہیں۔ متن چکرورتی جو اس فلم میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں۔ فلموں میں آنے سے پہلے خود نکسلائیٹ رہ چکے ہیں۔

★

جنتا حکومت نے سنسر شپ کی سختیوں کو بڑی حد تک ختم کر دیا ہے لیکن آج بھی بعض فلموں کے لئے سنسر سرٹیفکیٹ ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ باشو پروڈکشنز کی "آہوتی" کو سنسر کے دو اعتراضات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ فلم میں ایک گانے کے پس منظر میں شریمتی اندرا گاندھی کی تصویر بتائی گئی ہے اور بعض جگہ ان کے ۲۰ نکاتی پروگرام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ فلم میں یورانیم کے بارے میں کچھ کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سنسر سیاسی باتوں کے بارے میں بہت حساس ہو گیا ہے۔

★

باکس آفس پر کامیاب فلمیں تو سلور جوبلی اور گولڈن جوبلی مناتی ہیں لیکن بعض ناکام فلموں کی ناکامی کو چھپانے کیلئے پروڈیوسر، ڈسٹری بیوٹر اور کبھی کبھی آرٹسٹ فلم کی نمائش کو غیر ضروری طور پر طوالت دیتے رہتے ہیں۔ بعض دفعہ دوسری فلموں کی نمائش کو روکنے کے لئے بھی اس قسم کی حرکت کی جاتی ہے۔ پچھلے دنوں بمبئی میں "نس بندی" اور "نیا دور" کے فلم سازوں نے اس غلط روایت کو حقیقت پسندانہ انداز میں نظر انداز کرتے ہوئے بڑی صحت مند مثال پیش کی ہے۔ "نس بندی" کو جس کی نمائش "ناولٹی" میں ہو رہی تھی صرف دو ہفتے کے بعد مٹینی شو میں منتقل کر دیا گیا تاکہ "فلم گھر" کی نمائش کا انتظام ہو سکے۔ اسی طرح صرف چار ہفتے کے بعد گنگا میں "نیا دور" کی نمائش بند کر دی گئی۔

★

نئی ہیروئینوں میں ٹینا منیم (دیس پردیس) پونم ڈھلان (ترشول) اور نفیسہ علی (جنون) نے اپنی فلموں کی ریلیز سے پہلے ہی کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔ اور اکثر فلم ساز اپنی فلموں کے لئے ان سے معاہدے کر رہے ہیں۔ ایک اور نئی ہیروئن رشی پنڈت نے بھی فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ رشی پنڈت، سلکشنا پنڈت کی چھوٹی بہن ہے۔ اور اس کے پاس کئی فلموں کے معاہدے ہیں۔ بہت جلد اس کی ایک بڑی بجٹ کی فلم کا بھی اعلان ہونے والا ہے۔

★

راجکپور کی "ستیم شیوم سندرم" اور دیو آنند کی "دیس پردیس" کو "اے" سرٹیفکیٹ ملنے کے بعد ایسا لگتا ہے اب بہت سے فلم ساز وہدایت کار اپنی فلموں کے لئے "اے" سرٹیفکیٹ کی کوشش کریں گے تاکہ سنسر شپ کی رعایتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ باکس آفس کی بلندی تک پہنچنے کے لئے "SEX" کی سیڑھی کا سہارا اکثر کامیاب ثابت ہوا ہے۔ یہاں ایک بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ جب "شعلے" کو "اے" سرٹیفکٹ دیا گیا تو رمیش سپی نے اپنی فلم کے بعض کلائمکس سین کی دوبارہ شوٹنگ کی اور ان حصوں کو نکال دیا جن کی بناء پر

"اسے" سرٹیفکیٹ دیا گیا تھا اس طرح
"یو" سرٹیفکیٹ کے ساتھ اس فلم نے کامیابی
کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔ لاکھوں نوجوانوں
اور نابالغ بچوں نے اس فلم کو دیکھا اور
خاص طور پر امجد خان کی لاجواب اداکاری
کے گرویدہ ہوگئے۔

★

"ستیم شیوم سندرم" کے ایک گیت
کی ریکارڈنگ کے لئے راج کپور کو لتا منگیشکر
کا چھ مہینے تک انتظار کرنا پڑا اور پھر تین
مہینے کے انتظار کے بعد اس گیت کو زینت
امان پر فلمایا گیا۔ لیکن اتنے وقت اور پیسے
کے صرفے کے بعد جب راج کپور نے محسوس کیا
کہ وہ گانا فلم میں موزوں نہیں لگ رہا ہے
تو گانے کو فلم سے نکال دیا۔ راج کپور اس
طرح سے موسیقی کے ماہر سمجھے جاسکتے ہیں
کہ وہ عوام میں مقبول ہونے والی دھنوں
کا بہترین انتخاب کرتے ہیں۔

★

مہاراشٹرا حکومت نے گوریگاؤں
کے قریب جو فلمی شہر بسایا ہے وہ آج کل فلم
سازوں میں کافی مقبول ہو رہا ہے۔ یہاں
شوٹنگ وغیرہ کی اتنی سہولتیں فراہم کی گئی
ہیں کہ اب ہر فلم ساز و ہدایت کار اپنی فلم
کی شوٹنگ بجائے بمبئی کے فلمی شہر کو ترجیح دے رہے
ہیں۔

★

امین چودھری نے جو امریکہ کے ایک
اچھے فلم ساز ہیں اپنی انڈو امریکن فلم "کشش"
کو مکمل کر لیا ہے۔ اس فلم میں نوین نشچل اور
رینا رائے کے ساتھ انیل دھون، ڈاکٹر
سری رام لاگو، اے۔ کے۔ ہنگل، اچلا
سچدیو اور ششی کلا کام کر رہے ہیں۔ امین
چودھری نیویارک کی ایک بڑی سینما کو
خریدنے کے سلسلے میں بات چیت کر رہے
ہیں۔ اگر یہ بات چیت کامیاب ہو جائے
تو "کشش" کا پریمیئر شو نیویارک میں
ہوگا اس طرح "کشش" کو نیویارک میں
ریلیز ہونے والی پہلی ہندی فلم کا اعزاز
حاصل ہو جائے گا۔

★

کھنڈالا گھاٹ پر اب تک بے شمار
ہندی فلموں کی شوٹنگ ہو چکی ہے۔ لیکن
رمیش بہل کی نئی فلم "ترشنا" میں جس طرح
اس خوبصورت لوکیشن کو پیش کیا گیا ہے
ویسے شائد کسی ہندی فلم میں نہیں پیش
کیا گیا۔ اس فلم کو انیل گنگولی نے ڈائرکٹ
کیا ہے جس میں راکھی نے اپنی فلمی زندگی
کا سب سے زیادہ جذباتی رول ادا کیا
ہے۔ امرجیت کی لکھی ہوئی اس فلم میں سنجیو کمار
نے بھی بے حد متاثر کن اداکاری کا مظاہرہ کیا
ہے

★

سرت چندر کے لافانی شاہکار
دیوداس کو ہندی، تلگو، بنگالی اور ٹامل
زبان میں فلمایا جاچکا ہے۔ بنگالی میں ایک
بار پھر اسے فلمایا جارہا ہے جس میں اتم کمار
سومیترا چٹرجی اور سپریہ دیوی کام کر رہے
ہیں۔ تلگو میں بھی دیوداس کو دوبارہ فلمایا گیا
ہے۔ آج سے ۲۵ برس پہلے جب تلگو دیوداس
بنی تھی تو اے۔ ناگیشور راؤ نے دیوداس کا
رول ادا کیا تھا اور آج جو دیوداس بنی
ہے اس میں بھی یہ رول ناگیشور راؤ ہی نے
ادا کیا ہے۔ اس وقت ناگیشور راؤ کی عمر ۲۶
سال تھی اور آج تلگو فلموں کا یہ سدابہار
ہیرو ۵۱ سال کا ہو کر بھی تماشائیوں کے
دلوں پر راج کر رہا ہے۔

★

"آنکھوں کے جھروکوں سے" فلم کا نام
جتنا شاعرانہ اور پیارا ہے فلم باکس آفس
پر بھی اتنے ہی پیارے انداز میں کامیاب
ہو رہی ہے۔ اس فلم کا ٹائٹل گیت ہیم لتا
نے گایا ہے جو اس تیزی سے مقبول ہو رہا ہے کہ
لوگ سوچ رہے ہیں کہ بہت جلد ہیم لتا کے
نام کا پہلا حصہ کھو جائے گا اور ہیم لتا کل
کی لتا بن جائے گی۔

★

ایس۔ ڈی۔ نارنگ کی فلم "کالج گرل"
کے گانے بے حد مقبول ہو رہے ہیں۔ فلم کی ریلیز
سے پہلے اس کے دس ہزار ایل پی۔ فروخت
ہو چکے ہیں۔ برطانیہ امریکہ اور کینیڈا میں بھی
اس کے ریکارڈز تیزی سے فروخت ہو رہے ہیں

★

بمبئی کے مشہور سینما ہاؤس گنگا اور جمنا
ہیں۔ حسن اتفاق سے گنگا میں دلیپ کمار کی
مشہور فلم "گنگا جمنا" اور جمنا میں امیتابھ بچن

کی فلم "گنگا کی سوگند" لگی ہوئی ہے۔

★

اب "دیس پردیس" میں امجد خاں کو بھی لیا گیا ہے اور اسے کافی بڑا رول دیا گیا ہے۔ یہ بات یقیناً حیرت انگیز ہے۔ کیونکہ دیو آنند کی فلموں میں فلم کی ابتدا سے آخر تک دیو آنند ہی نظر آتا ہے۔ امجد کو بڑا رول دے کر ایک حد تک دیو آنند نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ کیونکہ دیو آنند کی پچھلی فلمیں یکے بعد دیگرے فلاپ ہوتی رہی ہیں۔ امجد خاں نے بڑے خوبصورت انداز میں "گبر سنگھ" کے امیج سے ہٹ کر اداکاری کی ہے جو ممکن ہے فلم کو باکس آفس پر کامیاب بنا سکے۔

★

مرکزی حکومت کی جانب سے فلموں کو جو قومی اعزازات دیئے جاتے ہیں اس کے ۲۵ سال مکمل ہو چکے ہیں۔ اس سال کنڑی کی فلم "گھٹا شردھا" کو سب سے بڑا اعزاز یعنی GOLDEN LOTUS دیا گیا ہے۔

گریش کسارولی کی اس فلم میں عورتوں کے ساتھ ناانصافی کے موضوع کو پیش کیا گیا ہے۔ ہندی اداکاروں میں صرف سنجیو کمار کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اسے دو مرتبہ بہترین اداکار قرار دیا گیا۔ ایک مرتبہ فلم "دستک" میں اور دوسری مرتبہ فلم "کوشش" میں۔ دوسرے ہندی اداکاروں میں جنھیں اداکاری پر انعام دیا گیا ہے، نرگس، اشوک کمار، سنیل دت وحیدہ رحمان، شرمیلا ٹیگور، شبانہ اعظمی ریحانہ سلطان اور سادھنا کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس سال ہندی فلموں میں ستیہ جیت رے کی فلم "شطرنج کے کھلاڑی" کو بہترین ہندی فلم منتخب کیا گیا جبکہ عوامی اپیل رکھنے والی فلم کے اعتبار سے "سوامی" کو بہترین فلم قرار دیا گیا۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے اس سال فلموں کا انتخاب کرنے والی جیوری کے صدر نشین مسٹر ابراہیم القاضی کے تعلق سے بعض فلمی حلقوں کو یہ شکایت ہے کہ انھوں نے اکثر فلموں کے صرف چند ریل دیکھے اور اس طرح نامکمل فلموں کو دیکھ کر ایوارڈ کے لئے منتخب کیا گیا ہے ——●●

بقیہ "فلم" جادو ٹونا"

خوبصورت نظم "آئینے کچھ تو بتا" کو کافی خوبصورتی سے فلمایا گیا ہے۔ مگر یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ اس نظم کی دھن حیدرآباد کے ایک موسیقار بہاؤالدین نے بھی بنائی ہے جو فلم دھن سے زیادہ دلکش لگتی ہے۔

بہ حیثیت مجموعی "جادو ٹونا" ایک اوسط درجے کی فلم ہے جو اس لئے دیکھی جا سکتی ہے کہ اس نوعیت کی فلمیں ہندی میں بہت کم بنی ہیں ویسے انگریزی HORROR FILMS کے تصور کو ذہن سے نکال کر دیکھئے ورنہ یقیناً آپ کو مایوسی ہوگی ——●

اردو لکھئے
اردو پڑھئے
اردو بولیے

کارخانہ زندہ طلسمات حیدرآباد

کی قابل اعتماد پیش کش

زندہ بام

درد سر، جوڑوں کے درد اور اعضا شکنی کے لئے

پچاس سال سے صحت و تندرستی کی حفاظت کے لئے نامور

زندہ طلسمات

یونانی طریقہ پر بنائی ہوئی دوا نزلہ زکام کھانسی پیچش پیٹ درد اور کئی امراض کے لئے

منجن فاروقی

جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ منجن فاروقی دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی حفاظت کے لئے۔

JUNE - 1978

فیض سوئے دار چلے

مرزا ظفر الحسن کا خصوصی مضمون

اس کے علاوہ

کہانیاں ۔ غزلیں ۔ نظمیں ۔ [illegible]

ادبی ڈائری اور تبصرے ۔ [illegible]

Price: Rs. 1.[illegible]

اشاعت کا چودھواں سال
جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت
علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

پونم

جلد (۱۴)
شمارہ (٦)
جون ۱۹۷۸ء

زرِ سالانہ (۱۵) روپے
لائبریریز کے لئے (۲۰) روپے
بیرونی ممالک سے (۲۵) روپے

ایڈیٹر
ناصر کرنولی ایم اے (عثمانیہ)

خط و کتابت کا پتہ:
مینجر ماہنامہ پونم
16-7-300/1
اعظم پورہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴

ماہنامہ پونم میں شائع ہونے والے تمام مضامین میں نام، واقعات، کردار اور متعلقات فرضی ہوتے ہیں۔ ان سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی جس کے لئے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

ترتیب

اردو کے ادبی رسائل خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالئے۔
(ادبی رسائل خریدنا بھی ایک طرح سے اردو زبان و ادب کی خدمت ہے۔)
(ادارہ)

٩١٩٦٨ مئی

چیف منسٹر سکریٹریٹ میں عوامی شکایات کے شعبہ کا قیام

عوام کی سہولت کی خاطر حکومت کے زیرِ غور عوامی کارروائیوں کی یکسوئی کے لیے درخواستیں اور شکایتیں وصول کرنے کے لیے چیف منسٹر سکریٹریٹ میں ایک علیحدہ عوامی شکایات کے شعبہ کی تشکیل عمل میں لائی گئی ہے۔ یہ شعبہ جنرل ایڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ سکریٹریٹ کی بلڈنگ حیدرآباد کی دوسری منزل پر قائم کیا گیا ہے۔

عوام سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنی شکایتوں اور درخواستوں کی تین کاپیاں اپنی کارروائیوں کی تفصیلات اور حوالوں و نیز ضروری مواد کے ساتھ شری کے۔ معین الدین ڈپٹی سکریٹری حکومت آندھرا پردیش (کمپلینٹ سیل) آفس آف دی چیف منسٹر سکریٹریٹ حیدرآباد ۲۲...۵ کو روانہ کریں۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ

حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

LETTER NO: 745/ADVT/78 DATED 15-5-78 NO: 9/78-79

★ کرنیں

(اداریہ)

اُردو تعلیمی ٹرسٹ

انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش نے اُردو تعلیم کے گرتے ہوئے معیار اور اُردو طلباء کی گھٹتی ہوئی تعداد کو محسوس کرتے ہوئے ایک "اُردو تعلیمی ٹرسٹ" کے قیام کا اعلان کیا ہے جو اُردو تعلیم کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر ایک نہایت ہی مستحسن اقدام ہے

اُردو آرٹس کالج کے قیام کے بعد ہم نے اپنے اداریوں کے ذریعہ اربابِ انجمن ترقی اُردو کی توجہ اُردو اسکولس کے قیام کی ضرورت کی طرف مبذول کروائی تھی تاکہ کالج کے لئے اردو میڈیم کے طلباء کی قابلِ لحاظ تعداد حاصل ہوسکے۔ آج اُردو آرٹس کالج جن حالات سے دوچار ہے وہ محض اُردو میڈیم اسکولس کی کمی ہی کا نتیجہ ہے۔ اگر کالج کے قیام کے ساتھ ساتھ مدارس کے قیام کی طرف بھی توجہ کی جاتی تو موجودہ حوصلہ شکن حالات کا سامنا کرنا نہ پڑتا۔ بہرحال اراکین انجمن نے بالآخر اُردو میڈیم کے مدارس کے قیام کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اُردو تعلیمی ٹرسٹ کے قیام کا فیصلہ کیا ہے جو قابلِ مبارکباد ہی نہیں بلکہ دیگر صوبائی انجمنوں کے لئے قابلِ تقلید بھی ہے۔

اراکین انجمن اُردو تعلیمی ٹرسٹ کے تحت چار ماڈل پرائمری اسکولس قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جن میں طلباء کو اُردو کے ساتھ ساتھ انگریزی اور تلگو میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اسپیشل کوچنگ کا انتظام بھی کیا جائے گا۔ اس طرح اُردو طلباء میں خود اعتمادی پیدا ہوسکے گی اور وہ دیگر میڈیم کے طلباء کے مقابلہ میں احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوں گے۔ اس کے علاوہ بعض خانگی اُردو میڈیم ہائی اسکولس اور جونیر کالجوں کے تعلیمی معیار کو اونچا کرنے کے لئے ٹرسٹ کی جانب سے امداد بھی دی جائے گی۔ اس پروگرام کو عملی شکل دینے کے لئے نائب صدر انجمن ترقی اُردو جناب عابد علی خاں کے بیان کے مطابق پندرہ لاکھ روپیوں کے سرمائے کی ضرورت ہے۔ اس خصوص میں ہندوستان اور بیرونی ممالک میں مقیم ہندوستانی باشندوں سے عطیوں کی وصولی کا سلسلہ بھی شروع ہوچکا ہے۔ ٹرسٹ سے وابستہ شخصیتوں کے اثر و رسوخ اور ان کے کام کرنے کی پُرخلوص لگن کے پیشِ نظر ہمیں کامل یقین ہے کہ تعلیمی ٹرسٹ کا یہ خواب ضرور بالضرور شرمندۂ تعبیر ہوجائے گا۔

اُردو والے اپنے تعلیمی مسائل کے حل کے لئے ہمیشہ حکومت پر تکیہ کرتے رہے ہیں اپنے مسائل خود حل کرنے کی اُنھوں نے کبھی کوشش نہیں کی جس کے نتیجہ میں سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ اگر اُردو والے بھی کرسچین مشن اسکولس کی طرح ابتدا ہی سے معیاری تعلیم کے اُردو مدارس کے قیام کی کوشش کرتے تو آج صورتحال دوسری ہی ہوتی۔ اُردو تعلیمی ٹرسٹ کا قیام اپنے مسائل آپ حل کرنے کی پہلی مستحسن کوشش ہے جس کے لئے اراکین انجمن مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ادارۂ پونم اُردو والوں اور اُردو دوستوں سے پُرخلوص اپیل کرتا ہے کہ وہ اُردو تعلیمی ٹرسٹ میں فراخدلانہ عطیئے دیں تاکہ اُردو تعلیم کا مستقبل تابناک ہوسکے

ناصر کرنولی

ہمارے سماج کے کمزور طبقات جنھیں ہماری برادری نے ایک عرصۂ دراز سے فراموش کر دیا تھا اب کچھ مدت سے ان کی ہمہ گیر ترقی کے لیے تیار کی ہوئی بہت سی خصوصی اسکیموں کے مفید اثرات کی بدولت اپنے لیے ایک مقام بنا رہے ہیں۔

آندھرا پردیش ان چند ریاستوں میں ایک ہے جہاں درج فہرست اقوام۔ درج فہرست قبائل اور ساتھ ہی ساتھ پسماندہ طبقات کی معاشی امداد کیلئے پروگرام آغاز کرنے کی خاطر مالیاتی اداروں کی تشکیل عمل میں لائی گئی ہے

تین با اختیار کارپوریشنوں یعنی شیڈولڈ کاسٹس کوآپریٹیو فینانس کارپوریشن۔ بیاک ورڈ کلاسز کوآپریٹیو فینانس کارپوریشن اور شیڈولڈ ٹرائبس کوآپریٹیو فینانس کارپوریشن گذشتہ تین برسوں سے کمزور طبقات کو وسیع اور مختلف اقسام کے فوائد سے ہمکنار کرنے کے لیے اپنی سرگرمیاں جاری کیے ہوئے ہیں ۱۹۷۸-۷۹ء کے سالانہ منصوبے میں کمزور طبقوں کی بہبود کے لئے ۳۲و۸ کروڑ روپیوں کی گنجائش ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ

حکومت آندھرا پردیش ۔ حیدرآباد

DIPR NO 6/78-79 LETTER NO: 1746

مرزا ظفر الحسن

فیض سوئے دار چلے

[فیض احمد فیض پاکستان میں تین مرتبہ گرفتار کئے گئے ہیں۔ ایک تو ۱۹۴۸ء میں جب کہ وہ پاکستان ٹائمز لاہور کے چیف ایڈیٹر تھے۔ دوسری بار ۱۹۵۱ء میں جس کے بعد ان پر "راولپنڈی سازش" کا الزام لگا کر چار سال قید کی سزا دی گئی تھی اور تیسری مرتبہ ۱۹۵۸ء میں جب انھوں نے تاشقند کی ایفرو ایشیائی کانفرنس میں حکومت پاکستان کی نمائندگی کی تھی اور وطن واپس آنے تک ایوب خاں والا مارشل لا لگایا جا چکا تھا اور ملک میں اندھا دھند گرفتاریاں عمل میں لائی جا رہی تھیں۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ پورے ستائیس برس گزر جانے پر بھی پاکستان اور ہندوستان میں کتاب تو بڑی بات ہے کسی نے "راولپنڈی سازش" پر کوئی مضمون تک نہیں لکھا جس سے ناظرین کو علم ہوتا کہ دراصل یہ "سازش" تھی کیا اور اس میں فیض نے کیا اور کس حد تک حصہ لیا۔ البتہ اس پر ضرور حیرت ہوگی کہ ۱۹۶۵ء میں کراچی کے دو ماہناموں "جائزہ" اور "افکار" نے دو "فیض نمبر" شائع کئے اور ان میں سرسری طور پر بھی فیض کی متذکرہ گرفتاری اور سزا کا ذکر نہیں کیا۔ ادارہ یادگار غالب کراچی کے سہ ماہی جریدے غالب کے "فیض نمبر" میں چند مضامین شامل ہیں مگر وہ بھی ناکافی ہیں۔

مرزا ظفر الحسن نے فیض کی متذکرہ اسیری پر ایک کتاب "فیض سوئے دار چلے" لکھی ہے جس کے آخری دو تین باب تشنہ طلب ہیں جو مرزا صاحب دکوس سے وطن لوٹ کر مکمل کریں گے اور امید ہے کہ یہ کتاب ۱۹۷۸ء کے اختتام سے قبل شائع ہو جائے گی۔ ۱۹۷۸ء فیض احمد فیض کی شاعری کی گولڈن جوبلی کا سال ہے۔ موصوف نے ۱۹۲۸ء میں شاعری شروع کی اور اب ان کی مشق سخن کے پچاس سال مکمل ہو رہے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب گولڈن جوبلی کا ایک تحفہ بھی ہے۔

ذیل میں ہم مرزا ظفر الحسن کی اسی کتاب کا اولین باب پیش کر رہے ہیں جس میں مصنف نے بچپن سے آج تک کے فیض کے مزاج کی جھلکیاں پیش کر کے ناظرین سے پوچھا ہے کہ "ایسے مزاج والے شخص و شاعر کی زندگی میں فساد، سازش اور بغاوت ہے کہ نہیں؟ اور اگر ہے تو ان کی زندگی اور شعر میں کہاں اور کس طرح ظاہر ہوتی ہے؟" ادارہ]

فیض احمد فیض تین بار گرفتار کئے گئے ہیں، ۱۹۴۸ء میں، ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۸ء میں۔ دوسری گرفتاری کے بعد ان پر نام نہاد "راولپنڈی سازش" کا مقدمہ قائم کر کے چار سال قید کی سزا سنائی گئی۔

میں سب سے پہلے فیض کے مزاج کا جائزہ پیش کرنا اور تصفیہ تمام تر آپ پر چھوڑنا چاہتا ہوں کہ ان کی زندگی میں فساد، سازش اور بغاوت ہے کہ نہیں اور اگر ہے تو ان کی زندگی اور شعر میں کہاں اور کس طرح ظاہر ہوتی ہے۔ شعر بیشتر صورتوں میں شا
زندگی اور مزاج کا آئینہ ہوتا ہے جس میں ش
کے مزاج اور کردار کا عکس اکثر نظر آتا
مزاج فیض تفصیل کا طالب ہے مگر میں
اور چند اشاروں سے کام لوں گا کیونکہ اگر

میرے علاوہ دوسرے کئی احباب لکھ چکے ہیں
دہرانے کا فائدہ [illegible] یا دو
مختلف اور متضاد [illegible] سب
کی نظر میں ان کا مزاج قریب قریب یکساں ہے
یعنی ریشم کی طرح نرم و ملائم اور گل نوشگفتہ
کی طرح پرکشش۔ جیسا کل تھا آج ہے اور
کل بھی ویسا ہی رہے گا۔

اختر جمال فیض کی بڑی بہن کے حوالے
سے ان ہی کے الفاظ میں لکھتی ہیں۔ "بچپن سے
خاموش مزاج اور حلیم الطبع تھے۔ فیض کے
مزاج کا یہ حال تھا کہ جن دنوں (ان کے ابا
کا) حکم تھا کہ بڑے اگر کھانے کے وقت پر
یعنی رات نو بجے تک گھر نہ آئیں تو کھانا نہ
دو۔ طفیل (فیض کے بڑے بھائی) مجھ یا
کسی اور کو جگا کر کھانا لیتے اور گرم کر کے
کھاتے۔ چھوٹے بھائی عنایت خود باورچی
خانے جا کر ڈھونڈ ڈھانڈ کر پیٹ بھر
لیتے مگر فیض آتے تو نہ کسی کو جگاتے اور
نہ کھانا تلاش کرتے بلکہ چپ چاپ بھوکے سو
جاتے۔ مجھے اس کے مزاج پر رحم آتا اور میں پوچھتی
فیض کھانا کھاؤ گے؟ جواب ملتا بہن اگر ملا
تو کھا لیں گے۔" یہ گھریلو واقعہ ہی سہی مگر اس کی
پابندی اور اس کے احترام کی یہ پہلی اور عمدہ
کی مثال ان کے مزاج کا اولین عکس ہے۔

ماہرین اطفال کا کہنا ہے کہ نہایت کم عمری
ہی میں مزاج کا ایک سانچہ بن جاتا ہے جس سے
شخصیت تیار ہوتی ہے اور اس میں بہت
زیادہ تبدیلی نہیں ہوتی۔

فیض کا ایک [illegible]

کراچی میں مقیم ہے جس میں وہ کہتے ہیں
"ہمارے گھر میں خواتین کا ایک ہجوم تھا
ہم جو تین بھائی تھے ان میں ہمارے چھوٹے
بھائی اور بڑے بھائی خواتین سے باغی ہو کر
کھیل کود میں مصروف رہتے تھے۔ ہم اکیلے
ان خواتین کے ہاتھ لگے۔ اس کا کچھ نقصان بھی
ہوا اور کچھ فائدہ بھی۔ فائدہ تو یہ ہوا
کہ ان خواتین نے ہم کو انتہائی شریفانہ
زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جس کی وجہ سے
کوئی غیر مہذب یا ابتذال کی بات اس
زمانے میں ہمارے منہ سے نہیں نکلی تھی
اب بھی نہیں نکلتی۔" آگے چل کر کہتے ہیں
"صبح ہم اپنے ابا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے
مسجد جایا کرتے تھے (یہاں پر فیض
کے حوالے سے لکھ چکا ہوں کہ ان کے بھائی
عنایت اور طفیل اپنے ابا کے ساتھ نہیں
جایا کرتے تھے) معمول یہ تھا کہ اذان
کے ساتھ ہم اٹھ بیٹھے ابا کے ساتھ مسجد گئے
نماز ادا کی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولوی ابراہیم
میر سیالکوٹی سے جو اپنے وقت کے بڑے عالم
تھے درس قرآن سنا، پھر ابا کے ساتھ
ڈیڑھ دو گھنٹے سیر کے لیے گئے۔ پھر اسکول۔"

اس مثال سے معلوم ہوتا ہے
کہ فیض کو ضبط، تحمل اور ڈسپلن کی
عادت ابتدائی عمر ہی سے پڑ گئی۔ آج بھی
ان میں بے حساب تحمل اور ضبط ہے۔
[illegible] مشاعرے [illegible]

[illegible]
کا رنگ
دور جا چکا ہے [illegible] رنگ
عنائی ہو گیا ہے پہلے جو دیکھنے میں آ…
تھا اس کی صورت بالکل مختلف ہو گئی
ہے۔ دنیا ایک طرح کی پردہ تصویر…
قسم کی چیز محسوس ہونے لگی تھی۔"
فیض کی اس بیان کردہ "خاص قسم کی
کیفیت" کا نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے …
تو تجزیہ نہیں کر سکتا مگر مجھے یوں محسوس
ہوتا ہے کہ طالب علم فیض کے جسم میں شاعر
فیض کی روح داخل ہونے کی کوشش
کر رہی تھی اور یہ کیفیت اسی کوشش
کی غماز تھی کیونکہ ان ہی دنوں فیض نے شاعری
شروع کی تھی۔ کہتے ہیں "ان دنوں مشاعرے
بھی ہوا کرتے تھے۔ ہمارے گھر سے ملی ہوئی
ایک حویلی تھی جہاں سردیوں کے زمانے
میں مشاعرے کیے جاتے تھے۔ سیالکوٹ
میں پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی ہوا کر…
تھے جو ان مشاعروں کے انتظامات کرتے
تھے۔ ایک منشی سراج دین تھے۔ سری نگر
میں مہاراجہ کشمیر کے میر منشی۔ وہ صدارت
کیا کرتے تھے۔ جب دسویں جماعت میں پہنچے
تو ہم نے بھی تک بندی شروع کر دی اور
دو ایک مشاعروں میں شعر پڑھ دیے۔
منشی سراج دین [illegible]

[illegible] شعر کہنا
[illegible] دیا۔ منشی سراج دین فیض کے والد
کے دوست تھے یہ فیض کی سعادت مندی
تھی کہ اپنے والد کے دوست اور ایک محترم
بزرگ کی نصیحت مان لی اور شاعری سے
اپنا ناتہ توڑ دیا۔ شاعری کی علت میں جو
گرفتار ہوا کبھی رہائی نہ پا سکا۔ یہ چسکا
اگر دسویں جماعت کے طالب علم کو پڑ جائے اور
اس پر منشی سراج دین جیسی شخصیت اور
حیثیت کے شخص کا یہ ریمارک بطور ریم چڑھے
کہ "تم بہت تلاش سے شعر کہتے ہو" تو کیا منہ
سے لگی ہوئی یہ کافر عادت چھوٹ سکتی ہے؟
ان کا مخلص مزاج ملازمت کے معاملے میں مستقل
ہوتا نظر آتا ہے۔

فیض کالج سیالکوٹ میں انٹرمیڈیٹ
کے طالب علم تھے۔ یوسف سلیم چشتی صاحب
نے جو اردو کے استاد تھے کالج میں طرحی مشاعرے
شروع کیے اور فیض سے کہا تم بھی شعر لکھو۔ فیض
نے لکھا، استاد نے سنا اور کہا۔ "اس طرف توجہ
کرو شاید تم کسی دن شاعر ہو جاؤ۔" ایک طرف
منشی سراج دین کی نصیحت کہ تعلیم کے زمانے
میں شاعری "تضیع اوقات" ہے دوسری
طرف اردو کے استاد کا حکم کہ "اس طرف توجہ
کرو" تیسری طرف شاعری کی روح کا فیض
کے جسم میں داخل ہونے پر اصرار۔ فیض کی

[illegible] اور
[illegible] اس لیے بہت اچھے نمبروں سے
انٹرمیڈیٹ پاس کر کے گورنمنٹ کالج میں داخل
ہو گئے۔ یہاں ثابت ہوتا ہے کہ ان کے
مزاج میں شدت نہیں تھی۔ نہ اصرار کی جانب
نہ انکار کی طرف۔ ایک بزرگ نے کہا شاعری
چھوڑ دو تو چھوڑ دی۔ دوسرے نے کہا شعر
کہو تو شعر کہنے لگے۔ کیا باغی ایسا کرتا ہے؟

فیض نے اسکول کی طالب علمی میں اپنے
اشعار پر ایک تمغا اور ایک روپیہ انعام پایا
تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور پہنچے اور وہاں اپنے
استاد صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے حکم پر ایک
نظم لکھی جو اقبال پر تھی اور اقبال کی موجودگی
میں سنائی جانے والی تھی۔ لکھنے کو تو نظم لکھ
دی مگر شرمیلے شاعر میں یہ ہمت نہ تھی کہ اقبال
کی موجودگی میں سنائے۔ صوفی صاحب نے
ہمت بندھائی تو نظم سنائی داد بھی پائی اور
انعام بھی۔ وہی صوفی صاحب اسی کالج کے ایک
اور مشاعرے کی روداد اس طرح بیان کرتے
ہیں "پھر ایک نوجوان آئے۔ گورے چٹے، کشادہ
جبیں، حرکات میں شیریں روانی، آنکھیں
اور لب بہ یک وقت نیم تبسم میں ڈوبے
ہوئے۔ شعر پڑھے۔ بڑے ڈھنگ اور
تمکنت سے پڑھے۔ یہ فیض تھے۔ شاگردوں
استادوں سبھی نے اپنے اپنے رنگ میں داد
دی۔ شعرا میں کچھ دبے دبے اشارے ہوئے
پطرس نے کچھ معنی خیز نظروں میں لاہور
کے نیاز مندوں سے باتیں کیں اور ان کی

نیم خاموشی کو رضا سمجھ کر دونوں نوجوانوں
(حفیظ ہوشیارپوری اور فیض) کو دوبارہ
اسٹیج پر بلایا۔ نیا کلام سنا۔ فیض صاحب نے
غزل کے علاوہ ایک نظم بھی سنائی۔ غزل اور
نظم دونوں میں سوچ کا انداز اور بیان کا
اچھوتا اسلوب تھا۔ مشاعرہ ختم ہوا قرار
پایا کہ احباب ان دونوں لڑکوں کو ہمراہ
لے کر غریب خانے پر جمع ہوں۔ رات کافی
گزر چکی تھی۔ [illegible] تک پہنچنا تھا۔
(پطرس) بخاری نے ان کی غیر حاضری کا ذمہ لیا
اور پھر گھنٹہ بھر کے لیے شعر و سخن کی صحبت
قائم رہی۔ یہ ان کی طبع آزمائی کا امتحان نہیں
اساتذہ کی حوصلہ افزائی کا امتحان تھا۔
دونوں کامیاب رہے۔"

فیض کو اعتراف ہے کہ انھوں نے
اپنی درسگاہ سے زیادہ اس وقت کے
بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر بہت کچھ حاصل
کیا اور وہ بزرگ ہیں پطرس، تاج، تاثیر،
سالک، ہری چند اختر اور چراغ حسن حسرت
جیسے نیاز مندان لاہور تھے۔ ان بزرگوں
میں باغیانہ اور متشددانہ مزاج رکھنے والا
کون تھا؟ میرا خیال ہے کہ ان میں سب
سے زیادہ محتاط، دور اندیش اور دانشمند
پطرس تھے تحریر و تقریر میں بھی فکر اور
اس کے ذکر میں بھی۔ اور وہی سب سے
زیادہ فیض کے فدائی ہوئے۔ فیض اپنی اسیری
کے خط نمبر ۶۸ میں لکھتے ہیں "یہ سن کر
دل بہت متاثر ہوا اور بہت [illegible]

میرے علاوہ دوسرے کئی اصحاب لکھ چکے ہیں دہرانے کا فائدہ یوں بھی نہیں ہے کہ کہیں دو مختلف اور متضاد رائیں نہیں ملتیں۔ سب کی نظر میں ان کا مزاج قریب قریب یکساں ہے یعنی ریشم کی طرح نرم و ملائم اور گلِ نوشگفتہ کی طرح پُرکشش۔ جیسا کل تھا آج ہے اور کل بھی ویسا ہی رہے گا۔

اختر جمال فیض کی بڑی بہن کے حوالے سے ان ہی کے الفاظ میں لکھتی ہیں۔ "بچپن سے خاموش مزاج اور حلیم الطبع تھے۔ فیض کے مزاج کا یہ حال تھا کہ جن دنوں (ان کے ابا کا) حکم تھا کہ لڑکے اگر کھانے کے وقت پر یعنی رات نو بجے تک گھر نہ آئیں تو کھانا نہ دو۔ طفیل (فیض کے بڑے بھائی) مجھ یا کسی اور کو جگا کر کھانا لیتے اور گرم کر کے کھاتے۔ چھوٹے بھائی عنایت خود باورچی خانے جا کر ڈھونڈ ڈھانڈ کر پیٹ بھر لیتے مگر فیض آتے تو نہ کسی کو جگاتے اور نہ کھانا تلاش کرتے بلکہ چپ چاپ بھوکے سو جاتے۔ مجھے اس کے مزاج پر رحم آتا اور میں پوچھتی فیض کھانا کھاؤ گے؟ جواب دیتے ہاں مل گیا تو کھا لیں گے۔" یہ گھریلو قاعدہ ہی سہی مگر اس کی پابندی اور اس کے احترام کی یہ پہلی اور لڑکپن کی مثال ان کے مزاج کا اولین عکس ہے۔

ماہرین النفس کا کہنا ہے کہ نہایت کم عمری میں مزاج کا ایک سانچہ بن جاتا ہے جس سے شخصیت تشکیل ہوتی ہے اور اس میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں ہوتی۔

فیض کی ایک ریکارڈنگ غالب لائبریری کراچی میں محفوظ ہے جس میں وہ کہتے ہیں "ہمارے گھر میں خواتین کا ایک ہجوم تھا ہم جو تین بھائی تھے ان میں ہمارے چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی خواتین سے باغی ہو کر کھیل کود میں مصروف رہتے تھے۔ ہم اکیلے ان خواتین کے ہاتھ لگے۔ اس کا کچھ نقصان بھی ہوا اور کچھ فائدہ بھی۔ فائدہ تو یہ ہوا کہ ان خواتین نے ہم کو انتہائی شریفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جس کی وجہ سے کوئی غیر مہذب یا بھدے قسم کی بات اس زمانے میں ہمارے منہ سے نہیں نکلتی تھی اب بھی نہیں نکلتی"۔ آگے چل کر کہتے ہیں "صبح ہم اپنے ابا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے (میں ایک جگہ فیض کے حوالے سے لکھ چکا ہوں کہ ان کے بھائی عنایت اور طفیل اپنے ابا کے ساتھ نہیں جایا کرتے تھے) معمول یہ تھا کہ اذان کے ساتھ ہم اٹھ بیٹھے ابا کے ساتھ مسجد گئے نماز ادا کی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے جو اپنے وقت کے بڑے فاضل تھے درسِ قرآن سنا، پھر ابا کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے سیر کے لیے گئے۔ پھر اسکول۔"

اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ فیض کو ضبط، تحمل اور ڈسپلن کی عادت ابتدائی عمر ہی سے پڑ گئی۔ آج بھی ان میں بے حساب تحمل اور ضبط ہے۔

پھر جب مشن ہائی اسکول سیالکوٹ کے طالب علم ہوئے۔ کہتے ہیں "اس زمانے میں کبھی کبھی ہم پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ جیسے یکایک آسمان کا رنگ بدل گیا ہے۔ بعض چیزیں کہیں دور چلی گئی ہیں۔ دھوپ کا رنگ اچانک حنائی ہو گیا ہے۔ پہلے جو دیکھنے میں آیا تھا اس کی صورت بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ دنیا ایک طرح کی پردۂ تصویر کے قسم کی چیز محسوس ہونے لگتی تھی۔"

فیض کی اس بیان کردہ "خاص قسم کی کیفیت" کا نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے میں تو تجزیہ نہیں کر سکتا مگر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ طالب علم فیض کے جسم میں شاعر فیض کی روح داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور یہ کیفیت اسی کوشش کا نتیجہ تھی کیونکہ ان ہی دنوں فیض نے شاعری شروع کی تھی۔ کہتے ہیں: "ان دنوں مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ ہمارے گھر سے ملی ہوئی ایک حویلی تھی جہاں سردیوں کے زمانے میں مشاعرے کیے جاتے تھے۔ سیالکوٹ میں پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی ہوا کرتے تھے جو ان مشاعروں کے انتظامات کرتے تھے۔ ایک منشی سراج دین تھے۔ سری نگر میں مہاراجہ کشمیر کے میر منشی۔ وہ صدارت کیا کرتے تھے۔ جب ہم سکول کی جماعت میں پہنچے تو ہم نے بھی تک بندی شروع کر دی اور دو ایک مشاعروں میں شعر پڑھ دیئے۔ منشی سراج دین نے [illegible]

"تم بہت تلاش سے شعر کہتے ہو مگر یہ کام چھوڑ دو ابھی تو تم پڑھو لکھو اور جب تمہارے دماغ میں پختگی آجائے تب یہ کام کرنا۔ اس وقت یہ تضیع اوقات ہے۔ ہم نے شعر کہنا ترک کر دیا۔" منشی سراج دین فیض کے والد کے دوست تھے۔ یہ فیض کی سعادت مندی تھی کہ اپنے والد کے دوست اور ایک محترم بزرگ کی نصیحت مان لی اور شاعری سے اپنا ناتہ توڑ دیا۔ شاعری کی علت میں جو گرفتار ہوا کبھی رہائی نہ پا سکا۔ یہ چسکا اگر دسویں جماعت کے طالب علم کو پڑ گیا اور اس پر منشی سراج دین جیسی شخصیت اور حیثیت کے شخص کا یہ ریمارک بطور ریم چڑھے کہ "تم بہت تلاش سے شعر کہتے ہو" تو کیا منہ سے لگی ہوئی یہ کافر عادت چھوٹ سکتی ہے؟ ان کا مخملی مزاج ملائمت کے معاملے میں مستقل ہوتا نظر آتا ہے۔

فیض کالج سیالکوٹ میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ یوسف سلیم چشتی صاحب نے جو اردو کے استاد تھے کالج میں طرحی مشاعرے شروع کیے اور فیض سے کہا تم بھی شعر لکھو۔ فیض نے لکھا، استاد نے سنا اور کہا۔ اس طرف توجہ کرو شاید تم کسی دن شاعر ہو جاؤ۔ ایک طرف منشی سراج دین کی نصیحت کہ تعلیم کے زمانے میں شاعری "تضیع اوقات" ہے دوسری طرف اردو کے استاد کا حکم کہ "اس طرف توجہ کرو" تیسری طرف شاعری کی روح کا فیض کے جسم میں داخل ہونے پر اصرار۔ فیض کی منزل کافی کٹھن تھی۔ شاعری کی کمی اور نہیں بھی کی اسی لیے بہت اچھے نمبروں سے انٹرمیڈیٹ پاس کر کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مزاج میں شدّت نہیں تھی۔ نہ اصرار کی جانب نہ انکار کی طرف۔ ایک بزرگ نے کہا شاعری چھوڑ دو تو چھوڑ دی۔ دوسرے نے کہا شعر کہو تو شعر کہنے لگے۔ کیا باغی ایسا کرتا ہے؟

فیض نے اسکول کی طالب علمی میں اپنے اشعار پر ایک تمغا اور ایک روپیہ انعام پایا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور پہنچے اور وہاں اپنے استاد صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے حکم پر ایک نظم لکھی جو اقبال پر تھی اور اقبال کی موجودگی میں سنائی جانے والی تھی۔ لکھنے کو تو نظم لکھ دی مگر بھرے مشاعرے میں یہ ہمت نہ تھی کہ اقبال کی موجودگی میں سنائے۔ صوفی صاحب نے بہت بند ھائی تو نظم سنائی داد بھی پائی اور انعام بھی۔ وہی صوفی صاحب اسی کالج کے ایک اور مشاعرے کی روداد اس طرح بیان کرتے ہیں۔ "پھر ایک نوجوان آئے۔ گورے چٹے، کشادہ جبیں، حرکات میں شیریں روانی، آنکھیں اور لب بہ یک وقت نیم تبسم میں ڈوبے ہوئے۔ شعر پڑھے۔ بڑے ڈھنگ اور تمکنت سے پڑھے۔ یہ فیض تھے۔ شاگردوں استادوں سبھی نے اپنے اپنے رنگ میں داد دی۔ شعراء میں کچھ دبے دبے اشارے ہوئے پطرس نے کچھ معنی خیز نظروں میں لاہور کے نیاز مندوں سے باتیں کیں اور ان کی نیم خاموشی کو رضا سمجھ کر دونوں نوجوانوں (حفیظ ہوشیارپوری اور فیض) کو دوبارہ اسٹیج پر بلایا۔ نیا کلام سنا۔ فیض صاحب نے غزل کے علاوہ ایک نظم بھی سنائی۔ غزل اور نظم دونوں میں سوچ کا انداز اور بیان کا اچھوتا اسلوب تھا۔ مشاعرہ ختم ہوا قرار پایا کہ احباب ان دونوں لڑکوں کو ہمراہ لے کر غریب خانے پر جمع ہوں۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ انھیں بورڈنگ پہنچنا تھا۔ (پطرس) بخاری نے ان کی غیر حاضری کا ذمّہ لیا اور پھر گھنٹہ بھر کے لئے شعر و سخن کی صحبت قائم رہی۔ یہ ان کی طبع آزمائی کا امتحان نہیں اساتذہ کی حوصلہ افزائی کا امتحان تھا۔ دونوں کامیاب رہے۔"

فیض کو اعتراف ہے کہ انھوں نے اپنی درسگاہ سے زیادہ اس وقت کے بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر بہت کچھ حاصل کیا اور وہ بزرگ پطرس، تاج، تاثیر، سالک، ہری چند اختر اور چراغ حسن حسرت جیسے نیاز مندان لاہور تھے۔ ان بزرگوں میں باغیانہ اور مفسدانہ مزاج رکھنے والا کون تھا؟ میرا خیال ہے کہ ان میں سب سے زیادہ محتاط، دور اندیش اور دانشمند پطرس تھے تحریر و تقریر میں بھی فکر اور اس کے ذکر میں بھی۔ اور وہی سب سے زیادہ فیض کے فدائی ہوئے۔ فیض اپنی اسیری کے خط نمبر ۶۸ میں لکھتے ہیں "یہ سن کر دل بہت متاثر ہوا اور بہت مطمئن بھی

کہ بانکے میاں نے تحقیق [illegible] ہے۔
مجھے شبہ تھا کہ شاید دوستی کا رشتہ ہمارے
صداقت کا بوجھ برداشت نہ کرسکے بہت
اچھا ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔ بانکے کے میاں
پطرس بخاری تھے۔ جنھوں نے آلیس فیض کو
پانچ سو روپے بطور تحفہ اس وقت بھجوائے
جب فیض سازش کے الزام میں قریباً دو
سال جیل میں گزار چکے تھے۔ کیا اقوام متحدہ
سے منسلک اعلیٰ رتبے کا عہدیدار اور بین
الاقوامی شخصیت والا پطرس بخاری سازش
کے ملزم کی بیوی کو رقم بھجوا سکتا ہے؟ کیا
مرحوم بخاری صاحب فیض کو "سازش"
میں ملوث اور ایک باغی مانتے ہوں گے؟
اور مانتے پر بھی رقمی امداد کی ہوگی؟

پطرس کا شمار برصغیر کے ان لوگوں
میں کیا جاتا ہے۔ جو نہایت بیباک تھے
ان کی فکر اور عمل میں بے مثال ہم آہنگی تھی۔
انھوں نے کبھی کوئی غلط سمجھوتہ نہیں کیا نہ
اپنی خاطر نہ دوسروں کے لیے۔ دکھاوا
اور تصنع ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔
وہی پطرس فیض کے لیے فکر مند تھے کیوں؟

فیض کے نقادوں، مضمون نگاروں
اور دوستوں نے ان کے مزاج کے تعلق سے
جو الفاظ استعمال کیے اور اوصاف گنائے
ہیں انھیں یکجا کریں تو ایک دفتر مرتب ہو جائے
مجھے یہ دفتر مرتب کرنا نہیں بلکہ صرف یہ
دیکھنا اور دکھانا ہے کہ کیا کہیں شائبہ بھی
ان کے مزاج میں بغاوت اور فتنہ و فساد
کو داخل کرنے کی کوئی گنجائش ہے کہ نہیں۔
بلکہ انھیں صلح پسند، حلیم الطبع، شائستہ
اور مہذب گردانتے ہیں۔ کچھ کا خیال
ہے کہ وہ بے مثال قوت برداشت کے
مالک تھے جس وجہ سے آزاد، امن کے
علمبردار اور انسانیت پر جان چھڑکنے
والی شخصیت ہیں۔ میں ان کے صرف چار
احباب کے خیالات نقل کروں گا۔ جن میں
دو دوست صلح پسند اور غریب طبع ہیں
اور دو اپنی فکر اور مزاج میں اشد بلکہ
کٹر ہیں۔ یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اپنے
تصفیہ کی ترازو میں تول کر دیکھیں کہ پلّہ
فیض کی بغاوت کی طرف جھکتا ہے یا
نہیں۔

سید محمد حمید گورنمنٹ کالج لاہور
میں فیض کے ہم سبق تھے ان کے ساتھ ہاسٹل
میں رہتے اور ایسے دوست تھے کہ اپنے
والد کے انتقال کی خبر صرف ان ہی کو
لکھ بھیجی اور وہ بھی محض ایک فقرہ کہ
"تمھارا فیض یتیم ہوگیا"۔ سید محمد حمید
لکھتے ہیں "فیض ٹھنڈے مزاج کے
بے حد صلح پسند آدمی ہیں۔ بات کتنی بھی
اشتعال انگیز ہو، حالات کتنے بھی ناساز
گار ہوں وہ نہ برہم ہوتے ہیں اور نہ
مایوس۔ سب کچھ تحمل اور خاموشی سے
برداشت کر لیتے ہیں۔ نہ کوئی شکوہ نہ
کسی کا گلہ، نہ چڑچڑاہٹ، نہ بدگوئی
میں نے فیض کو نہ کبھی طیش میں دیکھا
ہے اور نہ کبھی کسی کا شکوہ شکایت کرتے
سنا ہے۔"

خدیجہ بیگم علی گڑھ کے "نیلا چھتری"
والے ظفر عمر مرحوم کی صاحبزادی اور فیض
کی دوست ہیں لکھتی ہیں۔ "فیض صاحب
کی امن پسند طبیعت اور صلح آمیز مزاج دیکھ
کر اور پُرسکون باتیں سُن کر میں حیران ہوتی
ہوں کہ یہ ترقی پسند باغی شاعر تو کسی طرح
بھی نہیں ہو سکتا۔ جو شخص دوست سے
زبانی اختلاف تک سے گریز کرتا ہے سماج
اور نظام سے کس طرح ٹکر لے سکتا ہے؟"

سبطِ حسن سماج اور سیاست ہی نہیں
اپنی اور دوسروں کی زندگی کے معاملات میں بھی
اشد خیالات رکھتے ہیں۔ سبط حسن جیسا
کافر کبھی مسلمان نہیں ہوگا۔ قیدیوں کے نام
آنے والے اور دوسروں کو قیدیوں کی طرف
سے لکھے جانے والے خطوط کے سلسلے میں
لکھتے ہیں "ہمارے ملک میں سیاسی قیدیوں
کے اظہارِ خیال پر کڑی نگرانی ہوتی ہے...
.... جیل میں ان سے یا دوسرے عام قیدیوں
سے جو سلوک ہوتا ہے خطوں میں اس کا تذکرہ
بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان احکام کی تعمیل کے
لیے دو محتسب مقرر ہوتے ہیں۔ اول جیل کا
عملہ، دوسرے سی آئی ڈی کے حکام۔ یہ محتسب
حضرات سیاسی قیدیوں کی خط و کتابت کو
بڑے غور سے پڑھتے ہیں اور قابلِ اعتراض
فقروں کو کاٹ دیتے ہیں..... حیرت تو
اس بات پر ہوتی ہے کہ ان پابندیوں کے

باوجود فیض صاحب نے اسیری کے دنوں میں اتنے اچھے خط کیسے لکھ لیے جب کہ راولپنڈی سازش کیس کی ننگی تلوار ہر وقت ان کے سر پر لٹکتی رہتی تھی۔۔۔۔ وہ جیل کی صعوبتوں کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں گویا وہ بھی محبوب کی ادائیں ہیں۔۔۔۔ اس ذہنی کیفیت کا باعث وہ مسلکِ حیات ہے جسے فیض صاحب نے بڑے غور و فکر کے بعد اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ان کا ایمان ہے کہ جس طرح رات کے بعد دن نکلتا ہے اور خزاں کے بعد بہار آتی ہے اسی طرح آج نہیں تو کل ظلم کے بعد انصاف، باطل کے بعد حق اور کذب کے بعد صداقت کی صبح ضرور طلوع ہوگی۔"

فیض کی اسیری کے خطوط (صلیبیں مرے دریچے میں) ملاحظہ فرمایئے اور تصفیہ کیجیے کہ ایک قیدی کس طرح قید و بند کی صعوبتوں کو بھلا کر اس طرح خوش فکر رہ سکتا ہے فیض کے مزاج کا تجزیہ کرنے کے لئے ان کے یہ خطوط کافی ہیں۔

سجاد ظہیر کٹر کمیونسٹ تھے۔ کمیونسٹ کے عقائد میں رعایت اور نمائش شامل نہیں ہوتی وہ کھرا بھی ہوتا ہے اور کھرا بھی۔ حیدرآباد سندھ کے جیل میں فیض اور دوسرے "ملزمین" کے خلاف سماعت کرنے والی عدالت کے باب میں لکھتے ہیں۔ "ہم وکیل سرکار کی بحث اور جرح اور صفائی کے وکیلوں کا جواب سیکڑوں گواہوں کی گواہیاں یہ سب سنتے رہتے تھے عام طور پر یہ چند گھنٹے نہایت بورنگ ہوتے تھے۔ ملزموں کے کٹہرے میں۔۔۔۔ دوسری یا آخری صف کے بائیں سرے پر میں اور فیض پاس پاس بیٹھے سرگوشیاں کرتے رہتے اور سامنے پڑی ہوئی کاپی پر کارٹون بناتے کبھی گواہوں کی شہادت پر اپنے نوٹ لیتے ہم تعزیراتِ پاکستان کی بے شمار دفعات میں ماخوذ تھے جن میں سب سے سنگین فوجی بغاوت کے ذریعہ حکومتِ پاکستان کا تختہ الٹنے کی سازش اور فوجی بغاوت پھیلانے کا الزام تھا جس کی سزا موت تھی۔ ہمیں اس وقت ہنسی آتی تھی جب ہمارے خلاف جھوٹی گواہیاں پیش ہوتی تھیں۔ سب سے زیادہ تکلیف ہمیں اس وقت ہوتی تھی جب ہم پر غداری یا وطن دشمنی کا الزام لگایا جاتا تھا۔۔۔۔"

فیض کے مزاج کی بابت ان کے بچپن سے لے کر زیرِ بحث اسیری تک کے دنوں کی معتبر اور مستند رائیں دینے کے بعد اب ان کی شاعری کے پس منظر میں مختصر جائزہ پیش کروں گا۔ فیض کی شاعری میں بے پناہ تنوع ہے اور متنوع موضوعات پر پس منظر بیان کیے بغیر نتیجہ خیز گفتگو نہیں کی جا سکتی۔

نقشِ فریادی سے سروادیٔ سینا تک کے پانچوں مجموعوں میں (۱۰۸) نظمیں (۶۴) غزلیں اور (۳۲) قطعات ہیں۔ ان کا شعری سفر ۱۹۷۸ء میں اپنی چھٹی منزل میں داخل ہوگا۔ لیلےٰ اور لیلائے وطن دونوں ان کے ہم سفر رہ چکے ہیں۔ اپنی نظموں میں ایران میں طلبے ہیں اور افریقہ میں بھی سپاہی کا مرثیہ لکھتے ہیں اور سیاسی لیڈر سے ہمکلام ہوتے ہیں، بھائی اور دوست کا مرثیہ کہتے ہیں، اپنی گلیوں کے نثار ہوتے ہیں اور تاریک راہوں میں مارے جاتے ہیں۔

ان گلیوں اور تاریک راہوں میں اس شاعر کو تلاش کرنا ہے جسے باغی اور غدار قرار دیا گیا ہے۔ میں اس تلاش میں شاعر کے مسلک اور اظہارِ مسلک سے بحث کروں گا اور اسے دستِ صبا سے شروع کروں گا کیونکہ نقشِ فریادی آزادی سے پہلے کا اور دستِ صبا فیض کی قید و بند کا اولین مجموعہ ہے۔ گو اس میں کئی برس پہلے کا کلام بھی شامل ہے جیسے سیاسی لیڈر کے نام۔

فیض کے مسلک کا اہم ترین جزو محبت ہے۔ محبت چاہے کسی سے کی جائے۔ اس کے مقابلے میں نفرت منفی عمل ہے۔ فیض کا پورا کلام پڑھ لیجئے نظم بڑی بات ہے فیض کے کسی مصرعے یا شعری ترکیب میں بھی نفرت کا کوئی عنصر نہیں ملے گا بلکہ "نفرت" اور اس سے قریب تر مفہوم کے الفاظ کے استعمال کے لیے دستِ صبا میں ایک درجن کے قریب نظمیں ہیں۔ فیض کی جگہ کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو ان نظموں میں اس کا لہجہ درشت اور الفاظ کرخت ہوتے۔ شورشِ بربط و نے، طوق و دار

کا موسم، سرِ مقتل، ترانہ، دو عشق، شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، زنداں کی ایک شام اور زنداں کی ایک صبح ایسی تخلیقات ہیں اور ایسے ماحول میں ظہور پذیر ہوئی ہیں کہ اگر فیض کا مزاج مختلف ہوتا تو غالب جیسے عظیم شاعر کی تتبع اور تقلید میں وہ بھی سوزشِ دل سے سخن گرم "لکھتے۔ تا رکھ سکے نہ کوئی مرے حرف پہ انگشت۔ مگر ان کے مزاج نے انھیں" سفاک مسیحا" کوئے ملامت" "اہلِ ہوس" جیسی تراکیب سے زیادہ سخت لکھنے نہیں دیا۔ نفرت کا لفظ تک فیض نے استعمال نہیں کیا۔

زنداں نامہ میں کچھ کلام مقدمہ کی سماعت کے زمانے میں اور کچھ سزا پانے کے بعد لکھا گیا ہے۔ اس کی چند نظموں میں بھی تلخی و تندی غیر متوقع نہ تھی مگر یہاں بھی فیض "ظلم پرست" بیدادگروں کی بستی" "ستم کشو" وغیرہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے اور محبت کا راگ اپنے مسلک کے حسین و خوبصورت سُروں میں الاپتے ہیں حالانکہ "ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن" یا "شام فراق نہ اب نہ پوچھ" جیسی صدائیں لگاتے وقت لوح و قلم کو سنبھالے رکھنا سوائے مزاج کے معجزے کے اور کچھ نہیں۔

دستِ تہ سنگ کا کچھ کلام بھی قید و بند کا تحفہ ہے۔ دورِ ایوبی کے مارشل لا میں تاشقند کانفرنس میں شرکت

نہ حصہ لیا اور نہ مارشل لا کے اٹھ جانے کے بعد روس میں یا وہاں سے وطن لوٹنے پر کوئی

کے بعد وطن لوٹتے تو بلا وجہ گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیے گئے جہاں "شورشِ زنجیر بسم اللہ" "آج بازار میں پابجولاں چلو" "یہ جفائے غم کا چارہ وہ نجات دل کا عالم" "قید تنہائی" جیسی چیزیں لکھیں۔ ان کا ایک ایک لفظ فیض کے مزاج کا عکاس ہے۔ نفرت کا دور دور تک نشان نہیں ملتا۔

فیض سرکاری طور پر تاشقند کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے بھیجے گئے روس میں تھے کہ ایوب خاں والا مارشل لا لگا۔ نہ پہلے سیاست میں کوئی بیان دیا یا سیاست میں دخل دیا مگر پکڑ لیے گئے۔ ایسی صورتِ حال ہو تو اپنی بے وجہ گرفتاری پر کون سا افروختہ نہیں ہوگا؟ شاعر تو ان حالات میں اپنے شعر کے ذریعے لاوا اگل دے مگر اس زمانے کے شعر پڑھ کر سوچئے کہ فیض نے باغیانہ خیالات و جذبات کا اظہار کیوں نہیں کیا؟

سرِ وادیٔ سینا کی صرف تین تخلیقات کے حوالے دوں گا جو ایوب خاں کی آمریت کے عروج میں پیش کی گئیں "انتساب" "لہو کا سراغ" اور زنداں زنداں شور انا الحق" والا قطعہ۔ انھیں پڑھیے آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ فیض کی پوری شاعری، نفرت، کدورت اور غیظ و غضب سے پاک ہے۔ میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ ان کے پاس کوئی منفی عمل نہیں ہے اور جہاں وہ کذب و کدورت کی نفی کرتے ہیں وہاں بھی ان کا رویہ فسادیوں جیسا نہیں بلکہ ایک طرح سے فرشتوں جیسا ہے۔

اب آئیے مثبت عمل یعنی محبت کی طرف۔ لیلائے سخن نہیں بلکہ لیلائے وطن سے فیض کی محبت میرا موضوع ہے کیونکہ یہاں دیکھنا تو یہ ہے کہ فیض کے مسلک اور فکر میں وطن سے والہانہ محبت ہے یا "غداری" اور "بغاوت" کے وہ عناصر ہیں جن کی بناء پر انھیں پابندِ سلاسل کیا گیا۔ فیض کا مسلک ان کے اپنے نہایت واضح الفاظ میں یہ ہے۔

"مجھے یقین ہے کہ انسانیت
جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی
ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے
گی اور آخر کار جنگ و نفرت اور
ظلم و کدورت کے بجائے ہماری
باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی
جس کی تلقین اب سے پہلے فارس کا
شاعر حافظ نے کی تھی" ۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

ایک خاص حلقے میں فیض کی ایک نظم پر سب سے زیادہ اعتراضات کیے گئے ہیں۔ اس کا پہلا بند ملاحظہ ہو۔

صبحِ آزادی اگست ۱۹۴۷ء

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

ہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
لے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
لک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
ہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
ہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل

سرسری طور رہی سے سہی مگر متذکرہ منذر" خاص حلقے" کی وضاحت اور تشریح ضروری ہے۔ اس حلقے میں وہ لوگ شامل تھے اور آج بھی ہیں جو اقتدار کے بھوکے ہیں۔ جن کا ایمان استحصال ہے۔ سرمایہ داروں اور سامراجیوں کے ایجنٹ، ہوس کے پجاری، دولت کے دیوتا اور کرسی نشینوں کے حاشیہ بردار ہیں۔ آزادی کے وقت اور آزادی کے بعد سیاسی، سماجی اور معاشی ہلڑبازی ہوئی۔ فیض کے معترضین اور مخالفین نے یا تو اُسے محسوس نہیں کیا یا عمداً اپنی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر بیٹھ گئے۔ یہ سارے ہلڑباز اُسے آزادی کا انعام سمجھتے تھے۔ قتل کیا تو بھول گئے کہ خود وہ بھی قتل ہوسکتے تھے۔ بہو بیٹیوں کی آبروریزی کی تو اپنی بہو بیٹیوں کو یاد نہ رکھا۔ گھر جلایا اور سمجھا اپنا گھر محفوظ ہے، حق غصب کیا اور سمجھتے رہے کہ کوئی اور غاصب پیدا نہیں ہوگا ہر قسم کی افراتفری کے کھلاڑی آنکھ مچولی میں مصروف تھے۔ بعض تماشائی چپ سادھ کر بیٹھ گئے یا ان میں طرزِ تغافل کے خلاف عرضِ تمنا کی ہمت نہ تھی۔

شعلوں میں لپٹے ہوئے لاہور سے گزر کر فیض پاکستان ٹائمز کے کارٹونسٹ انور کی تلاش میں لدھیانے گئے۔ انور کے الفاظ میں "وہاں گولیاں اور بم بارش کی طرح برس رہے تھے۔ لیکن میں دبکا رہا۔ فیض لدھیانے کے مہاجر کیمپوں میں خاک چھانتا رہا۔ لاشیں پہچانتا رہا۔ تین چار روز کے بعد لاہور لوٹا تو میری میز پہ پندرہ بیس تصویریں رکھ کر چلا گیا۔ بغیر ایک لفظ کہے۔ منہ اس کا ہلکا اس کے گھٹنوں سے لگ رہا تھا اور رنگ بھی اس کا ہلدی جیسا تھا۔۔ سب سے نچلی تصویر ایک لاش کی تھی۔ میرے بچپن کے دوست کا لے کی"۔

پاکستان ٹائمز کے مشہورِ زمانہ کارٹون کے کردار "ننھا" کا خالق انور ۱۹۴۷ء میں بہت کم اہمیت کا حامل کارٹونسٹ تھا عین فسادات کے زمانے میں لاہور سے نکلنا، لدھیانے جانا، مہاجر کیمپوں میں انور کو تلاش کرنا۔ خاک و خون میں لتھڑی ہوئی لاشوں کو دیکھنا کوئی معمولی تجربہ اور مشاہدہ تھا؟ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سے

جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں

ان حالات میں شاعر کس طرح اس آزادی کو انعام اور اس ارض کو ارضِ جنت قرار دیتا۔ معترضین یہ کیوں بھلا دیتے ہیں کہ شاعر نے یہ تو نہیں کہا کہ آزادی کیوں لی۔ وہ تو خود آزادی کا متوالا ہے۔ اس نے تو صرف شریفانہ اور شاعرانہ شکایت کی ہے کہ ؎

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی

معاشرے کی کسی خرابی کی شکایت ہر انسان کا بنیادی حق اور ادیب و شاعر کا تو فرض ہے۔ اگر شاعری سے فرض کے اس عنصر کو حذف کر کے دیکھیں تو جگہ جگہ خلا نظر آئے گا۔ ہر زبان اور ہر عہد کے شاعروں نے اس کے ذریعے انسانوں کو ان کے حقوق دلوائے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ فیض نے تیس ۳۰ سال پہلے جو شکوہ کیا تھا کیا وہ دور ہوگیا یا جوں کا توں باقی ہے اور اس میں اضافہ ہو رہا ہے؟ شاعرانہ تمام کیفیات اور مایوسیوں کے باوجود جو نظم میں بیان کی ہیں کہتا ہے ؎

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

مخالفین کس بے ایمانی کے ساتھ بھلا دیتے ہیں کہ شاعر وقت کو پیچھے کی طرف نہیں لوٹا رہا ہے بلکہ وہ تو منزل کا یقین رکھتا ہے اور اسی یقین کے باعث کہتا ہے "چلے چلو" منزل کی طرف جو کہ ابھی نہیں آئی مگر موجود ہے محبت اگر اندھی ہوگی تو سچی نہیں ہوگی اپنے دیس کے گھٹاٹوپ اندھیرے کو بقعۂ نور قرار دینا دوستی نہیں دشمنی ہے۔ اس نظم پر مخالفت کا چھوٹا موٹا طوفان اٹھا مگر اسی موضوع پر پانچ سال بعد فیض نے پھر لکھا اور اسی وقت

...وہ سوئے دار لے جائے جا چکے تھے۔ یہ تکرار فیض کی صداقتِ فکر کی دلیل ہے

اگست ۱۹۵۲ء

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے رہِ چمن میں غزلخواں ہوئے تو ہیں
ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پرافشاں ہوئے تو ہیں
ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

پہلی نظم میں داغ داغ اُجالا، شب گزیدہ سحر، فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل، فراقِ ظلمت و نور، نشاطِ وصل حلال، عذابِ ہجر حرام اور نجاتِ دیدہ و دل جیسی تراکیب کے کیف و اثر نے متذکرہ ہوس پرستوں اور اقتدار کے دقیانوس دونوں کو نہ صرف ہلا کر رکھ دیا بلکہ اگلے پانچ برس کی مدّت میں پیدا ہونے والے اصحابِ کہف نے محسوس کیا اور کہا ؎

ہاں کج کرو کلاہ کو کہ سب کچھ لُٹا کے ہم
اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں
اہلِ قفس کی صبحِ چمن میں کھُلے گی آنکھ
بادِ صبا سے وعدہ و پیماں ہوئے تو ہیں
ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پا سے فیضؔ
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

یہ پانچ برس بھی ہر قسم کے شر اور شرارت اور سیاسی، سماجی اور معاشی خون خرابے کے تجربات و مشاہدات میں گزر گئے۔ اہلِ دل کو بصیرت ملی ان کے دیدے روشن اور دل کشادہ ہوئے۔ عقل نے اُس منزل کی نشاندہی کی جس کی بابت پہلی نظم میں شاعر نے "چلے چلو" لکھا تھا اب نہ صرف پہلی نظم اپنی پوری کیفیت کے ساتھ زیادہ متاثر کرنے لگی بلکہ دوسری نظم نے بھی جو قیدی شاعر نے لکھی تھی بے پناہ داد پائی۔

تین سال بعد شاعر نے پھر وہی راگ چھیڑا مگر اس بار سُر الگ تھے، تاروں کی جھنجھلاہٹ مختلف تھی۔ ۱۹۵۲ء میں اُس نے کہا تھا گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں، مگر تین سال بعد کہتا ہے۔

اگست ۱۹۵۵ء

شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے
دل دُکھا ہے نہ وہ پہلا سا نہ جاں تڑپی ہے
ہم ہی غافل تھے کہ آئی نہیں عید اب کے

شاعر کو غم ہے کہ غم والوں نے حسرتِ دل کی تمہید نہیں باندھی، لیلائے وطن کی آنکھوں نے نہ چاند دیکھا نہ ہونٹوں پہ شفق اور اس لیلیٰ کی دید شب غم سے ملتی جلتی دکھائی دی۔ وہ بے چین اور بے کیف ہے اور یاد دلاتا ہے کہ دیکھو ؎

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لاکے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

میرا مقصد کسی کی تحقیر نہیں بلکہ محض تجزیہ ہے۔ فیض تو قبر کی منزل برس ہا برس پہلے طے کر کے بہت آگے چلے گئے ہیں۔ ان کی تیس سال پرانی نظم "یہ داغ داغ اُجالا" آج بھی اتنی ہی اثر انگیز ہے جتنی پہلے تھی۔ اسی موضوع پر بعد کی دو نظموں کا نشہ بھی اسی طرح سرشار ہے۔ یہ نظمیں اور ان کے مقابلے میں، حالانکہ مقابلہ کا کوئی سوال نہیں، وہ نظمیں اور نغمے جو ساز و آواز کے بل بوتے پر اور دلکش دھنوں کی بیساکھیوں کے سہارے ریڈیو اور ٹی وی پر ہزاروں بار نشر کیے اور کرائے گئے ہیں، صاحبانِ بصیرت کی محفلوں میں ایک ساتھ ان کے شاعروں کی زبانی سن لیجئے، سنوا دیجئے کھرے کھوٹے کا امتحان ہو جائے گا کہ داد و بیداد کے پروانے کدھر جاتے ہیں۔ یہ امتحان "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" والا امتحان ہی نہیں بلکہ شاعری اور صناعی کے درمیان خطِ فاصل بھی کھینچتا ہے۔ میرے نزدیک محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ فرسودہ بلکہ بیہودہ مقولہ ہے۔ محبت میں غلو چاہے ارضِ وطن سے ہو یا اولاد سے عقل پر غالب آنے کے مترادف ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ اپنی ارضِ پاک اور اولاد کی خامیوں کو خوبیاں قرار دے کر آپ دوستی نہیں دشمنی کریں گے۔

۱۹۵۲ء میں مولانا چراغ حسن حسرت کے ایک خط کے جواب میں فیض لکھتے ہیں۔

کے دن آپ نے لاہور کی طرف رُخ کر کے
نکلنے کو کہا ہے۔ یہاں تو عید شب برات
نہیں مستقل یہی کیفیت رہتی ہے۔ اس
لہار میں ایک شعر کہا ہے ؎

ہے یادِ حریفانِ بادہ پیما کی
ب کو چاند نہ نکلا نہ دن کو ابر گئے

اسی تخلیق کا ایک اور خوبصورت
ملاحظہ ہو جس میں شاعر کے محبت بھرے
دھڑکن ہے۔ ؎

سیلِ نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دستک دی
قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

شہر اور وطن کے سلسلے میں بھی شن
کر اگست ۱۹۵۲ء والی نظم "روشن کہیں
کے امکان ہوئے تو ہیں" حیدرآباد
سے آلیس فیض کو بھیجنے کے فوری بعد
بز (۱۹۵۴) بھی لکھا جس میں کہتے ہیں
ل (یعنی ۱۴ اگست) کو یہاں کے منظر میں
انقلاب دیکھنے میں آیا۔ جیل کے درواز
سرخ، سبز اور نیلی بتیوں کی لڑیاں روشن
ئیں اور چار لاؤڈ اسپیکروں نے اپنی
شی ہوئی اور بے سُری آوازوں میں ریڈیو
نغمے شروع کیے۔ رنگ اور بتیاں اور
غل یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم حیدرآباد
میں نہیں بلکہ انارکلی بازار میں ہیں۔
آنکھ کھلی تو دل میں عجیب طرح کی خوشی
س ہوئی اور میں نے اسی وقت بیٹھ کر
لکھنا شروع کیا جو اس خط کے ساتھ بھیج
رہا ہوں۔ مجھے انتہائی تعجب ہے کہ لکھنے
میں کچھ وقت ہی نہ لگا اور ناشتے کے وقت
تک میں اسے قریب قریب ختم کر چکا تھا
ابھی تک اس کا نشہ موجود ہے" اور وہ
نظم ہے:

نثار میں تیری گلیوں کے.....

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد
بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کیلئے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں
بُجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام و سحر میں رہتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں رہتے ہیں
یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ کے پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے
گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

اس کیف آور نظم کے بارے میں مختصراً یہی کہوں گا کہ یہ محبت کے انمول موتیوں کی مالا ہے اس کی آب و تاب اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک عہدِ وفا استوار رکھا جائے گا مگر استواری کے لیے وطن کے فراق میں صبح و شام کرنے ہوں گے گرفتِ سایۂ دیوار میں جینا ہوگا۔ ریڈیو اور ٹی وی کے نغموں سے اپنا نام تو ہو سکتا ہے وطن کا نہیں اخباری بیان سے یہ بات بنے یا نہ بنے اثر نہیں کر سکتی۔ کالم سے اپنی ہوس اور اخبار کا پیٹ تو بھر سکتا ہے۔ وطن کی وہ خدمت نہیں ہوتی جس کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے ایسے محبت نامے کے لیے پہلے خونِ جگر چاہیے اور اس کے بعد قلم کی روشنائی۔ دل کی دھڑکن چاہیے طبلے کی تھاپ نہیں۔

اسی سلسلے کی ایک اور نظم ہے جو ۲۸ مارچ اور ۱۵ اپریل ۱۹۵۴ء کے درمیانی وقفے میں لاہور جیل اور منٹگمری (ساہیوال) جیل میں کہی گئی تھی۔ فکر اور فکر مندی میں ڈوب کر صرف فیض جیسا شاعر ہی کہہ سکتا ہے

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

استاتذۂ سخن کی اصلاحیں

سید مجاور حسین تمنا

شعر: صبر لکھنوی

یا آہی جس پہ میں دیتا ہوں جان
وہ چہرہ اب مجھ سے کتنی دور ہے

اصلاح:

بند آنکھیں ہیں تو بتلائے کوئی
وہ چھری گردن سے کتنی دور ہے

مصرع اولیٰ میں بند آنکھوں کا ذکر ضروری تھا کیونکہ مصرع ثانی میں جو استفہام ہے وہ بغیر اس کے ادا نہ ہوتا تھا۔ "گردن سے" یہ ٹکڑا بھی خوب بنایا کیونکہ چھری کا تعلق گردن ہی سے تھا۔

شعر:۔

یہ سے داغ دل کو کب ہے وہ نصیب
صبح کے تارے میں جتنا نور ہے

اصلاح:۔

کھینچ لے اس کو بھی داغ جذب دل
صبح کے تارے میں جتنا نور ہے

صبر کا مصرع اولیٰ مذاق شاعری کے برعکس تھا اسی وجہ سے مصرع بدلا گیا اس اصلاح سے عاشق کے دل کی کشش اور شوق کا ثابت ہو گیا۔

شعر:۔

میری کشتی غرق ہوتے جب نظر آئی اسے
دیر تک ہاتھوں سے دل تھامے رہا ساحل کے پاس

اصلاح:۔

ٹوٹ کر مجھ سے حبابوں نے نہ جانے کیا کہا
دیر تک ہاتھوں سے دل تھامے رہا ساحل کے پاس

صبر کا پہلا مصرع مہمل سا تھا۔ نہ کشتی آب نہ کشتی دل نہ کشتی عمر کسی کا پتہ نہ چلتا تھا اس لئے مصرع بدل دیا گیا جس سے مصرعۂ ثانی کا مفہوم ادا ہو گیا۔

شعر:۔

کسی کی دید نے ایسا کیا ہے مضطرب اس کو
کہ لہریں آرہی ہیں آج آئینہ کے پانی میں

اصلاح:۔

نہ جانے پھر رہا ہے عکس کس کی زلف پر خم کا
کہ لہریں آرہی ہیں آج آئینہ کے پانی میں

زلف پر خم کے عکس سے لہروں کی پوری تشبیہ بھی ہو گئی اور شعر بھی سلجھ گیا

شعر:۔

قفس سے دیکھتا ہوں سیر اپنے آشیانے کی
اڑے جگنو تو سمجھوں چاند اک نکلا نشیمن سے

اصلاح:۔

مجھے حسب ہے ہر چیز اپنے آشیانے کی
اڑے جگنو تو سمجھوں چاند اک نکلا نشیمن سے

ایک لفظ مرغوب سے جگنو چاند بن گیا

شعر:۔ شاغل لکھنوی

یہ کہہ کر میں نے دونوں ہاتھ رکھے اپنی آنکھوں پہ
کہ اب مشکل ہے اس شب کی قیامت تک سحر ہونا

اصلاح:۔

یہ کہہ کر میں نے آخر بند کر لیں شام غم آنکھیں
کہ اب مشکل ہے اس شب کی قیامت تک سحر ہونا

"بند کر لیں آنکھیں" اس ٹکڑے نے نیند اور موت دونوں کے معنی دیئے ہیں اور آخر کا لفظ بھی خوب ہے۔

شعر:۔

صنعت بتوں کی دیکھ کر آئی خدا کی یاد
ثابت قدم رہا تو خدا نے بچا لیا

اصلاح:۔

صنعت بتوں کی دیکھ کے آئی خدا کی یاد
گرنے سے مجھ کو لغزش پا نے بچا لیا

اصل شعر کے دونوں مصرعوں میں خدا کی تکرار تھی اور پھر مصرعوں میں ربط بھی نہ تھا اس لئے یہ مصرع خوب بنایا۔ اب شعر عمدہ ہو گیا۔

آئندہ اصلاحیں
صفدر علی صفدر مرزاپوری

غزلیں

جرم محمد آبادی

دنیا ہو کیوں نہ واقف راز غم نہاں سے
فریاد کر رہا ہوں میں وقت کی زباں سے

وہ بھی تھا ختم ، جو کچھ تھا ربطِ گلستاں سے
تنکے گرے قفس پر جس وقت آشیاں سے

لاکھوں ابھی بلائیں آئیں گی آسماں سے
گلشن کے رہنے والو ہشیار گلستاں سے

اُن کی عنایتوں سے ہم بے خبر نہیں ہیں
سب جانتے ہیں لیکن کہتے نہیں زباں سے

دھمکی سے کیا دبے گا طوفانِ سرفروشی
بڑھتی ہے دل کی ہمت اعلانِ امتحاں سے

کہنے کو ہمسفر ہوں لیکن ہوں بے تعلق
رہ کے بھی ساتھ کوسوں آگے ہوں کارواں سے

وہ سن کے حالتِ دل اس غور میں پڑے ہیں
بے کیف داستاں میں جان آگئی کہاں سے

دیوانگیٔ دل تک جب داستان پہونچی
تیرا ہی نام نکلا بے ساختہ زباں سے

کیف داثر میں ہرگز کوئی کمی نہ ہوگی
افسانۂ محبت چاہے سنو جہاں سے

تسکین جس نے دی تھی دل بھی اسی نے توڑا
ساحل وہیں تھا پہلے طوفاں اٹھا جہاں سے

اے جرم اہلِ فن سے خالی نہیں ہے دنیا
نکلیں گے لاکھوں یوسف ایک ایک کارواں سے

ناصر کرنولی

پتھر کو راستے سے ہٹا دینا چاہیئے
چاہت فریب ہو تو ہٹا دینا چاہیئے

توہین ضبطِ غم کی علامت ہے چشمِ نم
کم ظرف آنسوؤں کو بہا دینا چاہیئے

وابستہ ہوس ہیں محبت کے نام پر
اندھی رفاقتوں کو دُعا دینا چاہیئے

کاسہ بدست آیا ہے اخلاصِ رہزنی
سرمایہ زندگی کا لٹا دینا چاہیئے

کچھ اور بڑھ گیا ہے تری یاد کا خلوص
سوچا ہے جب بھی تجھ کو بھلا دینا چاہیئے

جلنے کا آندھیوں میں جسے حوصلہ نہیں
ایسا ہر اک چراغ بجھا دینا چاہیئے

شرمندہ ہو نہ جائے کہیں چہرۂ وفا
آئینہ سامنے سے ہٹا دینا چاہیئے

منزل پہ پھر نصیب کہاں لذتِ سفر
قربت کے فاصلوں کو بڑھا دینا چاہیئے

بنیاد ختم ہو گئی صدیوں کے پیار کی
اک لمحہ 'انا' کو دُعا دینا چاہیئے

پابندِ وقت اور محبت کے حوصلے!
فرسودہ ہر رواج اُٹھا دینا چاہیئے

ملتے ہو اپنے آپ سے بھی اجنبی کی طرح
ناصر تکلفات اُٹھا دینا چاہیئے

رؤف خیر

جس روپ میں بھی چاہے تماشہ گرو رہو
اتنا ہو اپنے ہونے کی پہچان تو رہو

بے خواب آسماں کا سفر بھی سرشت ہے
دم بھر خمارِ خواب غنیمت ہے ، سو رہو

قاتل ہوں یا خضر ہوں کھلے گا یہ کس طرح
اے بدگمان لوگو مرے ساتھ تو رہو

ہر کشتِ جاں تو دانۂ گندم پسند ہے
کاٹو گے رات گر کوئی سورج بھی بو رہو

اپنا تو یہ اصول ہے اے خوفِ رائگاں
جب پار اُتر چکے ہو تو کشتی ڈبو رہو

مجھ سے گزر کے جاؤ اگر اختیار ہے
یا میرے ساتھ ساتھ مرے ہمسفر رہو

تعمیر آسماں کے لئے اس زمین پر
یوں جی ابھی بُرا نہ کرو بے گھرو رہو

دھندلا نہیں ہے کوئی بھی منظر رؤف خیر
بس اتنی شرط ہے کہ نہ آنکھیں بھگو رہو

چیک شاعر MIROSLAV HOLAB کی نظم کا ترجمہ

"نذر"

ڈاکٹر غیاث صدیقی

گیانی دنیا پھر سے گونج رہی تھی
جیسے بُلبُل کی چُنڈھیا
اور اس کے پیچھے
جل سانپ کی چکنی کھال کی مانند
دھرتی گویا رینگ رہی تھی
گھر کے باہر اندھیارے کی "ٹک ٹک"
صاف سنی جاتی ہے
ایسے میں
آکاش سے کالے آنسو کا قطرہ ٹپکے ہے
اعلان کرے ہے "میں بھی ایک قیامت ہوں"
چاندنی رات ایک ایسی پُستک تھی
جس کے صفحات
لفظوں کو نگل کر سفید ہو گئے تھے
اک کُتّا
پانی میں سے اپنا عکس
اپنے جبڑوں میں پکڑ کر بھاگے ہے

اور امن
آئینے کی سطح سمان
اٹل بھی تھا، پرسکون بھی تھا
آنکھ کی پُتلی سے اک چیخ
'ہاں' جیسی نکل پڑی
جیسے کروکشتر میں پانڈو معصوم پُتر کی آواز
بجھ گئی
"ہم کو لہو دو، ہم آزادی دیں گے"
یہی شبد سب ذہنوں میں افکار بن گئے
یہ وہی ویر تھا
جس نے وطن کو آزادی سے ہم کنار کیا
تم سمجھے دنیا میں اسی کا نام ہے سُکھ
لیکن یہ تو
خالی کمرے میں فون کی گھنٹی کی ہے گونج
ٹیلی فون کی گونج کو
"سُکھ" سمجھ لینے والی دنیا کی نذر کرنے کو
میں یہ نظم کہی ہے

٭٭

سعید بن محمد نقش

یادوں کا کینسر

ہری، لال
نیلی، پیلی
کتنی صدیاں گذار دیں تم نے
سچ کا کوئی رنگ نہیں ہوتا
سازِ حیات پہ
مضرابِ انا سے
اتنی شدید ضربیں کیوں لگا رہی ہو

سرخ چنگاریاں
آواز کا پیرہن بنتی جا رہی ہیں
اور ٹوٹا ہوا تار
تمہارے گھر کا گیٹ بن چکا ہے
بوسیدہ دیوار کے کالے کالے شگاف
تمہاری یادوں کا کینسر بن چکے ہیں

٭

غزلیں

اثر غوری

یہ درد سینے میں چندن دکھائی دیتا ہے
میرا وجود ہی دشمن دکھائی دیتا ہے

وہ رام کون سے چہروں کی تہہ میں بیٹھا ہے
ہر ایک شخص تو راون دکھائی دیتا ہے

یہ کارخانے۔ پراجکٹ یہ حسین چہرے
یہ شہر نور کا مسکن دکھائی دیتا ہے

رگوں میں زہر غم روزگار بہتا ہے
مرض یہ آج تو کامن دکھائی دیتا ہے

نہ کوئی شور نہ کھڑکی نہ نام کی تختی
خود اپنا گھر مجھے مدفن دکھائی دیتا ہے

بدن میں ایسے جراثیم ہیں کہ خود مجھ سے
میرا ضمیر بھی بدظن دکھائی دیتا ہے

بکھر گیا میرا شیرازۂ حیات اثر
خیال یار ہی رہزن دکھائی دیتا ہے

جمیل سحر (بمبئی)

سراپا جستجو ہے آج تک عمر رواں میری
طلب کی راہ میں کام آئی سعیِ رائگاں میری

فرازِ دار پر شاید اناالحق کہنے والا تھا
غنا نیت نے لیکن روک دی بڑھ کر زباں میری

سکوں ناآشنا ہے سبزۂ بیگانہ گلشن کا
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

لکیریں دیکھ کر حالات کی قرطاسِ عالم پر
ادا میں نے کیا مفہوم کھلتے ہی زباں میری

سکوتِ شب میں کس کو ڈھونڈتی رہتی ہے تاریکی
نہ میں ہوں راز داں اس کا نہ وہ ہے راز داں میری

پر پروانہ طائر جب بھی تھک کر پھڑپھڑاتے ہیں
قفس کی تیلیوں سے گونجتی ہے داستاں میری

سحر ممکن ہے مل جائے گناہِ عشق کی فرصت
اگر دھوکا نہ دے جائے مجھے عمر رواں میری

جگن ناتھ گوہر کیفی (بمبئی)

حیات اور بھی ہے اس رہِ حیات کے بعد
ملے گی منزلِ مقصود مشکلات کے بعد

نہیں نہیں تھی زباں پہ ہر ایک بات کے بعد
وہ راہِ راست پہ آئے تکلفات کے بعد

تو خوش ہے اُن کے کرم پر مگر خیال رہے
ستم کریں گے ہمیشہ وہ التفات کے بعد

نگاہِ ذوقِ تجسس بلند کر ناداں
ہیں کائنات کئی تیری کائنات کے بعد

تمہارے قبضہ میں ہے نبضِ عالمِ ہستی
نہیں کسی پہ بھروسہ تمہاری ذات کے بعد

دیئے جلائے ہیں میں نے وفا کی راہوں میں
کرے گا یاد زمانہ مری وفات کے بعد

سمجھ میں آ نہ سکی ان کی یہ ادا گوہر
ہنسے وہ سُن کے بہت، غم کے واقعات کے بعد

تاج احمد تاج

حق جو کہتے تھے سرِ دار، کہاں ہیں جانے
سر وہ کٹوانے کو تیار، کہاں ہیں جانے

خود تو بیمار مگر تھے جو مسیحا سب کے
آج وہ لوگ طرح دار، کہاں ہیں جانے

جانے بستے ہیں کہاں جا کے گذرتے لمحے
ہیں جو اب آنے کو تیار، کہاں ہیں جانے

یاد ان کی مرے یاروں نے دلائی ہے بہت
شہر کے سارے ہی اغیار، کہاں ہیں جانے

تاج یوں تو سبھی کہتے ہیں غزل اب لیکن
غالب و میر کے افکار، کہاں ہیں جانے

(طنزیہ)

بھارت چند کھنہ

زخمِ وزارت

میکدے سے بہت دور اک موڑ پر
ایک اونچی سی کوٹھی کے دالان میں
چند پیاسے پڑے تھے بہت دیر سے
غم وزارت کے خوابوں میں پیتے ہوئے
صبر و اُمید کی کشمکش میں گھرے
تھی وزارت دُعا — تھی وزارت بقا
تھی وزارت خدا

پھر سنو دوستو — اک لطیفہ ہوا
اک تماشہ ہوا — اک شگوفہ کھلا
کر رہے تھے وہ باتیں بڑے راز سے
صاحبانِ وزارت کے انداز سے
ان کے چہروں پہ رونق وزارت کی تھی
دل میں مضمر تمنّا شرارت کی تھی
ہم نے دیکھا : نہیں
دھوپ میں چھاؤں میں ۔ شہر میں گاؤں میں
دن میں رات میں ۔ جیت میں مات میں
پیاس بجھ نہ سکی تشنگی رہ گئی
ساتھ اشکوں کے خود آرزو بہہ گئی
غم تمنّا کا دل میں سجائے ہوئے
حسرتوں کے جنازے اٹھائے ہوئے
چل دیئے اپنے منہ کو چھپائے ہوئے

اُف وزارت کے بدلے حقارت ملی
تھی محبّت کی امید نفرت ملی
یک بیک ہر طرف شورِ ماتم اُٹھا
تشنہ ہونٹوں سے آنے لگی یہ صدا
یہ بتا چارہ گر تیری زنبیل میں
کوئی مرہم بھی زخمِ وزارت کا ہے

عاتق شاہ

(کہانی)

بیچ کا آدمی

آزاد روڈ سے گذرتے ہوئے عبداللہ بھائی ٹیلر ماسٹر کی دکان پر ایک نظر نہ ڈالنا میرے لیے ایسا ہی ہے جیسے ضرورت کی کسی شے کے لئے بازار جانا اور بغیر کچھ خریدے لوٹ جانا اور پھر بڑی کوشش کے بعد یہ یاد نہ آنا کہ آخر وہ کون سی شے تھی جس کی خاطر یہ سب کچھ ہوا۔ بڑی عجیب سی بے لطفی اور محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ میں اس کی وجہ نہیں جانتا۔ لیکن یہ خلاء اس وقت تک میرے ذہن اور وجود پر چھایا رہتا ہے جب تک میں عبداللہ بھائی کو دکان پر بیٹھا جھانہ دیکھ لوں۔ یا اُن کے نوکروں کو کام کرتا ہوا۔ یا دکان بند رہنے کی صورت میں کم از کم ٹین کے اس پرانے بورڈ کو نہ دیکھ لوں جو ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے سے سر کھجاتا رہتا ہے۔ اور جس پر لکھے ہوئے الفاظ قریب قریب مٹ چکے ہیں۔

عبداللہ بھائی کی دکان پہ ایک نظر پڑتے ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ ہر شے ثابت و سالم ہے اور محفوظ ہے اور کمشنر کی یہ چکیلی سڑک اسی ادا سے آگے بڑھ کر اپنی بڑی بہن سے گلے مل رہی ہے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں کی ہر شے بدل گئی ہے۔

آزاد روڈ سے پہلے یہاں کلائیو روڈ تھی۔ کلائیو روڈ سے پہلے یہاں اکبر روڈ تھی اور اکبر روڈ سے پہلے ـــ پتہ نہیں کس کا کیا نام تھا۔ لیکن آدمیوں کی طرح ہر سڑک کی ایک کہانی ہوتی ہے ایک تاریخ ہوتی ہے۔ اور ایک نام ہوتا ہے اور ہر نام ایک تبدیلی اور انقلاب کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے۔

بظاہر اس چمکیلی سڑک کا عبداللہ بھائی کی خستہ حال دکان سے کوئی تعلق ہے اور نہ رشتہ۔ دونوں کناروں پر کھڑی ہوئیں اونچی اونچی عمارتوں ایئر کنڈیشن کمروں اور ملگیوں میں عبداللہ بھائی کی دکان ایسے ہی ہے جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔ یہ تضاد اُبھر کر ہر راہ گذرنے والے کے سامنے آتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک اجنبی بھی اُسے نوٹ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے باوجود بھی دل یہی کہتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ یہ سڑک، سڑک ہوتی اور نہ عبداللہ بھائی، عبداللہ بھائی ہوتے۔ میں؟ ہوتا۔ اور نہ آپ مجھ سے یہ سب کچھ سنتے!

عبداللہ بھائی کا جسم ذرا ذرا بھرا ہے۔ لیکن قد چھوٹا۔ ہمیشہ چہرے پر مسکراہٹ رہتی ہے۔ اور اُن کا منہ کھلے کا کھلا جس میں سے ان کے میلے کچیلے دانت جو کثرت پان کے استعمال سے کالے پڑ چکے ہیں باہر جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت کا بڑا خوش گوار اثر پورے ٹیلرنگ فرم پر چھایا رہتا ہے۔ ویسے یہ دکان دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصہ میں ایک لمبا اور اونچا میز ہے جس کی حیثیت ایک کاونٹر کی سی ہے اور مالک کی کرسی میز کے اُس طرف ہے۔ لیکن میں نے عبداللہ بھائی کو کبھی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا نہیں دیکھا۔ اس میز سے لگی ہوئی ایک بڑی الماری ہے جس میں گاہکوں کے ادھ سلے کپڑے رکھے جاتے ہیں۔ باہر کی طرف سڑک کی جانب لگا ہوا ایک اوسط درجہ کا شوکیس ہے جس میں گاہکوں کے بش شرٹ، کوٹ اور پتلون ہینگر پر جھولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

دوسرے حصے میں صرف کاریگر اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ کوئی مشین چلا رہا ہے کوئی سی رہا ہے۔ اور کوئی کاج بنا رہا ہے۔

اور عبداللہ بھائی دکان کے پہلے حصے میں بیٹھے بیٹھے یا کھڑے کھڑے نیا گاہک کا ناپ لیتے ہوئے آوازیں دیتے رہتے ہیں۔

شرفو بیٹیا ذرا بش شرٹ کو کریز تو لگا دے۔

اور ارے وہ کالو! ذرا مسٹر ملک کے رشمی شرٹ کو بٹن تو ٹانک دے۔

اور ستار میاں! ذرا سنو تو جیمس صاحب شام کے ۶ بجے آئیں گے۔ کیا ان کا سوٹ تیار ہوگیا! بھائی ذرا جلدی کرو۔ جلدی۔ کوئی یہ نہ کہنے پائے کہ عبداللہ بھائی بھی دوسروں کی طرح وعدہ خلافی کرنے لگا ہے۔ جان جائے۔ پر زبان نہ جائے۔ یاد رکھو پیارے میری یہ بات۔

عبداللہ بھائی کی گونجیلی آواز دکان کو پھلانگ کر سڑک پر دندناتی چیختی اور چلاتی ہوئی ٹرافک کے شور میں کھو جاتی ہے لیکن جیسے ہی مسجد سے اذاں کی آواز بلند ہوتی ہے عبداللہ بھائی اپنے کندھے پر رومال ڈال کر دکان سے نکل جاتے ہیں اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ کوئی لاٹ صاحب قسم کا گاہک ان کے کاونٹر پر کھڑا ہے۔

ان کے ملازمین عبداللہ بھائی کی غیر حاضری میں کبھی ان کے اعتماد کو دھکا نہیں لگاتے۔ اور پھر یہ کہ انھوں نے کبھی آقا اور خادم، مالک اور ماتحت کے فرق کو نہیں برتا۔ وہ اپنے ہر ماتحت کو خاندان کے ایک فرد کی طرح سمجھتے ہیں۔ لہذا تنخواہ میں اضافے کے سلسلے پر کبھی اُن کے یہاں ہڑتال نہیں ہوئی۔ جب کہ شہر کے اکثر ٹیلرنگ فرموں میں ایسی باتیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ جتنی آمدنی ہوتی ہے وہ سب کی سب آپس میں تقسیم ہوجاتی ہے اور عبداللہ بھائی بھی خوشی خوشی اپنے حصے کی کمائی جیب میں ڈال کر گھر چلے جاتے ہیں۔ کون مالک ہے اور کون خادم یہ کوئی کہہ نہیں سکتا۔ سوشلزم کہیں ہو یا نہ ہو لیکن عبداللہ بھائی کی چھوٹی سی دکان میں قدم رکھنے کے بعد اس کا پتہ چل جاتا ہے کہ سوشلزم آگیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کبھی کسی نے بھی انھیں پریشان نہیں دیکھا۔ جب بھی اُن کی مزاج پرسی کی جائے تو وہ یہی کہتے ہیں۔

اللہ کا فضل ہے!
مالک نے بڑے مزے میں رکھا ہے
نیلی چھتری والے کا بس کرم ہی کرم ہے۔

یہ بات انھوں نے اُس وقت بھی کہی جب کہ اُن کی بیوی دواخانے میں مر رہی تھی۔ اور اُس وقت بھی جب اُن کا نوجوان لڑکا ہنستا کھیلتا اچانک اس دُنیا سے چلا گیا۔ لیکن ان کی پیشانی پر بل آیا اور نہ غم میں ایک دن کے لئے انھوں نے دکان بند کی!

بس شروع سے وہ یہی کہتے ہوئے آئے ہیں۔

مالک نے بڑے مزے میں رکھا ہے

اپنے ہر گاہک سے وہ اسی طرح بات کرتے ہیں جیسے وہ کوئی ان کا قریبی دوست ہے۔ لیکن اکثر گاہک ان کے اس سلوک سے بے جا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ادھ ادھار کی رقم کبھی واپس نہیں کرتے۔ اور عبداللہ بھائی بھی اُن سے اس لہجے میں بات کرتے ہیں جیسے انھیں یاد ہی نہیں رہا کہ کوئی دھوکہ دے گیا!

ایک بار جب میں نے اُن سے یہ کہا کہ عبداللہ بھائی اس طرح لوگ آپ کا استحصال کر رہے ہیں۔ کسی کو لوٹنا جتنا بڑا جرم ہے اتنا ہی جان بوجھ کر خود کو لوٹے جانے کے لئے پیش کر دینا بھی کچھ کم جرم نہیں ہے۔

پھر مسکرا کر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ عبداللہ بھائی آپ جیسے نیک اور ایمان دار انسان کو بھی اس جرم کی پاداش میں کوئی نہ کوئی سزا ملنی ہی چاہئے۔ کہئے منظور!

عبداللہ بھائی ہنس پڑے۔ فوراً شرفو کو پکار کر سب کے لئے گھڑا چمچہ والی چائے کا آرڈر دیا۔ پھر چائے کو جیسے سِپ کرتے ہوئے بولے، سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے گاہک کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا اور میرا یہ ایمان ہے کہ کوئی گاہک بھی دھوکہ دینا نہیں چاہتا۔ دراصل مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ کپڑے کی قیمت اور سلوائی جیسے نفٹی نفٹی ہوگئی ہے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی گاہک اُدھار کی بات نہ کرے تو کیا کرے۔ یہ اُسکی اپنی مجبوری ہے۔

عبداللہ بھائی کو انسانیت پہ سو فیصد یقین ہے۔ انھوں نے اپنے بعض ایسے قصے بھی سنائے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ بعض گاہکوں نے برسہابرس گذرنے کے بعد بھی اُن کے پیسے لوٹا دیئے۔

انھوں نے کہا۔ حلال کی کمائی کبھی ضائع نہیں جاتی۔ اگر کسی گاہک نے انھیں دھوکا دیا بھی تو جاؤ میں نے اُسے معاف کیا۔ نیلی چھتری کا والا مجھے اس سے زیادہ دے دے گا۔

اتنی ایمانی قوت اور زندگی پر بھرپور اعتماد میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایک فن کار کی حیثیت سے بھی بہت بلند ہیں۔ ان کی اس عظمت میں نہ اخبار کا اشتہاروں کو دخل ہے اور نہ کسی پبلسٹی کو۔ بلکہ وہ اپنے کام کو عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔

کام کا کتنا ہی بوجھ کیوں نہ ہو لیکن وہ کٹنگ خود کریں گے۔ اور کپڑا کسی کاریگر کے حوالے نہیں کریں گے۔ اور گاہک کے اعتماد کو باقی رکھیں گے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ عید الفطر کی تیاریاں زوروں پہ تھیں۔ اور دکان پر کپڑوں کا ایک ڈھیر لگا تھا۔ چنانچہ ان کے ایک کاریگر نے اپنے مالک کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کپڑوں کی کٹنگ کردی۔ عبداللہ بھائی نے کاریگر سے کہا کہ تم کٹنگ نہیں۔ لیکن جب گاہک اپنا سوٹ لینے کے لئے آیا تو بجائے سوٹ دینے کے انھوں نے اُس سے کپڑے کی قیمت پوچھی۔ اور پھر اُسے وہ رقم دے دی۔ اور گاہک ہکا بکا منہ دیکھتا رہ گیا!

بعد میں اصل وجہ معلوم ہونے کے بعد گاہک جب دوسرا کپڑا لے آیا تو پھر حسب معمول مسکراتے ہوئے انھوں نے خود کٹنگ کی۔

ویسے عبداللہ بھائی کے یہاں لندن یا امریکہ یا اندرون ملک کے کسی بانی ٹلرنگ کالج کا ڈپلوما یا ڈگری تو نہیں ہے۔ لیکن ان کے ہاتھ جس کپڑے کو لگ جائیں وہ پہننے والے کی شخصیت کو نکھار دیتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ہر ذہن اور ہر فکر کا آدمی ملے گا۔ کیا مرد۔ کیا عورت؟

سینہ ـــ ۳۳ انچ

کمر ـــ ۲۰ انچ

اور کولھے ـــــ

اپنے کندھے پر پڑے ہوئے ٹیپ سے جسم کو ناپتے رہیں گے۔ اور خاموشی سے اپنی ڈائری میں نوٹ لیتے جائیں گے اور اس میکانیکل انداز میں گاہک کیا خود دیکھنے والا بھی فیصلہ نہیں کر پائے گا کہ عبداللہ بھائی کی موٹی موٹی انگلیاں گاہک کے جسم کو چھو رہی ہیں

دوسری بات یہ کہ وہ گاہک سے خواہ وہ کتنا ہی نیا کیوں نہ ہو سلوائی کے نرخ کے تعلق سے کبھی بھاؤ تاؤ نہیں کریں گے۔ بس گاہک اور ان کے درمیان فقط ایک خاموش معاہدہ تھا۔

بہرحال عبداللہ بھائی کے کردار کا تجزیہ بڑا مشکل ہے۔ لیکن ایک بات اپنی جگہ طے ہے کہ آزاد روڈ سے گذرتے ہوئے عبداللہ بھائی ٹیلر ماسٹر کی دکان پر ایک نظر نہ ڈالنا میرے لئے ایسا ہی ہے جیسے ـــ جیسے ـــ خیر جانے دیجئے مجھے کوئی مناسب تشبیہ یاد نہیں آرہی ہے لیکن آپ کو میں اپنے اس احساس میں ضرور شریک کرسکتا ہوں کہ گھر پہنچنے کے بعد بڑی دیر تک یوں معلوم ہوتا ہے کہ راستے میں میری کوئی قیمتی چیز گم ہوگئی ہے۔

آزاد روڈ پر عبداللہ بھائی کی دکان اور اُن کا وجود سلامتی کی علامت ہے!

لیکن آج یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے سلامتی خطرے میں ہے۔ عبداللہ بھائی کی دکان کو کسی نے ڈائنا میٹ لگا دیا ہے اور کوئی دم [illegible] خستہ حال دکان جو چالیس سال سے اس [illegible] کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہے ایک دھماکے کے ساتھ اُڑ جائیگی

میں یہاں فٹ پاتھ پر کھڑا دکان کو دیکھ رہا ہوں۔ عبداللہ بھائی اپنے اُسی انداز سے کام میں مگن ہیں۔ ابھی ابھی مجھے معلوم ہوا ہے کہ عبداللہ بھائی کو عدالت سے حکم ملا ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر دکان کا تخلیہ کردیں۔ کیونکہ مالک ملگی نے کسی پیسے والی پارٹی کو ایک بڑی رقم کے عوض یہ جائیداد بیچ دی ہے اور نیا مالک اس

کی عمارت گرادی گئی اس پر سہ منزلہ عمارت
تعمیر کر دی گئی۔ نچلے حصے میں ہوٹل رہے گی۔
دوسری منزل پر ٹو انسٹنگ اسکول اور
تیسری منزل پر کسی کلب کا آفس۔

یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ ظاہر ہے
عبداللہ بھائی کچھ نہیں کر سکتے۔ یہاں اُن کی
حیثیت صرف ایک کرایہ دار کی ہے۔ وہ یقیناً
کہیں چلے جائیں گے ۔۔۔ نیلی چھتری والے کا
نام لے کر۔

لیکن مجبوری کہ ہے۔ عبداللہ بھائی
کی دکان کے بغیر میں آفتاب روڈ کا تصور
نہیں کر سکتا۔ لیکن میرے تصور سے ہی کیا
ہوتا ہے۔ عبداللہ بھائی، اس سڑک کے
لئے تو ایک بڑی سچائی ہیں۔ حقیقت ہیں۔
ایک پُل ہیں جو ماضی کو حال اور حال کو مستقبل
سے ملاتا ہے۔ وہ ایک تہذیبی سفیر ہیں
جو دو نسلوں، دو نظریوں اور دو عقیدوں
کے درمیان کام کرتا ہے۔ بیچ کے آدمی ہیں
جو زندہ رہنا چاہتے ہیں اور زندگی کے لئے
جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ کیا بات ہوئی۔
میرے کانوں میں جیسے کوئی کہہ رہا ہے۔ ازل
سے یہی ہوتا آرہا ہے اور ابد تک یہی ہوتا
رہے گا۔ بڑی مچھلی ہمیشہ چھوٹی مچھلی کو کھاجاتی
ہے۔

تو کیا یہ سچ ہے۔ میں خود سے پوچھ
رہا ہوں۔ پتہ نہیں دور کا قانون کیا آج
بھی رائج ہے۔ عبداللہ بھائی کی ٹکیا، ان
کی فن کاری، خلوص اور ان کا علم سب کچھ کیا
سب سے بڑی مچھلی کے پیٹ میں چلا جائے گا۔
اور اس جنگل کے قانون کے خلاف کوئی آواز
نہیں اُٹھائے گا!

میں آزاد روڈ سے آہستہ آہستہ
قدم اُٹھا رہا ہوں۔ شام کے دھندلکے
میں ہر چیز چھپتی جارہی ہے۔ ٥۔۔!!

بقیہ: سلسلہ "سوئے دار"

آخری بند ملاحظہ ہو۔

اے روشنیوں کے شہر
آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر
شب خون سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں اونچی رکھیں لو

بچپن سے فیض کے مزاج میں انکسار،
علم، صلح، امن دوستی اور محبت ہے۔
ایسے شخص و شاعر کو "غدار" اور "وطن
دشمن" قرار دینا غداری اور وطن دشمنی
کی تعریف تبدیل کرنے کے مماثل ہے
کسی "خاص حلقے" کو اگر اصرار ہے تو فیض
کو کسی سے سند لینے کی ضرورت نہیں کہ
وہ وطن کے وفادار ہیں۔ میں نے اسی
حلقے کے عالی مقام لوگوں کو فیض کے قدموں
میں بھی بیٹھا دیکھا ہے۔

سیاسی اور ادبی بونے تیس برس
سے آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے بیل کی
طرح فیض کی فنی عظمت کے کولھو میں جتے
ہوئے ہیں۔ فیض کو تو ان کے اعلیٰ و ارفع
مقام سے نیچے کیا لاتے تیس سال کی مسلسل
تگ و دو محنت و مشقت کے باوجود بھی
کوئی مقام پیدا نہ کر سکے۔ یہ سب حضرات
الاوریں ہیں۔ ان کا حشر معلوم ہے ●

ساجدہ اعظم

(کہانی)

دوسری شام

اس آفس کے باہر شام روشن ہو چلی ہے سڑک پر شور ہے۔ ہنگامہ ہے لیکن سیما میں تو خواب دیکھ رہا ہوں اور خوابوں کی رہ گذر پر چلنے والوں کو شور کی اجازت نہیں۔ چلو۔ کہیں۔ دور۔ بھاگ چلیں جہاں سناٹا ہو۔ جہاں روشنی تو ہو مگر چاند تاروں کی۔ دھیمی، دھیمی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو۔ ہمارے نیچے نرم اور شبنم سے نم گھاس ہو۔ فضا میں پھولوں کی خوشبو رچی ہو۔ چلو۔ وہاں۔ بھاگ چلیں۔ اور وہاں جاکر ہم اپنے دلوں کے الاؤ جلائیں، جن کی روشنی میں ہمارے چہروں پر پیار کی تحریریں ابھر آئیں جنہیں ہم ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے ہوئے پڑھ سکیں

اُٹھو سیما سے شام بیت رہی ہے کہیں یہ آہستہ آہستہ رات نہ بن جائے اور چپکے سے گزر نہ جائے۔

تم اتنی خوبصورت کیوں ہو سیما؟ مرمر کی تراشی ہوئی مورت کی طرح کتنا سڈول جسم ہے تمہارا اور تمہارے جسم کی رنگت جیسے سورج کی صبح کی کرنوں میں کوئی گلال ملا دیا ہو۔ تم بات کرتی ہو تو لگتا ہے جیسے خوشبو سی خوشبو اڑ رہی ہو۔ جیسے پھول ہی پھول کھل رہے ہوں۔ اور جب خاموش ہو کر مشغول ہو جاتی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی سیپ سمندر کی تہہ سے ابھری اور برکھا کی بوند کو سمیٹ کر موتی بناتی ہوئی پھر سمندر کی تہہ میں جا چلی گئی ہو۔ تم جذب کرنے میں ماہر ہو اور تم نے نہ جانے مجھے اپنے میں کتنی بار جذب کر لیا ہے مجھے بھی موتی بنا دو سیما میں بھی برکھا کی ایک آوارہ بوند ہوں مجھے بھی اپنے آغوش میں لے کر سمندر کی تہہ میں چھپا لو سیما۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں تیرتے ہوئے ہلکے ہلکے سرخ ڈوروں کو لئے مجھے خالی خالی کیوں دیکھتی ہو۔ ان ڈوروں میں "اقرار" کچھ قسمیں، کچھ وعدوں کی ہلکی سی چنگاریاں بھی بھر لو نا۔

میں تو ایک بُت کی طرح تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ نہ جانے تمہارے آگے میں گونگا کیوں بن جاتا ہوں۔

"یس۔ پلیز۔" تم جیسے پھر سمندر سے ابھریں۔

"دیکھئے مس سیما۔ میرا ٹکٹ O.K ہوا یا نہیں" میں تم سے ایک اجنبی کی طرح بات کر رہا ہوں لیکن میرے اندر تم کوئی غیر نہیں۔ میری اپنی ہو۔ ہمیشہ سے رہی ہو اور ہمیشہ رہو گی،

"آپ کا ٹکٹ O.K ہو گیا ہے۔ کل آجائیے۔ P.FORM کلیر کروا کر ٹکٹ آپ کو دے دوں گی، کچھ۔ اور۔" تم پھر ڈوب گئی ہو

"جی کچھ نہیں"۔ ؟ میں یہ نہیں کہنا چاہتا ہوں سیما "کچھ اور ..." کے جواب میں تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ۔ "ہاں بہت کچھ اور چلو اٹھو یہاں سے آؤ میرے ساتھ چلو۔ دُور ـــ کہیں دُور ـــ" لیکن میں کچھ بھی تو نہ کہہ سکا اور تمہیں آفس میں چھوڑ کر باہر چلا آیا ہوں۔

رات روشن ہے دن کی طرح اور میں تنہا ہوں۔ تم دریا کنارے ٹہر کر وہاں ... بات ... گی اور کوئی تمہارے مقابل ہو گا۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا۔ سدا میں ہی تمہارے مقابل رہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے سراپا میں تمہاری آنکھوں میں، تمہاری زلفوں میں، تمہاری باہوں میں، تمہارے جسم میں اپنے آپ کو پگھلا کر بوند بوند کر کے جذب ہونا چاہتا ہوں۔ میری رات کس طرح کٹے گی سیما۔ اور کل تم سے ملنے تک میرا دن کیسے بیتے گا۔ مجھے تو چند دنوں میں اپنا وطن چھوڑنا ہے سمندروں کی وسعتوں کو آسمانوں کی راہوں سے پھلانگ کر ایک اجنبی دیار میں قسمت آزمائی کرنے جانا ہے۔

میں تمھیں نہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا
کہیں تم کھو تو نہ جاؤ گی؟ میری آنکھوں میں یہ
کیسی نمی سی کیوں ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ کل جب
میں تم سے ملنے آؤں گا تو تم سے کہہ دوں گا۔ مجھے
شکست ہو گئی نہیں تمھاری بھی ضرورت ہے
کیا تم میری بن سکو گی۔ مجھے اپنا سکو گی۔ میرے
آنے تک میرا انتظار کرو گی۔ میرا اقرار
شاید تمھاری "بشریت" کو پگھلا دے
شاید تم کچھ غلط انداز نظروں سے میری جانب
دیکھ لو۔

رات بہت گذر چکی ہے۔ میں نے
بہت کوشش کی ہے کہ نیند کی اجلی وادیوں
میں کل کی خوش رنگ تصویریں سجاتا ہوا
دُور نکل جاؤں۔ لیکن سیما جیسے ذہن
میں چپک کر رہ گئی ہے۔ اور میں باوجود
کوشش کے اس اسرار کو سمجھ نہیں پا رہا
ہوں کہ محض چند دنوں کی ایک انجانی لڑکی
سے کاروباری ملاقاتیں کیا میری زندگی کو
اتنے شدید طوفان سے دوچار کر سکتی ہیں۔
میں بہت کوشش کر رہا ہوں کہ سیما کو
ذہن سے جھٹک دوں۔ مجھے اپنے مستقبل
کے لئے بہت دُور جانا ہے ایسی جذباتیت
میرے اِرادوں کو نیست کر سکتی ہے۔
نہیں مجھے سب بھول جانا چاہئے۔ ایک
انجانی لڑکی کے لئے اتنا کیوں الجھوں، ایسی
اُلجھن سے کیا فائدہ جو سلجھ نہ سکے۔
مجھے سو جانا چاہئے۔ مجھے سو جانا
چاہئے۔ کل کی زندگی کے خوبصورت خوابوں
کو دیکھنے کے لئے۔ مجھے سو جانا چاہئے۔

پھر وہی آفس ہے۔ اور وہ میرے
آگے بیٹھی ہے خاموش سمندر کی طرح
اور پھر میں بے قابو سا ہوتا جا رہا ہوں
میرے اندر خود اعتمادی کا بُت ٹوٹ
چکا ہے اور اُسے مقابل پا کر میرے دل میں
ایک طوفان سا اُٹھ رہا ہے۔ میرے لب
تو بند ہیں لیکن میں نظروں سے اُسے گھونٹ
گھونٹ کر کے پی رہا ہوں اور وہ میرے
اندر دُور تک پھیلتی جا رہی ہے۔
"آپ کا سارا کام مکمل ہو چکا ہے
جناب، آپ کی سلامتی کے ساتھ اُڑان
کے لئے نیک تمنائیں"۔ اُس کے کاروباری
جملوں میں۔ میں چاہ ڈھونڈ رہا ہوں۔
"شکریہ مس سیما۔ کیا آپ میرے
ساتھ کافی پینا پسند کریں گی۔؟
نہ جانے مجھ میں کہاں سے ہمت آ گئی۔
OH, SURE'WHY, NOT"
لیکن آپ کو چند لمحے انتظار کرنا ہوگا۔"
وہ میری دعوت اتنی آسانی سے قبول کرے
گی مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔
ایرکنڈیشنڈ ریستوران میں
مِز پرسیما اور میں تنہا ہیں۔ آفس کا حجاب
یہاں نہیں ہے لیکن باوجود شدید خواہش
کے میں اُس سے بے حجابانہ گفتگو نہیں کر
پا رہا ہوں۔
"آپ HIGHER-STATE
STUDIES کے لئے جا رہے ہیں۔"
وہ پوچھ رہی ہے
"ہاں اسٹڈیز بھی اور کمائی بھی۔" میں
بھی رسمی جواب دے رہا ہوں۔
"آپ اس آفس میں کب سے کام
کر رہی ہیں سیما"۔
"ایک سال ہوا"۔
"باہر جانے کا ارادہ ہے آپ کا بھی"۔
"ارادہ تو بہت کچھ ہے لیکن ذمہ داریاں
بھی بہت ہیں"۔ وہ کچھ اداس سی ہو گئی
SORRY میں آپ کی نجی زندگی میں مخل
ہو رہا ہوں۔
"نو امیٹس آل رائٹ"
"میں کچھ کہنا چاہتا تھا آپ سے"۔
میرے اندر کی لہریں لبوں تک آ چلی تھی۔
"کہئے۔ میں سن رہی ہوں"۔
"میں شاید دو تین سال بعد لوٹوں گا۔
واپسی پر کیا آپ مجھے پہچان پائیں گی"۔
میرے ان جملوں میں شاید میرا اقرار تھا۔
میں نے بات کو نبھانے کے انداز میں آگے
کہنا شروع کیا۔
"روز ہی کئی لوگوں سے آپ ملتی رہتی
ہیں۔ اور آپ کا تو یہ معمول ہے اب
کہاں تک کسی کو آپ یاد رکھیں گی"
"ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔
لیکن میں نے آج تک کسی کی کافی کی دعوت
قبول نہیں کی۔ آپ ایسے ذہن میں رکھ سکتے
ہیں۔ جب آپ لوٹیں شاید میں.... وہ
بھی کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن پھر خاموش

سی ہو گئی ہے اور میز کے گلدستے کو دیکھ رہی ہے ہم ریستوان سے اُٹھ چکے ہیں۔ وہ آفس کی طرف جا رہی ہے اور میں اسکوٹر کے پاس کھڑا اُسے خدا حافظ کہہ رہا ہوں اچانک جیسے مجھے کچھ یاد آجاتا ہے۔

"سُنیے۔ بُرا نہ مانیے گا۔"

"کہیے" وہ شاید میرا مقصد بھانپ گئی ہے۔

"خط کا جواب دیں گی۔ آپ۔"

"شاید" اور تیز تیز آفس کی طرف جا رہی ہے۔

ایرپورٹ پر بہت بھیڑ ہے میرے اپنوں کے تمام چہروں میں جو مجھے چھوڑنے آئے ہیں سیما کا چہرہ بھی چاند کی طرح نظر آ رہا ہے میرے اپنے رو رہے ہیں اور سیما کی آنکھوں کی گلابیاں شفق کی سرخیوں میں بدل رہی ہیں اور کچھ وعدوں اور قسموں کا پرتو، ان سرخیوں میں تیر رہا ہے۔

خدا حافظ ۔ الوداع

الوداع ۔ خدا حافظ

ہمیں یاد رکھنا۔

ہوائی جہاز نے ٹیک آف لے لیا ہے اور میں اپنے ماضی کو سینے سے چمٹائے یوں بیٹھا ہوں کہ کہیں مستقبل کے بے رحم پنجے میرے ماضی کو مجھ سے نہ چھین لیں۔ اور پھر سیما کا سراپا اور اس کا میرے لئے کچھ کچھ پیار کا جذبہ میرے احساس کی سطح پر اُبھر آیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کوئی قیمتی چیز کھو دی ہے۔

شکاگو کے ایرپورٹ پر جب میں اُترا تو میرا ماضی دھندلا رہا تھا، جھلملا رہا تھا۔ اور میرے آگے مستقبل کی خوبصورت تیز رفتاریاں باہیں پسارے کھڑی تھیں!

اور پھر نہ جانے کب میں ماضی سے نکل کر مستقبل کی گود میں جا بیٹھا اور میری زندگی تیز رفتار شہر کے گھنٹوں میں بٹ گئی۔ شاید میں نے دو ایک خط سیما کو بھی لکھے جس میں وہ ساری باتیں لکھ گیا جو کہہ نہ سکا تھا پھر میں نے نہ جانے کیسے ان احساسات کو ایک خواب کی طرح بھول گیا کیونکہ خوبصورت حقیقتیں میرے ان تصورات کو سلب کر چکی تھیں جو محض بہلاوے تھے۔ ماضی کے مٹتے ہوئے دھندلکوں میں مستقبل کی غیر فانی حقیقتیں جگمگا رہی تھیں۔

تین سال بعد کچھ بن کر، کچھ کما کر، چند دنوں کے لئے میں اپنے ملک، اپنے شہر کو لوٹ آیا ہوں۔

وہ تمام جذبے جو ایک معمولی لمس کا احساس پا کر کسی خوبصورت حسینہ کو دیکھ کر میرے سراپا میں چنگاریاں بھر دیتے تھے آج سرد پڑ چکے ہیں، ان تین سالوں میں میرا ادھورا پن ختم ہو چکا ہے اور میں ایک مکمل انسان بن چکا ہوں۔

شکاگو میں پیار کا ڈھکا چھپا انداز لمس کی والہانہ خواہشات اور کسی کو پانے کے لئے صبر آزما جد و جہد یہ ساری باتیں عنقا ہیں۔ وہاں ایسی فضاء نہیں جو گھٹن کو جنم دے۔ وصالِ یار کے لئے وہاں ہجر و فراق کے مشکل مرحلوں سے گذرنا نہیں پڑتا وہاں تو ہر نظر بے جھجک بلاوا اور ہر جسم جذبات کا امنڈتا ہوا دریا معلوم ہوتا ہے۔ میں جذبوں اور احساسات کی کئی بہتی دریاؤں میں نہا آیا ہوں۔

ہاں اب مجھے ضرورت ہے۔ زیادہ کمائی کی اور میں وہاں یہ اسی وقت کر سکتا ہوں جب کام کے لئے مجھے کچھ اور گھنٹے مل جائیں جو میں اپنے کھانے، پکانے، رہنے پر تنہائی کی وجہ سے صرف کرتا ہوں۔ یہ گھنٹے بھی میرے کام میں گذر جائیں تو میں کچھ اور کما سکتا ہوں اور اس کے لئے مجھے ایک گھریلو لڑکی کی ضرورت ہے۔

تین سالوں کے بعد یہ، ایک دوسری شام کا ذکر ہے۔ وہی آفس ہے، جہاں سے میں ٹکٹ لے کر ماضی کی گود سے مستقبل کی کھوج کے لئے اٹھا تھا۔ میرے سامنے سیما بیٹھی ہے۔ خاموش اپنے کام میں مصروف، میں اُسے پہچان تو رہا ہوں لیکن اب اُسے دیکھ کر کوئی جذبہ مجھے نہیں جھنجوڑتا وہ مجھے آنکھوں میں خوشی کی چمک لئے دیکھ رہی ہے اس طرح جیسے وہ میری منتظر تھی اور اسے میرا انتظار کیا تھا۔

"کب آئے آپ" اُس کے لہجے میں والہانہ انداز ہے ۔

"کچھ دن ہوئے" میرا جواب ہر قسم کے ردِ عمل سے خالی ہے ۔

"کہیے میں آپکی کیا خدمت کرسکتی ہوں" وہ اداس لہجے میں مجھ سے پوچھ رہی ہے ۔ شاید اُس نے مجھے توقع کے خلاف پایا ۔

"کچھ نہیں ۔ میرا RETURN TICKET O-K کروانا ہے ۔

کب جا رہے ہیں آپ" ؟ اُس کی آواز میں مایوسیوں کی بازگشت ہے وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن میرا لہجہ میرا انداز اُسے ضبط کی تلقین کر رہا ہے "کل میری شادی ہے اُس کے دس دن بعد کی کوئی فلائٹ مل جائے تو اچھا رہے گا ۔ میں نے سرد لہجے میں کہا ۔

"CONGRADULATION" ۔ سیما کے لہجے میں مصنوعی خوشی کے اظہار کی ناکام کوشش ہے

تھینک یو ۔

"SORRY میرے پاس وقت نہیں ۔

میں بہت مصروف ہوں ، پھر کبھی ۔ یہ میرا ٹکٹ رکھ لیجئے ۔ میں پھر آؤں گا ۔" میں آفس کے باہر آچکا ہوں مجھے پتہ نہیں سیما پر کیا گذر رہی ہے ۔ شاید اُس کے انتظار کا بھرم ٹوٹ چکا ہے اس کے حسین خواب بکھر چکے ہیں ۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں ۔

آفس کے باہر کی شام تین سال پہلے ہی کی طرح کی شام ہے ۔ سڑک جاگ رہی ہے شہر بھی وہی ہے ۔ ہنگامہ بھی وہی ہے اور سیما بھی وہی ہے ۔

لیکن ۔ میں وہ نہیں ہوں !!!

تخلیقات ارسال کرتے وقت اختصار کو پیشِ نظر رکھیئے ! (ادارہ)

محمد اکرام اللہ خاں

فلموں کا ذکر اور ستاروں کی باتیں

یوں تو اس وقت ہندوستان میں سینکڑوں فلمیں بن رہی ہیں لیکن آج کل ساری انڈسٹری کو بس دو ہی فلموں کا "بخار" چڑھا ہوا ہے۔ ایک تو ہے دیو آنند کی "دیس پردیس" اور دوسری راج کپور کی "ستیم شیوم سندرم"۔ یہ دونوں ایک زمانے سے فلمیں بنا رہے ہیں دونوں کا انداز بالکل جداگانہ اور دونوں کی شہرت اور مقبولیت بالکل ہی الگ الگ ہے۔

دیو آنند نے ایمرجنسی سے پہلے ایک فلم کا مہورت کیا تھا "دیس پردیس" لیکن اس وقت کی حکومت نے انھیں بیرون ملک جاکر شوٹنگ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بہت دنوں تک یہ سلسلہ سرکار کی خدمت میں اپنا مقدمہ پیش کرتے رہے لیکن حاصل کچھ نہ ہوا۔ پھر انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ اس فلم کو اپنے ہی ملک میں ویسی ہی سٹنگ لگا کر فلمالیں جیسا کہ وہ لندن میں دیکھ آئے تھے۔ لیکن دشواری صرف یہ تھی کہ ان مناظر میں وہ قدرتی حسن اور اصلیت کا آنا مشکل تھا جو وہاں شوٹنگ کرنے سے حاصل ہو سکتی تھی۔ اسی اثنا میں ملک میں انتخابات منعقد ہوئے اور آنند برادرس نے خاص طور پر جنتا پارٹی کے لئے بڑے شد و مد سے کام کیا ان کا مطمع نظر صرف شکلا تھے اور شکلا کو شکست دینا ان کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ خیر شکلا ہی کیا پوری کانگریس ہی ختم ہوگئی اور دیو آنند اپنی فلم کی بیرون ملک شوٹنگ کرنے کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اب فلم تیار ہو چکی ہے اور جس طرح سے دیو آنند نے ہندوستانیوں کے مسائل کو لندن کے ماحول میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ حقیقت سے کس قدر قریب ہے اس کا جواب خود دیو آنند صاحب ہی دے سکتے ہیں۔ گذشتہ دنوں اس فلم کی نمائش چند مخصوص لوگوں کے لئے کی گئی تھی جن میں ویکلی کے ایڈیٹر سردار خشونت سنگھ بھی شامل تھے ان کے الفاظ میں یہ فلم ان لوگوں کیلئے خاص طور پر دلچسپ ثابت ہوگی جو لندن یا دیگر بیرون ممالک جاکر رہنے بسنے اور کمانے کا خیال رکھتے ہیں کس طرح ایک ٹراویل ایجنٹ انھیں چکر دیتا ہے اور کس طرح درمیانی لوگ سبز باغ دکھاکر وہاں انھیں عجیب و غریب حالات سے دوچار کر دیتے ہیں غرض اس طرح کی کئی دلچسپیوں سے بھرپور یہ فلم دو گھنٹوں کے لئے تفریح۔ قہقہے غیر معمولی واقعات۔ بناوٹی اداکاری اور غیر دلکش نغموں کا سامان فراہم کرتی ہے۔

راج کپور نے فلم بابی بناکر انڈسٹری سے پھر ایک بار اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا تھا۔ اب کی مرتبہ کپور صاحب نے اپنی ہی ایک بہت ہی پرانی کہانی کے پس منظر میں نئی فلم بناڈالی ہے۔ یہ پرانی کہانی اس وقت کی یاد دلاتی ہے جب لتا منگیشکر نئی نئی پلے بیک سنگر کی حیثیت سے فلموں میں گانے لگی تھی اور اس کی آواز کا جادو دنیا کو مسحور کر رہا تھا آواز کی خوبصورتی کا شیدائی اگر لتا کا چہرہ دیکھ لیتا تو اس کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا۔ اسی خیال کی روشنی میں انھوں نے ایک کہانی لکھوائی جس کا سارا انحصار لتا منگیشکر کی آواز اور صورت پر تھا کچھ حالات ایسے ہوئے کہ لتا اس فلم میں کام نہ کرسکی اور یہ کہانی تشنۂ تکمیل رہ گئی۔ ایک عرصے بعد راج صاحب کو

اپنی تشنگی مٹانے کا موقع ہاتھ آیا اور انھوں نے زینت امان کو لے کر" ستیم شیوم سندرم" بناڈالی۔

ستیم شیوم سندرم کے اعلان کے ساتھ ہی انڈسٹری کی خوبصورت لڑکیاں اور مشہور و معروف ہیروینیں راج صاحب کے گرد منڈلانے لگیں کہ شاید اُن کی نظرِ انتخاب ان پر پڑ جائے۔ سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جب راج صاحب فلم بناتے ہیں تو کسی کے نخرے نہیں اٹھاتے وہ ہیروئن سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتے ہیں۔ غرض بڑی رازداری اور سسپنس کے بعد زینت امان کا انتخاب ہوا۔ زینت یوں بھی روشن خیال لڑکی ہے اور بقول اس کے "میں آرٹ کے لئے مجھ سے جو کچھ کہو کرنے کو تیار رہوں"۔ راج صاحب نے اس کی روشن خیالی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور زینت بھی اس فلم میں وہ سب کچھ کر گزر رہی ہے جو شاید کسی اور سے ممکن نہیں تھا۔ تنگبھدرا سے شوٹنگ کر کے واپس ہوتے ہوئے ششی کپور نے کہا تھا کہ زینت اس فلم میں دل لگا کر ہی نہیں بلکہ جسم بھی لگا کر کام کر رہی ہے۔ فلم کی پبلسٹی کے لئے جو فوٹوز دکھائے گئے ہیں انھیں دیکھ کر لوگ یقیناً زینت کو دیکھنے کے لئے ایکبار اس فلم کو ضرور دیکھیں گے۔ فلم تیار ہے خاص خاص لوگ دیکھ چکے ہیں ان کی رائے اور مشوروں سے ضروری تبدیلیاں بھی کی جا رہی ہیں اور شاید جب آپ ان سطور کو پڑھ رہے ہوں گے یہ فلم کسی نہ کسی سینما گھر میں دکھائی جا رہی ہوگی۔

اب ان دونوں فلموں کو دیکھنے کے بعد اگر خدانہ کرے "دیس پردیس" فلاپ ہوجاتی ہے تو آئندہ کسی بھی پروڈیوسر کو بیرون ملک فلم بنانے کی شاید ہی اجازت مل سکے۔ کیونکہ بیرونی ممالک کی شوٹنگ کے لئے حکومت نے جس قدر زرِ مبادلہ فراہم کیا ہے اگر وہ رقم حکومت کو واپس نہ ملے تو شاید انفارمیشن منسٹری یہ کہنے لگے کہ بھائی اپنے ہی ملک میں فلم بناؤ باہر جا کر اپنا وقت اور دولت کیوں برباد کرتے ہو۔ یہی بات ستیم شیوم کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ اگر اس درجہ برہنگی کو ہماری قوم برداشت نہ کرسکے تو شاید ہماری فلموں کو پھر ان ہی دنوں کی طرف لوٹنا پڑے گا جب برقعہ میں چھپی ہوئی حسینہ میں بھی بڑی دلکشی نظر آتی تھی۔ ●●

بقیہ: فلمی تبصرے

لطیف لمحوں کے لئے نسبتاً کم گنجائش نکلتی ہے لیکن جتنی بھی گنجائش نکلتی ہے اسے سحر انگیز اور ترنم ریز بنانے میں ساحر و خیام کی کوشش کامیاب و قابلِ تعریف ہے یہاں "کبھی کبھی" کا تذکرہ یقیناً غیر ضروری ہے کیونکہ اتنے حسین حادثے صرف کبھی کبھی ہوتے ہیں۔ کے۔جی کے کیمو نے فلم کو خوبصورت بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

مختصر یہ کہ "ترشول" ایک اوسط درجہ کی فلم ہے جو کسی بھی اعلیٰ درجہ کی تفریح کی غیر موجودگی میں دیکھی جا سکتی ہے

بےلاگ فلمی تبصرہ

ترشول

از
تماشائی

"ترشول" ایک بڑی فلم ہے اور اس اعتبار سے بڑی ہے کہ یش چوپڑہ اس کے ہدایت کار ہیں، کہانی، اسکرین پلے اور مکالمے سلیم جاوید کے تحریر کردہ ہیں، خیام اور ساحر نے فلم کو موسیقی اور گیتوں سے سنوارا ہے اور اس کے ساتھ بڑے اداکاروں کی ایک کہکشاں ہے جس میں سنجیو کمار، امیتابھ بچن، ششی کپور، راکھی اور ہیما مالنی شامل ہیں لیکن اتنے ڈھیر سارے بڑے ناموں کے باوجود فلم میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو کے درشن کو بڑا بنا سکے۔ ابتدائی ہفتوں کی وجہ سے فلم باکس پر مضبوط جا رہی ہے لیکن شاید "ایمان دھرم" کے بعد یہ سلیم جاوید کی دوسری بڑی فلم ہوگی جو باکس آفس کی ناکامی سے دوچار ہوگی اور اگر خوش قسمتی سے ایسا نہ بھی ہو تو یہ بات یقینی ہے کہ ترسوتی کی پچھلی فلم "دیوار" کی کامیابی اسے ہرگز نصیب نہ ہوگی۔ "دیوار" کی کہانی جہاں مضبوط اور حقیقی بنیادوں پر استوار کی گئی تھی وہاں "ترشول" کی کہانی اپنے جذباتی پس منظر کے باوجود انتہائی بھونڈے غیر حقیقی اور خیالی واقعات کے سہارے آگے بڑھتی ہے اور تماشائی کہیں بھی کہانی کے نشیب و فراز سے ذہنی ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتا۔ ویسے کہانی پر سلیم جاوید کا "فلمی ٹریڈ مارگ" (جو ان کی تجارتی کامیابی کا ضامن ہے) موجود ہے یعنی ان کی بیشتر کامیاب فلموں کی طرح اس فلم کی کہانی بھی انتقام کے موضوع پر ہے اور اس کا مرکزی خیال بھی ان کا اپنا نہیں ہے بلکہ MARIE CORELI کے ناول VANDETTA سے لیا گیا ہے البتہ TREATMENT اور انجام بڑی حد تک مختلف ہیں۔

انتقام کی یہ کہانی راج (سنجیو کمار) کے رومان سے شروع ہوتی ہے جو شانتی (وحیدہ رحمان) سے محبت کرتا ہے لیکن راستے میں راج کا باس آجاتا ہے جو ایک کنسٹرکشن کمپنی کا مالک ہے وہ راج کی صلاحیتوں سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ اُسے اپنا داماد بنانا چاہتا ہے راج کے قدم محبت کی راہ میں لڑکھڑا جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی ماں کے اس فلسفے کو تسلیم کر لیتا ہے کہ زندگی کے حسین خوابوں کو حقیقت سے ہمکنار کرنے کے لئے دل کی دھڑکنوں کا نہیں بلکہ سونے چاندی کی چمک دمک کا سہارا لینا ضروری ہے اور پھر راج محبت کی کمزور باہوں سے نکل کر دولت کی دیوی کو گلے لگا لیتا ہے۔ شانتی جو راج کے بچے کی ماں بننے والی ہوتی ہے اُسے زندگی کے نئے سفر پر مبارکباد دیتی ہے اور ساتھ ہی راج کے ہاتھوں سے رحم کی بھیک قبول کرنے سے انکار کرتے ہوتے خود زندگی کی پرخار راہوں کے کٹھن سفر پر روانہ ہو جاتی ہے۔ انہی راہوں پر مصیبت، غربت اور محنت کی دھوپ میں تپ کر راج کا بیٹا وجے (امیتابھ بچن) جوان ہوتا ہے اور ماں کی آخری سانسوں کے درمیان عہد کرتا ہے کہ وہ اپنے بے رحم باپ سے بدلہ لے گا۔ انتقام کی یہ کہانی دلی میں شروع ہوتی ہے جہاں راج BUSINESS TYCOON بنا ہوا ہے اور عمارتوں کی تعمیر کے ذریعے دولت کی ٹکسال میں اتنا مصروف ہے کہ لندن سے بزنس ایڈمنسٹریشن کی تکمیل کر کے لوٹنے والے اپنے بیٹے شیکھر (ششی کپور) کو لینے کے لئے ایرپورٹ بھی نہیں جا سکتا۔ وجے اپنے باپ راج سے ایک زمین کا سودا کرتا ہے اور راج اس حقیقت سے ناواقف کہ وجے اس کا اپنا بیٹا ہے وہ اس زمین کا سودا کر لیتا ہے جس پر

ایک غنڈے کا قبضہ ہے اور جس کا مقدمہ عدالت میں چل رہا ہے۔ وجے اپنے مخصوص ایمبولنس اسٹائل کے ذریعہ زمین پر قبضہ کر لیتا ہے اور پھر اس زمین پر قرضہ لے کر راج کو معاوضہ ادا کر دیتا ہے۔ اب وجے اپنی ایک کنسٹرکشن کمپنی قائم کر لیتا ہے اور تجارتی مسابقت شروع ہو جاتی ہے۔ اس دوڑ میں تجربہ کار راج ہر ہر قدم پر ناکام ہوتا ہے اور کامیابی صرف وجے کے حصے میں آتی ہے اور اس طرح وجے اپنے باپ کو تجارتی سطح پر برباد اور دیوالیہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور آخر کار راج کے سارے اثاثے کو خرید کر اُسے تحفے کے طور لوٹا دیتا ہے۔ ایک بیٹے کا تحفہ اپنے باپ کے لئے جس نے اس کی ماں کو محبت کے بدلے مایوسی اور مصیبت کا انعام دیا تھا۔ کہانی کے دوران وجے کے انتقام کی آگ شیکھر کی محبت کو بھی خاکستر کرنا چاہتی ہے جو مس ورما (ہیما مالنی) کی محبت میں گرفتار ہے لیکن انجام کو پہنچتے پہنچتے انتقام کی یہ آگ خود خاکستر ہو جاتی ہے اور جب راج اپنے بیٹوں وجے اور شیکھر کی جان بچاتے ہوئے اپنی جان بھینٹ کر دیتا ہے تو وجے کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی شکست کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے شکست خوردہ اور ٹوٹے ہوئے دل کو سہارا دینے کے لئے گیتا (راکھی) آگے بڑھتی ہے۔ شیکھر مس ورما کو پا لیتا ہے۔ وجے اور شیکھر کی چھوٹی بہن بیلی (پونم) بھی اپنے خوابوں کے شہزادے (روی سچن) کو پا لیتی ہے اور اس طرح راج کا خاندان ہنسی خوشی آپ کو خدا حافظ کہتا ہے۔

کہانی کا پس منظر اور مجموعی تاثر تماشائی کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن غیر منطقی و خیالی واقعات کا تسلسل کہانی کو حقیقت سے پرے خیالی جنت میں تبدیل کر دیتا ہے جس سے آج کا تماشائی متاثر نہیں ہو سکتا۔ جس زمین کا مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے اس پر غنڈوں کے ساتھ غنڈہ گردی کر کے قبضہ کر لینا، کم بجٹ کا ٹینڈر داخل کر کے ایک قدیم و مشہور کمپنی کے مقابلے میں کام حاصل کر لینا، مخالف پارٹی کی طرف سے رشوت دینے کی کوشش کرتے ہوئے ایک ٹرسٹ کے تجربہ کار ٹرسٹی کو دھوکہ دینا، ایک دو سال کے مختصر عرصے میں کنسٹرکشن کے کاروبار کو ایک قدیم و مشہور کمپنی کے مقابلے میں وسیع تر کر لینا یہ اور اسی قسم کے بے تکے واقعات سلیم جاوید کی کہانی میں تو ہو سکتے ہیں حقیقی زندگی میں ممکن نہیں۔ شہر کے بدنام غنڈوں کو مار پیٹ کر ایمبولینس کے ذریعے دواخانہ بھجوانے والا وجے جب اپنے بھائی شیکھر کے ساتھ لڑتے ہوئے ادھ موا ہو جاتا ہے تو وجے سے نہیں بلکہ سلیم جاوید سے ہمدردی کرنے کو جی چاہتا ہے ویسے ایمبولینس کے اس جدت پسند استعمال کو صرف پردہ کے قریب والے تماشائی پسند کر سکتے ہیں۔

فلم کا قابل تعریف حصہ سنجیو کمار کی اداکاری ہے جو ساری فلم پر چھایا ہوا ہے امیتابھ نے اپنے انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے کردار کو خوبی سے نبھایا ہے۔ ششی کپور کا کردار "دیوار" اور "کبھی کبھی" کے کرداروں کی طرح متوازی نہیں اس لئے اپنے مخصوص انداز کے باوجود ششی کپور پوری طرح ابھر نہیں سکا۔ راکھی کا کردار متاثر کرتا ہے لیکن اس کے رول کو کہانی کے اعتبار سے اور زیادہ جاندار بنایا جا سکتا تھا۔ ہیما مالنی کے کردار کو گولف، ٹینس کورٹ اور رسٹوران میں DECORATION PIECE کے طور پر استعمال کیا گیا ہے پونم کی پہلی کوشش قابل تعریف ہے سچن بس ٹھیک ہے۔ پریم چوپڑہ اپنے انداز میں کامیاب ہے۔ یش چوپڑہ کی ہدایت بے داغ، دلکش اور خوبصورت ہے جو تماشائی کی توجہ کو بھٹکنے نہیں دیتی۔ سلیم جاوید نے کہانی کے کمزور حصوں کو مضبوط اور تیز رفتار اسکرین پلے سے سہارا دینے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اس کوشش میں ان کے دلچسپ و متاثر کن مکالمے بھی شامل ہیں۔ فلم کے تیز رفتار اور کثیف ماحول میں موسیقی کے

(باقی ص ۴۲ پر)

فلمی ڈائری

راج کپور کی معرکتہ الآرا فلم "ستیم شیوم سندرم" اسی مہینے سارے ہندوستان میں ریلیز کی جارہی ہے۔ اس فلم کی پبلسٹی فلم کی ہیروئن زینت امان کے انتخاب سے اب تک مختلف انداز سے ہوتی رہی ہے۔ فلم کا انوکھا موضوع بھی ایک عرصے تک فلمی حلقوں میں بحث کا مرکز بنا رہا۔ اب فلمی دنیا میں اس فلم کے تعلق سے دو نقاط نظر پیدا ہوگئے ہیں ایک نقطۂ نظر کا حامل گروپ تمام پبلسٹی کو ایک اسٹنٹ قرار دے رہا ہے جبکہ دوسرے گروپ کا خیال ہے کہ یہ فلم راج کپور کے فن کا ایک اور شہ پارہ ہوگی جو باکس آفس پر بھی کامیابی کے نئے ریکارڈس قائم کرے گی ویسے "ستیم شیوم سندرم" راج کپور کے لئے ان معنوں میں بھی ایک چیلنج ہے کہ راج کپور کے گن گنت چاہنے والے اور دوسرے تماشائی یہ دیکھنے کے مشتاق ہیں کہ آیا راج کپور اس فلم میں فنی و تجارتی اعتبار سے "بوبی" سے ایک قدم آگے بڑھنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں یا نہیں۔ راج کپور کی نگرانی میں لکشمی کانت پیارے لال کی مدھر موسیقی کے ساتھ اس فلم کے ایک لاکھ سے زائد ایل۔پی اب تک فروخت ہو چکے ہیں اگر ریکارڈس اسی تیزی سے فروخت ہوتے رہے تو فلم کی ریلیز سے پہلے ریکارڈس کی فروختگی کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہوسکتا ہے

★

کمال امروہی کی تاریخی فلم "رضیہ سلطان" تقریباً آدھی مکمل ہوچکی ہے۔ بڑے بجٹ کی اس عظیم الشان فلم کے بارے میں رائٹر ڈائرکٹر کمال امروہی نے بڑے ہی وثوق سے کہا ہے کہ یہ فلم تاریخی فلموں کے ایک نئے دور کا آغاز کرے گی۔ ہیما مالنی جو فلم کا مرکزی کردار ادا کر رہی ہے اپنے رول کو اپنی فلمی زندگی کا یادگار رول بنانے کے لئے انتھک کوشش کر رہی ہے۔ ہر سین سے پہلے مکالموں کے ٹیپ حاصل کرکے ہیما ان پر کافی محنت کر رہی ہے تاکہ وہ اس تاریخی کردار کو حقیقت سے زیادہ سے زیادہ قریب کرسکے۔ اس فلم کے ایک ایک سین پر بے اندازہ دولت صرف کی جارہی ہے جس کی ذمہ داری دی کے لے۔ کے۔ مصرا نے لی ہے جو ایک بہت بڑے ڈسٹری بیوشن ادارے کے مالک ہیں۔ فلم میں ہیما مالنی کے علاوہ دھرمیندر، سہراب مودی، پردیپ کمار، وجیندرا، پروین بابی اور ساریکا مختلف اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

★

رمیش بہل کی "قسمیں وعدے"

جس میں امیتابھ بچن، رندھیر کپور، راکھی اور نیتو سنگھ نے کام کیا ہے باکس آفس پر بے حد کامیاب جا رہی ہے۔ رندھیر کپور نے پہلی بار اس فلم میں اتنی خوبصورت اور جاندار اداکاری کی ہے کہ وہ امیتابھ کا ہم پلہ نظر آتا ہے۔ اس فلم کی کہانی اور اسکرین پلے "مرزا برادرس" نے تحریر کیے ہیں۔ تینوں بھائیوں ہمایوں مرزا، شہ رخ مرزا اور ماہ رخ مرزا کی یہ ٹیم کہانی کار اور اسکرین پلے رائٹرس کی حیثیت سے کافی مشہور ہوچکی ہے اور تیزی سے کامیابی کے زینے طے کر رہی ہے۔ ہمایوں مرزا اس سے پہلے "زخمی" کا اسکرپٹ لکھ چکے ہیں۔ "قسمیں وعدے" ان تینوں بھائیوں کی مشترکہ کوشش ہے جس کی کامیابی کے سبب یہ کئی فلم سازوں اور ہدایتکاروں کی توجہ کا مرکز بن گئے ہیں۔ اپنی پہلی کوشش کے بارے میں ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس فلم کی کامیابی کا انھیں پہلے ہی یقین تھا۔ اپنے کام کے طریقۂ کار کے بارے میں ان لوگوں نے بتایا کہ چونکہ فلم کا اسکرپٹ تیار کرتے ہوئے مختلف شعبوں پر پوری پوری توجہ دینی پڑتی ہے اس لئے یہ لوگ بھی اپنے کام کو تقسیم کر لیتے ہیں۔ ہمایوں مرزا فلم کے جذباتی حصوں پر توجہ دیتے ہیں، ماہ رخ فلم کے تیز رفتار واقعات پر کام کرتے ہیں۔ اور شہ رخ ڈرامائی عنصر پر۔ ویسے تو فلمی دنیا میں کہانی کاروں اور قلم کاروں کی کمی نہیں ہے لیکن اچھے کہانی کار کم ہیں جو بے حد مصروف ہیں۔ اچھے اور کامیاب قلم کار بمبئی کی مختلف "فائیو اسٹار" ہوٹلوں مثلاً "سن اینڈ سینڈ" "اوبرائے شیریٹن" وغیرہ میں شفٹ سسٹم میں کام کرتے ہیں۔ صبح میں

ایک ہوٹل میں ایک فلم کے لئے۔ دوپہر میں دوسری فلم کے لئے دوسری ہوٹل میں اور شام میں تیسری ہوٹل میں۔ یہ اچھے یا کامیاب کہانی کار اور فلم کار وہ ہیں جن کی فلمیں باکس آفس پر سلور جوبلی یا گولڈن جوبلی منا چکی ہیں۔ فلمی دنیا میں کامیابی کا واحد پیمانہ باکس آفس ہے۔ "مرزا برادرس" بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ مشین کی طرح کام کرنے کے قائل نہیں ہیں

★

پچھلے سال "راجشری فلمز" واحد ادارہ تھا جس کی سب سے زیادہ فلمیں باکس آفس پر کامیاب ہوئیں۔ اس وقت اس ادارہ کی ۸ فلموں کی شوٹنگ چل رہی ہے جیسے ایک انگریزی فلم ASSIGNMENT BOMBAY بھی شامل ہے۔

★

بی۔ آر۔ چوپڑہ کی فلم "برننگ ٹرین" کے لئے بمبئی کی فلم سٹی میں بمبئی سنٹرل اسٹیشن کا ایک عظیم الشان سیٹ تیار کیا گیا ہے۔ اس سیٹ پر ریلوے لائن تاروں کے کھمبے، سگنل پوسٹ، کنٹرول ٹاور اور دوسری عمارتیں اس انداز میں تعمیر کی گئی ہیں کہ حقیقی ریلوے اسٹیشن کا گمان ہوتا ہے آرٹ ڈائرکٹر شانتی داس کی نگرانی میں تیار ہونے والا یہ سیٹ فلمی دنیا کا سب سے بڑا سیٹ ہے

★

امرتسر میں بعض ہریجن قائدین نے "گنگا کی سوگند" فلم کے خلاف مقدمہ دائر کیا ہے کہ اس فلم کے بعض مکالمے ان کی دل شکنی کا سبب بنے ہیں۔ عدالت نے فیصلے تک فلم کی نمائش پر پابندی لگادی ہے۔

★

موسیقار خیام کو "کبھی کبھی" کی سحر انگیز موسیقی کے لئے "گولڈ ڈسک" ملا تھا۔ اس کے بعد مینا کماری کی "میری تخلیق میری آواز" کے لئے اور اب "ترشول" کی موسیقی کے لئے "سلور ڈسک" ملا ہے

★

"امانش" جیسے شکتی سامنت ہندی اور بنگالی میں بنا چکے ہیں اب ٹامل میں بن رہی ہے جس میں شیواجی گنیشن مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ فلم تلگو زبان میں کامیاب ثابت ہوئی۔

★

سریندر موہن جب فلموں میں آئے تھے تو لوگوں نے ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تھی لیکن "ہتیارا" کی کامیابی کے بعد وہی لوگ ان کی صلاحیتوں کے قائل ہوگئے ہیں اب "فدا گولہ" کے رش پرنٹس دیکھ کر لوگ سوچ رہے ہیں کہیں سریندر موہن دوسرے من موہن دیسائی نہ بن جائیں۔ سریندر موہن۔ راکیش روشن کی اپنی فلم بھی ڈائرکٹ کر رہے ہیں جس میں [illegible] اور نیتا مینن کام کر رہے ہیں۔ یہ راکیش روشن کی بحیثیت فلمساز پہلی فلم ہوگی۔

★

گلزار کے ایک اسسٹنٹ معراج پہلے ہی ڈائرکٹر بن چکے ہیں۔ انھوں نے "پلکوں کی چھاؤں میں" کی ہدایت دی ہے۔ اب ان کے دوسرے اسسٹنٹ چندر شیکھر بھی نانک فلمز کی آنے والی فلم کی ہدایت دیں گے۔ "پلکوں کی چھاؤں میں" کی طرح یہ فلم بھی گلزار ہی کی لکھی ہوئی ہے۔

★

سلیم جاوید نے اپنی بے مثال کامیابیوں کے ذریعے نہ صرف فلمی دنیا میں ایک نئی تاریخ بنائی ہے بلکہ فلمی کہانی کاروں اور قلم کاروں کو وہ مقام دلایا ہے جس کا کسی نے خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ آج ہر فلمساز اور ہدایت کار، فلم کی کہانی اور موضوع کی اہمیت کا قائل ہوگیا ہے۔ اب کہانی کاروں کی یہ عظیم جوڑی عظیم ہدایت کار وی۔ شانتارام کے لئے کہانی اور اسکرین پلے لکھ رہی ہے۔ یقیناً یہ ملاپ کسی عظیم شہ پارہ کی تخلیق کرے گا۔

POONAM URDU MONTHLY,

...pura, Hyderabad-500 026. Editor : Nasir Kurnool, M.A.

...CE BOOKING

at : Dilshad : 10 a.m. to 2 p.m. only

...line, Shaam & Nataraj : 11- to 1 & 4 to 6 p.m

at : Sudha & Sobhana : During show timings.

Releasing On Friday 16 JUNE

Love is Truth ...... Love is Sublime ...... Love is Beautiful............

Raj Kapoor's



...OR ADULTS ONLY)

...SHI KAPOOR, ZEENATH AMAN

...nce Booking at DISHAD for entire one week and Daily 4 Shows

At : 11-30 a.m. ...

DILSHAD

Aircooled

SUDHA

Shalibanda

SKYLINE

&

NATRAJ-70mm

A/C

...from Fri. 16th to Sun. 18 June Daily 4 Shows At : 11-30 a.m. ...

JULY - 1978

Price : Rs. 1.[illegible]

اشاعت کا چودھواں سال
پچاس جلد کا کثیر الاشاعت
شعری، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

پونم

ایڈیٹر:
ناصر کرنولی ایم اے عثمانیہ

جلد (۱۴) شمارہ (۷)
جولائی ۱۹۷۸ء

زر سالانہ (۱۵) روپے
لائبریریز کے لئے (۲۰) روپے
بیرونی ممالک سے (۳۵) شلنگ
فی پرچہ ـــــ Rs. 1/25

خط و کتابت کا پتہ:
منیجر ماہنامہ پونم
16-7-300/1
اعظم پورہ، حیدرآباد ۲۴...۵

پونم میں شائع ہونے والے تمام مضامین میں نام، واقعات، کردار، اور مقامات فرضی ہوتے ہیں، اُن سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی جس کے لئے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔

طباعت:
[illegible] الیکٹرک پریس
[illegible]

ترتیب

اسکول - کالج - کارخانے - دواخانے

بلدیات اور پنچائتیں

* اس موسم میں درخت لگاکر اپنے احاطوں کی خوبصورتی بڑھائیں۔

** پھل دار، سایہ دار اور پھولدار درختوں کے پودے

بالکل مفت ہمدست ہوسکتے ہیں

*** پودے لگانے کا موسم — جولائی اور اگست

پودوں اور مشورے کے لئے
درج ذیل دفاتر سے ربط پیدا کیجئے

دونوں شہروں میں	اضلاع میں
ڈیویژنل فارسٹ آفیسر	ضلع مستقر پر واقع
اکسٹنشن ڈیویژن	دفتر ڈیویژنل فارسٹ آفیسرز
حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۴	
فون نمبر ۳۰۵۲۱ (ایکسٹنشن ۴۵)	

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش - حیدرآباد

LETTER NO: 992/ADVT/CA/78 Dt. 14-?-78, DIPR No: 10/78-79

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

یکم جون ۱۹۷۸ء کی صبح ایوانِ اردو کا ایک اور ستون زمیں بوس ہو گیا۔
ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی ریڈر اردو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ اردو ادب ایک دیانتدار نقاد سے اور نوئم کے صفحات اپنے ایک دیرینہ کرم فرما کے قلمی تعاون سے محروم ہو گئے
خلیل الرحمٰن اعظمی کی موت ایک روشن دماغ کی موت ہے جس سے بے پناہ ذہانت کی کرنیں پھوٹتی تھیں۔ ایک شاعر، ایک نقاد، ایک استاد اور ایک اچھے انسان کی حیثیت سے ان کا درجہ نہایت بلند تھا
جدید شاعری میں اعظمی نے جو گُل پھول کھلائے ہیں ان میں کلاسک کی مہک بھی ہے اور نئے پن کی مہک بھی۔
ان کے دو مجموعے "کاغذی پیرہن" اور "نیا عہد نامہ" ان کی شعری صلاحیتوں کے خوب صورت ثبوت ہیں۔ بحیثیت نقاد اعظمی کے انتقادی شعور کے نیاز فتح پوری سے جدید اور کم عمر صاحبِ قلم تک معترف اور مداح تھے۔ جب نگار میں اعظمی کا مضمون حسرت موہانی پر چھپا تو باوجود نظریاتی اختلاف کے نیاز صاحب نے ایک توصیفی نوٹ لکھا جب کہ حسرت نیاز کے محبوب اور پسندیدہ شاعر تھے۔
"آتش" پر اعظمی نے اس قدر بصیرت افروز مقالہ لکھا کہ سارے ملک میں دھوم مچ گئی۔
غرض کہ "فکر و فن" "نوائے ظفر" "ترقی پسند تحریک" "مقدمۂ کلامِ آتش" وغیرہ اردو انتقادیات کا ایک عظیم سرمایہ ہیں۔
"اعظمی" نے علیگڈھ ہی میں تعلیم پائی۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا۔ لکچرار بنے پھر ریڈر ہوئے اور اب جبکہ انھیں پروفیسر شپ ملنے کو تھی وہ چل بسے۔
ہم خلیل الرحمٰن اعظمی کی بیگم اور بچوں کو پرسہ دیتے ہیں۔
ان احباب کو پرسہ دیتے ہیں جنھیں ان کی رفاقت حاصل تھی۔
دیارِ سرسید میں پیوند خاک ہونے والے شاعر کو خدا اپنی رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

(ادارہ)

خلیل الرحمٰن اعظمی

میں گوتم نہیں ہوں

میں گوتم نہیں ہوں
مگر میں بھی جب گھر سے نکلا تھا
یہ سوچتا تھا
کہ میں اپنے ہی آپ کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں
کسی پیڑ کی چھاؤں میں
میں بھی بیٹھوں گا
اک دن مجھے بھی / کوئی گیان ہوگا
مگر جسم کی آگ
جو گھر سے لے کر چلا تھا
سلگتی رہی
گھر کے باہر ہوا تیز تھی
اور یہ بھی بھڑکتی رہی
ایک اک پیڑ جل کر ہوا راکھ
میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں
جہاں میں ہی میں ہوں / جہاں میرا سایہ ہے
سائے کا سایہ
اور دور تک
بس خلا ہی خلا ہے

غزل

مری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے

میں اپنے گھر کو بلندی پہ چڑھ کے کیا دیکھوں
عروجِ فن! مری دہلیز پر اتار مجھے

اُبلتے دیکھا ہے سورج سے میں نے تاریکی
نہ راس آئے گی یہ صبحِ زر نگار مجھے

کہے گا دل تو میں پتھر کے پاؤں چوموں گا
زمانہ لاکھ کرے آ کے سنگسار مجھے

وہ فاقہ مست ہوں جس راہ سے گزرتا ہوں
سلام کرتا ہے آشوبِ روزگار مجھے

شاذ تمکنت

زمیں کا قرض

(خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں)

زمیں کا قرض ہے ہم سب کے دوش و گردن پر
عجیب قرض ہے یہ قرضِ بے طلب کی طرح
ہمیں ہیں سبزۂ خود رَو ہمیں ہیں نقشِ قدم
کہ زندگی ہے یہاں موت کے سبب کی طرح
ہر ایک چیز نمایاں ہر ایک شئے پنہاں
کہ نیم روز کا منظر ہے نیم شب کی طرح

تماشہ گاہِ جہاں عبرتِ نظارہ ہے
زیاں بہ دستِ رفاقت کے کاروبار مرے
اُترتی جاتی ہے بام و درِ حیات سے دھوپ
بچھڑتے جاتے ہیں اک ایک کرکے یار مرے
میں دفن ہوتا چلا ہوں ہر ایک دوست کے ساتھ
کہ شہر شہر ہیں بکھرے ہوئے مزار مرے

صنعتی ادارے اور کارخانہ جات

خصوصی توجہ دیں

قانون کارخانہ جات کے دفعہ ۶۱۱۔ جس کے مطابق کارخانوں کے
تحت کے علاقوں میں درختوں کا لگانا لازمی ہے۔

درخت فضائی آلودگی اور
گرمی کی شدت کو کم کرتے ہیں

اس موسم (جولائی۔ اگست اور ستمبر) میں درخت لگا کر
مزدوروں کو خوشگوار سایہ فراہم کیجیئے
اور
اپنے علاقوں کو خوبصورت بنالیجئے

پودوں کی مفت سربراہی اور مشورے کے لیئے
درج ذیل دفاتر سے ربط پیدا کیجیئے

دونوں شہروں میں

ڈیویژنل فارسٹ آفیسر
اکسٹنشن ڈیویژن
حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۴
فون نمبر ۳۰۵۳۱ (اکسٹنشن ۴۵)

اضلاع میں

ضلع مستقر پر واقع
دفتر ڈیویژنل فارسٹ آفیسر

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

LETTER NO: 592/ANVT/C4/78 Dt: 14-6-78

DIPR. NO. 11/78-79

از: ڈاکٹر سعد ظلام
ترجمہ ـــــ ڈاکٹر ظہور احمد

اقبال امیرِ سخن، اللہ کا شاعر

(ڈاکٹر سعد ظلام الازہر یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کے استاد ہیں۔ دنیا کے اہل علم و فضل میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں ایک بلند پایہ ادیب اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پختہ فکر شاعر بھی ہیں ازہر یونیورسٹی کے علمی و تحقیقی رسالے مجلۃ الازہر میں ان کا یہ قصیدہ بعنوان "اقبال امیر الکلمۃ" یعنی اقبال شعر گوئی کا امیر چھپا ہے۔ یہ ان کے منتخب قصائد میں سے ایک قصیدہ ہے جو میں نے حالیہ دورۂ مصر کے موقع پر جمع کئے اور "اقبال عرب شعراء کی نظر میں" کے عنوان سے زیر ترتیب کتاب میں مع ترجمہ شامل ہے قارئین کی خدمت میں اس کے چیدہ چیدہ مقامات کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔ مترجم)

میں دلِ مسلم کی لطافت و پاکیزگی ہے۔ بیت اللہ کی زیارت کرنے والے کا سا خشوع و خضوع ہے اور ذوق و شوق سے لبریز دل کے ساتھ حاضر ہوا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرے جذبۂ محبت اور طلب کی تشنگی کی تسکین کا سامان ہو۔

میری آرزو ہے کہ اپنے فریضۂ ضمیر کے ذریعے اللہ کے شاعر اور راست کے نغمہ سرا سے سرگوشی کا لمحہ نصیب ہو۔ اور میں اپنے ظلمت زدہ دل کو ضیائے حرم جیسی روشنی کے طفیل تازگی و درخشندگی دینا چاہتا ہوں!

اقبال! آپ تو میرا خواب بھی ہیں بیداری بھی، اور آپ ہی میرے خوابوں کو پریشان ہونے سے بچانے والے بھی ہیں! میں تو پناہ کا متلاشی ایک پرندہ ہوں، جسے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اہل عشق کی خبر گیری کے ساتھ ساتھ نغمات کی گرمجوشی بھی فراہم کر سکتا ہو!

میں تو ایک زخمی دل ہوں جو زخمی پرندے کی طرح خود کو مرہم رکھنے والے چارہ گر کے آغوش میں ڈال دینے کا متمنی ہوں۔ ایک بھٹکنے والے پیاسے انسان کی مانند باب آرزو پہ دستک دینا چاہتا ہوں، شاید تسکین کا سامان میسر آ سکے۔ اور بلند پرواز ی نصیب ہو جائے

اقبال! مجھے بھی اپنے اُمڈتے ہوئے پاکیزہ سرچشمے سے سیراب کیجئے! اور اپنی کریمانہ روشنی کے دائرے میں سمیٹ لیجئے! مجھے بھی ایک الہام یافتہ نغمہ گر کی روح عطا کر دیجئے۔ کیونکہ جذبۂ عشق اسی قدر بڑھتا ہے جس قدر اس کا عطا کرنے والا روحانی القاء و الہام سے بہرہ ور ہوتا ہے۔!

اقبال بھی سقراط کی طرح شاہ سخن اور حق گو تھا، وہ بھی فکر انسانی کے ان پیامبروں میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ جن کی قلم کاری زندہ جاوید بن گئی ہے۔ جو کاروانِ حق کو حیاتِ نو بخشتے رہے۔ اور حق کا علم بلند کرتے رہے! وہ ایک ایسے فلسفی تھے جو عقل کے قدر شناس اور اس کی قیمت کو جلا بخشنے والے تھے!

اقبال نے انسانیت کی تشنگی کو سیرابی سے بدل دینے کا سامان کیا، وہ اسلام کا ایک مشعل تھا۔ جس کی نغمگی نے دُور دُور تک روشنی پھیلا دی۔ وہ دین کے بغیر دنیا کو ایک مبہم، بے معنی اور بے فائدہ خواب تصور کرتے تھے!

اقبال اگر اپنے روح پرور نغمات میں اسلام کی مدح سرائی نہ کرتے، اسلام سے بے رخی کرتے اور اس کی عظمت و شوکت کے گیت نہ گاتے وہ اگر اللہ کے بتائے ہوئے راہ ہدایت اور روحِ اسلام سے لاتعلقی کا مظاہرہ کرتے تو اہل یورپ اسے سر پر اٹھا لیتے، اس کے منظوم گیتوں کو اچھالتے اور اس کی یاد کو غیر فانی بنانے کے لئے ایک زوردار رزمیہ گیت تخلیق کر ڈالتے

اے شاعرِ اسلام! اے سازِ اسلام!

اللہ تعالیٰ نے تر و تازہ احساس و شعور میں ڈھالا ہے! جس نے قوت ایمانی کے

کو چمک دمک عطا کی۔ جسے اللہ نے اسرار و رموز کے مخفی گوشے عطا کئے تھے۔

تیری روح اسرارِ دین کو دھڑکتے ہوئے حساس دل کے ساتھ پرجوش نغموں کی شکل میں پیش کرتی ہے تیرے نزدیک دین ہی وہ لے ہے جس میں نغمہ سرائی زیب دیتی ہے۔ یہی وہ موتی ہے۔ جس کا دور کبھی نہیں ٹوٹ سکتا! یہ دینِ متین ہی وہ عظمت ہے، جسے تو نے چاہا، جو تمام عمر تیرا سرمایۂ فخر رہا!

یورپ کے ساز و نغمات تجھے خیرہ نہ کر سکے کیونکہ وہ تو ایک چھلکے کی مانند تھے جو کسی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑا ہو اور اس لئے بھی کہ یورپ کے ریگستان میں کوئی بھی روح پرور نخلستان نہیں جہاں تھکا ہارا مسافر کچھ دیر کے لیے آرام کر سکے۔

بات دراصل یہ ہے کہ زندگی تو دین سے عبارت ہے اگر وہ لٹ گیا تو پھر نہ تو قافلۂ زندگی محفوظ ہے اور نہ لذتِ سفر باقی رہتی ہے اور جب ایمان کی دولت کھو جائے تو بشریت کا احساس و شعور بھی بے چینی و پریشان حالی سے دوچار ہو جاتا ہے!

٭ ٭ ٭

اے توحیدِ الٰہی کے نغمہ خواں اے برکت کمادی کے طفیل روحانیت کا والہانہ شیدائی بھی ہے! نغمۂ توحید نے صاف و شفاف سرچشموں سے سیراب شدہ تیرے تر و تازہ احساس و شعور کو کیا کیا افکار بلند الہام والقا کئے ہم ملت اسلامیہ ایک ریوڑ کی مانند ہیں جو ایک ہی جسم و وجود رکھتی ہے، جس کا احساس و شعور ایک اور جس کے دلوں کی دھڑکن بھی ایک ہے! کیا ہم توحید پر ایمان رکھنے والی امت نہیں؟ وہی توحید جو سراپا جذب و شوق، روشنی ہی روشنی اور اخوت ہے

قرآنِ کریم نے ہمیں ایک امت بنا کر راہِ وفا و اخلاص پر ڈال دیا۔ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے۔ ہمارا نبی بھی ایک ہی ہے جو خیر الانبیاء ہے جو سرچشمۂ ہدایت اور اللہ کے نور و برکت کی بنیاد پر قائم ہے

جب سے کائنات ہستی نے ہمارا وجود دیکھا ہے اس وقت سے دنیا میں صبح روشن جلوہ فگن ہے اور ایک نغمۂ امید و رجائیت گونج رہا ہے گویا کائنات کو جگانے والا ہمارا ہی نغمہ تھا ہم نے ہی اسے تازگی اور چمک دی ہے ہم نے روئے زمین پر امن و سلامتی اور نورِ ہدایت کے پودوں کی آبیاری کی اور ایک عظمت و شوکت کی عمارت کھڑی کی! کتنی خوبصورت عمارت تھی وہ لغد کتنے شریف و باکمال تھے اس کے معمار!

٭ ٭ ٭

اب پھر سے مشرق نے پرانے پھولوں کا تاج سجا لیا ہے مگر اس کی آرزوئیں ابھی دبی ہوئی ہیں جنہیں بادِ سموم کے بے رحم تھپیڑے مسلے چلے جاتے ہیں۔

اقبال! ذرا تھم کر دیکھئے، مشرق آپ کو ایک زخمی پرندے کی طرح نظر آئے گا جس کے پروبال نظر آئے گا جسے قید و بند کے مظالم نے ڈھا رکھا ہے اور اس کے زخموں سے ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔

مشرق کے لیڈر تو بہت ہیں مگر ہیں سب بیتموں کا ریوڑ! العدین سے ہم سرکش اٹھیں پہاڑ مجرمانہ شر و خباثت پر تلا ہوا ہے اور کے سبب ہمیں جہنم کی آندھیوں کے تھپیڑوں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے جس کے سبب ہم ذلت و الم کی غلامی میں کراہ رہے ہیں۔

مایوسی ہمارا درد زبانی ہے۔ ہم بھی کبھی ہڈیوں سے بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ پھر ہم خود کو پرانے نغمات اور قدیم عظمتوں سے بہلاتے ہیں اور وہ کہانیاں بڑے بھونڈے انداز میں دہراتے رہتے ہیں جنہیں دنیا سن سن کر بیزار ہو چکی ہے۔

اقبال! اب ہم میں نغماتِ فردوس گنگنانے والا کہاں سے آئے گا جو ایک عظیم الشان آبشار کی مانند جذبہ آرزو بیدار کر سکے جو جذبہ فکر کی بیڑیاں کاٹ ڈالے اور شکستہ دلوں کو تازگی عطا کرے اور ان میں نیا جوش و ولولہ پیدا کر دے

٭ ٭ ٭

اے فرزندِ اسلام! یہ دنیا تو ایک رزمگاہِ حیات ہے جہاں مخلصانہ پیار اور وحشت کی نفس پرستی باہم دست و گریباں رہتے ہیں۔ جہاں تمناؤں کی کشتیوں کو غداری و عیاری کی آندھیاں اڑا لے گئی ہیں اور اب وہ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈگمگاتی پھرتی ہیں!

ہمارا بیت المقدس صہیونیوں کے قبضے میں

(باقی صفحہ آئندہ)

اقبال متین

اُردو افسانے کے بیس سال

ادبی اکاڈمی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے سیمینار منعقدہ ۲۱، ۲۲ اپریل ۷۸ء میں پڑھا گیا

اگر میں بیس برس اِدھر کے افسانے سے مراد یہ لیتا ہوں کہ میری نسل کے پہلے کی کھیپ کے افسانہ نگاروں نے جو لکھا ہے وہ بیس برس اُدھر کا افسانہ ہے اور آج میں اور میرے ہم عصر جو لکھ رہے ہیں وہ بیس برس اِدھر کا افسانہ ہے تو شاید میں صحیح طور پر کل اور آج کے افسانے کا تعین نہیں کر سکا ہوں۔ اس لئے بھی کہ میری بعد کی نسل کے لکھنے والے اور پھر اس کے بعد کی جدید تر نسل کے لکھنے والے مجھے آج کا تسلیم نہیں کرتے کل کا ٹھہراتے ہیں برخلاف اس کے میں منٹو، بیدی کرشن اور قاسمی کو بھی نہ صرف آج کا افسانہ نگار تسلیم کرتا ہوں بلکہ آنے والے کل کا بھی۔ میری دانست میں ادب کی کسی صنف کو بھی زماں کے اس محدود سیاق و سباق میں سمجھنے کی بجائے وسیع تر تناظر میں سمجھنے، پرکھنے اور رد و قبول کرنے کی کوشش کی جانی چاہیئے ——— آج اور کل یا بیس سال اِدھر یا اُدھر ... [illegible] ایک بات جو ... [illegible] ... ذہن کو ... [illegible] ... کہ ہم ... [illegible]

افسانے کا آج کے افسانے سے تقابل موازنہ کرنے کا جواز تلاش کر رہے ہیں سوال یہ ہے کہ اس موازنہ یا تقابل کی ضرورت ہی کیوں محسوس کی گئی ——— وہ افسانہ جسے آپ کل کا افسانہ سمجھتے ہیں وہ آج کا افسانہ بھی ہے اور وہ آنے والے کل کا افسانہ بھی ہو سکتا ہے یہ بھی عین ممکن ہے کہ میرے آج کے افسانے کے لئے آنے والا کوئی کل ہو ہی نہیں۔ ایسے میں ایک بات واضح ہوتی ہے کہ ادب اگر وہ اپنے وسیع تر مفہوم میں ادب ہے تو کل اور آج کے سوا آنے والا کل بھی اُس کا ہو سکتا ہے اور اگر نہیں ہو سکتا ہے تو اُس ادب ہی میں کچھ کھوٹ ہے اور اس کھوٹ کو کھرا ثابت کر کے زندگی عطا کرنا کسی فن کار کے بس میں نہیں ہے اگر آپ اس بات کو تسلیم کر لیتے ہیں تو کل اور آج کے افسانے کے درمیان اتنی اُونچی دیوار کھڑی ... [illegible] ... کی جائے کہ ... [illegible] ... کر ... [illegible] ... بھی ... [illegible] ... نہ دے۔ ... [illegible] ... نظر کر کے اگر میں

بیس برس اُدھر کے افسانے سے آج کے افسانے کی الگ پہچان کے لئے کل کا افسا[ne] اس افسانے کو قرار دیتا ہوں جو ... خارجی عوامل اور اس کے محسوسات کا اعا[ne] کرتا ہے اور آج کے افسانے کو اس سے اس طرح ممیز کرتا ہوں کہ آج کا افسا[ne] ذات کے اندر کی طرف مراجعت کرتا ہے تو اس سے یہ بات کہاں ثابت ہو[ti] ہے کہ خارجیت اور داخلیت اپنا اپنا مطلق وجود اس طرح رکھتے ہیں کہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر اپنی پہچان بن سکیں غم ذات، غم زندگی سے منہ موڑ کر اپنا ... آگہی کے ویرانے بھی تلاش نہیں کر سکتا۔ تب ذات میں گم ہو کر ایک ... یقیناً تلاش کر سکتے ہیں۔ ذات کو کہیں ایسی جگہ لے جا کر چھپا نہیں سکتے کہ دنیا اُسے تلاش نہ کر سکے ——— بیس برس اُدھر کے افسانے نے ... [illegible] ... کیا ہے جہاں ... [illegible] ... کا ... [illegible] ... نہیں ہوا ہے۔ آج کا افسانہ ... ادب بن سکتا ہے جب وہ ذات ... [illegible]

درد کی آگہی کے لئے [illegible] ذات کی آگ میں تپ کر کندن بنے۔ بعض فیشن زدہ ترقی پسند جس مزدور اور کسان کا [illegible] ہے وہ اس سے واقف ہی نہیں تھے۔ فیشن زدہ جدید ادب کے علم بردار جس ذات کو رو رہے ہیں وہ اس کے اندر کی کرب سے واقف ہی نہیں ہیں۔ ادب کے ہر دور میں نظریے اور اقدار کے بدلنے سے شکست و ریخت کا یہ سلسلہ چلتا ہے اور جو بچ رہتا ہے وہی صرف وہ ہوتا ہے جو ادب ہوتا ہے۔

ادب کی کوئی قسم نہیں ہوتی۔
ادب کی صرف دو ہی قسمیں ہوتی ہیں۔
اچھا ادب اور برا ادب۔

کل کے افسانے کو آج کے افسانے سے جدا کر کے صاف پہچان لینا میرے لئے شاید اس لئے بھی دشوار ہے کہ میں خود کو کل کا افسانہ نگار بھی سمجھتا ہوں آج کا افسانہ نگار بھی۔ اور اگر میں ایسا نہ سمجھتا تو میری افسانوی موت واقع ہو گئی ہوتی۔ کوئی فن کار یہ کہہ کر نہیں لکھتا کہ وہ گھٹیا ادب لکھ رہا ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی کہہ کر نہیں لکھتا کہ وہ کوئی شاہکار تخلیق کر رہا ہے —— اگر وہ ان دونوں باتوں سے کوئی بات بھی تسلیم کر لے تو پھر وہ اور بہت کچھ کر سکتا ہے تخلیق نہیں کر سکتا۔

اچھے اور برے افسانے کی پہچان یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم افسانے کو اس کی [illegible] مبہم، ابہام اور گنجلک پیرایۂ اظہار کی وجہ سے اچھا ہونا قرار دیں۔ اگر یہ پیمانہ ہے تو پھر ادب پر ایسا وقت آپہنچا ہے کہ اس کے پیمانے صرف ایسی فیکٹری میں ڈھل رہے ہیں جو ان پیمانوں کی صورت گری کے لئے لوح و قلم کا ہر معاملہ استعمال کرتی ہے صرف خون دل استعمال نہیں کرتی۔

مجھے تسلیم کہ آپ نے شناخت کر لی۔ مجھے یہ بھی تسلیم کہ خود میرے اپنے کل کو آپ نے میرے اپنے آج سے الگ کر کے پھینک دیا لیکن میں آپ سے ایک بات پوچھنے کا حق تو مانگوں گا ہی کہ آپ نے میرے آج کو میرے کل پر فوقیت کس طرح دے دی۔ ادب کو آج اور کل کے خانوں میں بانٹے بغیر زندہ رہنے دینا ہوگا۔ اس میں کس بل ہے تو گیا ہوا کل بھی نہیں آنے والا کل بھی اس کا ہے اور اگر اس میں کس بل نہیں ہے تو اس کا اپنا آج بھی اس کا اپنا آج نہیں ہے۔

ایک افسانہ وہ بھی تھا جس کے لئے اس کا عظیم خالق یہ فتویٰ صادر کرتا تھا کہ افسانہ قاری کے اس لئے پلے نہیں پڑتا ہے کہ قاری نا اہل ہے اور قاری کی ذہنی سطح تک ضرورت نہیں ہے کہ خالق خود چلا آئے کی اہانت برداشت کرے۔ اس صورت حال میں تخلیق کا رشتہ یہاں تک ادھا کر دیا تھا کہ صاحب [illegible] صرف دو تین آدمیوں کے لئے لکھتا ہے۔ [illegible] خود لینے [illegible] اور وہ ایک ذہین اور فطین پڑھنے والوں کے لئے جو اس کی بات کو سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ایسا تخلیق کار اپنی تخلیق کی تین کاپیاں نکلوانے پر اکتفا نہیں کرتا کہ اپنے دو تین فطین پڑھنے والوں کے حوالے کر کے چین کی بنسی بجائے۔ وہ رسالوں میں چھپنا چاہتا ہے۔ اپنی توصیف کے حصول کے لئے اسی راندۂ درگاہ قاری سے رجوع ہوتا ہے اور وہ تماشہ کرتا ہے کہ الحفیظ۔ ادب میں ایسی چیستاں بازی کا زندہ رہنا زندہ زبانوں میں بھی مشکل ہے چہ جائے کہ ایسی زبان میں جس کی زندگی کے خود لالے پڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ آج یہ ہو رہا ہے کہ وہ لوگ جو اردو ادب شوق اور ذوق سے پڑھتے تھے وہ بھی اردو ادب نہیں پڑھ رہے ہیں۔ کسی عظیم فنکار کے لئے جب سرے سے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے کہ اس کا کوئی قاری بھی ہے یا نہیں تو قاری کے پاس اتنی فرصت کہاں ہے کہ آپ کی تخلیقات کے لئے اپنا سر بھی پھوڑے اور آپ کو عظیم بھی تسلیم کرے۔

میں نے اپنی زندگی کے تیس سال کہانی کے ناز اٹھائے ہیں۔ اس کے نخرے اور چونچلے سہے ہیں۔ آپ کو حق ہے کہ آپ اس کے باوجود مجھے کہانی کار تسلیم نہ کریں۔ لیکن آپ مجھ سے میرے قاری ہونے کا حق تو نہیں چھین سکتے۔ یہ حق تو نہیں چھین سکتے کہ میں اپنے ذہن کی ساری توانائیاں صرف کر کے بھی اگر آپ کا افسانہ نہ سمجھ سکوں تو اپنی سلامتی کیلئے

کہتے کہ میں بھاگ کھڑا ہو جاؤں اور رسالے میں نام دیکھ کر اپنی جان چھڑانے کے لئے احتراماً بغیر پڑھے اوراق الٹ دوں اور اپنے مصروف قیمتی وقت کی خیر مناؤں۔

یہ ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ اس قاری کی نسبت جو عام قاری ہے جانے پہچانے قاری میں اخلاقی جرأت اور ادبی دیانت داری کا زیادہ فقدان ہے۔ عام قاری کو اس کی پرواہ نہیں ہے کہ، آپ کون ہیں۔ وہ آپ سے نظریں پھیر کر آپ کی تخلیق کا قصہ ہی پاک کر دیتا ہے لیکن جانا پہچانا قاری جیسے میں ہوں۔ میں زیادہ بزدل ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ آپ مجھے جاہل قرار دیں گے۔ بھلا میں یہ کیسے سہہ سکوں گا سو میری مصلحت پسندی مجھے کچھ نہ سمجھنے کے باوجود سب کچھ سمجھا دیتی ہے

علامتی افسانے کا حسن یہ ہے کہ وہ کم کینوس پر وسیع تناظر کا احاطہ کرتا ہے علامت کا تخلیق کار کے ذہن سے قاری کے ذہن تک سفر ضرور ہوتا ہے اگر آپ علامت کو اپنی ذاتی ملکیت قرار دینے سے گریز کریں کہ قاری اس کا دروازہ کھٹکھٹانے کی جرأت بھی نہ کرے۔ علامت اس لئے وضع نہیں کی جاتی کہ آپ کو علامتی افسانہ لکھنا ہے۔ افسانہ اپنے دروبست کے لئے اپنے اظہار کے لئے علامت کا سہارا اس وقت لیتا ہے جب [illegible] کہ وہ [illegible] و مفاہیم کا زیادہ بوجھ اٹھانے کے قابل بنائے۔ اس لئے نہیں کہ سرے سے لفظ کی پہچان ہی ختم کر دے۔

یہ عجیب منطق ہے کہ آپ اس مشینی زندگی کی تیز گامی اور زود حسی۔ اس کے مزاج کی برق رفتاری و بے دردی، ان سب کا احاطہ کرنے کے لئے ایک علامت اس لئے وضع کرتے ہیں کہ وہ کئی سطور و صفحات کو پڑھنے والے کے ذہن میں کم وقت میں منتقل کر دے۔ اور جب آپ یہ سب کچھ کر سکنے کی اہلیت اپنی تحریر میں نہیں پاتے تو لفظ کی بے معنویت کا شکوہ کرتے ہیں اور اس حقیقت سے بھی پہلو تہی کرتے ہیں کہ آپ کی طرح آپ کا قاری، اس مشینی دور میں سانس لے رہا ہے۔ تخلیق کار نے اپنے اطراف کچھ ایسی خود ساختہ دیواریں کھڑی کر لی ہیں کہ وہ اس خول سے نکل کر زندگی کو دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہے بلکہ چاہتا ہے کہ اس کا قاری اسی کے خول کو توڑ پھینکے۔ یہ طرزِ فکر کہانی کو دو سمتوں پر بہت تیزی سے لے جا رہا ہے۔ ایک جہت اس کی بے معنویت کی ہے اور دوسری جہت اس کی لایعنیت کی جو اسے کو گھٹیا جاسوسی ادب سے ملا رہا ہے

اس پر مستزاد کہانی اپنا چہرہ کھو رہی ہے۔ اس کی پہچان مشکل ہو گئی ہے۔ فیشن زدہ [illegible] چہرہ کھونے کی وبا اس قدر عام ہو گئی ہے کہ تخلیق کار اپنے اور دوسروں کے چہرے [illegible] اپنے ہاتھوں ہی مسخ کرتا ہے اور پھر آئینے کے آگے کھڑا ہو کر خوف کھاتا ہے کہ ہر مسخ شدہ چہرہ اسے اپنا ہی لگتا ہے اور اس کا اپنا چہرہ تو سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ عمل جراحی اپنے چہرے ہی تک محدود ہوتا تو شاید قاری بھی رو پیٹ کر صبر کر لیتا۔ لیکن سرے سے کہانی اور افسانے کا چہرہ ہی اس حد تک مسخ کر دیا جائے کہ کہانی اور افسانہ خود کو نہ پہچان سکیں۔ کون سا تخلیقی عمل ہے۔ اصرار یہ ہے کہ اس کو افسانہ ہی کہا جائے۔ کیوں صاحب اگر تخلیقی افسانہ یہی ہے تو ہم اسے "تخفسہ" کیوں نہ کہیں۔ آپ کو افسانہ کہلوانے پر اصرار کیوں ہے آپ ادب میں توڑ پھوڑ کی اس بلندی پر پہنچ گئے ہیں اور نام رکھائی کے تماشے تقسیم ہوں تو نام توڑنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ منٹو، بیدی، کرشن (جن کو رد کرنا آج جدید ہونے کی پہلی شرط ہے) قاسمی، غلام عباس قرۃ العین حیدر ان کی ساری کی ساری غیر تخلیقی تخلیقات اس لئے مسترد کی جائیں کہ وہ "تخفسے" نہیں ہیں۔ یعنی تخلیقی افسانوں کی اس تعریف پر پورے نہیں اترتے جو آپ نے وضع کی ہے اگر تخلیقی افسانوں کی کوئی تعریف ہے

میرے نزدیک کہانی خواہ وہ علامتی ہو کہ تجریدی اس کو پہلے کہانی ہونا چاہئے۔ اس کا کہانی پن یا اس کی افسانویت [illegible] بے چہرگی سے [illegible] سکتا ہے جو نظر نہ آ رہا ہے ●●

صفدر علی صفدر مرزاپوری

شعر:۔ غلام حسین قمر

گو سر خرو ہوں دونوں پھر بھی ہے فرق اتنا
تیری حنا ہے میرا لہو لہو ہے

اصلاح:۔

گو سرخرو ہیں دونوں پھر بھی ہے فرق قاتل
تیری حنا حنا ہے میرا لہو لہو ہے

مصرعۂ اولیٰ میں زمانہ مستقبل تھا اور مصرعۂ ثانی میں زمانۂ حال تھا اصلاح سے پہلے مصرعہ کا زمانہ بھی حال ہو گیا اور قاتل کا لفظ اس شعر میں قاتل ہو گیا جس سے شعر میں جان پڑ گئی۔

شعر:۔ قمر

اک ناز نین سے مل کر کھوئے گئے کچھ ایسے
اب لے قمر ہمیں کو خود اپنی جستجو ہے

اصلاح:۔

اک زہرہ وش سے مل کر کھوئے گئے کچھ ایسے
اب اے قمر ہمیں کو خود اپنی جستجو ہے

زہرہ وش سے قمر کی مناسبت پیدا ہو گئی اور مقطع میں صنعت مراعاۃ النظیر کے علاوہ ایک خاص لطف بھی پیدا ہو گیا۔

شعر:۔ حمید اعظم گڑھی

نقاب رخ شب مہتاب میں کس نے اٹھا رکھا تھا
یہ عقدہ کھلا کس نے فلک پر ماہ کامل کو

اصلاح:۔

نقاب رخ شب مہتاب میں کس مہر نے اٹھی
نظر آنے لگے تارے فلک پر ماہ کامل کو

اس ترمیم سے شعر میں چار چاند لگ گئے۔ معنی روشن ہو گئے۔

شعر:۔ حمید

ہم مست ہیں شراب محبت پیے ہوئے
ہم پی کے کیا کریں گے مئے لالہ فام کو

اصلاح:۔

جو مست ہیں شراب محبت پیے ہوئے
وہ پی کے کیا کریں گے مئے لالہ فام کو

پہلے مصرعہ میں بجائے "ہم" کے "جو" اور دوسرے مصرعہ میں بھی بجائے "ہم" کے "وہ" بنا کر شعر کو لطیف اور دل آویز کر دیا۔

شعر: حمید

پیری کی صبح دیکھ کے روتے ہیں بیٹھ کر
اب یاد کرتے ہیں جوانی کی شام کو

اصلاح:۔

پیری کی صبح دیکھ کے آنکھیں سی کھل گئیں
اب یاد کرتے ہیں جوانی کی شام کو

"روتے ہیں بیٹھ کر" کچھ جچتا نہ تھا بجائے اس کے "آنکھیں سی کھل گئیں" کتنا با محل محاورہ ہے کیونکہ عموماً صبح کو آنکھیں کھل جایا کرتی ہیں۔

شعر:۔ شاہد جونپوری

ہے طرز سخن اور تو انداز بیاں اور
القصہ ہر اک بات پہ ہوتا ہے گماں اور

اصلاح:۔

ہے طرز نگہ اور تو انداز بیاں اور
ظالم تری ہر بات پہ ہوتا ہے گماں اور

طرز سخن و انداز بیان متحد المعنی تھے اس لئے پہلے مصرع میں "ہے طرز نگہ" بنا دیا اور مصرعۂ ثانی میں بجائے "القصہ ہر اک بات" بنا کر مطلع کو لطیف و نازک کر دیا۔

شعر:۔ شاہد

ساقیا موسم بہاری ہے
صرف اب تیرا انتظاری ہے

اصلاح:۔

ساقیا موسم بہار ہے اب
صرف تیرا ہی انتظار ہے اب

موسم بہاری کسی قدر کانوں کو برا معلوم ہوتا ہے اور انتظاری بمعنی انتظار تو قطعاً غلط ہے اس لئے قافیہ و ردیف دونوں ترمیم کر دیے گئے جس سے شعر کی صحت ہو گئی۔

آئندہ اصلاحیں

حضرت نوح ناروی

سائے دھنک میں ڈوبے کیوں؟

منظوم مختصر کہانی
ڈاکٹر غیاث صدیقی

سلمیٰ جب کالج کو گئی
تو ماں کی مانگ میں
باپ کی مونچھ میں
ہلکی سفیدی آنے لگی تھی
دونوں نے سازش کی
لڑکا ڈھونڈا
سلمیٰ کی شادی رچائی
پھر سلمیٰ کے شانوں پہ
دو ننھی ننھی گڑیاں جیسے اُگ آئیں
سلمیٰ کے شوہر کو
اک دن
اوپر سے بلاوا آیا
اُفق میں اک نغمہ گونجا
وہ نغمے کے پیچھے پیچھے بھاگے
رنگ بن گئے
اور دھنک میں ڈوب گئے

سلمیٰ کے اعصاب کے ساز بجنے لگے
شوہر، گڑیاں، کپڑے، الماری، گھر، زیور
کچھ بھی اس کو یاد نہ تھا
کسی نے اس کی عمر سے گویا
پانچ مہینے چُرا لئے تھے

ہوش کی کشتی ساحل سے جب ٹکرائی
سلمیٰ کے اعصاب کے ساز تھمے
ہونٹوں پہ گڑیوں کے نام آئے
ذہن کے دروازے سے کسی نے جھانکا
اب سلمیٰ اپنی گڑیوں میں مگن تھی

سلمیٰ کے بابا کو سلمیٰ کی تنہائی کھلتی تھی
اک فوجی افسر تھا
اس کے دو ننھے ننھے لڑکے تھے
اس کی بیوی بھی اک دن
افق کے اوپر چلی گئی تھی

سلمیٰ کے بابا نے
سلمیٰ کے ہاتھوں کو
فوجی افسر کے ہاتھوں میں تھما دیا
شاید دونوں گھر بس جائیں
سلمیٰ کو لڑکے، افسر کو گڑیاں مل جائیں

افسر کے لڑکوں کو ماں کا پیار ملا
قریہ قریہ کوچہ کوچہ
سلمیٰ ان کو سینے سے لگائی رہتی
لیکن سلمیٰ کی گڑیاں تو
شہر میں اپنی ماں کی خوشبو کو ترسیں
ایک تبسّم عیدی میں بھی مل نہ سکا

میں کب سے یہ سوچ رہا ہوں
سلمیٰ کا پیلا ہونا
شانوں پہ گڑیوں کا اُگنا
سایوں کا اُفق میں گم ہو جانا
کیا یہ نیارا تماشا تھا؟!

مظہر محی الدین

تسکین

مثل مشہور ہے
آج تک یہ زمین
صرف سونے کے انڈے اگلتی رہی
روح پرور غذاؤں کا مخزن رہی
ایک مدت ہوئی بس یہی سوچتے
روح پرور غذاؤں کی لذت کجا
اک نظر دیکھ لیں یہ بھی ممکن نہیں
حال کا تو بہرحال یہ حال ہے
کون جانے کہ ماضی کا کیا حال تھا
ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ اس شہر میں
میوزیم ہے — جہاں
مختلف دور کے
مختلف ساز و سامان محفوظ ہیں
چل کے دیکھیں بالآخر وہیں ہم، چلو
کم سے کم چشمِ مضطر کی تسکین تو ہو!

تلاش بہاراں

نفیر قریشی

ہوٹلوں اور کلبوں میں دل کا سکوں ڈھونڈتے ہو کہاں تم؟
ہر صدا شور میں بے صدا ہے
قہقہوں کا یہ سیلاب مرحوم لمحات کا مرثیہ ہے
چہرے اپنی چمک ڈھونڈتے ہیں
جسم خوش رنگ ملبوس کی ہیں دکانیں
جھوٹی خوشیوں کا بازار ہر سو لگا ہے
خواب کی کرچیاں ذہن اور دل میں چبھتی ہیں ہر دم
کھوئی جنت کا متلاشی آدم
پہلی غلطی کی تعزیر بھگتے
ربِ کون و مکاں سے اپنی تقصیر کو بخشوانے کا طالب
خود کو بہلا رہا ہے
اپنی پرچھائیوں ہی کا پرتو
ٹھوکریں کھا رہا ہے
یہ فلورا، فلورنڈا، سیتا و مریم
یہ شموئل، پرآن اور ڈیوڈ
آرزوؤں کے انبوہ میں خود کو تحلیل کرتے چلے جا رہے ہیں
سانپ عضوِ بدن سے ہیں لپٹے
زندگانی درندوں کے خونی حصاروں سے بچ کر نکلنے کی راہ ڈھونڈتے
سانس کی دھن بھی ہے الوداعی
رات کی بات کا صبح کے رخ پہ گہرا اثر ہے
زہرِ تنہائی رسیلا ہمیں بانٹتا ہے
یہ صدا، شور، نغموں کی یورش
وقت کے زلزلوں سے فنا ہونے والی ہیں سن لو!
تم بھی تنکوں کی مانند بکھروگے اک دن
یہ کلب، بزمِ مے، محفلِ صبح و شام بکھراؤ کی زد میں ہیں
راہِ نروان کی ڈھونڈنا ہے تو کہیں اور ڈھونڈو!
روح کا بند دروازہ کھولو!!

غزلیں

قطب سرشار

ریت کا گھر ہوں سمندر کی نمی رکھتا ہوں
موج در موج میں اُمید نئی رکھتا ہوں

جھوم جاؤں تو ہوا دل کو طراوت بخشے
درد کا پیڑ ہوں میں چھاؤں گھنی رکھتا ہوں

میری آنکھوں میں کوئی میں کسی چہرے کی ضیاء
فرد ہو کر بھی میں اندازِ دوئی رکھتا ہوں

چاہتا ہوں میں تجھے بس یہی کافی ہے مجھے
قیس کا دل نہ دم کوہکنی رکھتا ہوں

مجھ کو کھوجو نہ کریدو نہ ہی اندر جھانکو
جیسے اندر مرے باہر بھی وہی رکھتا ہوں

مجھ کو سرشار نے تہذیب کا مفلس جانا
بات یہ ہے کہ علاوت کی کمی رکھتا ہوں

رونق دکنی سیمابی

اتباعِ حاصلِ لاحاصلی کرتے رہے
تیرگی میں جستجوئے روشنی کرتے رہے

اجنبی راہوں میں تنہائی کا تھا جو احتمال
اپنے ہی سایہ سے صلح و آشتی کرتے رہے

دے نہ الزام کم آمیزی کا ہم کو اے ہمنشیں!
عالمِ شورش میں مشقِ خامشی کرتے رہے

تھی جو عبرت خیز دنیائے یقین و آگہی
بے حسی سے جرأتِ وابستگی کرتے رہے

موت آنے پر کھلا رازِ حیاتِ مختصر
عمر بھر جینے کی خواہش واقعی کرتے رہے

رابطے قائم جو کرنے تھے ہمیں انسان سے
مدتوں رونق تلاشِ آدمی کرتے رہے

سید اطہر حسین

مصلحت ہے جو چھپے ہیں وہ کہیں دل کے قریب
کھنچ گیا پردۂ حسرت مہِ کامل کے قریب

کس طرح کھلتے کسی پر یہاں اسرارِ حیات
حق کو جلتے نہیں دیکھا کبھی باطل کے قریب

یوں تو گمراہ ہوئے راہ میں کتنے ہی مگر
ہائے وہ لوگ جو بھٹکے کسی منزل کے قریب

ورطۂ بحر میں جا کر دُرِ مقصود ملا!
اور ہم تھے کہ کھڑے رہ گئے ساحل کے قریب

گر کے نظروں سے تری خود جو نمایاں تھا مجھے
پھر نہ جایا گیا مجھ سے تری محفل کے قریب

جاں سے گذرا کوئی دیوانہ کسی صحرا میں
اک بگولہ سا نظر آتا ہے محمل کے قریب

جب تلک پار نہ ہو جائیں کہیں کیا اطہر
کشتیاں کتنی تھیں ڈوبی ہیں جو ساحل کے قریب

سید شاہ نصیر الدین بسمل

میری قسمت میں اُن کی قربت ہے
بختِ زاہد میں صرف جنت ہے

اُس مقامِ شعورِ حسن میں ہوں
جس جگہ آپ کی ضرورت ہے

آپ بھی آزمائیں دنیا بھی
کیا یہی اہلِ دل کی قیمت ہے

دل میں آتا تو ہے نظر کوئی
ہو بہو آپ کی شباہت ہے

پیکرِ خاک مظہرِ انوار
کتنے پردوں میں یہ حقیقت ہے

تشنہ لب رہ کے بھی جو کیف میں ہوں
چشمِ ساقی کی یہ کرامت ہے

جب سے احساسِ قرب ہے بسمل
"زندگی کتنی خوب صورت ہے"

گداگری

• ڈاکٹر انعام الحق

ایک دوست نے یہ کہا
[illegible] ایک چیک مرا
کیش ہے آج ہی مجھے درکار
آپ دے دیں ایک دن کو ادھار
ایسے چمپت ہوئے رقم لے کر
آج تک پھر کہیں نہ آئے نظر
[illegible] یہ دو برس کی بات
[illegible] سے گیا ہیہات
یہ [illegible] گداگری دیکھو
دوستانہ گداگری دیکھو

ایک حضرت سفید پوش و جسیم
[illegible] ہوئے پیدا [illegible]
ابھی [illegible] کو [illegible] آیا ہوں
کچھ تبرک بھی ساتھ لایا ہوں
آپ [illegible] اب گھر بیٹھے
ہو [illegible] گھر بیٹھے
[illegible]
مجھ پہ پھر آپ کر دعا دو [illegible]
[illegible] گداگری دیکھو
[illegible] گداگری دیکھو

ایک صاحب سے پڑا پالا
ان دنوں جن کا بول بالا
[illegible] آئے ہیں کام مگر
آپ کو جانتے ہیں تین چار افسر
آپ خود جانتے ہیں بات ہے یہ
دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ
آپ اس کا اب انتظام کریں
کام ہم آپ کا تمام کریں
حاکمانہ گداگری دیکھو
افسرانہ گداگری دیکھو

ایک امیدوار الیکشن کا
میرے گھر آ کے یوں ہوا گویا
نظر التفات [illegible] ہے
آپ کو میری بات رکھنی ہے
ابلہانہ گداگری دیکھو
لیڈرانہ گداگری دیکھو

ایک مخدومہ لیڈیوں کی امام
آ کے یوں نغمہ زن ہوئیں سر شام
[illegible]
ہم ہیں اپنی [illegible] کی آواز
لیکن اب ہم کو [illegible]
[illegible] کی صف میں آنا ہے
[illegible] آپ سے امید
دیجئے چندہ [illegible]
[illegible] گداگری دیکھو
فی زمانہ گداگری دیکھو

طنزیہ نظمیں

• ابن [illegible]

پگھلنے لگے

گرم جھکڑ ہواؤں کے چلنے لگے
دھوپ ایسی کہ بھیجے پگھلنے لگے
ہے یہ پہچان چمچے کی سب سے الگ
وقت بدلے تو وہ بھی بدلنے لگے
باغباں نے پٹائی جو کی بار بھر
ہم بھی جھنجھلا کے غنچے مسلنے لگے
کل تلک غیر [illegible]
آج ہم ان کی محفل میں کھلنے لگے
کیا بجٹ کا زمانہ قریب آ گیا
سیٹھ جی کیوں خوشی سے اچھلنے لگے
سگرٹیں کس لئے منہ چھپانے لگیں
کیوں خریدار پہلو بدلنے لگے
اب تو بچوں کو درکار ہیں نالیاں
اور کھلونوں سے بوڑھے بہلنے لگے
گر ہمیں اپنی قوت کا احساس ہو
پھر زمیں بھی خزانے اگلنے لگے
ہم جو چاہیں تو طوفان کو ٹال دیں
ہم جو چاہیں تو چشمے ابلنے لگے
جا کے [illegible] سے [illegible]
خواہشیں [illegible] ہم نکلنے لگے

انیس قیوم فیاض (ایم۔اے)

ثابت قدم رہیں گے...

"میں جاؤں امجد آئے ہیں"
ملتجی نگاہیں اٹھیں تو شوہر نے
نگاہ بھر کر شاہدہ کا جائزہ لیا۔ سجی سنوری
شاہدہ آج کچھ زیادہ ہی حسین لگ رہی تھی
سرتا پا سفید ہی سفید جیسے کوئی آسمانی حور!
مرمریں جسم کے گرد لپٹی ہوئی سفید سفید
ساڑھی ــــ اور اس کی سڈول بانہوں اور
سینے سے لپٹا ہوا چست بلاؤز!
زلفیں بھی نئی وضع سے سنوار کر
اس نے سفید ربن باندھ رکھا تھا اور ڈبل
ہیل سینڈل اس کے پیروں کو اور خوب
صورت بنا رہے تھے۔ عظمت بس دیکھتا ہی
رہ گیا۔ شاہدہ جھنجھلا گئی۔
"آپ نے ابھی تک کوئی جواب نہیں
دیا"
"آں" کیا.... تم نے واقعی کچھ
پوچھا تھا مجھ سے؟..... اوہ شاید تم
پوچھ رہی تھیں کہیں جانے کے لئے.....
مجھے تو یاد ہی نہ رہا۔ لیکن تم تو آج غضب
ڈھا رہی ہو شاہدہ!
وہ آگے بڑھا اور چاہتا کہ شاہدہ نے
ٹوک دیا۔
پہنے بھی دیجئے! آپ تو مجھے بناتے
ہیں"۔
میں کیوں تمہیں بنانے لگا شاہدہ
لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہیں یہ
حوروں جیسا لباس پسند ہی نہ تھا"
ہاں اب بھی پسند نہیں ہے۔
وہ کہتے کہتے رک گئی اور عظمت نے
جملہ پورا کر دیا۔
لیکن امجد صاحب کو سفید رنگ
سے رغبت ہے۔ یہی نا؟...."
اوفوہ! آپ صاف کیوں نہیں
کہتے کہ شاہدہ، امجد سے ملنے مت جاؤ
اس طرح رکاوٹیں ڈالنے سے کیا فائدہ!
اب پتہ نہیں امجد صاحب کیا سمجھ لیں ــ
کم از کم آپ کو میرے اس وعدے ہی
کا پاس ہوتا جو میں نے امجد صاحب سے
کیا ہے ــ خیر کوئی بات نہیں اب نہ
جاؤں گی میں ــ چاہے امجد صاحب مجھ
سے ملنے ہی کیوں نہ آجائیں"
شاہدہ کی آواز بھرا گئی تھی
وہ دوسرے کمرے کی طرف مڑ گئی
عظمت نے بڑھ کر شاہدہ کا
مرمریں ہاتھ پکڑ لیا۔ جو ایک پیاسی مچھلی (کی)
طرح اس کی گرفت سے نکلنے کو مچل رہا
تھا اور عظمت نہایت سنجیدگی سے مخاطب
تھا۔
.... میں نے یہ کب کہا شاہدہ کہ
امجد سے ملنے نہ جاؤ ــ کبھی میں نے تمہیں
منع کیا ہے اپنے دوستوں سے ملنے کے لئے
وہ تو بس یونہی ازراہ مذاق کہہ دیا تھا
کیا مجھے تم سے مذاق کرنے کا حق نہیں ــ
زندگی میں جب تک چھیڑ چھاڑ، نوک جھونک
نہ ہو زندگی کا صحیح لطف نہیں ملتا ــ
شاہدہ بت بنی اپنے شوہر کے چہرے
کو تک رہی تھی اور عظمت پھر ایک بار کہہ
رہا تھا تم جاؤ شاہدہ ــ ضرور جا
تم نے امجد سے وعدہ کیا ہے نا.. وعدہ
خلافی کر کے کج خلقی کا ثبوت نہیں دینا
چاہیئے۔ تم ہمیشہ ان کے فن کی مداح رہی
ہو تو مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا
شوہر کی صاف گوئی اور نیک نیتی
پر شاہدہ کے دل میں بے انتہا پیار امنڈ
آیا۔ بے اختیار ہو کر عظمت سے بولی
"آپ کتنے اچھے ہیں"۔
اور وہ امجد کے پاس چلی آئی ــ ا
جو ایک ادیب تھا۔ ایک فنکار تھا او
ہر فنکار کی طرح اس کا سینہ بھی ایک بے
جذباتی نازک دل رکھتا تھا۔ ایسا دل جو
سی ٹھیس پر ٹوٹ پھوٹ جائے۔ اس
ریزے ریزے ہو جائیں۔

لیکن اس نے دل سے سمجھوتہ کر لیا تھا کہ وہ شاہدہ کو چاہتے ہوئے بھی اس سے دور رہے گا۔ اتنا دور چلا جائے گا جہاں تک اس کی نظریں نہ پہنچ سکیں ـــ جہاں تک اس کی آہیں نہ پہنچ سکیں ـــ

پھر بھی وہ اپنے بے تاب دل کی تڑپ کو زیادہ دنوں تک چھپا نہ سکا۔ خود پہ قابو نہ پا سکا۔ شاہدہ نہ تو اس کی کلاس میٹ تھی اور نہ کوئی رشتہ دار ہی۔ وہ اس کے فن کی مداح تھی اس کی تحریر کی شیدائی تھی اور اسی تعلق نے انھیں بے حد قریب کر دیا تھا ـــ

یوں بھی امجد کے بے شمار مداحوں میں صنفِ نازک کی خاص تعداد تھی۔ لیکن نہ جانے شاہدہ میں وہ کونسی بات پا گیا تھا ـــ اس کے خلوص میں نہ جانے کیا نظر آیا تھا کہ وہ اس کی طرف کھنچتا ہی چلا گیا۔ اب وہ اس کے دل کی دھڑکن بن گئی تھی۔ لیکن دوسرے گھرانوں کی طرح ان کے ہاں بھی رشتہ کے لئے مخالفتیں ہوئیں۔ اور امجد کے [illegible] تو خودکشی کی دھمکی دے دی اور پھر ایک اداس رات جبکہ آسمان سے پانی نہیں خون برس رہا تھا۔ کسی کے ارمانوں کا خون ہو گیا۔ امجد کہہ رہا تھا "شاہدہ! چاہتا تو میں سب سے بغاوت کر کے تمھیں اپنے سینے سے لگا لوں۔ لیکن وہ مقام [illegible] اور [illegible]

نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ میرے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون انھیں کا ہے نا۔ اس لئے وہ اپنا حق جتلاتے ہیں۔ لیکن میری روح آزاد ہے۔ وہ کسی کی نہیں ہو سکتی وہ صرف تمھاری ہے اور تمھاری رہے گی!"

شاہدہ فکرمند لہجہ میں بولی۔ جس سے اس کی قوتِ ضبط کا اندازہ ہوتا تھا۔ "قبروں پہ اپنی آرزوؤں کے محل تعمیر کرنا مجھے پسند نہیں امجد!"

ان دنوں میرے رشتے کی بات بھی چل رہی ہے۔ دعا دینا کہ ثابت قدم رہوں۔ سنتی ہوں وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ میں بھی ہمیشہ تمھارے لئے دعاگو رہوں گی۔"

شاہدہ نے اتنے بڑے غم کو اس حسن و خوبی سے جھیل لیا کہ کوئی محسوس تک نہ کر سکا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ شاہدہ اور امجد ایک دوسرے کے تمنائی تھے۔

اور پھر اگلے سال جب اس نے ایم اے کر لیا تو عظمت سے اس کی شادی کر دی گئی جو عظیم تھا بلند اخلاق تھا محبتوں کا چمن تھا۔ خلوص و وفا کی سدابہار ڈالی تھا۔

اس نے شاہدہ کی ہر خوشی اپنا مقدر سمجھ لیا۔ آفس میں گذرنے والا وقفہ اسے اب بور محسوس ہونے لگا تھا۔ اتنی حسین باسلیقہ خوش گفتار بیوی ملے گی

وہ یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

اس نے اپنی امی کا بے حد ممنون تھا کیونکہ شاہدہ اس کی امی کی پسندیدہ تھی۔

اور جب شاہدہ نے عظمت کو سمجھ لیا تو اسے سکون ہو گیا۔ عظمت ہمیشہ اس کے جذبات کا خیال رکھتا تھا۔ کہیں کوئی فنکار آتا یا ادبی اجلاس ہوتے تو عظمت ہمیشہ اسے ساتھ رکھتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی شاہدہ ادب نواز ہے۔ ادیبوں کی دلدادہ ہے۔ وہ جس طرح اپنے ذوق کا لحاظ کرتے ہوئے سائنسی تصانیف کا انتخاب کرتا وہیں شاہدہ کے لئے ادبی شہ پاروں کے دفتر سمیٹ لاتا۔"

اس نے شاہدہ ہی کی زبانی سن رکھا تھا کہ اور ادیبوں، شاعروں کی طرح امجد بھی شاہدہ کے دوستوں میں سے ہے لیکن اب تک وہ اس ہستی سے متعارف نہ ہو سکا تھا۔ اور ہوتا بھی بھلا کیسے جبکہ امجد اور شاہدہ نے کبھی نہ ملنے کے وعدے کر رکھے تھے ـــ

امجد جب لکھنؤ چلا آیا تو اس جانفزا ماحول میں بھی اسے گھٹن سی محسوس ہونے لگی یہیں سے وہ اپنے ادبی مشاغل جاری رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے تخیل کا سوتا جیسے سوکھ گیا تھا تین سال اس نے کسی طرح گذار لئے۔ لیکن ان تین سالوں میں بھی شاہدہ اس کے ذہن و احساس پر چھائی رہی۔

اور وہ اس کی یاد سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہوئے بھی نہ چھڑا سکا۔ اس کی یاد اس کے دل کے دامن سے لپٹی رہی۔ شاہدہ کے گنے چنے خطوط اس کے لئے رنگین نظارے بن گئے۔ ہر رات وہ ستاروں کی طرح انھیں دیکھا کرتا اور پھولوں کی طرح ان کی خوشبو سونگھتا۔

امجد سوچتا۔ مجھے شاہدہ سے ایک بار ہی سہی مل لینا چاہیئے۔ مانا وہ اب پرائی ہو چکی۔ لیکن بحیثیت ایک دوست کے مل لینے میں کیا حرج ہے۔ کچھ نہیں تو زندگی میں حرارت ہی آجائے۔

کیا وہ ملنے سے گریز کرے گی؟

کیا وہ مجھے بھول گئی ہوگی؟ نہیں نہیں۔ جب میں اسے نہیں بھول سکا ہوں تو وہ مجھے کیسے بھول سکتی ہے۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ اس کے دل سے یہی صدا بار بار ابھر رہی تھی۔

شاہدہ ——— شاہدہ!!!

اور وہ لکھنؤ سے چلا آیا ———

شاہدہ کے شہر، روشنیوں کے شہر!!

جس جگہ شاہدہ کو اس نے ملاقات کا وقت دیا تھا وہ کلب تھا۔ شاہدہ نے خلاف توقع تین سال بعد امجد کا فون ریسیو کیا تو اسے حیرت ہوئی۔ کبھی نہ آنے کا وعدہ کرنے والا امجد اتنا جلد کیسے پھر سکتا ہے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ پھر بھی اس نے عظمت سے اجازت لینا مناسب سمجھا اور چلی آئی ———

ہیلو امجد ———!

جذبات کی شدت کے باوجود وہ امجد کو اتنے دنوں بعد دیکھ کر صرف ہیلو ہی کہہ سکی۔

جواب میں امجد گہری گہری نظروں سے مسکرا کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

"کافی اچھی ہو گئی ہیں آپ مسز عظمت"

مسز عظمت! شاہدہ کو نہ جانے اس کے منہ سے یہ الفاظ کچھ اچھے نہیں لگے۔

یہ تم کیا کہہ رہے ہو ———!

"کیوں کیا آپ مسز عظمت نہیں ہیں؟"

مجھے تو اب بھی تمھیں صرف امجد پکارنا ہی اچھا لگتا ہے۔

یہ سب جذباتی باتیں ہیں مسز عظمت میں تو صرف ایک دوست کی حیثیت سے آپ سے ملنے آیا ہوں۔ امجد بے بسی سے بولا۔

مجھے یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ تم اب وہ نہیں رہے۔

کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ مسز عظمت میں وہی ہوں آپ وہی ہیں لیکن حالات نے ضرور موڑ اختیار کر لیا ہے۔

وہ ایسے کرسٹیبل کے پاس آ گیا۔ جس پہ شغل بےنوشی کا سامان دھرا تھا شاہدہ تڑپ اٹھی

"تم کب سے پینے لگے ———

میں پیتا کہاں ہوں مسز عظمت! آج کل شراب ہی شراب کو پی رہی ہے۔ اور وہ دن بھی اب دور نہیں جب مجھے ہی پی جائے۔

امجد ———!!!

سچ کہہ رہا ہوں ——— آپ سے ملنے کو جی چاہا اس لئے چلا آیا۔ کون جانے زندگی آج ہی ختم ہو جائے۔

لیکن تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو کون سے ہوٹل میں ——— کونسے روم میں مجھے بتانا۔ میں ضرور آیا کروں گی تم سے ملنے۔

آپ نہیں آسکیں گی مسز عظمت عظمت صاحب کی نگاہیں آپ کے پیر کی زنجیر بن جائیں گی۔

نہیں امجد! عظمت ایسے نہیں تم کیا جانو عظمت کو . . . .

عظمت تو . . . عظمت تو فرشتہ ہیں۔ وہ مجھے تم تک پہنچنے سے نہیں روک سکتے۔ کیوں کہ وہ خود ایک درد بھرا دل رکھتے ہیں؟

اچانک امجد ہنس پڑا ——— پھیکی ہنسی ——— بولا

"جب کوئی ایک بار وجود پر چھا جاتا ہے تو انسان اس کی ستائش پر مجبور ہو جاتا ہے

وہ اپنے خیالات میں آ گئی ہے۔

۔مہ سے ملاقات کا سارا منظر اس کی نگاہوں میں محوِ رقص ہے۔ اچانک عظمت کے قدموں کی چاپ اسے اپنی طرف آتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

وہ مسکرا کر ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

تم کب آئیں شاہدہ ــــ؟ کیسی رہی امجد سے ملاقات؟ اس نے سوالات کی بوچھار شروع کر دی اور یوں شاہدہ کو تکنے لگا جیسے اس کے تاثرات کو پڑھ رہا ہو ــ اور شاہدہ پژمردہ آواز میں بول پڑی۔

ملاقات تو ٹھیک رہی لیکن وہ یار معلوم ہوتا تھا۔ یہ لوبیب شاعر بھی بیب ہنستے ہیں۔ چپ چاپ سے ــ ٹم سے! ــــ اب تو وہ پینے بھی لگا ہے..... عظمت کی پیشانی عرق آلود و گئی۔

ہاں عظمت ــــ!

بلا وجہ کوئی نہیں پیتا شاہدہ! غلط کرنے کے لئے پیتا ہو گا۔

غم ــــ اُسے کا ہے کا غم ہے شاہدہ ندازسے بغاوت صاف ظاہر تھی۔ عظمت نے سگریٹ سلگا لیا اور ؛ لگا ــ

تمھیں اس کا غم بانٹ لینا چاہئے ہدہ! تم اس کی مزاج پرسی کو جایا کرد چارہ ...۔

لیکن شاہدہ نے فیصلہ کر لیا ہے امجد کے پاس نہیں جانے کا ــــ

میں اپنے عظمت کو دھوکا تو نہیں دے سکتی۔

وہ مجھ پہ مہربان ہیں تو میں کیوں انھیں فریب دوں۔

میں نہیں جاؤں گی..... نہیں جاؤں گی ــــ نہیں جاؤں گی اور کمرے میں سنائی نہ دینے والی آواز دم توڑ کر رہ گئی ــــ ●● ــــ

بقیہ :۔ اقبال، امیرِ سخن، اللہ کا شاعر

ہے۔ اللہ کی پکار ہیں اس کی طرف پیش قدمی کی طرف بلا رہی ہے۔ سرزمین فلسطین لٹ رہی ہے جس کے گرد انسانی بھیڑیئے منڈلا رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ سرزمین اسلام کا دفاع تو بہادر مومن اور خود دار روحوں کا کام ہے اس لئے اہلِ اسلام! شیروں کی طرح مختلف جہات میں پھیل جاؤ اور وحشیانہ قبضہ سے اُسے آزاد کراؤ۔ اسلام تو ذکرِ خدا کے ساتھ ساتھ دفاع و جہاد بھی ہے اس لئے اللہ کا غیر متزلزل عزم بن کر اٹھو اور ٹوٹ پڑو ا ●●

(افسانہ)

ریشمی لڑکی

شہزادہ سلیم

وہ امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھی۔ جس کا برانچ آفس پرنس روڈ کی ایک عالی شان عمارت کی ساتویں منزل پہ تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ اتنا نازک اور لچک دار ریشمی جسم پوری سات منزل کس طرح طے کر پاتا ہوگا جبکہ مجھ جیسا صحت مند آدمی چار منزل تک اُوپر چڑھنے کے بعد سانس لینے کے لئے چند ثانیئے رُک جانے پر مجبور ہو جاتا ہے

پرنس روڈ کی کسی عمارت میں خودکار زینہ یا لفٹ نہیں تھی۔ میرا دفتر اس عمارت کے سامنے ایک دوسری بلند و بالا عمارت کی ساتویں منزل پہ عین اس کے دفتر کے سامنے تھا۔ میرے دفتر کی طرح غالباً اس کے دفتر میں بھی مختلف چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے۔ یعنی ایک بڑے ہال کی ہارڈ بورڈ کی مدد سے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور یہ پارٹیشن کچھ اس مناسبت کے ساتھ کی گئی تھی کہ ہر کیبن ایک چھوٹے مگر مکمل کمرے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا

وہ ایک ایسے ہی چھوٹے سے کیبن نما کمرے میں بیٹھا کرتی تھی جس کی ایک کھڑکی شاہراہ کی طرف یعنی میرے کیبن کی کھڑکی کے سامنے کھُلا کرتی تھی۔

ہماری محبت کا آغاز انہی کھڑکیوں کے راستے ہوا تھا۔

دونوں کھڑکیوں کا فاصلہ مشکل سے دوسو فٹ کے قریب تھا اور یہ فاصلہ اتنا معمولی تھا کہ اس پیکرِ حُسن وجمال کے بارے میں مجھے اپنی حتمی رائے قائم کرتے وقت کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

وہ جوان تھی، خوبصورت تھی اور دل کش خدوخال کی مالک تھی۔ بس یہی اس کا تعارف تھا۔ اس سے زیادہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ اس فرم میں کس حیثیت سے ملازم ہے تاہم میں اس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا لیکن فطری طور پر چونکہ میں ٹھنڈے دل ودماغ کا عادی اور نہایت مستقل مزاج آدمی ہوں، اس لئے کوئی غیر فطری قدم اُٹھا کر جلد بازی نہیں کرنا چاہتا تھا

مجھے اس دفتر میں کام کرتے ہوئے صرف دو ماہ ہوئے تھے۔ اور میرے کمرے کی کھڑکی پر دبیز جھالردار پردے ہونے کے باعث وہ میری نظروں سے اوجھل رہی تھی۔ مجھے یہ علم بھی نہ ہو سکا تھا کہ میرے سامنے والے دفتر میں ایک پری پیکر اپنی بھرپور رعنائیوں کو دامن میں سمیٹے جلوہ افروز ہے۔ دو ماہ کی مدت میں نہ کبھی کوئی ایسا اتفاق ہوا تھا کہ کھڑکی کے پردے ہٹائے جاتے اور نہ کبھی اس کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ یوں ہی دفتر میں میرا کام کچھ اتنا زیادہ ہوا کرتا تھا کہ صبح سے دفتر بند ہونے تک کا وقت فائلوں میں سر کھپاتے گزر جاتا تھا۔

وہ تو محض ایک اتفاق تھا کہ سخت گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں اچانک پورے علاقے کی بجلی فیل ہو گئی اور میں گرمی کی شدت سے گھبرا کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

اور پھر جیسے مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔

سیاہ گھنیری زلفیں، کمان دار ابرو گھنی پلکیں، شوخ اور بے چین آنکھیں، گرمی کی حدت سے تمتماتے ہوئے رخسار گلابی سی رنگت، امڈتا شباب، نکلتا ہوا قد، اوپر سے نیچے تک بڑے متناسب نشیب وفراز والا سڈول جسم اور پسینے کی وجہ سے بدن کے ساتھ چپکا ہوا سفید وائل کا کرتہ، اگر دیکھنے والے کے منہ میں پانی نہ آئے تو بدن میں چیونٹیاں سی رینگتی

ضرور محسوس ہوں۔

سخت گرمی میں اتنا صحت بخش دیدار رُوح تک کو تر و تازہ کر گیا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے شاعر نہ ہونے پر افسوس ہوا ورنہ ایک آدھ غزل تو ہو ہی جاتی۔ مگر نہیں۔۔!

نظریں ملائیں ۔۔۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے ایک میٹھی سی مسکراہٹ کا خیر مقدم کیا اور دل کے کسی انجانے گوشے میں گدگدی سی محسوس ہوئی۔۔۔

لوگ کہتے ہیں کہ محبت سالہا سال کی قربت سے جنم لیتی ہے لیکن اس لمحے کے بعد میں اس بات پہ ایمان لے آیا کہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ محبت کا آغاز پہلی نظر سے ہوتا ہے اگر پہلی نظر سے نہ ہو تو سالہا سال کی قربتیں بھی جذبوں کو محبت کا نام نہیں دے سکتیں۔

اس روز کے بعد کھڑکی سے پردے ہٹا دیئے گئے ہر روز صبح کام کا آغاز ایک میٹھی سی مسکراہٹ کے تبادلے کے بعد ہوتا، پھر یہ مسکراہٹ ایک غیر محسوس سر کے سلام میں بدل گئی۔ میں کام شروع کرنے سے پہلے کھڑکی میں جا کھڑا ہوتا اور بڑے نامحسوس طریقے سے اپنے ہاتھ پیشانی تک لے جاتا۔

وہ بھی اپنے سر کو خفیف سا جھکا اُٹھا لیتی۔۔۔ گویا سلام قبول کر لیا تا۔۔۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے۔ پورا ایک سال گزر جانے کے بعد بھی ہمارے معمول میں کوئی فرق نہ آیا حالانکہ ہمارے درمیان صرف دو سو فٹ کا فاصلہ تھا۔ لیکن یہ فاصلہ اتنا خطرناک تھا کہ میں چاہتے ہوئے بھی اسے نہ پاٹ سکا۔ شاید اس لئے کہ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ اور پہلی محبت تھی یا شاید اس لئے کہ دو سو فٹ کے اس معمولی فاصلے سے قطع نظر میرے اور اس کے درمیان چودہ منزلوں کی خلیج حائل تھی۔ میں عام شاہراہ سے سات منزل کی بلندی پر تھا۔ اور اس کا دفتر بھی سامنے والی عمارت کی ساتویں منزل پہ تھا۔

ایک سال کی مُدت میں اس پری پیکر کی اور بہت سی چیزوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ مثلاً وہ زیادہ میک اپ کی عادی نہیں تھی۔ اس کا چہرہ یوں بھی مصنوعی رنگ و روغن کا محتاج نہیں تھا تاہم عمر کا تقاضا تھا کہ وہ بھی عام لڑکیوں کی طرح چہرے پر کریم، روج لپ اسٹک، کاجل یا پوڈر کا استعمال کرتی لیکن اس کا چہرہ ہر بناوٹی سنگھار سے عاری ہوتا۔

وہ خوش لباس بھی تھی حالانکہ اس کے بدن پہ کبھی کوئی قیمتی کپڑا دکھائی نہیں دیا مگر وہ گھٹیا قسم کے میلے کچیلے یا واہیات قسم کے پرنٹ بھی نہیں پہنتی تھی بلکہ نہایت سادہ اور صاف ستھرے لباس زیب تن کرتی تھی۔ اسے موسم کی مناسبت سے رنگوں کے انتخاب کا سلیقہ حاصل تھا اور وہ سادگی میں حسن کا وقار قائم رکھنے کا گر جانتی تھی۔

اس میں چھچھورا پن بھی نہیں تھا اور نہ ہی وہ اتنی جذباتی تھی کہ حد سے تجاوز کر جائے۔ اس کے مستقل مزاج ہونے کی بہت سی دلیلیں تھیں مثلاً وہ کام کے وقت صرف کام میں دلچسپی رکھتی تھی اور ہر طرف سے بے نیاز ہو جاتی تھی۔ وقت پہ دفتر آنا اس کا معمول تھا۔ وہ دفتری وقت سے ٹھیک پانچ منٹ پہلے اپنے کمرے میں داخل ہوتی تھی اور یہی وہ پانچ منٹ تھے جن کا اثر میرے اعصاب پر پورے چوبیس گھنٹے طاری رہتا تھا کیونکہ انہی مختصر سے وقفے میں وہ مجھ پر اپنی مسکراہٹوں کے خزانے لٹاتی تھی۔ ایک سال کی مدت میں وہ عام تعطیل کے سوا ایک روز بھی دفتر سے غیر حاضر نہیں ہوئی تھی

محبت ہو جائے تو سوچ کے زاویئے بھی بدل جاتے ہیں۔ آدمی اچانک سوتے میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے اور پھر اسے نیند نہیں آتی۔ ذہن عجیب عجیب سی کروٹیں لینے لگتا ہے۔ میں ان دنوں انہی مرحلوں سے گزر رہا تھا۔ رات کی تنہائیوں میں جب اس کا خیال آتا تو دل میں گدگدی سی ہونے لگتی کہ وہ اتنا اُجلا لباس پہنتی

ہے تو یقیناً ہر روز نہاتی بھی ہوگی اس کا ایک چھوٹا سا غسل خانہ بھی ہوگا۔ غسل خانے میں نلکا بھی ہوگا۔ نلکے میں پانی بھی آتا ہوگا۔ اسی پانی کے ساتھ وہ اپنے کپڑے دھوتی ہوگی۔ کچھ کپڑے ایسے بھی ہوں گے جنہیں وہ سب کے سامنے نہیں دھوتی ہوگی۔ نہاتے وقت وہ کون سا صابن استعمال کرتی ہوگی۔ یقیناً کوئی ٹائلٹ سوپ ہوگا۔ میں بھی تو ٹائلٹ سوپ استعمال کرتا ہوں۔ ٹائلٹ سوپ کی بھینی بھینی خوشبو اس کے گیلے بدن کی مہک کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر کس قدر لطیف ہو جاتی ہوگی۔ صابن کا جھاگ اس کے بدن پر کتنا بھلا دکھائی دیتا ہوگا۔ وہ نہاتے ہوئے میری طرح گنگناتی بھی ہوگی اور اگر کبھی غسل کے دوران نلکے میں پانی آنا بند ہو جائے تو...

تو........!!

بس! بس اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکا۔ کچھ بھی ہو! وہ لڑکی میرا آئیڈیل تھی، ہر طرح سے، ہر اعتبار سے، ہر لحاظ اور ہر پہلو سے وہ میری فطرت سے مطابقت رکھتی تھی۔

باشعور۔ بااصول! باادب اور باوقار!! صاف ستھری، غیر جذباتی مستقل مزاج، فرض شناس اور وقت کی پابند!!!

میرا آئیڈیل بھی تھا۔ یہی میرا ادراک تھا۔ میری سوچ کی پرواز اسی لڑکی تک تھی۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں اگلی صبح اپنے دفتر آنے سے پہلے اس کے دفتر جاؤں گا اور دو ٹوک لفظوں میں اسے اپنا فیصلہ سناؤں گا کہ میں اسے شریکِ حیات بنانا چاہتا ہوں۔

اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ کیونکہ ایک سال کے طویل عرصے میں میری طرح اسے بھی کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی وہ بھی دو سو فٹ کے اس فاصلے کو ختم نہیں کر سکی تھی۔ اس کی ہر عادت میری طرح تھی۔ اس کی سوچ، اس کا ذہن فہم، ادراک اور فطرت ہر چیز مجھ سے ملتی تھی۔

وہ بالکل مجھ جیسی تھی۔

اگلے روز صبح پرنسی روڈ پر پہنچتے ہی میرا رخ اس کے دفتر کی جانب ہوا۔ اس کے دفتر کی عمارت میں داخل ہوتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں سیڑھیاں چڑھتے وقت میرے اعصاب پر عجیب سی گھبراہٹ طاری تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ مجھ سے کس طرح پیش آئے گی؟ میں گفتگو کا آغاز کس طرح کروں گا؟ مجھ سے اتنی بڑی بات اس کے سامنے کہی بھی جاسکے گی یا نہیں؟ میرا ذہن ماؤف ہوا جا رہا تھا رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔ سر چکراتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا میں کب ساتویں منزل پر پہنچا؟ مجھے کچھ یاد نہیں! میں اس کے کمرے تک کیسے پہنچا؟ مجھے یہ احساس بھی نہ ہوسکا وہ رہ رہ کے ایک ہی خیال ستا رہا تھا کہ مجھے اچانک اپنے کمرے میں پاکر اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ وہ دفتر میں میری موجودگی پسند بھی کرے گی یا نہیں؟۔

آٹھ بج چکے تھے۔

دفتر کا وقت شروع ہو چکا تھا ڈوبتی ہوئی نبضوں کے ساتھ میں نے فیصلہ کیا اور دل کڑا کر کے آہستہ سے اس کے کمرے کا دروازہ اندر کی طرف دھکیلا۔

دروازہ کھلا اور کھلتا چلا گیا کمرے میں پہلا قدم رکھتے ہی میری ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ سارے پروگرام خاک میں مل گئے۔ دل کو ایک ٹھیس سی لگی۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔

ٹھیک اسی لمحے میری نظر کھڑکی کے راستے اپنے دفتر پر پڑی۔

وہ میرے دفتر میں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی —

افسانہ

یہ رشتے یہ بندھن

رحمت سلیم

پورے تین دن ہو چکے تھے۔ بیڈ نمبر ۱۲ کو ڈاکٹرس، نرسیں گھیرے ہوئے تھے۔ اُس کی حالت میں کوئی فرق نہیں تھا ہسپتال کا سارا اسٹاف اُس کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں دواخانے میں شریک ہوا تھا۔ بخار کی تیزی سے اُس کا بدن جھلس رہا تھا علاج ہوتا رہا۔ بخار کم ہو گیا تو نقاہت بڑھ گئی اور پھر اختلاج شروع ہو گیا۔ ایک کے بعد دوسری بیماری اُسے گھیرتی رہی۔ اور آج پورے تین دن سے وہ بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ بستر پر دراز۔۔ کھلی آنکھیں چھت کی طرف لگی ہوئیں۔۔ گھومتے ہوئے سیلنگ فیان پر مرکوز تھیں۔۔ پنکھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اُس پر پھینکا ورکر رہا تھا۔ تمام اعضاء جواب دے چکے تھے۔ دماغ ابھی سوچنے کے قابل تھا۔ دل تو بس ہر کتا جا رہا تھا۔۔ ہولے ہولے۔ دھیرے دھیرے۔ یہ مسافر بہت دیر سے چلتا رہا ہے۔ اب تو اسے آرام ملنا ہے۔ اُس نے اپنے بارے میں کچھ اس طرح سوچا اور اطراف کھڑے ہوئے سفید

کپڑوں میں ملبوس ڈاکٹرس، نرسس کی گفتگو کے تشویشناک لہجے کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"اِس کے کسی رشتہ دار کو خبر ہے؟" ڈاکٹر نے سوالیہ انداز میں نرس کی طرف دیکھا

"نو۔۔ ڈاکٹر"

"کوئی نہیں ہے اس کا۔۔ ؟"

ڈاکٹر دوبارہ نرس سے مخاطب تھا۔

"ڈاکٹر۔۔ اس آدمی کے جیب میں سے ایک چھوٹی سی ڈائری ملی ہے جس میں کسی رضیہ کا نام تین چار مقامات پر لکھا ہوا ہے۔" نرس نے ڈاکٹر کو بتایا۔

"آئی۔ سی۔" ڈاکٹر نے یہ کہتے ہوئے کچھ سوچا اور پھر کہنے لگا۔۔ "ایسا کرتے ہیں ریڈیو پر ایک ANNOUNCEMENT جاری کرواتے ہیں۔ ایک مریض بستر مرگ پر زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ اُس کا حلیہ یہ ہے۔ کوئی وارث ہو تو فوراً دواخانہ پہنچ جائے اور اگر اس عرصے میں یہ مر گیا تو اس کی نعش کو مردہ خانہ میں محفوظ کر دیا جائے گا۔" ڈاکٹر نے آئندہ کا پروگرام سنا دیا۔۔

موت کے تصور کے ساتھ ہی اُسے ہنسی سی آئی۔ لیکن چہرے اور ہونٹوں پر اُس کا اختیار ختم ہو چکا تھا زندگی کا راز بھی عجب راز ہے۔۔ موت سے گلے ملنے سے کچھ پہلے یہ راز کھل جاتا ہے۔۔ زندگی پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔۔ اور پھر اتنا وقت نہیں رہتا کہ کچھ سمجھا سکیں۔ کچھ بتا سکیں۔ اور موت کے تعلق سے بھی اُس کی معلومات بہت ہی ناقص تھیں۔ اُسے اپنی ماں یاد آئی اُسے کس طرح بے بس و بے سہارا چھوڑ کر وہ صرف ایک ہچکی لے کر چلی گئی تھی۔۔۔ چھوٹا سا تھا وہ۔۔ اُس وقت اُس کی خالہ نے اُسے سمجھایا تھا کہ اُس کی ماں جنت کو گئی ہے۔ اُس کے لئے بہت سارے پھل اور بہت ساری مٹھائیاں لائے گی۔۔۔ وہ چھوٹی تسلی سے چپ ہوا تو خالہ کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ اُسے بہت تعجب سا ہوا۔ وہ پوچھنے لگا۔ "آپ کیوں رو رہی ہیں۔۔؟"

"نہیں تو۔۔ میں۔۔ میں کہاں رو رہی ہوں۔" کہہ کر پھیکی مسکراہٹ سے اپنے آپ کو سنبھال کر خالہ نے اُسے اپنے کلیجے سے لگا لیا۔۔ اُن کی ممتا بھری گود میں مجھے بے پناہ سکون سا محسوس ہوا اور پھر دن یوں ہی گذرتے رہے۔ کئی شامیں سرکتی گئیں۔۔ پھر ایک ایسی شام بھی آئی جس کی صبح کبھی نہ ہوئی۔ اُس شام وہ

کھیل کود سے تھک کر گھر واپس ہوا تو خالد کی زندگی بھر کی تھکن دور ہو چکی تھی۔ اُن کی بند آنکھیں ۔۔ خاموش نبض نے سب کچھ سمجھا دیا۔ وہ اپنے آپ کو زمین اور آسمان کے بیچوں۔ بیچ خلاؤں میں غوطے کھاتا محسوس کر رہا تھا۔ وہ بالکل بے سہارا ہو گیا تھا۔۔ اب اُسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا تھا۔ اپنے پیروں سے چلنا تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے زمین جلتی رہی۔ کوئی سائے دار درخت تو تھا ہی نہیں ۔۔ وہ جلتی ہوئی ریت بھری زمین پر چلنے لگا۔ زندہ رہنے اور تعلیم جاری رکھنے کے لئے ٹیوشن نے کافی سہارا دیا۔ تکالیف سے اب اُسے گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی۔ کوئی دکھ دکھ نہیں تھا کوئی غم غم نہیں تھا۔ ٹھوکریں کھا کھا کر وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ بڑی سے بڑی پریشانی بھی اُس کے لئے معمولی بات تھی۔ اکیلا تھا ۔۔ کسی بات کی پرواہ نہ تھی۔ جینا تو بہر حال ضروری تھا موت کے آنے تک تو جینا ہی پڑتا ہے

کالج میں وہ کسی سے کھل کر بات نہ کرتا تھا۔ غربت کا احساس ذہن کو کچوکے لگاتا رہتا۔ شاید غریبی پیرہن میں لگا کچھ ایسا پیوند ہے جس کو جتنا چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اتنا ہی ظاہر ہونے لگتا ہے۔ کالج میں تقریباً سب ہی اُسے جانتے تھے طالبات اس کی طرف توجہ نہ دیتی تھیں۔ شاید اس لئے کہ اُس کے پاس چمکتی ہوئی اسکوٹر نہیں تھی۔ فیشن کے کپڑے نہیں تھے۔ اُس کے لئے خوشی تو ایک عجوبہ تھی اور پھر واقعی ایک عجوبہ سا ہو گیا۔ بلندی پستی کو سینے سے لگانے آگے بڑھی۔ رضیہ ۔۔ میڈیکل سٹوڈنٹ شہر کے مشہور رئیس وجاہت مرزا کی اکلوتی بیٹی کی پُر خلوص محبت نے اس کا دامن تھام لیا۔ سوکھی جلتی ہوئی زمین پر ٹھنڈے پانی کا ایک چھینٹا بھی گرتا ہے تو زمین میں دراڑ سی آ جاتی ہے۔ دھواں سا اٹھتا ہے میٹھی میٹھی سوندھی خوشبو پھیلتی ہے۔ پھر اس خوشبو میں وہ سارے غم بھول گیا۔ سارے دکھ مٹ گئے۔ ساری شکایتیں دور ہو گئیں۔ بس ایک سپنوں بھری دنیا تھی ۔۔ وہ تھا اور رضیہ تھی ۔۔ مہکتے پھول تھے، چٹکتی کلیاں تھیں ۔۔ گنگناتے بھونرے تھے، نرم و نازک چنچل ہوائیں تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی تھی جگمگاتے تارے تھے۔ اس رنگین دنیا میں وہ اپنی غریبی بھول گیا رضیہ کو اپنی امارت یاد نہ تھی۔ پیار کے سیلاب نے انہیں ایسی جگہ لاکر پھینک دیا تھا جہاں آدمی آدمی کی قدر کرتا ہے جہاں سکے اپنی قدر کھو دیتے ہیں۔ جہاں دل کے احکام چلتے ہیں جہاں آغاز اور انجام دونوں پیار کا سرچشمہ ہوتے ہیں اس انوکھے پیار کی ابتدا بھی بڑی انوکھی تھی۔ وہ کالج کی عمارت کی سیڑھیاں اُتر رہا تھا کہ کوئی اُس سے ٹکرا گیا۔

فضاء میں ایک چھناکا سا ہوا۔ کتابیں کاپیاں سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی فرش پر بکھر گئیں۔ ہوا کے ایک زوردار جھونکے نے کاپی کے اوراق اُلٹ دیئے۔ ٹکرانے والی ہستی کو وہ تھوڑا بہت جانتا تھا۔ اُس نے کتابیں سمیٹنے میں مدد کرنی چاہی اور اسی کوشش میں ایک عجیب بات ہو گئی۔ مرمریں ہاتھوں نے کھردرے ہاتھوں میں چپکے سے ایک عجیب و غریب لطیف شئے تھما دی۔ ایک مختصر پیام۔ جس کے ایک ایک لفظ میں پیار بھری زندگی کا بھرپور احساس پوشیدہ تھا یہ تو کب سے خوابوں میں بسی ہوئی تھی۔ نہ جانے کہاں چھپ گئی تھی اب تک ۔۔؟ اس پہ تو کچھ حق سا لگتا ہے جیسے کوئی بھی ہوا اپنی سی لگتی ہے۔ اس قدر اپنا پن ۔۔۔ وہ پاگلوں کی طرح سوچنے لگا۔ اُس کے پاگل پن سے رضیہ ناواقف نہ تھی جب کبھی وہ نرم نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتا تو نہ جانے کیا بات تھی ان آنکھوں میں وہ بے بس ہو کر رہ جاتی تھی اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان آنکھوں سے دو ریشمی تار سے نکلے ہوئے ہیں۔ نرم و ملائم مگر مضبوط سے۔ اس کو چاروں طرف سے باندھ رہے ہیں اور

ؤں کے اس بندھن میں جکڑ کے رہ گئی ہے۔
ُس کی مسلسل تڑپ رنگ لائی، خوابوں
حقیقتوں کا گمان غالب آنے لگا۔ پھر
کی زندگی نے کروٹ لی۔ رضیہ کو پانے
ے ڈاکٹری کی ڈگری تو کیا آسمان کے
ے بھی توڑ کر لانے کی ہمت اُس میں آگئی تھی
کبھی کبھی جبکہ اُس کے قدم حقیقت کی زمین
چھوتے تو اُسے ایسا لگتا تھا جیسے رضیہ
سمانوں کی بلندیوں پر ہے اور وہ ——
س کے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا
کی الجھن میں جب وہ اداس ہو جاتا تو
ضیہ اُسے ڈانٹا کرتی۔ اُس کی ڈانٹ بھی
تنی پیاری لگتی تھی کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا
ہ کوئی اُس کو مور کے پنکھ سے مار رہا ہو۔
"تمہاری اداسی کا سبب کیا میں
ان سکتی ہوں ——؟" رضیہ نے ایک ایسے
ی موقع پر پوچھا۔
"سبب جانتے ہوئے بھی، تم مجھ
سے پوچھ رہی ہو —— وہ دیکھ رہی ہو آسمان
کی بلندیوں کو —— تمہارا وہیں کہیں بسیرا
ہے اور میں یہاں —— یہیں کہیں اِسی
زمین میں دھنسا ہوا ہوں —— یہ فاصلہ
یہ دوری —— کیا آسمان اور زمین مل
سکتے ہیں ——؟"
"ایسا محسوس ہوتا ہے تمھیں میرے
پیار پر بھروسہ نہیں۔" رضیہ کی آواز میں
درد کا سمندر تھا۔
"نہیں —— ایسی بات نہیں ——
مجھے تم پر —— تمہارے پیار پر —— اپنے
آپ سے زیادہ بھروسہ ہے —— مگر ——
میں اپنی قسمت سے ڈرتا ہوں۔" اُس نے
ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ ادا کیا۔
"اور مجھے اپنی قسمت پر پورا بھروسہ
ہے۔ اپنے ڈیڈی پر پورا یقین ہے وہ
میری بات نہیں ٹالیں گے —— میں ——
میں تمھیں ڈیڈی سے مانگ لوں گی" وہ
جذبات سے مغلوب ہو گئی۔
اور پھر ڈیڈی کے سامنے اُسے جانا
پڑا۔ "کیا کام کرتے ہو ——؟" رضیہ
کے ڈیڈی نے سگار کے دھوئیں میں ایک
تیر سا چھوڑا۔
"جی —— جی —— میں ابھی پڑھ
رہا ہوں —— ایم بی بی ایس کر رہا ہوں۔"
"تمہارے والدین کیا کرتے ہیں ——؟"
"جی میرے کوئی نہیں ہیں —— میں ہی اپنا
سرپرست، اپنا کفیل ہوں۔" اُس
نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔
"کوئی جائداد وغیرہ بھی رکھتے ہو ——؟"
"جی نہیں ——"
رضیہ کے ڈیڈی کا چہرہ سرخ
ہو گیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال کر
بیٹی کی طرف دیکھا۔ بیٹی کی آنکھوں میں التجا
تھی۔
"ڈیڈی —— میں —— میں ان سے
وعدہ کر چکی ہوں۔ ڈیڈی —— میں انھیں
بے حد —— —— " رضیہ کی آواز میں کپکپاہٹ
اور ڈر کی ملی جلی کیفیت تھی۔
"تم چپ رہو" —— انھوں نے رضیہ
کو ڈانٹتے ہوئے کہا "اور ہاں تم بھی سنو۔
میں اپنی بیٹی کی خوشی کی خاطر موت کو بھی
گلے لگانے تیار ہوں۔ لیکن افلاسی کچھ
ایسی موت ہے جو قسطوں میں آتی ہے
اور ایسی موت سے تکلیف بھی زیادہ ہوتی
ہے۔"
"آپ مطمئن رہیں۔ میں رضیہ
کی خاطر اپنی جان بھی کام آجائے تو بخوشی
دے دوں گا۔ اور میرا وعدہ ہے کہ رضیہ کی
زندگی میں خوشیوں کا جو اُجالا ہے اُس اُجالے
میں اندھیرا بن کر نہیں مسلط ہوں گا۔ میں
ذرّہ تھا —— پیار کی روشنی میں نہا کر چمکنے
لگا اور آفتاب ہی سے ٹکرانے چلا تھا۔
اچھا کیا —— آپ نے یاد دلا دیا۔ بہت
بہت شکریہ۔ بڑی مہربانی آپ کی۔
اُس نے بڑے ضبط و تحمل کے ساتھ رضیہ
کے ڈیڈی کو جواب دیا —— رضیہ کی طرف
ایکبار دیکھا۔ آنکھوں میں سینکڑوں دیئے
جھلملانے لگے۔ اور پھر تیزی سے باہر نکل
گیا —— اور چلتا ہی گیا —— یہاں تک
کہ وہ رضیہ کی زندگی اور اُس کی پہنچ سے بہت
دور نکل گیا۔ تعلیم ادھوری ہی رہ گئی ——"
کس کے لئے ڈاکٹر بنتا ہے مجھے ——؟"
کس کے لئے جی رہا ہوں میں ——؟ اور
کب تک یہ سانسوں کا بوجھ سہنا پڑے
گا۔ ایسی سانسیں جو ہر دم رضیہ کے پیار

مہک اور یادوں کے زخم دل کے اندر پیوست
رہتی ہیں۔ اس کا سلسلہ آخر کب ختم
ہوگا؟ وہ سوچتا ہی چلا گیا۔ اور بہت بار
ایسا بھی ہوا کہ کسی نے اس کے دل کی کشتی
میں سوار ہونے کی کوشش کی تو اس نے کشتی
ہی الٹ کر رکھ دی۔ اور پھر اس کے بعد
کوئی اس کے قریب نہ آ سکا۔ مسلسل لاپرواہی
نے صحت کو گرانا شروع کر دیا۔ اپنی گرتی ہوئی
صحت سے اسے مسرت ہوتی تھی۔ دن بدن
لمحہ بہ لمحہ وہ موت سے قریب ہو رہا
تھا موت جو ہر مشکل ہر آفت کا آخری حل
ہوا کرتی ہے موت جو اپنے دامن میں سکوت
ہی سکوت لیے رہتی ہے۔ اور ادھر رضیہ
کے ڈیڈی لاکھوں کی دولت اور اپنی F.R.C.S
ڈاکٹر بیٹی کو چھوڑ کر اکیلے ہی چلے گئے ایسی جگہ
جہاں سے انسان واپس لوٹ کر نہیں آتے
رضیہ جو شہر کے گورنمنٹ ہسپتال میں R.M.O
بن چکی تھی — اس کے نام اشتہار چھپوائے
اس سے واپس آ جانے کی التجا کی — مگر
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رضیہ کے ڈیڈی
سے کیا ہوا وعدہ اسے یاد تھا۔ دن گذرتے
گئے جب فاقہ اور صحت جواب دینے لگی
تو ایک ہی خواہش اسے ستانے لگی —
کاش وہ مرنے سے پہلے رضیہ کو دیکھ لیتا!
اس خواہش اور تلاش میں کچھ اس
قدر نڈھال ہو گیا کہ اسے ہسپتال کا گیٹ
یاد تھا اور اس کے بعد کچھ بھی یاد نہ رہا —
سیلنگ فین اسی انداز سے گھوم رہا تھا

کسی کے قدموں کی چاپ اس کے کانوں سے
ٹکرانے لگی۔ یہ آواز — یہ چاپ تو کچھ
جانی پہچانی سی لگی۔ سفید سائے اس کی طرف
بڑھ رہے تھے۔
" ڈاکٹر یہ مریض دم توڑ رہا ہے۔
شاید کسی کے انتظار میں اس کا دم نہیں
نکل رہا ہے" نرس نے ڈاکٹر کو بتایا۔
" اچھا — ہم دیکھتے ہیں —"
یہ آواز کانوں میں رس گھولنے لگی۔ یہ تو
وہی آواز تھی۔ وہی۔ سو فیصد وہی
R.M.O رضیہ اس کے قریب آگئی اور
پھر جیسے اسے الیکٹرک شاک سا لگا " یہ —
یہاں — کب سے ہے۔ یہاں —"
وہ تقریباً چیخ پڑی —
" دس دن کے اوپر ہوئے" کسی نے
جواب دیا —
" دس دن —" ڈاکٹر رضیہ نے دہرایا
اور پھر اسے خیال آ گیا کہ وہ ان دس دنوں
میں کتنی مصروف تھی۔ ڈاکٹروں کی آل انڈیا
کانفرنس میں شرکت کے لئے دہلی گئی ہوئی تھی
کاش وہ دس دن پہلے ہی آ جاتی —" وہ
سوچنے لگی۔
پھر مریض نے کچھ کہنے کے لئے لب
ہلائے۔ ڈاکٹر رضیہ اس پر جھکی رہی۔
اس کی آنکھوں سے دو موتی ٹپک کر مریض
کے چہرے پر پھیل گئے۔ وہ مسکرانے کی کوشش
کرنے لگا۔ اور ڈاکٹر رضیہ اسے کچھ کہنے کے
لئے آمادہ کرتی رہی۔ یکایک ایک زبردست

سا اجالا مریض کی آنکھوں کے سامنے پھیل
گیا۔ ہر چیز اجلی اجلی سی — انتہائی بلندی
سے کوئی سایہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ
تو اس کی رضیہ تھی۔ وہ بانہیں پھیلائے
مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھتی گئی۔ اور
پھر نہ جانے اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ وہ
ایکدم تندرست سا ہو گیا۔ وہ بستر
سے اٹھ کر رضیہ کی باہوں میں باہیں ڈالے
جانے لگا۔ حیرت تھی کہ اسے اپنا وزن
بھی نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ سامنے ایک
سیاہ گھوڑا ان کا استقبال کر رہا تھا اس
کا جی چاہا کہ وہ اس پر سوار ہو جائے اور
پھر ایسا ہی ہوا وہ دونوں اس پر سوار
ہو گئے۔ گھوڑے نے جست لگائی — اور
ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اوپر ہی اوپر
کی طرف — اجالا ختم ہونے لگا۔ اب
اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اب نہ رضیہ تھی
نہ گھوڑا تھا۔ نہ اپنا اس کا وجود اور نہ
اس کے وجود کا احساس...
ڈاکٹر رضیہ چیخ پڑی۔ مریض کی کھلی
آنکھیں کھلی ہی رہ گئیں۔
" اس لاش کو مردہ خانے میں رکھ دو"
کوئی ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔
" نہیں — نہیں — یہ لاوارث نہیں ہے
یہ لاش — یہ لاش کی وارث میں ہوں میں ہوں"
ڈاکٹر رضیہ کو دیگر ڈاکٹرز سنبھالنے لگے۔
" ڈاکٹر رضیہ اس کی وارث ہیں۔ کون ہوتا
ہے یہ ان کا؟" اسٹاف کی سرگوشیاں ڈاکٹر رضیہ

بیچ. لو اسی ہسپتال میں جو ایک ... سنجیدہ ہونے پر جواب تھا ... ہسپتال کا اسٹاف حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ خدا جانے یہ کیسے رشتے ہیں یہ کیسے بندھن ہیں —

کو جھنجھوڑ ڈالی۔ واقعی یہ کون تھا؟ کون سا رشتہ تھا اس کے ساتھ! کون سا بندھن ہے جس میں بندھی ہوئی ہوں۔ ڈاکٹر رضیہ سوچنے لگی پھر اسے ان سوالات کا جواب مل گیا۔ اور اس کے چہرے پر ایک *

محمد اکرام اللہ خان

فلمی دنیا کے شب و روز

پردہ پس پردہ

من موہن کرشن ہماری فلموں کے بہت ہی قدیم اداکار ہیں۔ کہتے ہیں کہ فلموں میں آنے سے پہلے یہ کسی کالج میں پروفیسر ہوا کرتے تھے۔ بڑے خوش اخلاق سنجیدہ اور ذہین آدمی ہیں مختلف انجمنوں کے روح رواں ہیں اور انڈسٹری میں ان کا بہت بلند مقام ہے ان کا ایقان ہے کہ ایسی شہرت اور عزت جو مشترکہ کوششوں کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے اس کا سہرا کسی ایک فرد کے سر نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ان تمام افراد کے سر ہونا چاہیئے جن کی بدولت وہ حاصل ہوئی ہے۔ وہ ابھی حال میں روس کے دورہ سے واپس ہوئے ہیں اور وہاں کے فنکاروں کے خلوص، مقبولیت اور کامیابی سے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے انھوں نے بتلایا کہ ایکبار وہ روس کے بالشوی تھیٹر میں کوئی شو دیکھنے گئے۔ بڑا ہی اچھا بیلے تھا جب شو ختم ہوا تو تماشائیوں کی طرف سے ایک بڑا سا گلدستہ ہیروئن کی خدمت میں پیش کیا گیا ہال تالیوں سے گونج اٹھا ہیروئن نے شکریہ کے ساتھ اسے قبول کر لیا اور اسی گلدستہ کو اس نے ہیرو ہیرو کے حوالہ کر دیا اس لئے کہ ہیرو بھی اس ڈرامہ کی کامیابی میں اس کا برابر کا شریک تھا۔ ہیرو کو گلدستہ دینا تھا کہ ہال پھر ایک بار تالیوں سے گونج اٹھا۔ کسی بھی میوزیکل ڈرامہ یا بیلے میں میوزک ڈائرکٹر کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے اب اسی ہیرو نے آگے بڑھ کر اسی گلدستہ کو میوزک ڈائرکٹر کو پیش کر دیا اور تالیوں کا سلسلہ ہے کہ ٹوٹنے ہی نہیں پاتا۔ میوزک ڈائرکٹر کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کے ساتھی سازندوں کے بغیر وہ اتنا کامیاب میوزیکل شو پیش ہی نہیں کر سکتا تھا لہذا اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس گلدستہ کے پھولوں کو اپنے ساتھی سازندوں پر سے نچھاور کر دیا اور بالشوی تھیٹر صدائے تحسین کی فلک شگاف آوازوں سے مسلسل گونجنے لگا۔ روس، امریکہ اور یورپ کی پیروی کرنے والے ہمارے فلمساز اگر مل بانٹنے کے اس انداز کو بھی اپنانے کی کوشش کریں جو مغربی فنکاروں کا نصب العین ہے تو ہماری انڈسٹری کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

گذشتہ شماروں میں آپ نے ایک فلم "شالیمار" کے بارے میں ضرور پڑھا ہوگا اب، یہ فلم مکمل ہوگئی ہے اور باہر سے جتنے بھی لوگ اس کی تیاری کے سلسلے میں آئے تھے وہ سب واپس جاچکے ہیں۔ اور فلم بھی بیرونی ملکوں میں نمائش کے لئے پروڈیوسر کرشن شاہ اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں۔ خیال ہے کہ ہندوستان میں یہ فلم شائد ستمبر یا اکتوبر میں ریلیز کر دی جائے گی اور اس وقت تک اس فلم کی پبلسٹی پر کرشن شاہ تقریباً ۳۰ لاکھ روپیہ خرچ کر چکے ہونگے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اتنی رقم میں ہمارے ہاں سو چھوٹی تقریباً چھ فلمیں بنا سکتے ہیں جب کرشن شاہ نے اس فلم کا اعلان کیا تو اس قسم کے اشتہار اخباروں میں جاری کئے گئے۔ "ایلزبیتھ ٹیلر نہیں بلکہ زینت امان" مرلین برانڈو نہیں بلکہ دھرمیندر کو آپ شالیمار میں دیکھیں گے۔ اس قسم کی پبلسٹی ہندوستانیوں کے لئے نئی تھی اور لوگ سوچ رہے تھے کہ شائد یہ سب ڈھونگ نکلے۔ کیونکہ فلم کا مہورت کسی اسٹوڈیو میں ہونے کے بجائے بمبئی کے ٹرف کلب میں ہوا اس کے دعوت نامے اتنے بڑے سائز میں چھاپے گئے تھے کہ ان سے ایک پوری کھڑکی کے ڈھانکنے کا کام لیا جا سکتا تھا مہورت کے سلئے

یہاں خصوصی ہالی وڈ کی مشہور اداکارہ جینا لولوبرگیڈا کو بلوایا گیا تھا جو ہوشربا انداز میں لوگوں کو اپنے مرمریں جسم کے نظارے دکھا رہی تھی ــــ اس مہورت کے بعد تو لوگوں میں شبہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ کرشن شاہ کوئی فراڈ ہے اور اتنا بڑا شو کرکے باہر کے لوگوں سے حاصل کی ہوئی دولت کے ساتھ کہیں فرار ہو جائے گا اور فلم بنانے کے نام پر ایک اور بہت بڑا دھوکہ دنیا کے سامنے آ جائے گا۔ لیکن لوگوں کے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے اور گزشتہ سال ستمبر کو یہ فلم بننا شروع ہوئی۔ فلم کی تیاری کا طریقہ بالکل انوکھا تھا روزآنہ کام اس طرح ہوتا جیسے منٹ منٹ کا حساب ہو رہا ہو ــ اس طرح مہینوں کا کام گھنٹوں میں ہو رہا تھا۔ ان سب چیزوں کے لئے وہ لوگ ڈالر میں معاوضہ ادا کر رہے تھے ہر روز لاکھوں ڈالر ہندوستانی کرنسی میں بدلے جاتے۔ دھرمیندر اور زینت امان نے ایک درجن ہندوستانی پروڈیوسروں کی فلموں کو ادھورا چھوڑ کر کرشن شاہ کے لئے کام منظور کر لیا تھا اس لئے کہ ہندوستانی پروڈیوسر ان کے لئے ٹھہر سکتے تھے لیکن کرشن شاہ کیلئے شاید وقت بھی ذرا سی دیر کے لئے نہ ٹھہر سکے اور معاوضہ انھیں جو ملا وہ دس ہندوستانی فلموں کے برابر تھا اور وہ بھی نقد ا ــ اس طرح سے اتنی بڑی فلم ریکارڈ ٹائم یعنی چند مہینوں میں بن کر تیار ہو گئی۔ اب ریلیز کے لئے پبلسٹی کے نت نئے طریقے آزمائے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر پالی ڈور کمپنی والے جو اس فلم کے ریکارڈ تیار کریں گے وہ ہر ریکارڈ کے ساتھ ایک دلچسپ معمہ بھی رکھ رہے ہیں اور انعام جیتنے والے کو پچاس ہزار روپیہ کی مالیت کا ہیرا تحفہ میں دیا جائے گا اس طرح جو ریکارڈوں کی بکری ہوگی اس کا اندازہ کروڑوں میں کیا جا رہا ہے فلم کی ریلیز پر کئی کتابیں شائع ہوں گی جو فلم اور فلم بنانے والوں کے دلچسپ تجربات پر مشتمل ہوں گی غرض یہ فلم باہر والوں کے لئے معمولی بات ہو تو ہو ہندوستانی فلمسازوں کے لئے عجوبہ ثابت ہوگی ــــ ••

ارشادِ مرتضیٰ علیؑ

حضرت علی علیہ السلام اپنے فرزند امام حسینؑ کو ہدایت دیتے ہوئے اے فرزند بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جو مذہب کے معاملے میں آپ کے ہم خیال نہیں، لیکن آپ احتیاط کرنا، ایسی گفتگو نہ کرنا جس سے کسی کی دل شکنی اور رنجش ہو۔

فلمی ڈائری

راجکپور کی شاہکار فلم "ستیم شیوم سندرم" ریلیز ہوئی اور بے چین و مشتاق تماشائیوں نے جو ایک عرصے سے اس فلم کا انتظار کر رہے تھے ملے جلے انداز میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ بعض تماشائیوں کو جہاں یہ فلم بے حد پسند آئی وہیں دوسرے بہت سارے تماشائی اسے دیکھ کر مایوسی کا شکار ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ راجکپور سے جو توقعات تھیں وہ پوری نہیں ہوسکیں اسی ردعمل کا اظہار فلمی حلقوں میں بھی ہو رہا ہے اور "باکس آفس" پر بھی۔ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ "ستیم شیوم سندرم" کو وہ شاندار کامیابی نصیب نہیں ہوسکتی جو "بوبی" کو ملی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ فلم "میرا نام جوکر" کی طرح "باکس آفس" پر فلاپ نہیں ہوگی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "ستیم شیوم سندرم" مشہور انگریزی فلم "WOMANSFACE" کی کسی حد تک کاپی ہے۔

"ستیم شیوم سندرم" کا عالمی پریمیر ۲۰ مئی کو تاشقند کے فلمی میلے میں کیا گیا جہاں راج کپور کا اور اس فلم کے دوسرے اداکاروں کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ روسی عوام نے والہانہ انداز میں راجکپور اور اس کے ساتھیوں کو خوش آمدید کہا۔ خیر مقدمی تقریب کے موقع پر ازبکستان اسٹوڈیو میں ایک شخص نے اپنے سات سالہ بچے کو راجکپور کے سامنے پیش کیا اور کہا اس نے اپنے اس بچے کا نام راجکپور رکھا ہے۔ اس موقع پر ایک لڑکے نے راج کپور کی فلم "آوارہ" کے گانے پیش کئے اور ایک بار پھر یہ بات ثابت ہوگئی کہ راجکپور اور اس کی فلمیں روسی عوام میں بے حد مقبول ہیں اسی کے ساتھ ساتھ یہاں اردو کی مقبولیت کا ثبوت بھی ملا۔ جب ایک ازبک۔ اردو ترجمان نے ہندوستانی فلمی وفد کے سامنے بارہ فلمی گانے گائے اور وہ بھی شستہ اردو لہجے میں۔ اس نے یہ فلمی گانے ریکارڈ سن سن کر یاد کر لئے تھے۔

بمبئی میں، بمبئی لیبر یونین سے وابستہ سنیماؤں کے مزدور ہڑتال کر رہے ہیں اس ہڑتال کا سامنا "ستیم شیوم سندرم" کو بھی کرنا پڑا جب اندھیری کے ایک سنیما گھر کے مالک نے اس ہڑتال کے خلاف حکم التواء حاصل کر لیا اور اس طرح فلم کی نمائش جاری رہی۔ ملاڈ کے ایک سنیما "نیو ایرا" میں بھی ہڑتالیوں نے اس فلم کی نمائش کو روکنے کی کوشش کی اور فلم کے پرنٹس کو بھی دوسری سنیما جانے سے روک لیا گیا لیکن سنیما کے مالکین نے کسی طرح اس مسئلہ کو سلجھا لیا اور فلم کی نمائش جاری رہی۔

"ستیم شیوم سندرم" کو سنسر کا "A" سرٹیفکیٹ ملا ہے مرکزی سنسر بورڈ کے چیئرمین مسٹر کھنڈپور نے کہا ہے کہ فلم موضوع کے اعتبار سے ایسی ہے کہ اسے "U" سرٹیفکیٹ دیا جانا چاہئے تھا لیکن فلم کے بعض عریاں اور جنسی مناظر کے باعث "A" سرٹیفکیٹ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ بے بی پدمنی نے اس فلم میں زینت کے بچپن کا کردار ادا کیا ہے "A" سرٹیفکیٹ کے باوجود بے بی پدمنی کو اس فلم کے دیکھنے کی اجازت دی گئی جبکہ نوتن کو اپنی پہلی فلم "نگینہ" دیکھنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ نوتن نے اس فلم میں بچی کا رول ادا کیا تھا اور فلم کی نمائش صرف بالغوں کے لئے تھی۔

"ستیم شیوم سندرم" کی نمائش کے بعد دیو آنند کی "دیس پردیس" بھی پچھلے ماہ ریلیز ہوگئی ہے اور پھر ایک بار ہندوستانی فلم انڈسٹری کی دو دیو قامت شخصیتیں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ "دیس پردیس" کو بھی "A" سرٹیفکیٹ ملا ہے اور بعض فلمی نقادوں کا کہنا ہے کہ فلم ہر لحاظ سے انتہائی خوبصورت ہے۔ کسی فلم

کی خوبصورتی تماشائیوں کو زیادہ متاثر کرتی ہے اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔ اس سے پہلے بھی راج کپور اور دیو آنند کی فلمیں ایک ساتھ یا یکے بعد دیگرے آئی تھیں تو کامیابی کسی ایک کے حصے میں آئی تھی راج کپور کی "میرا نام جوکر" کے مقابلے میں دیو آنند کی "جانی میرا نام"۔ باکس آفس کے اعتبار سے بے حد کامیاب رہی جبکہ "میرا نام جوکر" بامعنی اور خوبصورت فلم ہونے کے باوجود بھی فلاپ ہو گئی۔ "جانی میرا نام" کی کامیابی کے بعد ہی دیو آنند کی "جوشیلا" آئی جو باکس آفس پر بری طرح ناکام ہو گئی۔ اس کے بعد راج کپور کی "بوبی" کو جو شاندار کامیابی ملی ہے وہ باکس آفس کی تاریخ میں بہت کم فلموں کو نصیب ہوتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ باکس آفس کی دیوی "ستیم شیوم سندرم" پر مہربان ہوتی ہے یا "دیس پردیس" پر ___

*

سہراب مودی ان دنوں "مینا کماری کی امر کہانی" بنا رہے ہیں۔ فلم کو زیادہ سے زیادہ حقیقت سے قریب کرنے کے لئے ان مقامات پر شوٹنگ کی جا رہی ہے جہاں مینا کماری نے زندگی بسر کی تھی۔ روپ تارا اسٹوڈیو کے سامنے اس مقام پر بھی شوٹنگ کی گئی جہاں مینا کماری کا بچپن گزرا تھا سہراب مودی کی اس دلچسپی اور محنت کے پیش نظر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ "مینا کماری کی امر کہانی" آپکی شاہکار فلموں میں سے ایک ہوگی۔ سہراب مودی تاریخی واقعات کو دلچسپ انداز میں فلموں کا روپ دینے میں اپنا جواب نہیں رکھتے بلکہ حقیقی معنوں میں تاریخی فلموں کی روایت صرف ان ہی کے نام سے وابستہ ہے پچھلے دنوں بمبئی میں سہراب مودی کی فلموں کا یادگار انتخاب (RETRES PEC TIVE) پیش کیا گیا۔ اس تقریب کا آغاز ان کی بیوی مسز مہتاب نے غالب کے اس خوبصورت شعر سے کیا ؎

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

اس موقعہ پر سہراب مودی کی یادگار فلمیں "سکندر اعظم" "پرتھوی ولبھ" "پکار" "جھانسی کی رانی" اور "مرزا غالب" دکھائی گئیں۔ سہراب مودی اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے فلم ساز ہی نہیں بلکہ مقبول ترین ہدایت کار اور اداکار بھی رہ چکے ہیں۔ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ جب ان کی فلم "شیش محل" چل رہی تھی تو ایک شخص ہر روز فلم دیکھنے آتا اور سر جھکائے اپنی نشست پر بیٹھا رہتا اسکرین کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ بعد کو پتہ چلا کہ وہ اندھا تھا اور صرف سہراب مودی کی آواز سننے کے لئے سینما ہال آیا کرتا تھا۔

*

"دیس پردیس" کے ایک گانے کی شوٹنگ پانچ سٹس پر کی جا رہی ہے۔ آر۔ کے۔ اسٹوڈیو میں تیار کئے جانے والے ان سٹس پر ۹ لاکھ روپے کی لاگت آئی ہے۔

*

آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے ستیہ جیت رے کو "ڈاکٹریٹ" کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی ہے۔ ہدایت کار کی حیثیت سے رے پہلے ہندوستانی ہیں جنھیں یہ اعزاز ملا ہے اس سے پہلے یہ اعزاز ایک انگلش اداکار کو مل چکا ہے۔

*

مارلن برانڈو کی شہرہ آفاق فلم "GOD FATHER" جس کا دو ڈھائی سال سے بے چینی کے ساتھ انتظار کیا جا رہا تھا۔ اب بہت جلد نمائش کے لئے پیش کی جا رہی ہے۔ بالآخر اس فلم کو سنسر کا سرٹیفکیٹ مل گیا ہے لیکن "A" سرٹیفکیٹ۔

موہن ظفر کی نئی پیشکش "[illegible] کرشنا" کا بہت جلد مہورت ہونے

والی ہے اس فلم کی کہانی ، جا رہے وزیر اعظم مسٹر مرار جی دیسائی کی ہے۔ راما نند ساگر اس فلم کی ہدایت دے رہے ہیں۔ جس میں ششی کپور، دھرمیندر، ہیما مالنی، ونود کھنہ، رشی کپور، راجندر کمار، سلکھشنا پنڈت اور اوم شیو پوری وغیرہ کام کر رہے ہیں۔

★

ہیما مالنی ان دنوں "رضیہ سلطان" اور "امیر" کی شوٹنگ میں مصروف ہے یہ فلمیں بہت جلد مکمل ہو جائیں گی۔ چونکہ یہ فلمیں موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں اس لئے ہیما مالنی کو ان فلموں کے لئے موڈ بنانے میں کافی دقت ہو رہی ہے۔ ہیما مالنی ایک ایسی فلم میں کام کرنا چاہتی ہے جس میں کم سے کم آٹھ دس کلاسیکل رقص ہوں۔ کوئی بھی ہدایت کار یا رائٹر جس کے پاس اس قسم کی کہانی ہو وہ ہیما مالنی سے ربط پیدا کر سکتا ہے ہیما نہ صرف اس قسم کی فلم میں کام کرنا پسند کرے گی۔ بلکہ خود اس فلم کو پروڈیوس کرنے کے لئے بھی تیار ہے۔

★

ہالی ووڈ کی سپر کار اداکارہ الزبتھ ٹیلر نے اعلان کیا ہے کہ مرنے کے بعد اس کی خوبصورت آنکھیں کسی کو نابینا کو دینے کیلئے محفوظ کر دی جائیں۔ ۔۔۔ اسی قسم کے سوال کر رہے ہیں۔

اردو اکیڈمی آندھرا پردیش

اردو اکیڈمی آندھرا

میں کہا گیا ہے کہ اردو کی کتابوں پر اکیڈیمی کی جانب سے ایوارڈ دینے کی اسکیم کے تحت آندھرا پردیش سے تعلق رکھنے والے اردو کے اہل قلم سے خواہش کی جاتی ہے کہ ۱۹۷۷ء کے دوران میں (یکم جنوری ۷۷ء سے ۳۱ دسمبر ۷۷ء تک) شائع ہونے والی اپنی اردو مطبوعات ڈائرکٹر صاحب اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش حیدرآباد کے پتے پر روانہ فرمائیں۔ جمیع اصناف ادب اور مختلف علوم و فنون کی کتابوں نیز معیاری ترجموں کی کتابوں پر انعامات دینے کے لئے غور کیا جائے گا۔ البتہ کسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن، درسی کتابیں اور ان کی شرحیں قابل قبول نہیں ہوں گی۔

۱۹۷۷ء کے دوران میں چھپنے والی ایسی کتابیں بھی بھیجی جا سکتی ہیں جنھیں ملک کے کسی سرکاری یا نیم سرکاری یا خانگی ادارے کی جانب سے یکم جنوری ۷۷ء تا ۳۱ دسمبر ۷۷ء کے دوران نقد انعام یا ان کی اشاعت کے لئے مالی امداد ملی ہو۔

درخواست کے ساتھ ہر کتاب کے پانچ نسخے روانہ کئے جائیں۔ اکیڈمی کے دفتر پر کتابوں کے وصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ جولائی ۱۹۷۸ء مقرر کی گئی ہے۔ درخواست کے مقررہ فارم اکیڈیمی کے دفتر سے کام کے دنوں میں روزانہ دن کے گیارہ بجے سے شام کے پانچ بجے تک دست بدست حاصل کئے جا سکتے ہیں یا بذریعہ ڈاک طلب کئے جا سکتے ہیں۔

★

آندھرا پردیش سے تعلق رکھنے والے اردو کے اہل قلم اپنے غیر مطبوعہ اردو نگارشات کی طباعت کے لئے اکیڈمی کی گرانٹ حاصل کرنے کی غرض سے مقررہ فارم پر درخواستیں بھیج سکتے ہیں درخواستیں دفتر پر وصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۶ اگست مقرر کی گئی ہے درخواست کے مقررہ فارم اکیڈیمی کے دفتر سے بذریعہ ڈاک طلب کئے جا سکتے ہیں یا کام کے دنوں میں دست بدست حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

کسی بھی صنف ادب یا علوم و فنون کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والی کتاب کا مسودہ روانہ کیا جا سکتا ہے۔ مسودہ کسی صورت میں بھی واپس نہیں کیا جائے گا اس لئے مناسب ہوگا کہ اہل قلم اپنے مسودے کی نقل روانہ فرمائیں۔ درسی کتابوں یا ان کی شرحوں کے مسودے قبول نہیں کئے جائیں گے۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلات مطلوب ہوں تو ڈاک یا فون نمبر ۳۴۳۵۰۲ کے ذریعے یا براہ راست اکیڈیمی کے ارباب کار سے رابطہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔

POONAM URDU MONTHLY
Office : Azampura Hyderabad-500 024 Editor : Nasir Kurnoo[l]

ماہنامہ پونم کی خصوصی اشاعت

افسانہ نمبر

جس میں

آندھراپردیش کے ممتاز افسانہ نگاروں کی تصاویر اور حالات زندگی کے

ساتھ ان کی منتخب تخلیقات بھی شامل ہوں گی

رنگین ٹائٹل، خوبصورت کتابت وطباعت سے آراستہ، یہ ضخیم نمبر

عنقریب شائع ہوگا۔

اشاعت کا چودھواں سال

جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت

علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

پونم

حیدرآباد

ایڈیٹر: ناصر کرنولی، ایم اے عثمانیہ

اگست ۱۹۷۸ء

جلد (۱۴) شمارہ (۸)

زرِ سالانہ: (۱۵) روپے

لائبریریز کیلئے: (۲۰) روپے

بیرونی ممالک سے (۳۵) شلنگ

فی پرچہ Rs. 1/25

خط و کتابت کا پتہ: منیجر ماہنامہ پونم

16-7-300/1

اعظم پورہ، حیدرآباد ۲۴-۵۰۰۰

ترتیب

15 اگست

خوشیوں کا دن — قربانیوں اور نصب العین کے لئے اپنے آپ کو پھر وقف کرنے کا دن۔

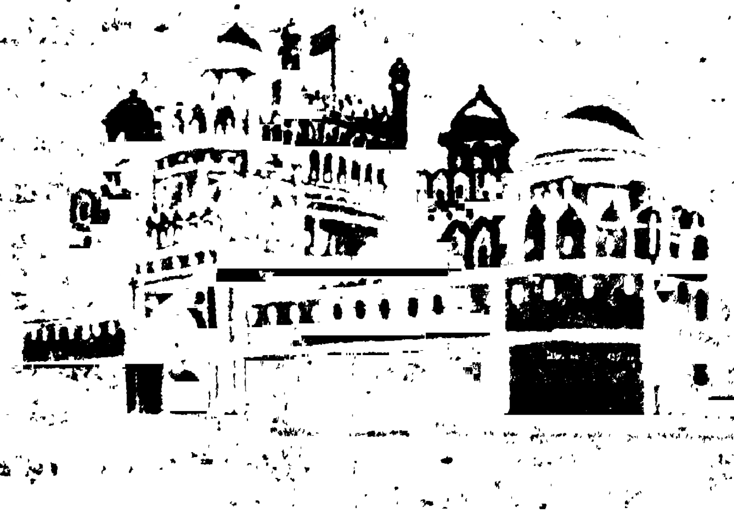
آج کے دن ہم یاد کرتے ہیں:

— مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں آزادی کی تاریخی جدوجہد۔
— ہمارے لاکھوں کروڑوں ہم وطنوں کی قربانیاں اور مصائب۔
— آزادی کا استحکام، ملک کی یکجہتی اور اقتصادی ترقی کی نیو رکھنے کے عظیم کام۔

آج ہم عہد کرتے ہیں:

— ہم ملک سے جہالت، بیماری اور ناداری دور کریں گے۔
— ہم اپنے 5 لاکھ 76 ہزار گاؤں کے لوگوں کو پینے کا پانی مہیا کریں گے اور ان کی صحت، تعلیم اور سڑکوں کی کمی کو کم سے کم وقت میں پورا کریں گے۔
— ہم سماج کے کمزور طبقوں کو اپنے ساتھ برابر کے حصہ دار بنا کر سماجی اور اقتصادی ترقی کی راہ پر آگے بڑھیں گے۔

آزادی کی اس اکتیسویں سالگرہ پر آیئے ہم عہد کریں کہ ہم مہاتما گاندھی کے سپنوں کا بھارت تعمیر کریں گے — آیئے! ہم ہر آنکھ سے آنسو پونچھنے کی کوشش کریں۔



ترنگا میرا وطن

مری زمین بھونی بڑی سلونی ہے
ترنگا بن گیا دامن ہوا میں لہراتا
مزاج ان کا انوکھا ہے تین رنگوں میں
ہرا ـــ زمین کا زیور ہے کھیت کی دھڑکن
یہی ہے روح کی ٹھنڈک، یہی نظر کا سرور
اسی کے بر مقابل شفق کی لالی ہے
یہی ہے سرخ سویرا یہی ہے جوشِ جنوں
ہمارا خون یہی ہے، ہماری قربانی
دھنک نے اپنے رنگوں سے رنگا ہے پیراہن
ہرے سے لال تلک صرف شانتی کا سفر
سفید ـــ نور کا دامن پیام بدھا کا
اشوک چکر پہ نازاں ہے میرا نقشِ سخن
ترنگا میرا چمن ہے
ترنگا میرا وطن

سعید بن محمد نقش

سفر کی انا

ظلمت سے انوارِ سحر تک
رکتے رکتے سنبھلے سنبھلے اور ذرا تیزی سے چل کر
ہم جس منزل پہ پہنچے ہیں
اس کا نام ہے چاندی جیسا
نظروں میں ہیروں کی چمک ہے
پیشانی پہ جگمگ کرتے یاقوت اور الماس کے جھومر
بازو بند میں نیلم، سونا اور جواہر
قدم قدم پر چاند ستارے
دیکھو! دنیا والو دیکھو!
کتنے تونگر، کیسے فرخ بخت ہیں ہم بھی
ظلمت سے انوارِ سحر تک
کتنا مبارک اور مستحسن اپنا سفر ہے

وقار خلیل

آزادی سے متعلق دو نظمیں

آندھرا پردیش اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن

۱۵ اگست ۱۹۷۸ء

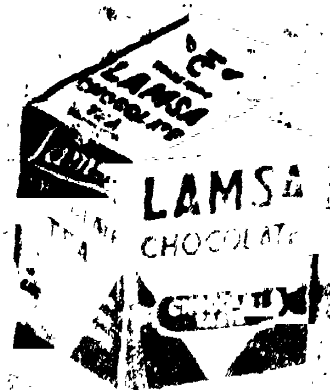
کے پُرمسرت موقع پر اپنے تمام بہی خواہوں کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے

عوام کے تعاون اور اشتراک سے کارپوریشن زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو رہا ہے
اور اس نے سارے ریاست میں اپنی سرگرمیوں کو پھیلاتے ہوئے پڑوسی ریاستوں کے تمام صدر مقامات
کو ہمارے ریاست کے صدر مقام سے مربوط کر دیا ہے۔
اور اب وہ ریاست آندھرا پردیش میں بس سروس کے ذریعہ
تمام دیہاتوں کو مربوط کرنے کے لئے کوشاں ہے۔

ہم مسافروں کے لئے موثر کم خرچ اور تیز رفتار ٹرانسپورٹ کی سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔

آر۔ پربھاکر راؤ آئی پی ایس
وائس چیرمن اینڈ جنرل منیجر آندھرا پردیش اسٹیٹ
روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن

پی۔ نرسنگ راؤ
چیرمن
آندھرا پردیش اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن



معیاری اور اعلیٰ ذوق کے اصحاب ہمیشہ

لمسا چاکلیٹ چائے

لاسا اسپیشل چائے

اور

نئی لاسا سوپر بلنڈ چائے

ہی پسند کرتے ہیں



مخدوم کی یاد میں

(مخدوم کی نویں برسی کے موقع پر ۔ ادارہ)

مخدوم محی الدین

چاند تاروں کا بن

(آزادی سے پہلے، بعد اور آگے)

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لئے
منتظر مرد و زن
مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن
صبح دم ایک دیوار غم بن گئے
خارزار الم بن گئے
رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو
جوئے خوں بن گیا

کچھ امامان صد مکر و فن
ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں تھا
اک کمین گاہ سے
پھینک کر اپنی نوک زبان
خون نور سحر پی گئے
رات کی تلچھٹیں ہیں، اندھیرا بھی ہے۔
صبح کا کچھ اجالا، اجالا بھی ہے

ہمدمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی، منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

بڑھ گیا بادۂ گلگوں کا مزہ آخرِ شب
اور بھی سرخ ہے رخسارِ حیا آخرِ شب

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب

کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیرِ درِ میخانہ
کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا آخرِ شب

سانس رکتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی
کوئی لیتا تھا ترا نام وفا آخرِ شب

گل ہے قندیلِ حرم گل ہیں کلیسا کے چراغ
سوئے پیمانہ بڑھے دستِ دعا آخرِ شب

ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جرم چپ سر بہ گریباں ہے جفا آخرِ شب

اسی انداز سے پھر صبح کا آنچل ڈھلکے
اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب

مسعلی
شفقی

غزلیں

شفقی

مخدوم محی الدین

یہ کون آتا ہے تنہائیوں میں جام لیے
جلو میں چاندنی راتوں کا اہتمام لیے

چٹک رہی ہے کسی یاد کی کلی دل میں
نظر میں رقصِ بہاراں کی صبح و شام لیے

ہجومِ بادۂ و گل میں ہجومِ یاراں میں
کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے

کسی خیال کی خوشبو کسی بدن کی مہک
درِ قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لیے

مہک مہک کے جگاتی رہی نسیمِ سحر
لبوں پہ یارِ مسیحا نفس کا نام لیے

بجا رہا تھا کہیں دور کوئی شہنائی
اٹھا ہوں آنکھوں میں اک خوابِ ناتمام لیے

۲۷، پٹوڈی ہاؤس
نئی دہلی ۱

ناصر صاحب
آداب

"جشن مخدوم" میں مخدوم صاحب پر جو مضمون پڑھا تھا وہ "پونم" کے لئے بھجوا رہی ہوں ۔ شایع کر لیجئے گا ۔ اگر طویل معلوم ہو تو دو قسطوں میں چھاپ لیجئے ورنہ اگر ایک ہی قسط میں چھپ سکے تو اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے کیونکہ تب مضمون کا امپریشن مکمل رہے گا بہر حال جیسی آپ کی سہولت اور مرضی ۔

آمنہ ابوالحسن
۱۴ مئی ۷۸

مخدوم ۔
روشن یادوں کا آبشار

آمنہ ابوالحسن

سب دوپہروں کی طرح وہ دوپہر بھی ڈھلی اور جب سہ پہر کی چائے ہو چکی تو میں نے کافی حیرانی سے دیکھا کہ میری دونوں بڑی بہنیں ہر شام کی طرح فوراً کھیل کے میدان میں اتر جانے کی بجائے اپنے کمرے میں چلی گئیں اور بڑی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں ۔ کچھ انتظار کے بعد میں بھی کمرے میں گئی اور ریکٹس کو تھامتے ہوئے پوچھا ۔ "کیا آج بیڈمنٹن نہیں کھیلا جائے گا ؟ آج ہمارے پاس کوئی دعوت ہے کیا ؟"

"نہیں تو" باجی نے کہا "دعوت تو کوئی نہیں مگر آج ہم کانفرنس میں جا رہے ہیں ۔"

"اور ہم ۔ ؟" میں انھیں تکنے لگی ۔

" آپ ۔ ؟ آپ چل کر کیا کریں گی ۔ آپ کی سمجھ میں تو کچھ نہ آئے گا ۔"

میں اداس سی آکر برآمدے کی کرسی پہ بیٹھ گئی ۔ ممانے میرا چہرا دیکھا اور باجی کو آواز دے کر بولیں "اسے بھی ساتھ لیجاؤ ۔ کیا حرج ہے ۔"

تب باجی جھٹ پٹ مجھے بھی تیار کرنے لگیں ۔ ۱۹۴۶ء کی ایک شام تھی وہ جب حیدرآباد میں پہلی مرتبہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس بہت بڑے پیمانے پر منعقد ہوئی تھی ۔ اس وقت حیدرآباد کی تہذیب میں خواتین کے لیے ابھی "چلمنیں" رائج تھیں چنانچہ شہ نشین کے ایک طرف چوڑی چکلی چلمنوں کے پیچھے ہی شوقین خواتین اپنے محبوب ادیبوں اور فنکاروں کو دیکھنے اور سننے کے لیے جمع تھیں ۔ تھوڑی دیر تک تو میں بھی چلمنوں کی اوٹ سے سارا ہنگامہ دیکھتی رہی پھر کچھ اکتا کر میں نے چلمن کا کونا اٹھایا اور ڈائس پر نکل گئی تاکہ سب کچھ پاس سے دیکھ سکوں اور اپنی اس عمر کے اعتبار سے میں ہر اہم اور بڑی شخصیت سے بے نیاز ڈائس کے کنارے کنارے ٹہلنے لگی ۔ مجھے خوب یاد ہے کہ دفعتہً کئی متعجب نگاہیں میری جانب اٹھ گئیں تھیں اور پھر ایک شخص لپک کر میری طرف آیا مجھے گود میں اٹھا کر میرا نام پوچھنے لگا ۔ نام تو میں نے بتا دیا مگر کچھ جھجک سی گئی کیونکہ میں اس شخص کو پہچانتی نہیں تھی ۔

"اچھا یہ تو بتائیے آپ یہاں کیا کرنے آئی ہیں ۔؟" اس شخص نے مجھے گود سے اتارے بغیر سوال کیا ۔

"ہم ۔؟ ہم یہاں کانفرنس دیکھنے آئے ہیں" میں نے کافی اٹھلا کر کہا ۔

وہ شخص مسکرایا ۔ "اوہو ۔ ! تو کہیں نظر آئی آپ کو کانفرنس ۔؟"

" ابھی تک تو نظر نہیں آئی۔"

" تو تب تک آپ ہماری گود میں بیٹھئے۔ جیسے ہی کانفرنس نظر آجائے ہمیں بھی بتادینا۔ ہم بھی دیکھیں گے۔"

وہ مجھے لیئے لوگوں کے درمیان پہونچے اور سب کو مخاطب کرکے کہا۔ " بھئی یہ کانفرنس دیکھنے آئی ہیں مگر انھیں کانفرنس نظر نہیں آئی۔ جس کسی کو نظر آجائے فوراً انھیں دکھلا دینا۔"

ڈائس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا اور ایک طبلے تڑنگے ایسے آدمی نے جس کے چہرے پر صرف ناک ہی ناک تھی جھٹکا " یہ رہی کانفرنس "۔ میں نے بے تابانہ دیکھا اور رھیا کہ مجھے بعد میں علم ہوا وہ عصمت چغتائی تھیں۔ میں کچھ پریشان سی ہوگئی۔ کیا میری بہنیں اور اتنے سارے لوگ اسی کانفرنس کو دیکھنے آئے ہیں۔؟ کیا یہ ساری رونق صرف اسی کانفرنس کے لئے ہے؟ میں نے سوچا اور سوچتی ہی رہ گئی کیونکہ تبھی جلسے کی کاروائی شروع ہوگئی اور سب مجھے بھول بھال کر اس طرف متوجہ ہوگئے۔ میں چپکے سے اس شخص کی گود سے اتر کر پھر کنارے ٹہلنے لگی کہ دیکھوں آخر ہوتا کیا ہے جلسے کی کوئی کاروائی اس وقت میرے پلّے نہ پڑی مگر وہاں سے لوٹ کر بھی وہ شخص اچھی طرح یاد رہ گیا جس کا رنگ اُجلا نہ تھا مگر آنکھیں شمع کی طرح روشن لہجہ ملائم اور مسکراہٹ ابتدائی آفتاب کی طرح نرم نرم تھی۔ ان آنکھوں کی چمک کے علاوہ جس کا اور تھا جس کا تعین میں بہت بعد میں کرسکی یعنی ذہانت مگر اتنی ہی دیر میں وہ آدمی مجھے ڈائس پر بیٹھے ہوئے ہر ہر اجلے اور خوب صورت شخص سے زیادہ پسند آگیا اور کافی عرصے کے بعد مجھے معلوم ہوا وہ مخدوم تھے " سرخ سویرا " کے خالق۔ سب کے محبوب و پسندیدہ شاعر۔ جنھیں دیکھنے۔ جن سے ملنے جن سے گھڑی دو گھڑی گفتگو کر لینے اس وقت چلمن کے پیچھے کی تقریباً ہر لڑکی بے تاب و بے قرار ہوا کرتی تھی اور جن کی پالنا سی گود میں میں ان کی ذرا سی بھی اہمیت جانے بغیر دیر تک بیٹھی رہ گئی تھی۔

مخدوم صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی پھر تو مخدوم صاحب نے میرا نام ہی کانفرنس رکھ دیا۔ جب جہاں کہیں ملتے فوراً مسکرا کر کہتے۔ "ہیلو کانفرنس" اور جب بجھ آئی تو اس بات سے اتنی شرمندگی ہونے لگی کہ جیسے ہی مخدوم صاحب کا سامنا ہوتا میں فوراً بھاگ کھڑی ہوتی۔ ان سے بچنا چاہتی مگر وہ مجھے سنتے اور سب کے بیچ ضرور مجھے چھیڑتے۔ " ہیلو کانفرنس "۔ بڑے دنوں تک وہ مجھے یونہی ستاتے رہے پھر شکر ہے کہ بھول بھال گئے۔ پھر ایک دن اچانک پتہ چلا کہ ممنوعہ سرگرمیوں کے تحت وہ گرفتار کر لیے گئے اور جیل میں بند ہیں۔ اس اطلاع کو پاکر میں بہت روئی اپنے آنسوؤں کا مفہوم جانے بغیر روتی رہی اور محض اس ڈر سے کہ کوئی ان کا مطلب پوچھے تو اپنے آنسوؤں کو کونسا نام دے سکوں گی میں نے وہ آنسو کسی پر ظاہر بھی نہیں کیئے بظاہر میں اپنی روزمرہ زندگی میں ٹھیک رہی مگر ان آنسوؤں کی وجہ سے میرے وجود کا ایک گوشہ پہلی بار دکھ اور کرب سے واقف ہوا۔ ٹھیک انہی دنوں عالم خوندمیری صاحب نے " سرخ سویرا " لاکر ہم بہنوں کو دیا کہ یہ مخدوم صاحب کی کتاب ہے اسے ضرور پڑھنا اور ہم سب بہنیں اسے یوں پڑھنے لگیں جیسے اگر " سرخ سویرا " نہ پڑھا تو ہماری تعلیم ادھوری رہ جائیگی۔ " سرخ سویرا " کی معنویت اور اس کا مزاج اس وقت کم از کم میری فہم سے بالا تھا پھر بھی چونکہ وہ مخدوم صاحب کی کتاب تھی اس لئے اس کی آسان آسان چیزیں میں نے فوراً از بر کرلیں اور اسکول وغیرہ نپٹا کر فرصت کے لمحوں میں گنگنانے لگی۔

گلنار ترانہ گاتا ہے ۔۔۔۔۔۔

دیکھو پرچم لہراتا ہے ۔۔۔۔۔۔

ایک دو مرتبہ خاموشی سے بیٹھے کے

بعد عالم بھابی نے کہا۔

"بھئی یہ کوئی غمگین گیت نہیں
اسے فلمی طرز پہ مت گاؤ۔ یہ تو آزادی کا ترانہ ہے۔ اسے تو بڑے جوش و خروش سے گانا چاہیئے۔"

لہٰذا پھر انہی کی بتائی ہوئی طرز پر میں نے مکہ لہرا لہرا کر گانا شروع کیا

وہ جنگ ہی کیا وہ امن ہی کیا
دشمن جس میں تاراج نہ ہو ....

تب بھابی نے ایک محبت بھری چپت میرے سر پر لگا کر کہا۔

"یہ کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ یہ تمہارے گانے کی چیز نہیں۔"

اور میں نے سوچا بھابی بھی عجیب ہیں کیا وہ مخدوم صاحب کو نہیں جانتیں۔ کیا اُن کی "سرخ سویرا" کبھی نہیں پڑھی اور اگر نہیں تو کیوں نہیں پڑھی۔ انھیں ضرور پڑھنا چاہیئے مگر اپنی اس سوچ کے باوجود میں نے وہ ترانہ پھر کبھی زور سے نہیں گنگنایا۔ من ہی من گنگنا لیا کرتی۔

کچھ دن اور گزر گئے تو لفظوں کی پہچان بڑھی۔ اُن کے معنی و صراحت سمجھ میں آنے لگے۔ اُن دنوں اُن کی رومانی شاعری نے مجھے خود متاثر کیا۔ عمر کی اُس منزل میں اُس شاعری کو پڑھ کر یہی لگا کہ پیار کی یہ بات مجھے اور نہ جانے کتنوں کو دوہرا رہی ہے۔ مخدوم صاحب پہلے ہی کہہ چکے ہیں "اس شاعری نے مخدوم صاحب کو بہت پاس لا کھڑا کیا اور ان کی نگہت یوں بڑھتی گئی کہ قدم قدم عمر کے مراحل سے گزرتے ہوئے شعور کی سادا بی شعور کی ترقی اُن کے تمام پیغام سمجھنے لگی وہ جو انھوں نے اپنے چاہنے والوں کو دیئے اور وہ بھی جو انھوں نے زمانے کو دیئے۔ ملک کے حالات تیزی سے بدل رہے تھے اور ان حالات کی پرچھائیاں ہر حساس ذہن پر اثر انداز ہو رہی تھیں ٹھیک یہی وہ دور تھا جب میں اُن کی رومانی شاعری سے سرعت سے گزر کر اُن کی سیاسی شاعری کی طرف متوجہ ہوئی، اور کتابِ مستقبل کا ایک نیا باب میری آنکھوں کے آگے کھلا ۔۔۔ بس اس شاعری کی سوجھ بوجھ کے ساتھ ذہن کے مقفل گوشے کھلتے گئے اُن کی تاریکی تنہائی دور ہونے لگی۔ آنے والے مرحلوں کی چاپ اسی شاعری سے اُبھر اُبھر کر آرزو کا آہنگ اور امید کا دامن بننے لگی۔ اُن کی انقلابی شاعری کا لہجہ اُس طبل کی طرح تھا جس کی پہلی ہی چوٹ معرکے کا اعلان ہو۔ میں اس جوش و جنون کو محسوس ہی کر رہی تھی کہ پتہ چلا مخدوم صاحب قید سے رہا ہو گئے۔ تب ان کے خیر مقدم کے لئے سلطان بازار میں واقع راجہ پرتاب گیرجی کی کوٹھی میں ایسا زبردست اجتماع عمل میں آیا جو ناقابلِ احاطہ تھا۔ لوگوں کا ایک سیلاب تھا جو نہ جانے کہاں کہاں سے امنڈ آیا تھا اور اس سیلاب کو دیکھ کر صرف یہی احساس ہوتا تھا کہ اُس وقت وہ بلکہ پورا محلہ ہی اینٹ پتھر سمنٹ کا نہیں بلکہ انسانی سروں، جسموں اور مشتاق محبتوں سے بنا ہوا ہے کوٹھی کا وسیع صحن بھی ہجوم سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور تاحدِ نظر انھیں چاہنے والوں کی ایسی بھاری بھیڑ تھی جو انتظار کے ایک ایک لمحے کو اپنی والہانہ بے تابی سے سنوار رہی تھی۔ ایسے میں نعروں کے شور اور جوشیلے جلوس کے جلو میں جب مخدوم صاحب شہ نشین پر پہونچائے گئے تو لوگوں کی بے تابی حد سے سوا ہو گئی۔ ہر شخص انھیں دیکھ لینے۔ اُن سے ایک آدھ بات کر لینے۔ آٹوگراف لینے بے چین ہو گیا پھر سب کی خواہش پر مخدوم صاحب نے اپنی نظمیں سنائیں۔ جو آخر آخر میں کورس کی شکل اختیار کر گئیں۔ اور مخدوم صاحب کا وہ خیر مقدم کوئی حیدر آبادی شاید ہی کبھی بھول سکے کہ ویسا قلبی خیر مقدم ہر ایک کا حصہ بھی تو نہیں۔

اس کے بعد وہ صرف شاعر ہی نہیں مجاہد اور قائد بھی مان لیے گئے اُن کا نام ادب کے ماتھے پر تو درج

...تب سیاست کے ماتھے پر جھا...
ہوگیا اور نہ صرف اُن کی شاعری نے بلکہ
سماجی جدوجہد نے بھی اُس وقت کی
اُبھرتی ہوئی نسل کو شدید طور پر
...و آگاہ کیا۔

پھر جب حیدرآباد میں دوسری
اُردو کانفرنس منعقد ہوئی تو اُس کے
پروگرام کے لئے جناب محبوب حسین
...احب نے جو اُس وقت سے اب تک
...آباد کے روحِ رواں ہیں مجھے کنوینر
...یا۔ میں بہت گھبرائی میں نے دبے لفظوں
...ر صاحب سے کہا۔ مجھے کنوینر نہ بنائیے
...مجھے کلچرل فیلڈ کا کوئی تجربہ نہیں مگر
...جگر صاحب کے مزاج سے واقف
...خوب جانتے ہیں کہ وہ اپنے فیصلے
نہیں کرتے لہٰذا انھوں نے نہایت
آواز میں کہا تم ہی اس پروگرام کی
...ر رہو گی۔ تجربہ کام کرنے سے حاصل
...ہے گھر بیٹھے رہنے سے نہیں۔ جاؤ
...پنا کام کرو۔

میری دھیمی آواز اُن کی اونچی آواز
...ب گئی اور میں اخبار سیاست کے آفس میں
... اُن دنوں ان سرگرمیوں کا مرکز تھا
...رسی پر ... کر پروگرام کی بابت حیرانی
...نے لگی تب اکبر نے مجھے ہمت دلائی
...س ہمت افزائی پر جو ... خیال ٹیک
...میرے ذہن میں آئے وہ مخدوم صاحب
...اور آرٹس اکیڈیمی کی بابت تھے۔

مجھے اپنا وجود روشن ہوتا محسوس ہوا اور
میں فوراً اٹھ کر فائن آرٹس اکیڈیمی کے
دفتر بھاگی جہاں ممتاز بھائی کے سوا اُس
وقت کوئی نہ ملا مگر ممتاز بھائی ہی اُمید
کی شعاع بن گئے۔ اُن سے تعاون کا پکا
وعدہ لے کر میں مخدوم صاحب سے ملنے
"اورینٹ ہوٹل" پہنچی اورینٹ ہوٹل اب
تو شادی خانہ بن گیا ہے مگر تب ادیبوں
اور آرٹسٹوں کا گڑھ تھا۔ مخدوم صاحب
حسبِ امید وہاں موجود تھے۔ حیرانی سے
مجھے دیکھ کر پوچھنے لگے۔ کہیں آج تم
اورینٹ ہوٹل دیکھنے تو نہیں آئی ہو؟
شریر گفتگو اُن کا خاصہ تھی۔

جی نہیں۔ میں ہوٹل ووٹل دیکھنے
نہیں آپ کے لئے آئی ہوں۔

میرے لئے۔؟ وہ جلدی سے میرا
کندھا تھام کر بولے۔

بیٹھو بیٹھو۔ کیا کام ہے مجھ سے؟
مجھے آپ کی غزلیں پیش کرنے کی
اجازت چاہیئے۔

ضرور پیش کرو مگر کیونکر پیش کرو گی
تم۔ کسی قوال سے گوانے کا ارادہ تو نہیں؟
حسبِ عادت اُن کا زوردار قہقہہ گونجا
اور اس قہقہے پر آس پاس کے لوگوں
نے پلٹ کر ہمیں دیکھا۔

اُفوہ۔ میں نے کہا۔ شرارت
چھوڑیئے کبھی تو سنجیدگی سے بات کیجئے
مجھ سے۔

ٹھیک ہے۔ ... سنجیدہ ہوں اب۔
پوری بات وضاحت سے بتاؤ۔

اور میں نے بتایا کہ اُردو کانفرنس
کے کلچرل پروگرام میں آپ کی غزلیں فائن
آرٹس اکیڈیمی کے فنکار گائیں گے۔

ضرور گائیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

تو اب یہ بھی بتا دیجئے اپنی کونسی
غزلیں سننا پسند کریں گے آپ۔؟

بھئی یہ تمہارا کام ہے۔ کنوینر تم ہو
انتخاب تمہیں ہی کرنا چاہئے۔ ذرا تمہارا
انتخاب بھی دیکھ لیں۔

اچھی بات ہے۔ میں اٹھ کھڑی
ہوئی اور پہلی بار بڑے عزم کے ساتھ واپس
لوٹی۔ اگلے ہی دن اس سلسلے کی ایک میٹنگ
ہوئی جس میں سارا پروگرام اکبر۔ میں جناب
حمایت اللہ صاحب ممتاز بھائی اور مصطفےٰ
علی بیگ صاحب کے مشوروں کے ساتھ
ترتیب دے کر منظوری کے لئے جگر صاحب
کو پیش کر دیا گیا۔ انھوں نے اس پروگرام
میں چند ایک تبدیلیوں کے بعد منظوری دے
دی اور وہ دن میرے اعتماد کا پہلا دن تھا
حالانکہ دل شدت سے دھڑک رہا تھا
مگر کچھ ایسی خوشی بھی وجود میں سما گئی
تھی جیسے صبحِ چمن پھول میں اتر آتی ہو۔
جب کانفرنس کی ادبی نشستیں ختم ہو گئیں تو
کلچرل پروگرام کی شام آئی۔ میں نے پردے
کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔ اُردو ہال
کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور سننے والی

صف میں تمام اہم شخصیتوں کے ساتھ مخدوم صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اعتماد کے باوجود مجھے پسینہ آگیا میں نے احتیاط سے اسے پونچھا۔ ڈائس کے وسط میں پہلے آئیٹم کے فنکار اپنی نشستیں سنبھال رہے تھے۔ میں جھک کر مائیک پر پہونچ گئی۔ اس پروگرام میں بہت کچھ شامل تھا مگر مخدوم صاحب کی غزل ۔

یہ کون آتا ہے تنہائیوں میں جام لئے
جلو میں چاندنی راتوں کا اہتمام لئے

جب بیگم راگنی نے اپنے خاص انداز میں سنائی تو محفل جھوم جھوم گئی پھر دوسرے کئی آئیٹمس کے بعد مخدوم صاحب کی نظم "چارہ گر" فائن آرٹس کے کچھ فنکاروں نے مل کر پیش کی تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ان تالیوں کی گونج میرے دماغ میں دیر تک بجتی رہی تب آخری آئیٹم کی کومنٹری دیتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ مخدوم صاحب کی مسرت بھری مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے اچک کر خود بخود میرے ہونٹوں پر آچکی ہے پھر جیسے ہی پروگرام ختم ہوا مخدوم صاحب لپک کر ڈائس پر آگئے اور مجھے گلے سے لگا لیا یہ شاباشی آج تک میری ہمت ہے ۔ اعتماد اور امیدوں کے ساتھ ہے ان کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرح ان کی یہ خوشی بھی قدم قدم میری زندگی کے ہر مرحلے میں میرے ساتھ ہر لمحہ رہی ہے

اس کے بعد تو ان سے ملاقاتوں کا ایک سلسلہ سا بندھ گیا اور اب میں گنتی کر کے بھی پتہ نہیں بتا سکتی کہ پھر کتنی بار کہاں کہاں آپ ان سے کتنا فیض اور خلوص نہ ملا۔

وہ حیدرآباد میں کہاں نہیں تھے۔ حیدرآباد کے دل و دماغ ادب تہذیب و تمدن۔ سیاست میں حیدرآباد کے قہقہوں میں آنسوؤں میں۔ ادیبوں کے جلسوں محنت کشوں کی محنت اور ہر ہر اہتمام و تیاری میں لگتا تھا حیدرآباد مخدوم صاحب کے بغیر مکمل نہ تھا اور مخدوم صاحب حیدرآباد کے بغیر مخدوم صاحب نہ تھے وہ جتنے حساس اور جی دار شاعر تھے اتنے ہی چست اور بے باک لیڈر بھی ثابت ہوئے۔ ہزار مشکلوں اور دقتوں میں بھی کبھی ہار نہیں مانی۔ وہ کبھی مایوس نظر نہیں آئے ہمیشہ اس جذبے کی طرح تھے جو دیکھنے میں کونپل کی طرح نرم معلوم ہوتا ہے مگر زمین کا سینہ چیرنے کی قوت بھی اپنے میں رکھتا ہے۔ درحقیقت وہ سیدھی لکیر کی طرح آسان اور قدرتی ماحول کی طرح ضروری تھے۔ ان کی رومانی شاعری اس دوشیزہ کی طرح ہے جسے چھو لیتے۔ چوم لیتے اپنا لینے خود زندگی بے تاب نظر آتی ہے اور ان کی سیاسی شاعری اس آواز کی طرح جو جنگجو سورماؤں کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی طرح جنگ کی تمام جنگی ساز و سامانی کے باوجود دور دور تک سنائی دیتی اور دوسروں کی جرأتوں کو بیدار کرتی ہے :۔

"سرخ سویرا" سے "گل تر" تک کا انکا ادبی سفر ان کے شاعرانہ اور سیاسی شعور کی بصیرت اور ارتقاء کا سفر ہے :۔

ان کے احساس کی غنائیت
ان کی محبت کی معصومیت
ان کے ادراک کی معنویت

ان کے الفاظ کا غم و غصہ۔ جوش اور فاشسٹ طاقتوں کے خلاف ان کی نفرت کی شدت ہی ان کی شاعری کی جان ہے۔

ان کی شخصیت ہر بھرم سے خالی تھی ویسے ہی خالص آدمی تھے جیسے سمندر سے نکلا ہوا نمک۔ پھر ۱۹۴۶ء میں ملازمت کے سلسلے میں اکبر کا حیدرآباد سے دلی ٹرانسفر ہو گیا تو میں اور اکبر دہلی منتقل ہو گئے مگر حیدرآباد جانا آنا برابر چلتا رہا۔

۱۹۶۸ء میں جب مخدوم صاحب نے چاول کی گرانی کے خلاف بھوک ہڑتال کی تو اتفاق سے میں اس وقت حیدرآباد میں ہی تھی۔ علاقہ سکریٹریٹ میں جب میں ان کے ہڑتالی کیمپ پر پہونچی تو وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں میں گھرے ہوئے

در سری میں بھی ایسی گرمی اور گرمجوشی
ظاہر کر رہے تھے کہ لگتا تھا وہ ایک
ل میں کھنچے ہوئے جیسے کسی پر تکلف
و ان پہ بیٹھے میرے نار نکے اٹھائے
میں بوجھل گئی تھی مگر سب بدستور
و تو آج بھی اپنے ذہن کے آئینے میں
ولی مجھے ۱۹۶۸ء کی آخری رات
مال کے نئے قبیلے میں جب وہ نظر
ہ تو تب بھی لطف کے طوفان میں
تھے اور طاہر یاد مہر ایک سے ہاتھ
ملا کر اپنے زبردست قہقہے لگا رہے
ر میں یہ تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکی کہ
ندہ اور پائندہ زندگی کی کتنی ہمہ گیر
ت ہیں۔ غم جہاں اور گردش آفات
کش فرائض انھیں تھکا نہیں سکتے
سکھ اور شادمانی کے علمبردار رہیں
ہمیشہ ظرافت اور قہقہہ گر۔
ایسے میں کون سوچ سکتا تھا
وقت انھیں یوں یکایک آ لے گی۔
ے دلی کے سفر کے صرف دو روز بعد
ی جگہ کا دورہ کرتے ہوئے دلی
پہنچنے والے تھے اور یہ وعدہ تھا
ی پھر جلد ہمیشہ کی طرح ہمارے بیچ
آ جائیں گے مگر ۲۰ اگست ۱۹۶۹ء
و اس رات کو میں نے دلی ریڈیو سے
ے انتقال کی خبر سنی تو سکتے میں آ گئی
آ تھے لیکن کیسے جیا اور یہ حادثہ
ایسا کہ قبر تک ہے جو اسی کی یاد سے

میں گھر لوٹ آئی کہ یہیں کی طرح ایک بار
پھر رات بھر میں ان کے لیے آنسو بہاتی
رہی مگر اب ان آنسوؤں کا مفہوم نامحرم
ہو رہا تھا۔ یہ وہ آنسو تھے جو ابرِ نیساں
کے قطروں کی طرح سیپ کے بطن میں
گہر بننے کو بے تاب تھے اور میں بیان
نہیں کر سکتی کہ اس بات کی صحیح حقیقت حل
سے ہوئی تب مخدوم صاحب کو ہمیشہ
ہمیشہ کے لیے وداع کرنے جب
میں "ونڈسر پیلس" پہنچی تو لوگوں
کا ایک ہجوم غفیر پہلے سے وہاں موجود تھا
سب کے چہرے درد و غم کی تصویر
تھے۔ ساکت مخدوم صاحب ایک لمبی
میز پر برف کی سلوں کے درمیان
لیٹے ہوئے تھے

یہ پہلا موقع تھا جب وہ چپ تھے اور
انھیں یوں دیکھ کر میرے ضبط کے حلق
سے بالآخر وہ چیخ نکل ہی گئی جسے میں
نے بڑی دیر سے روک رکھا تھا۔ میں
اس وقت لوگوں کی موجودگی، تہذیب
کے تقاضے، آداب سب بھول گئی
تب دوسرے کمرے سے ڈاکٹر راج
بہادر گوڑ نے آکر مجھے تھام کر
ایک طرف لے گئے۔

"سنبھلو اب ضبط کے سوا چارہ نہیں"
انھوں نے کہا تو میں انھیں گھورنے
لگی دوستی اور ساتھی رفاقت میں مخدوم
صاحب کے شانہ بہ شانہ رہنے والے
گوڑ صاحب اس وقت مخدوم صاحب کی
لاش کو خود اپنے صبر کے کندھوں پر سنبھالے
ہوئے محسوس ہوئے۔ اللہ نہ جانے
شہر دلی کے کتنے فرزانہ و نوخیز پھول
اس اندوہناک شام کو مخدوم صاحب
کی لاش پہ سے قربان ہو ہو گئے کہ
مخدوم صاحب نے اگرچہ اپنی جان
موت کی نذر کر دی تھی مگر ان کے
چہرے پہ کہیں موت کا خوف یا کرب
نہ تھا ہونٹوں پہ ہمیشہ جیسی ہلکی سی مسکراہٹ
ملتے ہوئے عزم و استقلال کی وہی دیرینہ
شگفتگی چہرے پہ چند ہی سکون جو زندگی
بھر ان کے خدوخال کا خاصہ رہا۔ اس
حالت میں بے شمار آبدیدہ آنکھوں
نے انھیں دیکھا۔ بے حساب چیختی ہوئی
آوازوں نے انھیں خدا حافظ کہا جب
حیدرآباد بھجوائے جانے کے لیے ان
کی نعش کو جستی تابوت میں محفوظ کیا
جانے لگا تو ہم سب کی وہ ساری سسکیاں بھی
جو تب تک ان کے خاموش وجود کو
سہارا دیے ہوئے تھیں قطرہ قطرہ
بن کر ٹپک پڑیں ان بے کس آنسوؤں
میں مل گئیں جو مخدوم صاحب کو رخصت
کر رہے تھے اور مخدوم صاحب کے
اٹھتے ہی وہ تمام پھول بھی بے جان سے
مرجھا کر مڑ تڑ گئے جو کچھ دیر پہلے تک
ایک عجیب بہت ہالے کی طرح انھیں
ڈھانکے ہوئے تھے اور جب تابوت

ین میں رکھ دیا گیا تو بہت سی الجھی ہوئی
مٹی ہوئی آوازیں ٹوٹے ہوئے الفاظ
ن ان کی معروف نظم جنگ آزادی
لا پنے لگیں ان تمام آوازوں سے بے نیاز
ب سیاہ وین مخدوم صاحب کے جسد خاکی
و لے نظروں سے اوجھل ہو گئی تو لگتے
وڑ سے گلے ایکدم بیٹھ گئے مجھے لگا دنیا
ا ایک چھوٹا سا مگر بہت روشن بہت
تابناک حصہ دنیا کے نقشے سے مٹ گیا
پھر سکا وہاں سب آنکھوں میں برابر
روشنی بن کر محفوظ رہے گا جنھوں نے
اُسے دیکھا اور خود اپنی نظر سمجھا۔

غم کی دہلیز سے اُتر کر میں نے اپنے
ماؤف دماغ کو سنبھالا۔ اپنی گیلی آنکھیں
خشک کیں اور ان کا ہنس مکھ چہرا۔ ان
کی خیری زندگی اپنے احساس کے حوالے
کر کے کہا۔

انھیں مرنے دو دنیا۔ اگر یہ مرگئے
تو مخدوم صاحب واقعی مرجائیں گے۔
یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔
بے شک مخدوم صاحب مادی
حد حجاب ہمارے درمیان نہیں ہے
لیکن وہ آج بھی آنکھ سے ٹپکا ہوا
آنسو بن معلوم ہوتے ہیں دل و دماغ
میں بسی ہوئی وہ صدا محسوس ہوتی ہے
یا اپنے اخلاص۔ جذبات
اور احتیاط سے کہتی ہے۔

ہم اپنے ایک حال بے دخل کے سامنے آئیں
تم اپنے محشر بدار و بہ کے ساتھ آؤ
اس حقیقت کی وسعت اب میں
کیوں بیاں کروں —— ●●

—— (بقیہ آئینہ ٹیلی) ——

جمہوری کا الم ہمیشہ تمھیں یاد ہوگا کہ گذشتہ
خطوں میں میں نے ایک منصوبے کا ذکر کیا
تھا۔ بڑا سیدھا سادا منصوبہ تھا لیکن وہ
مکمل ہو گیا میں نے تاریخ کو میں نے خواب آور
گولیوں کی ایک بڑی مقدار پانی میں ملا کر
شوہر کو دے دی۔ میرا خیال تھا کہ اتنی تعداد
میں گولیاں کھانے کے بعد وہ ہمیشہ کی نیند
سو جائے گی اور مجھے اس منحوس کی چیخ
چیخ سے نجات مل جائے گی بلکہ میں اس کے
مکان کی وارث بھی بن جاؤں گی لیکن برا ہو
بڑی سخت جان نکلی مرنا تو کجا کمبخت کو
نیند تک نہیں آئی۔ اس نے چیخ چیخ کر
سارا محلہ سر پر اٹھا لیا۔ اسے فوراً ہسپتال
پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹری معائنے کے بعد اس
کے پیٹ سے خواب آور گولیوں کے اثرات
برآمد ہو گئے۔ اور پولیس نے مجھے ارادہ
قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ ڈارلنگ
مجھ سے نفرت نہیں کرنا۔ خط و کتابت
بند نہیں کرنا۔ مجھ سے زندگی میں پہلی
مرتبہ یہ حماقت ہوئی ہے۔ تمھاری محبت
ہی میری زندگی ہے۔ اگر تم نے تعلق توڑ
لیا تو میں مر جاؤں گی۔

صرف اور صرف تمھاری جمہوری

——●●●

بلدیات اور پنچائتیں

اپنے شہروں ۔ قصبوں اور موضعوں کو خوبصورت ۔ خوش گوار اور فرحت بخش بنائیں
سڑکوں کے کنارے ۔ دفتروں ۔ اسکولوں ۔ میدانوں اور پارکوں میں درخت لگائیں

درخت لگانے کا موسم ۔ جولائی اور اگست

پودے اور مشورہ بالکل مفت بدست ہو سکتا ہے
درج ذیل دفاتر سے ربط پیدا کیجئے

دونوں شہروں میں

ڈویژنل فارسٹ آفیسر
ایکسٹنشن ڈویژن
حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۰۴
فون نمبر ۳۰۵۲۱ (ایکسٹنشن ۴۴)

اضلاع میں

مستقر ضلع پر واقع
دفتر ڈویژنل فارسٹ آفیسر

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش ۔ حیدرآباد

NO - 14/78 - 79

LETTER NO: 592/ADVT/C4/78 DATED 14-6-78

مضطر مجاز

لمحے کی بساط

ایک اک لمحہ
شب درفتہ کا صد چاک کفن پہنے ہوئے
تلخ و بے کیف مہ و سال کا چھلکتا ہوا جام
اپنے کاندھے پہ غمِ دوش کی میت کو اٹھائے
طفلِ نازادۂ فردا کو کلیجے سے لگائے
اپنی پیشانی پہ خونِ رگِ امروز سے قشقہ کھینچے
اپنی ہستی سے خجل
مضمحل، افسردہ، ملول
(شب کی جاگی ہوئی دلگیر طوائف کی طرح)
اپنے چہرے پہ لیے سینکڑوں صدیوں کی خراش
اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے قرنوں کی اڑائی ہوئی خاک
تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں میں لئے
خشک و بے رس سحر و شام کا اک کاسۂ دریوزہ گری
گرتا پڑتا کسی درماندہ بھکاری کی طرح
سر جھکائے ہوئے آتا ہے
گذر جاتا ہے!

غزل

گُل کی مہک تک یہ قبا، اوڑھ کے پتھر نکلوں
موسمِ سنگ ہے بھیس اپنا بدل کر نکلوں

خود مرے پاؤں مرے پاؤں کی زنجیر بنے
چاہتا تھا کہ کبھی جسم سے باہر نکلوں

تو اگر گُل ہے تو خوشبو کی بھی ارزانی کر
میں صبا ہوں تو کسی دن تجھے چھو کر نکلوں

کسوتِ شاخ میں ہوں پیڑ سے غلطاں پیچاں
پھول بن جاؤں تو خوشبو کے سفر پہ نکلوں

کوئی جھرنا ہوں کہ بت ہوں، یہ کھلے گا کیسے
قیدِ سنگینِ حجر ٹوٹے تو باہر نکلوں

سنگ میں بت کی طرح مجھ میں وہ انگڑائی لے
جسم کی گرد میں دامن سے جھٹک کر نکلوں

تپشِ دل کبھی وہ دن بھی دکھائے مضطر
بارشِ سنگ بھی ہو، میں بھی کھلے سر نکلوں

[illegible] پرواز

[illegible]وں میں کتنی ہی عمریں گنوا چکے
جتنے بھی تھے فریب زمانہ کے کھا چکے

[illegible] ہیں لوگ اُجالوں کا تذکرہ
جب ہم ہر ایک چراغِ محبت بجھا چکے

پا نصیب اب ہے تہی دامنی کا غم
سرمایۂ قرارِ دل و جاں لٹا چکے

[illegible] غم شناس ہو تو دو آنسو بھی ہیں بہت
آنکھوں سے ورنہ ہم بھی سمندر بہا چکے

بدلا مزاجِ دل تو ہر اک شئے بدل گئی
یاروں کے درمیان بہت مسکرا چکے

وہ بھی ہماری شکل فراموش کر چکی
تصویر اس کی کمرے سے ہم بھی ہٹا چکے

سنسان ہو چکی ہے ہر اک رہگزارِ دل
یادوں کے قافلے تو بہت دور جا چکے

اپنی شبِ حیات گراں بھی، طویل بھی
کتنے چراغ یوں ہی جلا کر بجھا چکے

اپنی نظر ہی اب اسے پہچانتی نہیں
دنیا کو ہر بہانے سے ہم آزما چکے

جس سے وجودِ یاس کا سر پھوڑتے تھے لوگ
ہم اضطرابِ دل کی وہ دیوار ڈھا چکے

وہ یاد ہی نہ آئے تو پرواز کیا کریں
ایسا بھی اب نہیں کہ اسے ہم بھلا چکے

غزلیں

مہدی پرتاپگڑھی

وہ صاف دل ہے کہ آئینہ کہہ رہا ہے مجھے
میں مطمئن ہوں کہ وہ کب سمجھ رہا ہے مجھے

میں اپنے آپ کو اب تک سمجھ نہیں پایا
اسے یہ زعم کہ وہ شخص جانتا ہے مجھے

زمانہ کہتا ہے تم ہی مرا مقدر ہو!
تعینات کے اس بُت کو توڑنا ہے مجھے

چراغِ راہ ہے احساسِ قربتِ منزل
ہزار خارِ مصائب کا سامنا ہے مجھے

عبور میں نے کئے کتنے آگ کے دریا
کہ زیست کرنے کا انداز آگیا ہے مجھے

میں جانتا ہوں کہ ہر دور میں خلوص ہے جرم
بہت عزیز مگر اپنی یہ خطا ہے مجھے

یہ میرا عزم کہ زندہ ہوں آج تک مہدی
صلیبِ غم پہ وہ کب کا چڑھا چکا ہے مجھے

ڈاکٹر نریش

ہم نے سوچا تھا مجسم دوستی ہو جائے گا
کیا خبر تھی ایک دن وہ اجنبی ہو جائے گا

میں نے کب سوچا تھا میری زندگی ہو جائے گا
درد جو تم نے دیا تھا، دائمی ہو جائے گا

اُف نہ کرنا، ہونٹ سی لینا جفائے یار پر
ورنہ تو بھی دوست ننگِ دوستی ہو جائے گا

دائروں میں باندھ لو جذبات کا سیلِ رواں
ورنہ جذبِ عشق آشفتہ سری ہو جائے گا

غم غلط کرنے کو پیتے تھے مگر کب علم تھا
ایک اک لمحہ رہینِ میکشی ہو جائے گا

پا لیجئے پروان چڑھنے دیجئے اس کو نریش
درد جب حد سے بڑھا تو بندگی ہو جائے گا

(افسانہ)

نعیم زبیری

ٹوٹے ہوئے لمحے

کینسر ہاسپٹل پہنچ کے میں ٹوٹ سا گیا ہوں۔ یہاں سب کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ ہر ایک چہرے پہ انتظار لکھا ہے ان موت کا انتظار ــ تلخ ــ طویل ــ اور کرب۔ بیگانہ مسکراہٹ مجبور مصنوعی ...... اور کھوکھلی سی ہے ہاسپٹل کے صاف اور شفاف فرش پر سفید ہرپری بادہ اوڑھی ہوئی موت سرسراتی پھر رہی ہے امید و بیم کی ایک عجیب سی کشمکش فضا میں ہے۔ میرے سامنے وہیل چیئر میں جو شخص بیٹھا ہے وہ میرا انتہائی قریبی دوست ہے ۔ اس کی ــ اور میری عمر میں بہت فرق ہے کیونکہ یہ میرا باپ ہے لیکن یہ میرا باپ کم ہے اور دوست زیادہ ــ چھوٹی چھوٹی باتوں میں حیرت ــ اور مسرت محسوس کرنے والا یہ تنومند شخص ــ ایک پرچھائیں کی طرح سمٹتے وہیل چیئر میں قریب غائب ہو چکا ہے ــ ہم دونوں ایک دوسرے کو زندگی میں شاید پہلی مرتبہ دھوکہ دے رہے ہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ اسے کینسر ہے۔ اور شاید ــ وہ خود بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا

جب پرائمری الوسٹی گیشن سنٹر کے ڈاکٹر نے نہایت سنجیدگی سے معائنہ کرنے کے بعد اسے علاج کے لئے آگے بڑھا دیا تھا پرائمری الوسٹی گیشن روم سے گذرنے کے بعد امیدیں ٹوٹ کر بکھر جاتی ہیں۔ لیکن دھوکے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ــ بائیوپسی ــ ڈیپ ایکسرے کوبالٹ ــ پتہ نہیں کتنے سارے ٹیکے مریضوں اور ان کے رشتہ داروں کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں بڑی باقاعدگی سے تھمائے جاتے ہیں۔ جسموں پر ناپ تول کے لکیریں ڈالی جاتی ہیں۔ بے داغ یونیفارم میں ملبوس فرشتے ــ جن کے چہروں پر بندھی ہوئی سفید پٹیوں کے اوپر سے خالی خالی آنکھیں جھانکتی رہتی ہیں .. نہایت ماہرانہ انداز میں بڑی بڑی پیچیدہ مشینوں کے اوپر بنے ہوئے ڈائلیں کو تاکتے رہتے ہیں۔ مریض کو الٹ پلٹ کر اس کے تیزی سے پگھلتے ہوئے جسم میں کوبالٹ کی شعاعیں ایک مقررہ حد تک پہنچاتے ہیں ۔ اتنے یونٹ دے جا چکے ہیں .. ابھی اتنے یونٹ باقی ہیں۔ جیسے سانسوں کی گنتی کی جا رہی ہے۔ اور پھر جب یہاں گنتی ختم ہو جاتی ہے ــ تو پھر مریض کو کسی اور شعبہ کی طرف پہنچا دیا جاتا ہے جہاں اس کے نیم جاں ہاتھوں میں کوئی اور تنکا تھما دیا جائے گا ــ اور مریض۔ اور اس کے چاہنے والے ــ انتظار کرتے رہیں گے ــ موت کا ــ یا ــ شاید اس تحقیقات کی کامیابی کا ــ جو دنیا کی ہزاروں تجربہ گاہوں میں کی جا رہی ہے ــ کینسر کے چھوٹے بڑے چیس نالوں میں پھنسے ہوئے مریض دنیا بھر میں سانسیں گن رہے ہیں ــ ہو سکتا ہے بالآخر سائنس کا عزم اور طاقتور ہاتھ ــ ایٹر باکس میں محفوظ کچھ لوگوں کو بچا لے کینسر کے بھیانک دانتوں کو توڑ دیا جائے لیکن ــ اس کا کیا ہوگا ــ جو میری آنکھوں کے آگے وہیل چیئر میں پگھل رہا ہے؟ ہو سکتا ہے ــ دھوکہ کا یہ سلسلہ کل ختم ہو جائے قہقہوں میں پھر سے شگفتگی آ جائے ۔ لیکن ان قہقہوں کا کیا ہوگا جو میرے دیکھتے دیکھتے ــ ٹوٹ رہے ہیں۔ بکھر رہے ہیں۔!! آج میرا یہ زندہ دل باپ ــ ہنستا بھی ہے ــ تو مجھے رونا آ جاتا ہے ــ لیکن میں رو بھی تو نہیں سکتا ــ

"یار ــ تم کسی ویٹرنری سرجن کے پاس تو نہیں پہنچ گئے تھے" ــ

وہ ایک نہایت بڑے کیپسول کو
...اکٹر نے تجویز کیا تھا الٹ پلٹ
...تے ہوئے مجھ سے پوچھتا ہے۔
...کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر پھیلی
...زردی اور مصنوعی مسکراہٹ کے
...پتہ نہیں کتنا کرب چھپا ہوا ہے۔
...اپنے دکھتے ہوئے دل سے پھوڑے کے
...مشکل سے تھوڑی سی مسکراہٹ اپنے
...ہونٹوں پر پھیلاتا ہوں۔ کہیں ایسا
...کہ اسے پتہ چل جائے کہ میں ہار گیا
...اسے اپنی نسل کی فوقیت کا بڑا
...س ہے
میری شکست پر ہو سکتا ہے پھر
...قہقہہ لگائے۔ نرس نے وہیل چیئر
...لکیل کے اندر پہنچا دیا ہے ۔۔ اور
...پند لمحوں کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے کا
...مل گیا ہے۔

"مجھے شائد ۔۔ کینسر ہے"
میرے قریب ہی بیٹھا ہوا ایک
...ان مریض مجھ سے کہتا ہے ۔۔ اور
...بڑی شدت سے اس بات کو محسوس
...کہ "شائد" کا اضافہ اس نے
...کیا ہے۔ اس کے بستر سے ہوئے
...کے باوجود میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ
...نہایت معمولی صورت نوجوان ہے
...بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی
...اس کی عمر ۲۵، ۲۶ سال
...نہیں ہے۔ میری نظر خود بخود

اس کے حلق کی طرف جاتی ہے۔ لیکن وہاں
کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ میری نظروں سے
استفسار پڑھ لیتا ہے۔
"لمور تھرا میں گرو تھ ہے" وہ
آہستہ سے کہتا ہے۔ اور اس کی آنکھوں
میں اداسی اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔
مجھے دھکا سا لگتا ہے اور میں پتہ نہیں
کیوں اس سے نظریں نہیں ملا سکتا!
اس سے کچھ ہی دور ۔۔ ایک بڑی
حسین لڑکی ستون سے لگی کھڑی ہے۔
اس کے چہرے پر ایک عجیب سی تھکن
ہے۔ اور اس کی آنکھیں بھی اداسی میں
ڈوبی ہوئی ہیں۔
"وہ ۔۔ میری بیوی ہے"
وہ میری نظروں کا پیچھا کرتے ہوئے
اپنی سرسراتی آواز میں بتاتا ہے۔ اور
میرا ذہن ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا
ہو جاتا ہے۔
"چار ہی مہینے ہوئے ہیں ہماری
شادی کو"

وہ میرے ذہن پر ایک اور ضرب
لگاتا ہے ۔۔ میں اچانک چونک کر اس
کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ بے حد ذہین
ہے ۔۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسی ندامت
آجاتی ہے جیسے وہ کوئی چوری کرتا ہوا
پکڑا گیا ہو ۔۔ "مجھے ۔۔ شادی کے
وقت بالکل پتہ نہیں تھا۔ یہ چیز تو ۔۔
بہت بعد میں DEVELOPE ہوئی"

وہ پتہ نہیں کیوں بڑی شرمندگی سے
وضاحت کرتا ہے ۔۔ اور میں پھر اس
سے نظریں چرانے لگتا ہوں ۔۔ "وہ بہت
اچھی لڑکی ہے ۔۔"
وہ باتیں کرتے رہنا چاہتا ہے۔
شائد اسے پتہ چل گیا ہے کہ اس کے پاس
وقت بہت کم ہے ۔۔ شائد ۔۔ وہ
بہت اکیلا ہے ۔۔
"ہم دونوں ۔۔ ایک دوسرے کو
بے حد چاہتے ہیں" وہ رکتے رکتے ۔۔
پتہ نہیں کیوں مجھ ایسے اجنبی کو اپنا رازدار
بنانا چاہتا ہے۔

۔۔ وہ مجھے اور بھی زیادہ
چاہتی ہے" وہ مجھ سے کہتا ہے "یہ
قمیص ۔۔ اسے بے حد پسند ہے ۔۔ وہ
نیلا رنگ بہت پسند کرتی ہے۔ اسی لئے
میں ۔۔ یہ قمیص ہمیشہ پہنے رہتا ہوں۔
وہ ہلکے نیلے رنگ کی قمیص کو چھو کے کہتا
ہے اور ایک لمحے کے لئے یوں لگتا ہے ۔۔
جیسے وہ سب کچھ بھول گیا ہو ۔۔ اور کسی
بھولے بھالے بچے کی طرح مجھے اپنا کھلونا
بتا رہا ہو۔ لڑکی کسی اور طرف دیکھ رہی
ہے ۔۔ دروازہ کھلتا ہے ۔۔ وہیل چیئر
باہر آگئی ہے۔ میرے باپ کے سوکھے
ہوئے ہونٹوں پر بدستور مسکراہٹ
ہے ۔۔ "چلئے ۔۔ گھر چلیں ۔۔ آج
کی ڈیوٹی ختم ہوئی"
اور میں وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا

ایک کھردری سڑک پر نکل جاتا ہوں — جس کا خاتمہ دور نہیں ہے — مجھے پتہ ہے کہ اس سڑک کے آگے کچھ نہیں ہے — پھر بھی میں آگے بڑھتا رہتا ہوں — میرے باپ کے ہونٹوں پر ہمیشہ کی طرح مسکراہٹ ہے

اور پھر — اچانک — ایک کربناک چیخ اُبھرتی ہے — اور خلاؤں میں کھو جاتی ہے — قہقہے — کھنکھناتے ہوئے۔ آہستہ آہستہ — دُور ہوتے جاتے ہیں اور میں — اپنا فرض پورا کر کے — سڑک کے آخری موڑ سے لوٹ پڑتا ہوں اس کھردری سڑک پر ابھی مجھے چلتے رہنا ہے۔ وقت گذرتا جاتا ہے — کینسر ہاسپٹل سے اب میرا ناطہ ٹوٹ چکا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس کے آگے سے گذرتے ہوئے — کچھ یادیں۔ بڑی شدت سے اُبھر آتی ہیں — اور آنکھوں میں بے اختیار دُھندسی چھا جاتی ہے۔ میں سمندر کے کنارے ٹھنڈی ریت پر لیٹا ہوا ہوں — اچانک قہقہے مجھے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں میرے قریب ہی ریت پر ایک نوجوان جوڑا — زندگی کو محسوس کر رہا ہے — یہ وہی لڑکی ہے جو ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی — وہی خوبصورت آنکھیں — لیکن اب ان میں اداسی نہیں ہے — اس لڑکی کی آنکھیں بھی بڑی بڑی ہیں۔ اور اس نے ہلکے نیلے رنگ کی قیمتی قمیص پہن رکھی ہے — ●●

— (بقیہ ۔ فلمی دنیا کے شب و روز) —

وہ ہندوستانی گانوں کے کئی پروگرام پیش کریں گی۔ یوں تو لتا کی آواز روس میں کافی مقبول ہے لیکن روسیوں کو پہلی مرتبہ لتا کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملے گا۔ لتا کی ایک خاص عادت یہ ہے کہ وہ جس ملک کو بھی جاتی ہیں اس ملک کی زبان کا ایک گیت خود گا کر سنا دیتی ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا لتا روسی زبان میں گا نا گا کر اپنی اس روایت کو برقرار رکھتی بھی ہیں کہ نہیں —

★

ستیم شیوم سندرم کی ناکامی اب مسلمہ بن چکی ہے اور بمبئی کے علاوہ شمالی ہندوستان میں اسے ایک عام فلم قرار دیا جا رہا ہے۔ ڈسٹری بیوٹرس کی لگائی ہوئی رقم اگر حاصل بھی ہو جائے تو منافع کی کوئی توقع نہیں ہے۔ شمالی ہندوستان کے برعکس جنوب میں اور خصوصاً حیدرآباد میں یہ فلم اچھا بزنس کر رہی ہے اور بقول میرے ایک دوست کے اس فلم کو کنواری لڑکیاں اور کم عمر بیوائیں زیادہ پسند کر رہی ہیں۔ غرض شرمناک حد تک عریانی نے بھی فلم کو کسی قسم کا سہارا نہیں دیا جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ عوام کا شعور بدل رہا ہے اور وہ صاف ستھری، بامقصد فلموں کو قبولیت کا درجہ عطا کر رہے ہیں۔ اگر عوام کا یہ رجحان برقرار رہا ہے تو مستقبل میں ہماری فلموں سے گندگی کا خاتمہ ہو جائے گی۔

سمری اسسمنٹ اسکیم

سے آپ بآسانی اور کم وقت میں انکم ٹیکس اسسمنٹ تیار کر سکتے ہیں

:: محکمۂ انکم ٹیکس کے دفتر میں آپ کی حاضری کے نوٹس سے نجات۔

:: انکم ٹیکس افسر کے سامنے کھاتے پیش کرنے کے لئے ملنے والے سمن سے چھٹکارا۔

:: آپ کی جانب سے دکھائی گئی آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں، ماسوائے اس کے جو حساب کی غلطیوں اور قانونی ردّ و بدل کے سبب ضروری ہو جاتا ہے۔

یقیناً آپ بھی اپنا اسسمنٹ اسی طرح بنایا کریں گے

اس کے لئے آپ کو بس یہ کرنا ہے کہ:

× اپنے ریٹرن انہی مقررہ فارم پر داخل کریں جو آپ کے لئے لاگو ہو اور اسی فارم کو ہر لحاظ سے مکمل اور صحیح پُر کریں۔

× ریٹرن کے مختلف حصوں اور ضمیموں میں اپنی آمدنی کی مکمل اور درست تفصیلات درج کریں۔

× اپنے ریٹرن کے ساتھ متعلقہ تخمینے جیسے ٹریڈنگ / مینوفیکچرنگ اکاونٹ / پرافٹ اینڈ لاس اکاونٹ اور بیلنس شیٹ وغیرہ اگر کوئی ہو تو منسلک کریں۔

× اپنے ریٹرن کے ساتھ ذریعہ آمدنی پر پہلے سے منہا ٹیکس کا سرٹیفیکٹ ایڈوانس ٹیکس اور سلف اسسمنٹ ٹیکس کی ادائیگی کے چالانوں کے کاونٹر فائل، لازمی بچت اور زندگی بیمہ کے پریمیم کی ادائیگی کی رسید یا منسلک کریں۔

ایک درست اور مکمل ریٹرن آپ کو ٹیکس کی پریشانیوں سے دور رکھتا ہے۔

جاری کردہ:- ڈائرکٹر آف انسپکشن
(ریسرچ، اسٹیٹسٹکس اینڈ پبلی کیشنز)
محکمہ انکم ٹیکس، نئی دہلی 110001

davp 78/157

خالدہ شاد

آئیڈیل

یکم اپریل

پیاری مارجری!

تھوڑی دیر پہلے تمہارا خوشیاں بکھیرتا ہوا خط ملا۔ ہمیشہ کی طرح میرے دل کی دنیا میں بہار آگئی۔ میں اپنی قسمتی پر جتنا ناز کروں کم ہے۔ میں نے ایک طویل تلاش کے بعد تمہیں پایا ہے۔ تم وہ پہلی لڑکی ہو جو میرے جذبات کو سمجھتی ہو۔ ہمارے خیالات اور احساسات میں زبردست ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ بلکہ حقیقت میں ہم ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہم نے ابھی تک نہ تو ملاقات کی ہے اور نہ ہی ایک دوسرے کی شکل دیکھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ملاقات کے بعد ہم اور بھی قریب آجائیں گے۔

میں یہ خط دفتر میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ شیشے کے دروازے سے میں اپنے دفتر میں کام کرنے والے دوسرے افراد کو دیکھ سکتا ہوں۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ یہ سب بے رنگ اور بے کیف ہیں۔ ان سے میرا واسطہ صرف کاروباری حد تک ہے۔ ان میں سے کوئی بھی میرے اندر چھپے ہوئے والٹر شیلر کو نہیں جانتا۔ اور نہ ہی کوئی میری خوشی غمی یا جذبات کو سمجھتا ہے۔

کوئی نہیں جانتا کہ میں کیسی اذیت ناک تنہائی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ رات کو میں تنہا اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھ کر یا تو ٹی وی دیکھتا ہوں یا کھڑکی سے نیچے سڑک پر گزرنے والے ہجوم کو دیکھتا رہتا ہوں۔ اور جب تھک جاتا ہوں تو اپنے سونے سونے بستر پر لیٹ کر چھت کو گھورتا رہتا ہوں۔

لیکن جب سے تمہارے ساتھ قلمی دوستی ہوئی ہے میرے اندر زندہ رہنے کی زبردست لگن پیدا ہوگئی ہے میں خوشگوار مستقبل کے لیے ایک بہترین منصوبہ بنا رہا ہوں۔

لیکن فی الوقت اس کی تفصیل نہیں بتا سکتا

تمہارا والٹر

تین اپریل

پیارے والٹر!

تمہارا خط ملا۔ بخدا میرے اور تمہارے خیالات میں زبردست ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ہم واقعی ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ تم سے قلمی دوستی ہونے سے پہلے میری زندگی کسی خشک صحرا کی مانند تھی لیکن اب مجھے ہر سمت بہاریں ہی بہاریں نظر آتی ہیں جب تمہارا خط ملتا ہے تو میرے اردگرد نقرئی گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں۔

میں بھی خوشگوار مستقبل کے لئے منصوبے بنا رہی ہوں لیکن ابھی تک کسی منصوبے کو آخری شکل نہیں دی۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ نہ معلوم میں کسی منصوبے پر عمل درآمد بھی کر سکوں گی یا نہیں۔

میری ایک دائم المریض خالہ ہے۔ اس خالہ کے بارے میں میں تمہیں پہلے بھی بہت لکھ چکی ہوں۔ اس خالہ کی دیکھ بھال مجھے ہی کرنی پڑتی ہے اس کے علاوہ میں ایک بیوٹی پارلر میں ملازمت بھی کرتی ہوں۔ بس ان دو کاموں میں ساری زندگی گزر رہی ہے۔ کبھی کبھی تو عاجز آجاتی ہوں

مثلاً کل ہی کی بات ہے بیوٹی پارلر میں میرے پاس ایک عورت آئی۔ اس کی عمر کم از کم بیالیس سال کے قریب ہوگی۔ اس نے بالوں میں رنگ کیا ہوا تھا۔ بھویں نقلی تھیں، چہرے پر بے تحاشا میک اپ تھا۔ ٹائٹ پتلون پہن رکھی تھی اور اٹھارہ سال کی چھوکری بننے کی کوشش کر رہی تھی لیکن درحقیقت وہ انتہائی بیہودہ لگ رہی تھی۔ آتے ہی بولی۔ "مارجری آج میں دھماکہ کرنا چاہتی ہوں، دھماکہ۔ ایسا میک

اپ کرو کہ دیکھنے والوں کی روح فنا ہو جائے۔"

میں کہنا چاہتی تھی کہ اسے بیوٹی پارلر میں آنے کے بجائے کسی دماغی امراض کے ماہر کے پاس جانا چاہیے تھا۔ تاہم کاروبار آڑے آگیا وہ ایک اچھی گاہک تھی اور ہمیشہ دو ڈالر ٹپ دیا کرتی تھی۔ جبکہ عام طور پہ پچاس سینٹ سے زیادہ ٹپ نہیں ملتی پس میں نے اسے نرمی سے کہا۔ "دیکھو مسز بلوجیٹ، تمہاری عمر اس قسم کے میک اپ کے لئے موزوں نہیں ہے۔ میں تمہیں لڑکی بنا دوں گی، لیکن تم اچھی نہیں لگو گی"

وہ کسی شوخ لڑکی کی طرح منکتی ہوئی بولی۔ "چھوڑو ان باتوں کو۔ بس دھماکہ خیز میک اپ کر دو۔"

میں نے پھر واقعی دھماکہ خیز میک اپ کر دیا۔ جب وہ ہمارے پارلر میں داخل ہوئی تھی تو بیالیس سال کی لگ رہی تھی لیکن جاتے وقت کم از کم باسٹھ سال کی لگ رہی تھی۔ یہ رنگین مزاج عورتیں اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتیں کہ وہ کیسی لگ رہی ہیں۔

یہی حال میری خالہ کا بھی ہے۔ اُس کی عمر اسی سال کے لگ بھگ ہے دیکھنے میں سو سال کی لگتی ہے جب وہ ڈیڑھ من میک اپ تھوپ کر باہر نکلتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ سیدھی کسی ناٹک سبھا سے چلی آ رہی ہے۔ مجھ میں نہیں آتا کہ اس عمر میں عورتوں کو جوان بننے کا شوق کیوں ہوتا ہے۔ صحت اچھی ہو تو تھوڑی بہت رنگینی بھلی لگتی ہے۔ لیکن خالہ کا یہ حال ہے کہ کم از کم ایک درجن بیماریاں تو میں اس کی زبانی گنوا سکتی ہوں۔ جوڑوں میں درد، گھٹنوں میں پانی، دردِ شقیقہ، بے خوابی کی شکایت، بدہضمی اور بے شمار ایسی بیماریاں جن کا ذکر کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا گھر آتے ہی خالہ کی خدمت میں لگ جاتی ہوں۔ مگر وہ کسی طور پہ مطمئن نہیں ہوتی مارجری یہ کام کر دو۔ مارجری وہ کام کر دو شاید اسے کوئی نفسیاتی بیماری ہے۔ مجھے فارغ نہیں دیکھ سکتی۔ کچھ بھی کام نہ ہو تو کہے گی۔ "مارجری، میرا سر دبا دو۔ میری ٹانگیں دبا دو کمر دبا دو۔ میرا بس چلے تو میں اسے سر کمر اور گھٹنوں سمیت کسی ایسی جگہ پہ دبا دوں جہاں سے واپس نہ نکل سکے۔ بعض اوقات تو اس کا رویہ قطعی ناقابل برداشت ہو جاتا ہے جی چاہتا ہے کہ اسے چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں لیکن پھر اس کے بڑھاپے پر رحم آ جاتا ہے میرے سوا اس کا کوئی رشتہ دار بھی تو نہیں ہے اور اب اس کی زندگی کے چند دن ہی تو رہ گئے ہیں۔ اس کی موت کے بعد اس کا مکان اور جمع پونجی بھی تو سنبھالنی ہے گو یہ کوئی بڑی جائداد نہیں لیکن کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہے۔ اگر میں اسے چھوڑ کر چلی گئی تو اس مکان سے بھی محروم ہو جاؤں گی اور جب سے تمہیں پایا ہے میرے اندر زندگی کی لذتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تم سے ملنے کے لئے سخت بے چین ہوں لیکن منصوبے کی تکمیل سے پہلے نہیں۔

صرف تمہاری مارجری

چھ اپریل

پیاری مارجری!

تمہارا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی انسانی نفسیات کے بارے میں تمہارا تجزیہ بالکل صحیح ہے۔ واقعی انسان کی حقیقت نہیں جو بظاہر نظر آتی ہے۔ ہم ہمیشہ اپنے اندر کے انسان کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ وہ ہمارا اصلی اور حقیقی چہرہ پیش کرتا ہے چہرے سے یاد آیا کہ میں جس بینک میں ہر جمعرات کو چیک کیش کرانے جاتا ہوں وہاں ایک قدِ آدم آئینہ نصب ہے۔ کاؤنٹر کے سامنے انتظار کے دوران میں آئینے میں اپنا عکس دیکھتا ہوں۔ اس میں مجھے ایک خوبصورت لیکن مرجھایا ہوا انسان نظر آتا ہے ایک ایسا انسان جو زندگی کے بوجھ سے تھک چکا ہو۔ جب تم سے مراسم نہیں ہوئے تھے تو میں اس چہرے کو دیکھ کر سوچا کرتا تھا کہ اس پر کبھی بہار نہیں آئے گی۔ اس پر کبھی مسرت کے پھول نہیں کھلیں گے۔ میں اس مرجھائے ہوئے چہرے اور خزاں رسیدہ جسم کو ختم کرنے کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ لیکن اب تمہارے خطوں نے میری کائنات بدل دی ہے۔ اب مجھے اس قدِ آدم آئینے میں ایک ایسے شخص کا چہرہ نظر آتا ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے اب اس چہرے پر سرخی آتی جا رہی ہے گو میں تم سے ملنے کے لئے سخت بے چین ہوں لیکن اس سے پہلے میں کچھ کرنا چاہتا ہوں کچھ بننا چاہتا ہوں۔ تاکہ روحانی لذتوں سے

ساتھ ساتھ ہم دنیوی لذتوں سے بھی لطف
اندوز ہو سکیں۔

تمہارا والٹر

دس اپریل

پیارے والٹر

آج کل اپنی خالہ کی وجہ سے سخت الجھن میں ہوں۔ اس کی کمر میں سخت درد ہے اور اس کے لئے بستر سے اٹھنا بھی محال ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اسے کوئی تکلیف نہیں لیکن وہ سارا وقت ہائے ہائے کرتی رہتی ہے اور چاہتی ہے کہ میں چوبیس گھنٹے اس کی خدمت میں موجود رہوں عجیب کشمکش کا عالم ہے۔ رات کو بمشکل دو تین گھنٹے سوتی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔

اگر تمہارے خطوں کا سہارا نہ ہوتا تو خالہ کو چھوڑ کر کہیں چلی جاتی یا اس دنیا سے کوچ کر جاتی۔ تمہارے خط میرے لئے آبِ حیات کی طرح ہیں۔ جس روز تمہارا خط ملتا ہے ایک عجیب بے خودی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ہر شے حسین نظر آنے لگتی ہے حالانکہ ابھی تک ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں جب تم سے ملاقات ہوگی تو کتنی عجیب قسم کی خوشی ہوگی پھر میں تمہارے ساتھ خوب جی بھر کے باتیں کروں گی۔

صرف تمہاری مارجری

تیرہ اپریل

پیاری مارجری!

تمہارا خط پڑھ کر بڑا افسوس ہوا تمہاری خالہ کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے اب میرے اور تمہارے درمیان کوئی حجاب اور کوئی چھپی ہوئی بات نہیں رہی۔ اس اعتبار سے میں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں۔ تمہارے ساتھ میں کھل کر بات کر سکتا ہوں۔ اپنی پریشانیوں اور خوشیوں کا ذکر کر سکتا ہوں اگرچہ میں ایک صحت مند اور خوبصورت نوجوان ہوں۔ مگر میرے اندر ایک بہت بڑی کمزوری پائی جاتی ہے۔ میں کسی کے ساتھ کھل کر بات نہیں کر سکتا۔ کسی کے سامنے اپنے دل کا حال بیان نہیں کر سکتا۔ اگر تم سے قلمی دوستی نہ ہوتی تو شاید میری امنگیں اور آرزوئیں میرے ساتھ ہی دفن ہو جاتیں۔

میں تمہیں ایک چھوٹا سا مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ جب انسان کسی مقصد کو حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کچھ قربانی دینی پڑتی ہے۔ ہمت سے کام لینا پڑتا ہے۔ دلیرانہ قدم اٹھانا پڑتا ہے مسائل خود بخود حل نہیں ہوا کرتے۔ تمہارا بھی ایک مسئلہ ہے وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے اردگرد نظریں دوڑاؤ گی تو خود ہی میرا مطلب سمجھ جاؤ گی۔ تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے۔

تمہارا اپنا والٹر

اٹھارہ اپریل

پیارے والٹر!

افسوسناک خبر! آج مجھے ملازمت سے جواب مل گیا ہے بری طرح سے جواب مل گیا ہمارے بیوٹی پارلر میں اکثر ایک موٹی سی خاتون آتی ہے۔ اس کا نام مسز سینڈرز ہے بڑی رنگین مزاج اور عیاش طبع ہے اس کی عمر کا ہندسہ پچاس کو چھونے والا ہے لیکن دوسری عورتوں کی طرح اسے بھی چھوکری بننے کا شوق ہے۔ آتے ہی کہنے لگی۔ "میرے بالوں کو سیاہ کلر لگا دو"۔

میں نے ادب سے سمجھایا۔ "محترمہ تمہاری عمر کی عورتوں کو سیاہ رنگ سوٹ نہیں کرتا"۔

"مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرو"۔ اس نے غصے سے کہا۔ "جو میں کہتی ہوں وہی کرو"۔

مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے کہا۔ "محترمہ تمہارے بالوں کے لئے لائٹ براؤن کلر مناسب رہے گا۔ میں گارنٹی کرتی ہوں کہ تمہیں پھر بھی مناسب گاہک مل جائے گا"۔

اس میں کوئی غلط بات بھی نہیں تھی وہ بھی دھندا کرتی تھی۔ ہر روز نئے گاہک کی تلاش میں نکلتی تھی۔ میری بات سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے چیخ کر منیجر سے میری شکایت کی اور منیجر نے مجھے کھڑے کھڑے ملازمت سے جواب دے دیا۔ دوسرا سانس بھی نہیں لیا۔ ذرا سوچو چھ سال کی سروس سے ایک ہی سانس میں جواب مل گیا۔

...ت ...ئی۔
...ے لئے اس بات کی کوئی اہمیت ...
... اس نے حسب معمول اپنے جوڑ والی
... رگھٹنوں میں پانی کا ذکر چھیڑ دیا۔
... سارا دن گھر میں پڑی رہتی ہوں اور
... سنتی ہوں سارا دن اس کے اشا...
... ہوں۔ زندگی مصیبت بنی ہوئی ہے
... مصیبت سے نکلنے کی تدبیر سوچ
...
... لیکن کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی ہوں
... قوت ارادی کمزور ہے۔

صرف تمہاری مارجری

... یل
... مارجری
... ا خیر پر معذرت خواہ ہوں۔ دراصل
... ہے گردش میں ہیں۔
... تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے گزشتہ
... ایک منصوبے کا ذکر کیا تھا گزشتہ
... نے اس منصوبے پر عمل کر ہی ڈالا
... منصوبہ فیل ہو گیا۔
... اس منصوبے کا خیال مجھے اس وقت
... میں بینک کے کیشئر کی دو ...
... سامنے نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر
... کرتا تھا کہ اگر یہ نوٹ مجھے مل جائیں
... شاندار زندگی گزار سکتا ہوں
... یہ خیال میرے ذہن میں بالکل پختہ
... ایک عمر رسیدہ اور کمزور سا آدمی
... ہوتے ہی میں الصبح بینک پہنچ

گیا اس وقت میرے داہنے ہاتھ پر اور
کہنی تک پٹی بندھی ہوئی تھی اور کوٹ کے نیچے پینتالیس
بائیس کا ریوالور تھا۔ بینک میں ابھی تک کوئی
گاہک نہیں آیا تھا۔ میں نے ایک خالی چیک اور
ایک پلاسٹک کا تھیلا کیشئر کی طرف بڑھایا
اور تھوڑی سی پستول کی نال بھی نمایاں کر دی
خالی چیک کے اوپر یہ فقرہ لکھا تھا "اگر زندگی
عزیز ہے تو سارا کیش اس تھیلے میں ڈال
کر میرے حوالے کر دو۔ میرے ہاتھ میں خطرناک
پستول ہے:

یہ دھمکی آمیز پیغام پڑھتے ہی کیشئر نے
دراز کھولی اور چند سکے، جن کی مجموعی مالیت
بمشکل چار یا پانچ ڈالر کے قریب تھی، تھیلے میں ڈالے
اور پھر تھیلا میری طرف بڑھاتا ہوا ہنسنے لگا۔
میں نے اسے دھمکی دی اور پوچھا کہ کیش کہاں ہے
لیکن وہ پیٹ پکڑ کر بری طرح ہنستا جا رہا تھا۔
میں نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تب اس نے بتایا۔
"ابھی نو بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ اور
کیش اسٹرانگ روم کے اندر ہے۔ جو تین
چابیوں سے کھلتا ہے ایک چابی منیجر کے پاس
ہے جو ابھی تشریف نہیں لائے آپ کو زحمت
تو ہوگی لیکن میں مجبور ہوں دس منٹ انتظار
کرنا پڑے گا۔ اور ہاں آپ کیا پینا پسند
کریں گے۔ کافی یا ٹھنڈا۔

میں نے پہلے اپنے اوپر لعنت بھیجی پھر
بینک کا سیف چھوڑ کے واپس جانے لگا
مڑا لیکن اس اثناء میں بینک کا سارا عملہ
میرے اردگرد جمع ہو چکا تھا۔ لہذا ان کے پکڑنے

کی بجائے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور اب یہ
خط جیل کے اندر سے لکھ رہا ہوں۔

پلیز مارجری، میرے بارے میں کوئی
برا خیال دل میں نہیں لانا۔ میں نے زندگی
میں پہلی مرتبہ ایسی حرکت کی ہے اور وہ بھی
تمہاری خاطر۔ خط کا جواب ضرور دینا۔ مجھے
یقین ہے کہ تم میری مجبوری کو مدنظر رکھتے ہوئے
مجھے برا نہیں سمجھو گی۔ جب تک تمہارا خط نہیں
ملے گا میں پریشان رہوں گا مارجری، تم سے
بہتر کوئی ... مجھے نہیں سمجھ سکتا۔ میں اب بھی
تم سے محبت کرتا ہوں۔ اور ہمیشہ کرتا رہوں
گا۔ کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے اور
تم مجھ سے ویسے ہی محبت کرتی ہو جیسے پہلے
کرتی تھیں۔ خدا حافظ

تمہارا اپنا والٹر

تیس اپریل

پیارے والٹر

اس سے پہلے اٹھارہ اپریل کو ایک
خط لکھا تھا۔ یقیناً تم نے اس کا جواب پوسٹ
کر دیا ہوگا۔ لیکن وہ جواب مجھ تک نہیں پہنچا
کیونکہ اس وقت میں جیل میں ہوں اور ابھی تک
پوسٹ مین کو پتہ ہی اس غیر معمولی تبدیلی کا پتہ
نہیں چلا۔ مجھے فوراً ہی خط لکھ دینا چاہیے
تھا۔ لیکن تم جانتے ہو کہ جیل کا ماحول خط لکھنے
کے لئے سازگار نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے نفرت کرنے
لگو گے لیکن میں نے جو کچھ بھی کیا انتہائی

(باقی صفحہ ۱۳۳ پر)

غبارِ خاطر

(مستقل فیچر)

(ایڈیٹر کا مراسلہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں)

جناب ایڈیٹر صاحب۔

تسلیم: "پونم" کے تازہ شمارہ میں اپنے عزیز ساتھی افسانہ نگار اقبال متین کا مضمون پڑھا۔ متین نے جس خوبصورتی سے اردو افسانے کے تعلق سے جن باتوں کو پیش کیا ہے وہ بڑی اہم ہیں۔ ان ہی باتوں کو وضاحت کے ساتھ میں نے آج سے دس سال پہلے مئی ۱۹۶۸ء میں اپنی کہانیوں کے مجموعے "ہم جنم جنم کے ساتھی" کے دیباچے میں "تخلیق کا کرب" کے زیرِ عنوان پیش کی تھیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اپنے ماہنامہ "پونم" میں اس مضمون کو شائع کریں کیونکہ اس میں کیوں اور کس لئے کا جواب بھی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس طرح پڑھنے والوں کے سامنے اور بہت سے گوشے آئیں گے۔

اس اہم ادبی جو نکا دینے والے سلسلے کے لئے میری مبارکباد قبول کیجئے۔ شکریہ

آپ کا

عاتق شاہ

تخلیق کا کرب

عاتق شاہ

حیدرآباد

انسانی رشتوں کا ادراک، برائی اور ناانصافی کا شعور اور سماج کو بدلنے کی بے پناہ خواہش جب تک کسی فن کار میں نہیں جاگتی اس وقت تک وہ کسی ایسی چیز کو جنم نہیں دے سکتا جس میں حرارت ہو۔ زندگی ہو۔ کیونکہ اس آگ کے، درد کے اور کرب کے بغیر کوئی تخلیق ممکن نہیں۔

چاہے عورت ہو یا کوئی فن کار، دونوں کو تخلیق کے ایک ہی کرب سے گذرنا پڑتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ عورت کو اس کرب سے نجات دلانے کے لئے دنیا جہاں کے دواخانے ہیں لیکن فن کار کے لئے ظاہر ہے کہ کسی دواخانے کے قیام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ فن کار کے درد کی دوا نہ کسی ڈاکٹر کے پاس ہے اور نہ دایہ کے منجھے ہوئے ہاتھوں میں۔ لہٰذا فن کار کو اکیلے ہی یہ درد سہنے پڑتے ہیں۔ البتہ جنم دینے کے بعد ہر کوئی یہی پوچھتا ہے کہ اولاد کیسی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے عورت بھی مجبور ہے اور فن کار بھی۔

اگر اولاد کالی کلوٹی بھی ہو تو گوارا ہے۔ بشرطیکہ صحت مند ہو۔ ورنہ بیمار اور ذہنی طور پر ناکارہ اولاد سے نہ خاندان کا بھلا ہوتا ہے۔ نہ سماج کا، اور نہ ملک و قوم کا۔ اس مقام پر تو فن کار کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔ وہ یہ کہہ کر کسی حال بھی نہیں چھڑا سکتا کہ میری مرضی۔ میں جو چاہے پیش کروں گا۔

آرٹ اور ادب کی بے پناہ قوت اور اس کی افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ورنہ وہ آرٹ جو عوام کو گمراہ کرنے اور زندگی کو منفی راستوں پر ڈال دے آرٹ نہیں۔ چند شرپسندوں کے ہاتھ بربادی ذہنوں کا آلہ ہے۔ افلاطون نے اپنی خیالی مملکت سے شاعروں کو محض اسی بنیاد پر شہر بدر کر دیا تھا کہ وہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ پتہ نہیں اس قسم کے سماجی مجرموں کے ساتھ اس کا کیا سلوک ہوتا؟

سب سے پہلے ان سے جو بات پوچھنی چاہئیے وہ یہی کہ آخر وہ کیوں لکھتے ہیں؟ عام طور پر ان کا جواب ایک ہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے لکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ اپنی ذات کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہی بات ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیوں اپنی تخلیقات کو بازار میں لاتے ہیں؟ اپنی میز کی دراز میں اسے کیوں محفوظ نہیں رکھتے؟ یا پھر ان کا فریم بنوا کر اپنے

ڈرائنگ روم کو کیوں نہیں سجاتے ؟ لیکن جب وہ اسے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں تو اس کا مطلب صاف یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے تخلیقی عمل میں دوسروں کو بھی شریک کر رہے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ دوسرے بھی اپنے نقطۂ نگاہ سے دیکھیں گے کہ فن کار نے اپنی تخلیق میں جس احساس جذبے، خیال، تاثر اور صداقت کو ابھارا ہے وہ کس حد تک ان کی زندگی سے مطابقت رکھتی ہے۔ کیا اس نے کسی ایسی چیز کا انکشاف کیا ہے جو اب تک ان کے تجربے اور مشاہدے میں نہ آسکی۔ اور اگر نہیں تو پھر وہ زندگی کے کسی پہلو کو سامنے لانا چاہتا ہے۔ جس پر ان کی نظر اب تک نہیں گئی۔ غرض اس پر سب ہی اظہار خیال کریں گے۔ اور اس کا انہیں حق پہنچتا ہے۔ اس طرح سماج اور فن کار کے باہمی رشتے کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

لیکن یہ بورژوائی ذہن، دماغ اور دل رکھنے والے وہ ادیب ہیں جو سرے سے انسانی قدروں کو مانتے ہیں اور نہ ان کے پاس سماج کی کوئی اہمیت ہے وہ عوام کو جانور سمجھتے ہیں۔ اور اپنے قاری کو بے وقوف جو ان کی تخلیقات کی فنی اور معنوی خوبیوں کو نہیں سمجھ سکتا ان میں سے اگر کسی کو عوامی دکھ اور درد کا خیال آجائے تو وہ اپنی اونچی بلڈنگ کے ایئر کنڈیشنڈ روم سے کوچہ و بازار کی طرف نظر دوڑاتا ہے۔ یا اسے ایسی بلڈنگ نصیب نہیں تو وہ تخیل کی سیڑھیوں سے آرٹ کے قطب مینار پر چڑھ کر عوامی زندگی کا ملاحظہ کرتا ہے۔ اور بے چارے عوام اسے کیڑے مکوڑوں اور چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے نظر آتے ہیں حقارت کے اس جذبے سے وہ اپنے اندر کے نقلی فن کار کو مطمئن کرتا ہے اور پھر احساسِ برتری کے نشے میں مدہوش ہو کر ناپ شناپ بکنے لگتا ہے۔

اس ادبی امپیریلزم کے لیے حقیقت پسندی کے نام سے ادب میں ایک قسم کا انارکزم پیدا ہو رہا ہے اس کو پھیلانے والے ایسے انارکسٹ ادیب ہیں جو کسی قدر کو نہیں مانتے البتہ اس بات کی ضرور وکالت کرتے ہیں کہ ہم ہر اس شئے کو ادب کا موضوع بنائیں گے جو ہمارے مشاہدے تجربے اور احساس کی زد میں آجائے حالانکہ ہم روز کئی تجربے کرتے ہیں۔ اور روز گلی کوچوں اور سڑکوں پر غلاظتوں کے ڈھیر دیکھتے ہیں لیکن آپ ہم ان کا شخصی زندگی میں ذکر تک نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ اس کو ادب کا موضوع بنائیں۔ فن کار میونسپل کارپوریشن کا ملازم نہیں ہوتا کہ سڑکوں کی گندگی دور کرتا پھرے۔ فن کار انسانی زندگی اور اس کے عمل کا نباض ہوتا ہے اور ادب اس کی عکاسی ہی نہیں کرتا بلکہ انسان میں جہاں جوشِ عمل کی آگ پیدا کرتا ہے وہاں نظر آنے والے مستقبل کے اندھیرے کو امید کے چراغوں سے بھی روشن کرتا ہے ایسے لکھنے والوں کو شاید یہ بات یاد نہیں کہ کوئی تجربہ تجربہ نہیں رہتا جس میں خونِ جگر شامل نہ ہو۔ یہ تجربہ کی قیمت بھی ہے اور فن کار کی طرف سے ادا کیا ہوا دل کا خراج بھی!

ادب میں یہ نراجی کیفیت نئی نہیں ہے خصوصیت کے ساتھ دوسری جنگِ عظیم نے انسانی تہذیب کی ہر قدر مٹا ڈالنے کی کوشش کی۔ اور آج اس ایٹمی دور میں انسان خود کو تنہا محسوس کر رہا ہے۔ مشینی زندگی کی گڑگڑ میں اس کی روح ڈوب گئی ہے۔ طبقاتی کشمکش اور افراد کے باہمی رشتوں میں دن بدن تناؤ پیدا ہوتا جا رہا ہے مشترکہ خاندان کی اکائی لمحہ بہ لمحہ ٹوٹتی جا رہی ہے جاگیردارانہ تہذیب میں کم از کم انسانی رشتوں کے احترام کا تصور تو ملتا تھا لیکن سرمایہ دارانہ نظام نے انسان سے سب کچھ چھین لیا اس کی مسکراہٹ بھی۔ اور اس کے آنسو بھی۔ اس لئے کہ ہر طرف ڈالر کا رواج ہے روپیے اور سونے کی حکومت ہے۔ کوئی کسی کو پوچھتا نہیں۔ بھائی بھائی کا دشمن ہے بیوی شوہر کے خلاف ہے۔ بہو، ساس سے لڑ رہی ہے اور بیٹا باپ سے۔ عاشق علی الاعلان گھر میں گھس کر محبوبہ کو بھگائے لئے جا رہا ہے اور ماں باپ دیکھ رہے ہیں۔ غرض گھر میں اور گھر کے باہر، ہر طرف ہنگامے

ہیں سے بے چینی ہے۔ نفرت ہے۔ بھوک ہے افلاس ہے۔ بیماری ہے اور قتل وخون کا بازار گرم ہے یہی نہیں بلکہ ایک ملک طاقت کے بل پہ دوسرے ملک کو ہڑپ کر رہا ہے ایسے وقت ادیبوں اور فن کاروں پر بڑی ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ وقت کے اس چیلنج کو قبول کرے۔ اور اس میکانیکل زوال آمادہ تہذیب کے ہر رخ کو بے نقاب کرکے محبت اور امن کی وہ فضا پیدا کرے جو آج کی بڑی ضرورت ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ اچھی صلاحیتوں والے فن کار بھی اس نراجیت کا شکار ہوکر ادب میں ایک نئی بربریت کو جنم دے رہے ہیں اور اپنے تحفظ کے لئے انھوں نے جدید ادب اور جدید ذہن کی اصطلاحوں کا سہارا لے رکھا ہے ورنہ جدید ذہن آج سے ہزاروں سال پہلے بھی تھا۔ اور اب بھی ہے۔ کیا سقراط کے پاس جدید ذہن نہیں تھا جسے نوجوانوں کو گمراہ کرنے کی پاداش میں مسکراتے ہوئے زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ کیا یسوع مسیح نے پھانسی کے پھاندے پر لٹک کر اپنے جدید ذہن کی قیمت ادا نہیں کی؟ کیا بدھ نے جدید ذہن کو اپنا کر محل کے عیش وآرام کو نہیں چھوڑا؟ کیا دنیا کی تاریخ اس حقیقت سے انکار کرسکتی ہے کہ عرب کے سچے اور عظیم انسان حضرت محمدؐ پر صرف اس لئے پتھر برسائے گئے کہ انھوں نے انسانیت کے سامنے ایک جدید خیال اور جدید فلسفہ حیات رکھا۔ تھا جدید ذہن کب نہیں تھا؟ یہ وہی جدید ذہن ہی تو تھا جسے تھری ناٹ تھری سے کئی بار نشانہ بنایا گیا۔ کیا مہاتما گاندھی، کینیڈی اور ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ نئے ذہن کے مالک نہیں تھے؟

میں جدیدیت کا مخالف نہیں ہوں اور نہ نئے تجربوں کا۔ موضوع اور فارم کے نئے نئے تجربے ضرور ہونے چاہئیں۔ کیونکہ اس سے ادب کے جسم میں نیا خون دوڑتا ہے۔ اس طرح میرؔ، غالبؔ، حالیؔ، سرسید، اقبالؔ، ٹیگور، سرت چندر چٹرجی پریم چند اور کئی فن کار نئے ذہن کے مالک تھے جنھوں نے اپنے زمانے کی صرف نمائندگی نہیں بلکہ اس کی روح کو اپنی تخلیقات میں محصور کرلیا لیکن میں اسے کسی حال اور کسی قیمت جدید ذہن ماننے کیلئے تیار نہیں ہوں جو عورت کی ننگی چھاتیوں، کولھوں اور کمر کو مختلف زاویوں سے دکھاتا ہے اور ہر عورت اور ہر مرد کے جسم سے کپڑے اتارنے پر تلا ہوا ہے۔ میں اسے جنسی کجروی اور فرسٹریشن کی بدترین علامت سمجھتا ہوں اس کی بڑی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی فرد سماج کے حصار کو توڑ کر اپنی انا اور ذات کی طرف لوٹتا ہے تو اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس سفر میں وہ راستہ کی ہر چیز اور روایت کے ہر سنگ میل کو ٹھوکر مارتا ہے اس کی نفسیاتی تحلیل کسی بھی انداز سے ممکن ہے۔ خواہ یہ رد عمل کسی خوف یا ڈر کا نتیجہ ہو یا آزادی کے بے پناہ احساس کا لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس عمل سے ایک نئی لذت پرستی کا آغاز ہوا۔ اور آج ہر طرف اس کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ چنانچہ نیم عریاں رقص، ناجائز جنسی تعلق سے پیدا ہونے والے بچے، کوک شاستر قسم کے فلمی ماہنامے، سستی جاسوسی کتابیں، مرد اور عورت کے پوشیدہ جسمانی حصوں کی تشریح کرنے والے پوسٹر، فلمیں ہیجان انگیز گانے، تھرل اور سسپنس، شادی سے پہلے رومان اور جنسی تعلقات، پھر شادی، طلاق، ذہنی تناؤ، شراب نوشی، خواب آور گولیوں کا استعمال، خودکشی اور قتل روز کی باتیں ہیں۔ یہ اجتماعی ہسٹریائی دورے دراصل اس روحانی زوال کا نتیجہ ہیں جن کا انجام سوائے تباہی اور موت کے کچھ نہیں۔

اس نراجی کیفیت سے انسانی تہذیب میں جو دھماکہ ہوگا وہ ایٹم بم سے کہیں زیادہ خطرناک ہوگا۔ اس لئے ان تمام لفظی جھمیلوں، اصطلاحوں اور بھونڈے بحث کے چکر سے باہر آکر تمام فن کاروں کو صرف ایک ہی بات کا جواب دینا پڑے گا کہ وہ کس کی طرف ہیں؟ زندگی کی یا موت کی! ●●

"علامتی کہانی"

قدیر زماں —— حیدرآباد

اپنے مضمون "اردو افسانے کے تیس سال" میں اقبال متین نے چند سوال اٹھائے ہیں ان میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اس طرح کے

تخیلات میں بعض ادیبوں کی زبانی بھی سُن چکا ہوں جو خود ادب کے اسکالر ہی نہیں بلکہ ادب کے خالق بھی ہیں اور میں خود بھی اُن کی تحقیقات کو ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں۔ ان میں بعض ایسے احباب ہیں جن کی قربتوں کا فیض مجھے حاصل ہے۔ میں اپنے اس مضمون میں اقبال متین کے ان ہی سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ویسے میرا یقین اپنی جگہ قائم ہے کہ نہ تو اقبال متین کے اُس مضمون سے جسے اُنھوں نے علیگڑھ یونیورسٹی کی ادبی اکاڈمی کے سمینار میں پڑھا اور نہ ہی میری اس جستجو سے اُردو افسانے کی اب کوئی سمت متعین کی جاسکتی ہے۔ جو نئی راہ اردو افسانے کو اختیار کرنی تھی وہ اس نے کرلی اور اسے زندہ ہی رہنا ہے تو وہ اپنی نئی نئی راہیں مزید اختیار کرتا جائے گا جو دنیا کی دوسری زبانیں اختیار کرتی رہیں گی مواد سے زیادہ اپنی ہیئت کی بنا پر ایک افسانہ گذرے ہوئے کل اور آج کے افسانے میں تقسیم کیا جائے گا اور اُسی کے مطابق اُس کا تخلیق کار بھی۔ جیمس جائیس اور کافکا کبھی کے مر چکے لیکن وہ آج کے ادیب اس لئے کہلاتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنے فکشن کو جو نئی ہیئت عطا کی اُس میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی ابھی تک نہیں آئی اور اگر کہیں آئی تو وہ ان سے آگے نہ جاسکی۔ انھیں آج کا ادیب کہنے سے موپساں، ڈکنز یا ٹالسٹائی اور دستوئیفسکی کی عظمت اور بڑائی میں رتی برابر فرق نہیں آسکتا۔ اُردو میں ڈپٹی نذیر احمد یا عبدالحلیم شرر کے ناولوں نے اپنے زمانے میں جو منصب ادا کیا وہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ منشی پریم چند کا نام لئے بغیر اردو افسانے کا ذکر آنے والی نئی نسل کے فرد کے لئے لاعلمی اور جہالت کے مترادف ہوگا لیکن ان کے بعد اردو افسانے میں ہیئت کی جو توسیع ہوچکی اُس کی وجہ سے پریم چند کو آج کا افسانہ نگار منوانے کی کوئی بھی کوشش بے سود ہوگی۔ آج بھی کوئی ادیب پریم چند، منٹو یا بیدی کی طرح افسانے لکھے تو اُسے اپنی بڑائی منوانے کی ضرورت ہی نہیں وہ اچھے اور دیرپا ادب کا خالق ضرور کہلا سکتا ہے لیکن آج کے افسانہ نگار کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

ہیئت کی تبدیلی کی بنیاد پر آج کے افسانہ نویس کی وکالت کر رہا ہوں تو میں ہرگز ایسے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو آنے والی نسل کے لئے اُسی طرح کلاسک نہیں بن سکتے جس طرح پریم چند، منٹو یا بیدی آج ہی کے نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی کلاسک بن چکے۔ اقبال متین کی طرح میں تو ہر اُس ادب کو "تخفے" کہنا چاہتا ہوں جو دراصل ادب ہی نہیں ہے۔ لیکن میں تنہا بلکہ ایک ایسا گروہ بھی جو صرف میرا ہم خیال ہے، اس کا مجاز نہیں ہے کہ ایک ایسے ادب کو رد کردے اور "تخفے" کا لیبل لگادے جس ادب یا ذہانت کے لئے میری یا اس گروہ افراد کی طبیعت موزوں نہیں ہے۔ تھوڑی سی دیر کے لئے اُس وقت میں میں پہنچ گیا جب اُردو ادب کے ایک محقق نے جو مغربی اور مشرقی جملہ زبانوں کے ماہر ہیں مجھ سے کہا کہ وہ نہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ہی کو بڑا شاعر مانتے اور نہ ہی ن۔ م۔ راشد کو۔ "یہ بھی کیا مصرعے، غیر ضروری طول۔ بھلا یہ کوئی شاعری ہے" اس وقت بھی میری آنکھیں پھیلی رہیں جب اُردو کے ایک مانے ہوئے شاعر و نقاد نے یہ کہا "جناب ہم تو تھراش (THRASH) لٹریچر بھی پڑھتے ہیں لیکن ہم کافکا کو بڑا ادیب ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ ہم نے تو اس کی ٹرائیل (THE TRIAL) ادھوری چھوڑ دی۔"

لیجئے صاحب "دی ٹرائیل" (THE TRIAL) کو آپ جب چاہے اور جہاں سے چاہے چھوڑ سکتے ہیں۔ آپ اپنے تن من کو ننگا کر دینے والے ادب کا مطالعہ کرنے والے ٹھہرے۔ آپ ایک ذہین قاری ہی نہیں بلکہ خود بھی ایک بڑے فنکار ہیں۔ آپ کسی بھی تحریر سے جس وقت جو بھی سلوک کرنا چاہیں۔ ایک تخلیق کار کیا جانے کہ وہ آپ کے حق کو چھینے اور جو چھینے

تو کس ذریعہ سے؟ — لیکن آپ ایک ادیب سے اُس کے لکھنے کا حق کیوں چھینا چاہتے ہیں وہ تو آپ سے ڈرا سہما اور ایک ناقد کی تنقید کا نشانہ بنا ہوا تو ہے ہی اُس پر آپ اگر یہ بھی پابندی لگا دیں کہ وہ ایسا ہی ادب تخلیق کرے جو صرف آپ کے یا آپ جیسے پڑھنے والوں کے مزاج کا ہو تو یقیناً آپ اُس سے تخلیق کا حق چھین رہے ہیں اور وہ آپ کی مرضی کے مطابق نہ لکھے تو آپ اُس کی کتاب کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیں اور پھر ماتم بھی کریں کہ آپ سے پڑھنے کا حق چھین لیا گیا — میں کہتا ہوں آپ اپنا حق زبان و ادب ہی کی حد تک کیوں محدود رکھتے ہیں۔ یہ تو موسیقی، پینٹنگس اور سارے فنونِ لطیفہ کی بات ہے۔ ماڈرن پینٹرس اور ماڈرن موسیقاروں سے کہئے کہ وہ قرونِ وسطیٰ کے فنکاروں کی طرح پینٹ کریں اور گائیں بجائیں۔ کیونکہ آپ کے دیکھنے اور سننے کا حق چھینا جا رہا ہے۔ یہ فن کار تو اپنی موت مر چکے ہوتے اگر نئی نسل ان کو ہاتھوں ہاتھ نہ لیا ہوتا۔ میں آپ کے پڑھنے کا حق چھین رہا ہوں اگر میں اپنی کتاب آپ پر لاد رہا ہوں۔ میں نے کب سے اپنی کتاب کی قیمت دس پیسے روپے زبردستی یا ازراہ نوازش وصول کی ہے تو آپ کی جیب کے دو پیسے کم ہو گئے جو آپ نے نالیا اپنی پسند کی کتابیں خریدنے کے لئے اشعار رکھے تھے۔

لیکن میں اردو کا ادیب پہلے ہی سے بڑی حد تک اپنی ذات میں سکڑا ہوا — سماجی، معاشی الجھنوں میں گرفتار کچھ پچھلے مانے ہوئے اور مستند ادیبوں کا ہدفِ ملامت آپ کی خدمت میں ایک کتاب پیش کرتا ہوں کہ آپ کو یہ اچھی لگے تب بھی اسے آپ نہ پڑھیں اور سچ مچ آپ پڑھتے کہاں ہیں — پھر آپ کی طرح اور بھی بہت سے لوگ یہ سب کے سب نہیں پڑھتے تو میرا نام اُس فہرست میں ہمیشہ کے لئے آجاتا ہے جو تیسرے درجے کا ادب بلکہ سرے سے ادب ہی تخلیق نہیں کرتے۔ بعد کو اگر میں کوئی اچھی تخلیق بھی پیش کروں تو اس کے ساتھ کوئی نیک سلوک ہونے والا نہیں — پھر تو یہ تخلیق کار ہی کی جان پر بن آئی کہ وہ اپنے حق کو تمیز سے استعمال کرے ورنہ وہ اپنی موت آپ مرے گا کہ حق تنسیخ تو صرف قاری کا حق ہے۔

اقبال متین نے جس موضوع کو ہدف ملامت قرار دیا وہ دراصل "اردو کی آج کی کہانی ہے جسکا تعلق علامتی ادب سے ہے۔ چند ذہین قاری علامتی ادب کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے تو ان کی خجالت پر حرف کیوں آئے؟ یہ تو علامتی ادب کا وصف ہی ہے کہ آپ ان علامتوں کی تعبیر ڈھونڈتے جا رہے ہیں جن علامتوں کو فن کار نے تخلیق میں سمویا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ بھی جو علامتی ادب کو وارفتگی سے پڑھتے اور اُس کی گرہوں کو کھولنے اور اُس مطالعہ کا انبساط حاصل کرتے ہیں و[ہ] بھی ضروری نہیں کہ اپنی رائے میں ایک دوسرے سے متفق ہوں۔ بعض وقت خود تخلیق کار کے ذہن میں جو علامت بر دمِ تخلیق اُبھرتی ہے وہی علامت خود اُس کے لئے کوئی نئی معنی اور نئی وسعت بخشتی ہے۔ تجربے کے لئے حال ہی میں میں نے جان اپڈائک کی ایک کہانی "جنگل کا کوا" تین مختلف احباب کو پڑھنے کو دی۔ شاعر و نقاد و ایڈیٹر۔ کہانی میں کوے کا اپنے پیروں کو پھڑپھڑا کر درخت کی ٹہنی پر جگہ تلاش کرنا ایک ایسی علامت ٹھہری جو کسی کے پاس جنگ، کسی کے پاس تحفظ اور کسی کے پاس جنس — تینوں نے اس کہانی کو بے حد پسند کیا باوجودیکہ تینوں کی توجیہات جدا جدا تھیں۔ میں نے جب سے کہانی پڑھی تو لگا میں ان تمام احساسات سے گذر رہا ہوں جن سے میرے احباب گزر چکے ہیں۔

ادب میں علامت کوئی نئی بات نہیں ہے۔ الف لیلہ، ہزار داستان کی کہانیوں میں جگہ جگہ آپ کو علامتیں ملیں گی۔ ان کہانیوں میں پریوں اور جنوں کے بار بار ذکر کی وجہ ان علامتوں پر زیادہ دھیان نہیں [illegible] ورنہ انسانوں کا پتھر بن جانا، عورتوں کے چہروں کو اُن کے تن سے جدا کرنا اور زندہ رکھنا، حسین شہزادیوں کا صندوق میں مقفل کر دیا جانا، قلعہ بندوں کے رقبہ

... ما ایسی باتیں ہیں جن میں اشاروں اور علامتوں کے ذریعہ زندگی کی پیچیدگیوں کے رموز کی گرہیں کھولنے کی کوشش کی ... ۔ زندگی کے پیچ و تاب کے سفر سے گذرنے کے بعد اگر کوئی جدید کہانی مکمل بن کر ہمارے سامنے آتی ہے تو ایک ... لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ذہن ... لے ۔ تفریح طبع کے لئے تو دوسرا ادب موجود ہے جسے قاری ہلکے پھلکے ... چاہے پڑھ لے ظاہر ہے اُن سارے ... نگاروں کو جو پریم چند اور منٹو کے ... اُن سب کو تو آج آپ نہیں پڑھیں ... طرز کے اُنھیں لکھنے والوں کو قاری ... کے پڑھے گا جو یا تو کلاسک بن ... چکے ہیں لیکن نئی طرز کے لکھنے والوں ... آپ نہ پڑھیں آپ اُن کے بارے ... کیوں کر دیں گے۔ آپ کے پڑھنے ... رہیں نہیں ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم عصر انھیں پڑھ لیں اور آپ ... جائیں۔ آج ہمارے تجربہ اور مشاہدے ... سب کچھ ہے جو بنی نوع انسان کی تاریخ ... واقعات اور حادثات کا ایک انبار لگا ... اور حادثہ کا درد ہماری زندگی سے ... ہے۔ ان میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ... حادثات کے اس انبوہ میں کچھ ... ایسا سانحات بھی جنم لیتے ہیں جن کے لئے ... کوئی حادثہ و تقدیر پذیر نہیں ہوا ... ٹیکنیکی واقعہ کا اظہار ممکن نہیں رہا۔

ایک علامت بے شمار حادثات اور واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ میرے اس حق کو کوئی نہیں چھین سکتا کہ میں ایسے ادب کو پڑھنا چاہتا ہوں جو علامتوں کے ذریعہ میری اور موجودہ نسل کی زندگی کے زیادہ سے زیادہ حادثات کو پیش کرتا ہے جیسا کہ "ہم سب اپنے اپنے جسم کی کھال کے اندر قید تنہا بھٹکتے رہتے ہیں" اور "ہم کوزہ نہ سنبھلے بغیر کسی گروہ کا ٹائٹل کے" بغیر کسی لیبل کے اور بغیر کسی نعرہ بازی کے ہے۔

میں ہر اُس ادب کو پڑھوں گا جو میرے ذہن کو بالیدگی اور میری روح کو تسکین بخشے اور میں کسی ادیب سے ہرگز یہ مطالبہ نہیں کروں گا کہ وہ کافکا کی طرح یا غوث سعید کی کہانی "مردہ گاڑی" کی طرح لکھے۔

جولائی کا شمارہ

بشیر انور — **حیدر آباد**

محترمی! تسلیم

پرچہ پابندی کے ساتھ موصول ہو رہا ہے۔ جولائی کا شمارہ نظروں کے سامنے ہے اس لئے آسانی کے ساتھ بتا سکتا ہوں کہ اس میں "کرنیں" روشن ہیں۔ ساز صاحب کی خوبصورت نظم کے آخری دو شعر قطعہ کی صورت میں "یادِ رفتگاں" کے لئے عام طور پر استعمال کئے جاتے رہیں گے۔ "گداگری" تیکھے انداز کی بہت اچھی نظم ہے۔ "ریشمی لڑکی" دلچسپ اور خوبصورت افسانہ ہے۔ "یہ رشتے یہ بندھن" کی کہانی آج کے دور میں فٹ نہیں ہوتی۔ غزلیات میں کوئی شکایات نہیں ہے۔ قطب سرشار کو اس لئے پڑھا کہ وہ نوجوان شعراء کی میری پسندیدہ اُس فہرست میں شامل ہیں جو رحمٰن جامی، رؤف خیر، غیاث متین، یوسف کمال اور مظفر حجازی پر مشتمل ہے۔ "تسکین" اور "تلاشِ بہاراں" اچھی نظمیں ہیں۔ غیاث صدیقی صاحب کی منظوم کہانی کسی تبصرے سے بالاتر ہے۔ ڈاکٹر اقبال پر مضمون کا اُردو ترجمہ بہت خراب اور بور ہے۔ یہی بوریت اقبال متین صاحب کے جائزے پر بھی طاری ہے جس میں اُردو افسانے کا بیس سالہ جائزہ کم ہے اور لفاظی بہت زیادہ ہے۔ پورا مضمون پڑھ کر بھی یہ راز نہیں کھلتا کہ اقبال متین صاحب کیا کہنا چاہتے ہیں۔ انیس قیوم فیاض کا افسانہ افسانہ کم اور بچکانہ زیادہ لگتا ہے۔ نعلی خفا اچھے و ناصح ثابت ہو رہے ہیں۔ پونم کے ٹائٹل کی خوبصورتی دیکھ کر خوشی ہونے لگتی ہے۔

ناہید فاطمہ * — **اورنگ آباد**

"پونم" ہر مہینے نظر سے گذر رہا ہے۔ تازہ شمارہ میں اس مرتبہ افسانے سبھی اچھے ہیں۔ اقبال متین نے "اُردو افسانے کے بیس سال" کا جائزہ لیتے ہوئے بہت کی باتیں کہی ہیں۔ واقعی ایسا ادب جو کسی کے پلے نہ پڑے تخلیق کرنے سے کیا فائدہ۔ نظم کے صفحات ہمیشہ کی طرح دلچسپ اور جاندار رہے۔ بہر حال ہر مہینے "پونم" کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ نیک تمناؤں کے ساتھ

پردہ پس پردہ

فلمی دنیا کے شب و روز

محمد اکرام اللہ خان

آج سے تقریباً چھ آٹھ سال قبل گاڈ فادر کے نام سے ایک فلم بنی تھی۔ جس نے ساری دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا اس فلم کی غیر معمولی شہرت کے پیش نظر نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی ایسے واقعات پر مبنی کئی فلمیں بنائی گئیں لیکن ایک فلم بھی گاڈ فادر کے معیار کے عشر عشیر تک نہیں پہونچ سکی۔ یہ فلم تشدد، جنس نشہ اور برہنگی کے ایسے مناظر کا مجموعہ تھی جو اس وقت کے سنسر بورڈ کی پالیسی کے خلاف تھے۔ چنانچہ ہندوستان میں اس فلم کی نمائش کی اجازت نہیں دی گئی۔ اب اطلاع آئی ہے کہ موجودہ سنسر بورڈ والوں نے فلم کے کچھ حصے نکال کر نمائش کی اجازت دے دی ہے۔ عوام میں فلم کے بے چینی سے انتظار کے پیش نظر یقین ہے کہ گاڈ فادر اگست ہی میں بمبئی میں ریلیز ہو جائے گی۔ فلم کی کہانی کیرولین فیملی کے واقعات پر مشتمل ہے جس کے مختلف کرداروں کی ہنگامہ آرائیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں ان کرداروں میں کوئی نشہ باز ہے تو کوئی محبت کا متوالا ہے کوئی اسمگلر ہے تو کوئی خاندان کی عزت و ناموس کا محافظ۔ مرکزی کردار کے رول میں مارلین برانڈو کی غیر معمولی اداکاری نے فلم کو ناقابل فراموش حیثیت عطا کر دی ہے۔ جس کا روشن ثبوت آسکر اکیڈیمی کا وہ عظیم ایوارڈ ہے جو فلم کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے۔ عوام کی بے پناہ دلچسپی کو دیکھتے ہوئے فلم کو ٹیلیویژن پر بھی دکھایا گیا۔ یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی کہ ٹیلیویژن کمپنی نے فلم بنانے والی پیرامونٹ کمپنی کو بطور معاوضہ تقریباً آٹھ کروڑ روپیہ ادا کئے تھے۔

★

لکھنو کے قریب و جوار میں ایک فلم بن رہی ہے جس کا نام ہے "جنون"۔ یہ فلم ششی کپور کے لئے شیام بینگل بنا رہے ہیں۔ فلم کی کہانی آزادی کی پہلی جنگ "غدر" کے بعد کے واقعات، ماحول اور کیفیت سے متعلق ہے۔ دو محبت کرنے والوں کی کہانی جو ملک اور مذہب کی پابندیوں سے بلند ہو کر ایک جان دو قالب نظر آتے ہیں فلم میں ششی کپور، شبانہ اعظمی، نفیسہ علی کے علاوہ عصمت چغتائی بھی پہلی مرتبہ میک اپ کے ساتھ نانی اماں کا رول ادا کر رہی ہیں۔ اور خود ششی کپور کی انگریز بیوی بھی فلم میں ششی کپور کی ساس کا رول ادا کر رہی ہے فلم بالی کی شہرت یافتہ وہ پارسن جو پیرل پدمسی کے نام سے اسٹیج اور فلموں میں مشہور ہے ایک اہم رول کے لئے منتخب کی گئی ہے۔ کہانی کا پس منظر جن واقعات سے مربوط ہے اس کی روشنی میں فلم کے مستقبل سے اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

★

وجے آنند نے اپنی بھانجی سے کیا شادی کی کہ ساری بمبئی میں ہلچل سی مچ گئی۔ بھانجی کے بھائیوں نے ترک تعلقات کی دھمکی دی۔ عزیزوں نے سوشل بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ لیکن وجے آنند پر اس کا کوئی اثر نہ ہو سکا۔ وہ بڑے ہی انہماک سے اپنے فلیٹ سجانے میں مصروف ہے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ آنند خاندان میں اس شادی کی وجہ سے بڑے بڑے ہنگامے بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن اب یہ بات پرانی ہو گئی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آنند خاندان کے افراد حالات سے سمجھوتہ کر لیں گے۔

★

گذشتہ دنوں آشا بھوسلے نے لندن کے البرٹ ہال میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا اور پسندیدہ گانے سامعین کی فرمائش پر سنا کر بے حد داد و تحسین حاصل کی تھی۔ آشا بھوسلے کی آواز کے ساتھ آر ڈی برمن کے آرکسٹرا نے اس پروگرام کو یادگار بنا دیا تھا۔ ان دنوں لتا منگیشکر روس کا دورہ کر رہی ہیں

(بقیہ صفحہ ۷۱ پر)

فلمی ڈائری

سدابہار ہیرو دیوآنند کی "دیس پردیس" جس میں بیرونی ممالک میں سکونت پذیر ہندوستانیوں کے مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے باکس آفس پر دھوم مچا رہی ہے۔ یہ پہلی "A" سرٹیفکیٹ والی فلم ہے جو بمبئی کے ڈرائیو-اِن سینما میں دکھائی جا رہی ہے۔ فلم کی ہیروئن ٹینا منیم کو دسکی کے ایک ڈرم میں نیم عریاں حالت میں دکھایا گیا اور اسی وجہ سے فلم کو بالغوں کے لئے محدود کیا گیا ہے۔ لیکن نابالغ بچوں کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ سین ٹریلر میں بتایا جا رہا ہے۔ ٹینا منیم کو اس فلم کی کامیابی کے ساتھ ہی دو تین بڑی فلموں کے معاہدے مل گئے ہیں۔ دیو آنند کی آنے والی فلم میں بھی ٹینا ہیروئن کا رول ادا کرے گی۔ ٹینا کے والد بابو بھائی منیم فلموں کے ڈسٹری بیوٹر رہ چکے ہیں اور انہوں نے پہلی بولتی ہندی فلم "عالم آرا" ڈسٹری بیوشن کے لئے لی تھی۔ چند سال پہلے ٹینا منیم نے امریکہ کے ایک "مقابلہ حسن" میں ... جہاں ایسے — MISS PHOTO GENIC قرار دیا گیا تھا

امول پالیکر کی شوٹنگ ایک دن ملتوی ہوئی تو وہ قریب کے ایک سینما میں اپنی فلم "داماد" دیکھنے گیا۔ فلم ہاؤس فل جا رہی تھی اسے ٹکٹ نہیں مل سکا اور پوری فلم اس نے کھڑے رہ کر دیکھی۔

★

ایف سی مہرہ سوویت یونین کی فلمی صنعت کے تعاون سے "علی بابا" بنا رہے ہیں۔ اس فلم میں کام کرنے والے ہندوستانی فن کاروں میں دھرمیندر، ہیما مالینی اور زینت امان شامل ہیں

★

بمبئی کی ایک کپڑے کی مل "ستیم شیوم سندرم" کے فیشن کی ... ساڑیاں تیار کرنے لگی ہے جو فلم میں زینت کے جسم کو بمشکل ادھا چھپا پاتی ہیں۔ "ستیم ... " کے تقریباً فلاپ ہونے کے بعد ایسی ساڑیوں کے فیشن کے چلنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟

★

"بوبی" نے راج کپور کو نہ صرف کنارے سے لگایا تھا بلکہ دولت کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا سنہرا موقع بھی دیا تھا۔ "ستیم شیوم سندرم" نے راج کپور کو پھر منجدھار سے قریب کر دیا ہے۔ اس بار راج کپور اپنے چھوٹے بیٹے راجیو کپور کی قسمت آزمانا چاہ رہا ہے۔ راجیو کو لیکر راج کپور "حنا" بنا رہا ہے تا کہ تاریخ دہرائی جا سکے۔

★

مرزا برادران کی "قسمیں وعدے" اور سلیم جاوید کی "ترشول" ہر جگہ باکس آفس پر نئے ریکارڈ قائم کر رہی ہے جبکہ "ستیم شیوم سندرم" کی رپورٹ ہر جگہ مایوس کن ہے۔ فلم اگر بہ حیثیت مجموعی اوسط جا رہی ہے تو اس میں راج کپور کے فن سے زیادہ زینت کے بڑی حد تک عریاں بدن کا دخل ہے۔

★

راج کمار کوہلی نے "ناگن" بنائی جس میں کئی ہیروز پیش کیے گئے تھے فلم باکس آفس پر اوسط کامیابی حاصل کر سکی فلاپ نہیں رہی۔ اب وہ "جانی دشمن" بنا رہا ہے جس میں چھ ہیروز اور چھ ہیروئنیں ہیں یہ فلم ۷۰ ایم ایم میں بنے گی۔ راج کوہلی کا کارنامہ یہیں ختم نہیں ہوگا بلکہ وہ بوہرہ برادرس کی ایک نئی فلم میں نو ہیروز اور ہیروئنوں کو ہدایت دے رہا ہے۔

★

دھرمیندر پہلی مرتبہ ایک فلم لڑائی کے ایک سین میں گاتا گاتے ہوئے "کراٹے" کا مظاہرہ کرے۔ یہ سین ایس مکرجی کی فلم "تیسری آنکھ" کے لئے فلمایا جا رہا ہے۔

★

انڈین فلم ڈائرکٹرز گلڈ اسوسی ایشن گذشتہ سال کی دس بہترین فلموں کا انتخاب کرے گی۔ فلم انڈسٹری کے تجربہ کار دو انڈور ہدایت کاروں کی ایک جماعت ان فلموں کا انتخاب کرے گی۔ ان ہدایت کاروں میں خواجہ احمد عباس، رشی کیش مکرجی، بی۔ آر چوپڑہ، باسو بھٹاچاریہ، گریش کرناڈ، باسو چٹرجی، شیام بینیگل اور گلزار شامل ہیں۔ یہ ہدایت کار اپنے طور پر فلموں کا انتخاب کریں گے۔ اس کے بعد تمام منتخب فلموں میں سے دس فلمیں چنی جائیں گی۔

★

لندن جانا آج کل ہمارے فلمی ستاروں کے لئے ایسا ہی ہو گیا ہے جیسے تفریح کے لئے کھنڈالا جانا۔ جب بھی فرصت ہوتی وہ چھٹی منانے کے لئے لندن چلے جاتے ہیں۔ بعض مشہور ستارے تو نئی کہانی سننے کے لئے بھی بمبئی پر لندن کو ترجیح دیتے ہیں۔ امیتابھ بچن نے ہدایت کار رمیش بہل سے کہا ہے کہ وہ کہانی سننے کے لئے لندن میں وقت دے سکتے ہیں۔ گذشتہ دنوں راکھی اپنی بچی میگھنا کو تفریح کرانے کی خاطر لندن گئی۔ وہ میگھنا کو ریجنز پارک لے جاتی اور اکثر میوزیم کی سیر کراتی۔ وہاں بچوں کے لئے ایک ... وہاں پروگرام بھی

"شالیمار" کے پرستار ابھی تیار نہیں ہوئے ہیں۔ گزشتہ شاہ جب کینس CANNES کے فلمی میلے میں گئے تو انھوں نے دس منٹ کی ایک ریل اپنے ساتھ رکھی جس میں فلم کے اہم حصوں کی جھلکیاں پیش کی گئی تھیں۔ اس ریل اور پبلسٹی کے دوسرے مواد کی مدد سے فلم سات ملکوں کے لئے فروخت ہو گئی۔

★

تنوجا بہت جلد سنیل دت کے بیٹے سنجے کے ساتھ ایک فلم میں آ رہی ہے۔ نرگس اور سنیل دت اس "آفر" کی تائید میں نہیں تھے لیکن چونکہ فلم ساز کے ان دونوں سے بہت گہرے دوستانہ تعلقات ہیں اس لئے بمشکل انھوں نے حامی بھری۔ محبت کے موضوع پر فلمائی جانے والی اس کہانی میں سنجے اور ... یقیناً حقیقت کا رنگ بھرنے میں کامیاب ہوں گے کیونکہ ان کے رومان کی افواہیں بڑی تیزی سے فلمی دنیا میں گشت کر رہی ہیں بلکہ بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ یہ فلم ان کی حقیقی زندگی کا ریہرسل ثابت ہو گی۔

★

گزشتہ دنوں ہیما مالنی کا (APPENDICITIS) کا آپریشن ہوا تو دھرمیندر جو لندن میں تھا فوراً بمبئی واپس لوٹ آیا۔ اس آپریشن کی وجہ سے ہیما کی فلموں کی شوٹنگ کچھ دنوں کے لئے رک گئی ہے۔

★

فلموں میں بعض وقت گانے ریکارڈ کئے جاتے ہیں لیکن فلمائے نہیں جاتے اور بعض وقت گانے فلمائے جاتے ہیں لیکن فلم میں شامل نہیں کئے جاتے۔ "ترشول" میں ایک گانا فلمایا جا چکا تھا اور جو ریکارڈ میں بھی موجود ہے۔ لیکن فلم میں اس کا کہیں پتہ نہیں۔ "قسمیں وعدے" میں ایک گانا رندھیر کپور اور نیتو پر فلمایا گیا لیکن اسے فلم میں شامل نہیں کیا گیا۔ اب یہ گانا دوسری فلم "بھلا مانس" میں شامل کیا گیا ہے۔ "بھلا مانس" کے موسیقار اور ہیرو، ہیروئن اتفاق سے وہی ہیں۔

بےلاگ فلمی تبصرہ

ستیم شیوم سندرم

(بشیر انور)

بڑے ہی اہتمام اور زبردست پبلسٹی کے ساتھ بنائی گئی راج کپور کی نئی فلم "ستیم، شیوم، سندرم" کا لوگ بڑی بے چینی اور اشتیاق کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ جب انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں تو فلم دیکھنے والوں نے ایسے متضاد تبصرے کئے کہ بہت سارے لوگوں کا اشتیاق ماند پڑ گیا۔ جو فلم راجکپور کی معرکتہ الآرا تخلیق سمجھی جا رہی تھی اسے چند ہی لوگوں نے "گوارا" فلم کا اعزاز بخشا۔ تبصرہ نگار نے جب یہ فلم دیکھی تو اس کے ذہن میں یہ ساری تلخ رائیں محفوظ تھیں۔ فلم کا آغاز راجکپور کے روایتی انداز پوجا پاٹ سے ہوا اور ساتھ فلم کا ٹائیٹل بڑے بڑے خوبصورت دیوناگری حروف میں پورے پردے پر پھیل گیا۔ اس کے بعد لتا منگیشکر کی جادو بھری مدھر آواز میں فلم کا ٹائیٹل گیت کانوں میں رس گھولنے لگا۔ اس گیت سے ہی فلم کی کہانی شروع ہوتی ہے جو کچھ اس طرح ہے۔ مگر ٹھہرئیے فلم میں کہانی ہے ہی کہاں؟ کسی واقعے، کسی خیال، کسی تصور، کسی موضوع کو کہانی کہہ سکتے ہیں تو وہ یوں ہے،

ایک گاؤں ہے، نظر نواز جلوؤں، دلکش مناظر، خوبصورت جھرنوں، سرسبز و شاداب درختوں، مہکتے پھولوں سے بھرا ہوا۔ جس کے بیچوں بیچ ایک وسیع اور شاندار مندر بنا ہوا ہے (کہا جاتا ہے کہ یہ سٹ پر ۷ لاکھ روپئے صرف کیے گئے ہیں) اور جس کے قریب ہی دنیا کا سب سے اونچا بند ناگر جوساگر ڈیم واقع ہے۔ اس گاؤں میں ایک ہی سائز، ایک ہی عمر اور ایک ہی پیمائش کی حسین و جمیل دوشیزائیں اٹھلاتی، بل کھاتی اور ناچتی گاتی پھرتی ہیں۔ اب اسے عزیت سمجھیں یا کپڑے کی قلت کہ یہاں کی نوجوان لڑکیوں میں چولی یا بلاؤز پہننے کا قطعی رواج نہیں۔ بس رانوں سے کچھ نیچے تک ساڑی پہن لی اور اسی ساڑی کے پلو سے اپنا سینہ چھپا لیا۔ ان ساری لڑکیوں میں سب سے نمایاں روپا (زینت امان) ہے سرو قد، حسین اور خوبصورت، چلتی ہے تو کمر میں سو سو بل پڑتے ہیں۔ اٹھلاتی ہے تو فضا جھومنے لگتی ہے مسکراتی ہے تو گل و گلزار شاداب ہو جاتے ہیں۔ روتی ہے تو ماحول پر اداسی چھا جاتی ہے۔ گاتی ہے تو سورج نکل آتا ہے اور گاؤں کی صبح ہو جاتی ہے مگر اس مجسم قیامت اور مکمل حسن کو گاؤں کے سارے لوگ منحوس اور ابھاگن کہتے ہیں کیونکہ روپا کے پیدا ہوتے ہی اس کی ماں چل بسی تھی جب اس کی سالگرہ منائی جا رہی تھی تو ایک حادثہ میں اس کے خوبصورت چہرے کا آدھا حصہ جل گیا تھا اور چاند سا یہ چہرہ مستقلاً گہنا گیا تھا۔ اپنے باپ کیلئے ایک بوجھ بنی ہوئی اور سماج کی معتوب اور ٹھکرائی ہوئی آدھی خوبصورت روپا کی ایک ہی خواہش رہتی ہے کہ کوئی اس کا ہاتھ تھام لے اور اس کی بقیہ زندگی کو سہانا بنا دے چنانچہ ایک گورا چٹا تنومند، خوبرو جوان انجینئر راجو (ششی کپور) جو خیر سے حسن پرست اور نفاست پسند بھی ہے ملازمت کے سلسلے میں بذریعہ میل گاؤں میں وارد ہوتا ہے اور لتا منگیشکر کی آواز کا پیچھا کرتے کرتے روپا تک پہنچ جاتا ہے اس کے جسم کی پیمائش (۳۶-۲۴-۳۶) بھی کر لیتا ہے اور اسے پانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ اس بیچ کچھ اور واقعات، حادثات اور اتفاقات شامل کر دیئے گئے ہیں تاکہ فلم کی طوالت برقرار رہے۔

ہندوستانی فلم انڈسٹری کے وقار کو اونچا کرنے والے ادارے آر۔ کے۔ پروڈکشن نے ہمیں برسات، آوارہ، جاگتے رہو، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، سنگم اور میرا نام جوکر جیسی مایہ ناز اور موسیقی ریز فلمیں دی ہیں جن میں سے ہر ایک فلم کسی نہ کسی موضوع اور بہترین کہانی پر مبنی ہے۔ ان میں بیشتر فلموں کی کہانیاں اردو کے ممتاز

[illegible]

... سنگھ ... بیرا یگر اشی کرناڈ، باسو چٹرجی، شیام بینیگل اور گلزار شامل ہیں۔ یہ ہدایت کار اپنے طور پر فلموں کا انتخاب کریں گے۔ اس کے بعد تمام منتخب فلموں میں سے دس فلمیں چنی جائیں گی۔

★

[illegible] آج کل ہمارے فلمی ستاروں کے لئے ایسا ہی ہو گیا ہے جیسے تفریح کے لئے [illegible]۔ جب بھی فرصت ہوئی وہ [illegible] کے لئے لندن چلے جاتے ہیں بعض مشہور ستارے تو کہانی سننے کے لئے [illegible] ہیں۔ [illegible] ہدایت کار [illegible] نے کہا ہے کہ [illegible] کہانی سننے کے [illegible] سکتے ہیں [illegible]

[illegible] شائع ہونے کے [illegible] نہیں ہوئی [illegible] کی ایک [illegible] ساتھ رکھی جس میں فلم کے اہم حصوں کی جھلکیاں پیش کی گئی تھیں۔ اس ریل اور پبلسٹی کے دوسرے مواد کی مدد سے فلم سات ملکوں کے لئے فروخت ہو گئی۔

★

ٹینا منیم بہت جلد سنیل دت کے بیٹے سنجے کے ساتھ ایک فلم میں آرہی ہے۔ نرگس اور سنیل دت اس "آفر" کی تائید میں نہیں تھے لیکن چونکہ فلم ساز کے ان دونوں سے بہت گہرے دوستانہ تعلقات ہیں اس لئے بمشکل انہوں نے حامی بھری۔ محبت کے موضوع پر فلمائی جانے والی اس کہانی میں سنجے اور منیم یقیناً حقیقت کا رنگ بھرنے میں کامیاب ہوں گے کیونکہ ان کے رومان کی افواہیں بڑی تیزی سے فلمی دنیا میں گشت کر رہی ہیں بلکہ بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ یہ فلم ان کی حقیقی زندگی کا ریہرسل ثابت ہو گی۔

★

[illegible] مالنی [illegible] (A [illegible]) [illegible]

★

فلموں میں بعض وقت گانے ریکارڈ کئے جاتے ہیں لیکن فلمائے نہیں جاتے اور بعض وقت گانے فلمائے جاتے ہیں لیکن فلم میں شامل نہیں کئے جاتے۔ "ترشول" میں ایک گانا فلمایا جا چکا تھا اور جو ریکارڈ میں بھی موجود ہے۔ لیکن فلم میں اس کا کہیں پتہ نہیں۔ "قسمیں وعدے" میں ایک گانا رندھیر کپور اور نیتو پر فلمایا گیا لیکن اسے فلم میں شامل نہیں کیا گیا۔ اب یہ گانا دوسری فلم "بھلا مانس" میں شامل کیا گیا ہے۔ "بھلا مانس" کے موسیقار اور ہیرو ہیروئن اتفاق سے وہی ہیں۔

بے لاگ فلمی تبصرہ

ستیم شیوم سندرم

(بشیر انور)

بڑے ہی اہتمام اور زبردست پبلسٹی کے ساتھ بنائی گئی راج کپور کی نئی فلم "ستیم، شیوم، سندرم" کا لوگ بڑی بے چینی اور اشتیاق کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ جب انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں تو فلم دیکھنے والوں نے ایسے متضاد تبصرے کئے کہ بہت سارے لوگوں کا اشتیاق ماند پڑ گیا۔ جو فلم راجکپور کی معرکۃ الآرا تخلیق سمجھی جا رہی تھی اسے چند ہی لوگوں نے "گوارا" فلم کا اعزاز بخشا تبصرہ نگار نے جب یہ فلم دیکھی تو اس کے ذہن میں یہ ساری تلخ رائیں محفوظ تھیں۔ فلم کا آغاز راجکپور کے روایتی انداز پوجا پاٹ سے ہوا اور ساتھ فلم کا ٹائٹل بھی بڑے خوبصورت دیوناگری [illegible] میں پیش کیا گیا۔ [illegible]

کہہ سکتے ہیں تو وہ یوں ہے،

ایک گاؤں ہے، نظر نواز جلوؤں دلکش مناظر، خوبصورت جھرنوں، سرسبز و شاداب درختوں، مہکتے پھولوں سے بھرا ہوا۔ جس کے بیچوں بیچ ایک وسیع اور شاندار مندر بنا ہوا ہے (کہا جاتا ہے کہ یہ سٹ پر ۷ لاکھ روپے صرف کیے گئے ہیں) اور جس کے قریب ہی دنیا کا سب سے اونچا بند ناگر جو ساگر ڈیم واقع ہے اس گاؤں میں ایک ہی سائز، ایک ہی عمر اور ایک ہی پیمائش کی حسین و جمیل رعنائیاں اٹھلاتی، بل کھاتی اور ناچتی گاتی پھرتی ہیں۔ اب اسے عزیت سمجھیں یا کپڑے کی قلت کہ یہاں کی نوجوان لڑکیوں میں چولی یا بلاؤز پہننے کا قطعی رواج نہیں۔ بس ناف سے کچھ نیچے تک ساڑی پہن لی اور اسی ساڑی کے پلو سے اپنا سینہ چھپا لیا ان ساری لڑکیوں میں سب سے نمایاں روپا (زینت امان) ہے سرو قد، حسین اور خوبصورت، چلتی ہے تو کمر میں سو سو بل پڑتے ہیں۔ اٹھلاتی ہے تو فضا جھومنے لگتی ہے مسکراتی ہے تو گل و گلزار شاداب ہو جاتے ہیں۔ روتی ہے تو ماحول پر اداسی چھا جاتی ہے۔ گاتی ہے تو سورج نکل آتا ہے اور گاؤں کی صبح ہو جاتی ہے مگر اس مجسم قیامت اور مکمل حسن کو گاؤں کے سارے لوگ منحوس اور اپشگن کہتے ہیں کیونکہ روپا کے پیدا ہوتے

ہی اس کی ماں چل بسی تھی جب اس کی سالگرہ منائی جا رہی تھی تو ایک حادثہ میں اس کے خوبصورت چہرے کا آدھا حصہ جل گیا تھا اور چاند سا یہ چہرہ مستقلاً گہنا گیا تھا۔ اپنے باپ کیلئے ایک بوجھ بنی ہوئی اور سماج کی معتوب اور ٹھکرائی ہوئی آدھی خوبصورت روپا کی ایک ہی خواہش رہتی ہے کہ کوئی اس کا ہاتھ تھام لے اور اس کی بقیہ زندگی کو سہانا بنا دے۔ چنانچہ ایک گورا چٹا تنومند، خوبرو جوان انجینئر راجو (ششی کپور) جو خیر سے حسن پرست اور نفاست پسند بھی ہے ملازمت کے سلسلے میں بذریعہ ریل گاؤں میں وارد ہوتا ہے اور روپا کی مترنم آواز کا پیچھا کرتے کرتے روپا تک پہنچ جاتا ہے اس کے جسم کی پیمائش (۳۶-۲۴-۳۶) بھانپ لیتا ہے اور اسے پالینے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ اس بیچ کچھ اور واقعات، حادثات اور اتفاقات شامل کر دیئے گئے ہیں تاکہ فلم کی طوالت برقرار رہے۔

ہندوستانی فلم انڈسٹری کے وقار کو اونچا کرنے والے ادارے آر۔ کے۔ پروڈکشنز نے ہمیں برسات، آوارہ، جاگتے رہو، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، سنگم اور میرا نام جوکر جیسی مایہ ناز اور موسیقی ریز فلمیں دی ہیں جن میں سے ہر ایک فلم کسی نہ کسی موضوع اور بہترین کہانی پر مبنی ہے۔ [illegible] بیشتر فلموں کی کہانیاں [illegible]

انڈین فلم ڈائرکٹرز میں [illegible] اس سال کی دس بہترین فلموں کا انتخاب کریں گے۔ فلم انڈسٹری کے تجربہ کار دانشور ہدایت کاروں کی ایک جماعت ان فلموں کا انتخاب کرے گی۔ ان ہدایت کاروں میں خواجہ احمد عباس، رشی کیش مکرجی، بی۔ آر۔ چوپڑہ، باسو بھٹاچاریہ، گریش کرناڈ، باسو چٹرجی، شیام بینیگل اور گلزار شامل ہیں۔ یہ ہدایت کار اپنے طور پر فلموں کا انتخاب کریں گے۔ اس کے بعد تمام منتخب فلموں میں سے دس فلمیں چنی جائیں گی۔

★

لندن جانا آج کل ہمارے فلمی ستاروں کے لئے ایسا ہی ہو گیا ہے جیسے تفریح کے لئے کھنڈالا جانا۔ جب بھی فرصت ہوئی چھٹی منانے کے لئے لندن چلے جاتے ہیں۔ [illegible] مشہور ستارے تو نئی کہانی سننے کے لئے بھی پھر لندن کو ترجیح دیتے ہیں۔ [illegible] امیتابھ بچن نے ہدایت کار [illegible] سے کہا ہے کہ وہ کہانی سننے کے لئے لندن میں وقت دے سکتے ہیں [illegible] ریکھا اپنی [illegible] کو تفریح [illegible] کی خاطر لندن لے گئی۔ وہاں [illegible] سے [illegible] اور اکثر [illegible] کی سیر کرائی [illegible] لے گئی۔ وہ [illegible] پروگرام بھی

ششی کپور کے [illegible] تیار نہیں ہوئے [illegible] ششی کپور جب کینس CANNES کے فلمی میلے میں گئے تو انہوں نے دس منٹ کی ایک ریل اپنے ساتھ رکھی جس میں فلم کے اہم حصوں کی جھلکیاں پیش کی گئی تھیں۔ اس ریل اور پبلسٹی کے دوسرے مواد کی مدد سے فلم سات ملکوں کے لئے فروخت ہو گئی۔

★

ٹینا منیم بہت جلد سنیل دت کے بیٹے سنجے کے ساتھ ایک فلم میں آ رہی ہے۔ نرگس اور سنیل دت اس "آفر" کی تائید میں نہیں تھے لیکن چونکہ فلم ساز کے ان دونوں سے بہت گہرے دوستانہ تعلقات ہیں اس لئے بمشکل انہوں نے حامی بھری۔ محبت کے موضوع پر فلمائی جانے والی اس کہانی میں سنجے اور ٹینا منیم یقیناً حقیقت کا رنگ بھرنے میں کامیاب ہوں گے کیونکہ ان کے رومان کی افواہیں بڑی تیزی سے فلمی دنیا میں گشت کر رہی ہیں بلکہ بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ یہ فلم ان کی حقیقی زندگی کا ریہرسل ثابت ہو گی۔

★

گزشتہ دنوں ہیما مالنی کا (APPENDICITIS) کا آپریشن ہوا تو دھرمیندر جو لندن میں تھا فوراً بمبئی واپس لوٹ آیا۔ اس آپریشن کی وجہ سے ہیما کی فلموں کی شوٹنگ کچھ دنوں کے لئے رک گئی ہے۔

★

فلموں میں بعض وقت گانے ریکارڈ کئے جاتے ہیں لیکن فلمائے نہیں جاتے اور بعض وقت گانے فلمائے جاتے ہیں لیکن فلم میں شامل نہیں کئے جاتے۔ "ترشول" میں ایک گانا فلمایا جا چکا تھا اور جو ریکارڈ میں بھی موجود ہے۔ لیکن فلم میں اس کا کہیں پتہ نہیں۔ "قسمیں وعدے" میں ایک گانا رندھیر کپور اور نیتو پر فلمایا گیا لیکن اسے فلم میں شامل نہیں کیا گیا۔ اب یہ گانا دوسری فلم "بھلا مانس" میں شامل کیا گیا ہے۔ "بھلا مانس" کے موسیقار اور ہیرو ہیروئن اتفاق سے وہی ہیں۔

بے لاگ فلمی تبصرہ

ستیم شیوم سندرم

(بشیر انور)

بڑے ہی اہتمام اور زبردست پبلسٹی کے ساتھ بنائی گئی راج کپور کی نئی فلم "ستیم، شیوم، سندرم" کا لوگ بڑی بے چینی اور اشتیاق کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ جب انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں تو فلم دیکھنے والوں نے ایسے متضاد تبصرے کئے کہ بہت سارے لوگوں کا اشتیاق ماند پڑ گیا۔ جو فلم راج کپور کی معرکۃ الآرا تخلیق سمجھی جا رہی تھی اسے چند ہی لوگوں نے "گوارا" فلم کا اعزاز بخشا۔ تبصرہ نگار نے جب یہ فلم دیکھی تو اس کے ذہن میں یہ ساری تلخ رائیں محفوظ تھیں۔ فلم کا آغاز راج کپور کے روایتی انداز پوجا پاٹ سے ہوا اور ساتھ فلم کا ٹائیٹل بڑے بڑے خوبصورت دیوناگری حروف میں پورے پردے پر پھیل گیا۔ اس کے بعد لتا منگیشکر کی جادو بھری مدھر آواز میں فلم کا ٹائیٹل گیت کانوں میں رس گھولنے لگا۔ اس گیت سے ہی فلم کی کہانی شروع ہوتی ہے جو کچھ اس طرح ہے۔ مگر ٹھہریئے فلم میں کہانی ہے ہی کہاں؟ کسی واقعے، کسی خیال، کسی تصور، کسی موضوع کو کہانی کہہ سکتے ہیں تو وہ یوں ہے،

ایک گاؤں ہے، نظر نواز جلووں، دلکش مناظر، خوبصورت جھرنوں، سرسبز و شاداب درختوں، مہکتے پھولوں سے بھرا ہوا۔ جس کے بیچوں بیچ ایک وسیع اور شاندار مندر بنا ہوا ہے (کہا جاتا ہے کہ اس سٹ پر ۷ لاکھ روپے صرف کیے گئے ہیں) اور جس کے قریب ہی دنیا کا سب سے اونچا بند ناگر جونا ساگر ڈیم واقع ہے۔ اس گاؤں میں ایک ہی سائز، ایک ہی عمر اور ایک ہی پیمائش کی حسین و جمیل رعنائیاں اٹھلاتی، بل کھاتی اور ناچتی گاتی پھرتی ہیں۔ اب اسے غربت سمجھیں یا کپڑے کی قلت کہ یہاں کی نوجوان لڑکیوں میں چولی یا بلاؤز پہننے کا قطعی رواج نہیں۔ بس رانوں سے کچھ نیچے تک ساڑی پہن لی اور اسی ساڑی کے پلو سے اپنا سینہ چھپا لیا۔ ان سارے لڑکیوں میں سب سے نمایاں روپا (زینت امان) ہے سرو قد، حسین اور خوبصورت، چلتی ہے تو کمر میں سو سو بل پڑتے ہیں۔ اٹھلاتی ہے تو فضا جھومنے لگتی ہے مسکراتی ہے تو گل و گلزار شاداب ہو جاتے ہیں۔ روتی ہے تو ماحول پر اداسی چھا جاتی ہے۔ گاتی ہے تو سورج نکل آتا ہے اور گاؤں کی صبح ہو جاتی ہے مگر اس مجسم قیامت اور مکمل حسن کو گاؤں کے سارے لوگ منحوس اور ابھاگن کہتے ہیں کیونکہ روپا کے پیدا ہوتے ہی اس کی ماں چل بسی تھی۔ جب اس کی سالگرہ منائی جا رہی تھی تو ایک حادثہ میں اس کے خوبصورت چہرے کا آدھا حصہ جل گیا تھا اور چاند سا یہ چہرہ مستقلاً گہنا گیا تھا۔ اپنے باپ کیلئے ایک بوجھ بنی ہوئی اور سماج کی معتوب اور ٹھکرائی ہوئی آدھی خوبصورت روپا کی ایک ہی خواہش رہتی ہے کہ کوئی اس کا ہاتھ تھام لے اور اس کی بقیہ زندگی کو سہانا بنا دے۔ چنانچہ ایک گورا چٹا تندمند، خوبرو جوان انجینئر راجو (ششی کپور) جو خیر سے حسن پرست اور نفاست پسند بھی ہے ملازمت کے سلسلے میں بذریعہ میل گاؤں میں وارد ہوتا ہے اور لتا منگیشکر کی آواز کا پیچھا کرتے کرتے روپا تک پہنچ جاتا ہے اس کے جسم کی پیمائش (۳۶۔۲۴۔۳۶) بھی کر لیتا ہے اور اسے پالینے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ اس بیچ کچھ اور واقعات، حادثات اور اتفاقات شامل کر دیئے گئے ہیں تاکہ فلم کی طوالت برقرار رہے۔

ہندوستانی فلم انڈسٹری کے وقار کو بلند کرنے والے ادارے آر۔ کے۔ پروڈکشنز نے ہمیں برسات، آوارہ، جاگتے رہو، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، سنگم اور میرا نام جوکر جیسی مایہ ناز اور موسیقی ریز فلمیں دی ہیں جن میں سے ہر ایک فلم کسی نہ کسی موضوع اور بہترین کہانی پر مبنی ہے۔ ان بیشتر فلموں کی کہانیاں اردو کے ممتا

ادیب خواجہ احمد عباس نے لکھی ہیں۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ راج کپور کی فلموں کے رسیا اس کی ہر نئی فلم کو ایک قدم آگے دیکھنا پسند کریں گے لیکن فلم "ستیم، شیوم، سندرم" نے شائقین کی توقعات کو پورا نہیں کیا۔ جہاں تکنک کے اعتبار سے یہ فلم نئے تقاضوں کو پورا کرتی ہے وہیں غیر حقیقت پسندانہ اور مجہول کہانی نے راجکپور کو بہت پیچھے ڈھکیل دیا ہے۔ کہانی تو جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، کچھ ہے ہی نہیں۔ البتہ فلم کے آغاز میں ایک موضوع کو دماغ میں ٹھونسنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حسن کا بذات خود کوئی وجود نہیں ہوتا بلکہ یہ عقیدت اور محبت ہی ہے جو ایک معمولی چیز کو بھی حسین بنا دیتی ہے اور اسے بہت اونچا اٹھا دیتی ہے۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے ششی کپور سے فلم میں بہت ساری حماقتیں کروائی گئی ہیں اس کو ایک حسن پرست بتایا جاتا ہے مگر بعد کے واقعات میں وہ ایک بوالہوس نظر آتا ہے اور اس مصرعے کی تفسیر بن جاتا ہے کہ

سے ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

ذرا غور کریں ایک نوجوان لڑکا اور نوجوان لڑکی بار بار ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں۔ ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہیں لڑکی کی آواز اپنا جادو جگاتی رہتی ہے۔ پھر دو بدن آپس میں مل جاتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی عقلمند عاشق صاحب اپنی محبوبہ کے چہرے کا سیاہ رخ نہیں دیکھ پاتے۔ البتہ انٹرول کے بعد جبکہ کیمرے کی آنکھ روپا کے جلے ہوئے رخ پر مرکوز کر دی جاتی ہے تو نکے عاشق صاحب اس بدصورتی کو برداشت نہیں کر پاتے اور ایک چیخ مار کر گھر کے باہر نکل جاتے ہیں۔ اس موقع پر نہ روپا کی سُریلی آواز کوئی جادو کر پاتی ہے اور نہ اس کا مرمریں بدن کچھ کام دیتا ہے کیونکہ بیوی کے روپ میں روپا کچھ کپڑے پہنے ہوئے رہتی ہے ایک عاشق کا اس سے بڑھ کر دیوالیہ پن اور کیا ہوگا کہ وہ اپنی محبوبہ کے قد و قامت کو نہ پہچان سکے، اس کے بدن کی خوشبو کو محسوس نہ کر سکے۔ اس کی آواز کو نہ پا سکے۔ نیت کی اس سے بڑھ کر توہین اور کیا ہوگی کہ محض چہرے کا کچھ حصہ جل جانے سے پھر بھی کسی کو اپنانے سے انکار کر دے، وہ بھی میڈیکل سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں جبکہ پلاسٹک سرجری سے بہت سے عیوب کو چھپایا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ محبت یا عقیدت اندھی ہوتی ہے اور وہ دل سے کی جاتی ہے مگر اس فلم میں دل تو ملتے ہی نہیں اور محبت کی بنیاد آنکھ، کان، عقل اور بدن کی عریانی پر رکھی گئی ہے۔ کسی عاشق کا دل تو موم کی طرح ہوتا ہے جو ذرا سی حرارت پر پگھل جاتا ہے۔ اس فلم میں روپا ایک ستم رسیدہ معصوم، بیکس اور زمانے کی ٹھکرائی ہوئی ہوتی ہے جب وہ بیوی بن کر راجو کے گھر آتی ہے تو ہیرو صاحب اسی ایک رخی بدصورتی کا بہانہ بنا کر اس کے ساتھ ہٹلر جیسا برتاؤ کرتے ہیں اور اس کی ایک التجا بھی سننے کو تیار نہیں ہوتے۔ ان غیر حقیقت پسندانہ واقعات سے ہٹ کر بھی فلم میں چھوٹی بڑی کئی غلطیاں ملتی ہیں جن کی راجکپور جیسے عظیم ہدایت کار سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ جیسے راجو اپنی بدصورت بیوی کو ٹھکرا کر گھر سے نکل جاتا ہے اس کے بدن پر اس وقت اجلا سفید اور بے داغ سوٹ ہوتا ہے۔ گھر سے نکل کر وہ مجنوں کی طرح تڑپتا ہے، گرتا ہے، اٹھتا ہے زمین پر لوٹتا ہے اور آخر کار جھرنے کے قریب جا کر (جہاں کی مٹی یقیناً نم ہوگی) زمین پر سو جاتا ہے جہاں سے لوگ اٹھا کر اسے واپس گھر لے آتے ہیں لیکن کیا مجال کہ اس کے اجلے سوٹ پر ایک دھبہ بھی نظر آئے۔ فلم کا سارا ماحول مذہبی بنا دیا گیا ہے 'مندر' بھجن، سنسکرت کے شلوک وغیرہ سے پھر اس فلم کو آسانی سے کسی دھارمک فلم میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس ماحول میں ڈیم کے افتتاح پر دیہاتی لڑکیوں کا شستہ اردو میں گایا ہوا تہنیتی گیت قطعی بے تکا معلوم ہوتا ہے گاؤں کی گدرائی ہوئی لڑکیوں کا راجو پر منڈلاتے رہنا اور موقع ملنے پر اس کو دعوت عیش دینا یقیناً لیے ہو گیا ہے۔

راج کپور کی فلموں کی خصوصیات میں موسیقی بھی شامل ہے اس کی پچھلی فلموں میں شنکر جے کشن کی مقبول و معروف جوڑی نے موسیقی کے فن کو معراج تک پہنچا

دیا تھا۔ اس جوڑی کے ٹوٹنے کے بعد لکشمی کانت پیارے لال اس ادارے سے وابستہ ہوئے اور فلم "بابی" میں ان کے سارے ہی گیت ہٹ ثابت ہوئے۔

ستیم، شیوم، سندرم کی موسیقی کے بارے میں انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ یہ ان کے کیریر کی بہترین موسیقی ثابت ہوگی۔ مگر یہ بات ایک گپ ثابت ہوئی۔ سوائے ایک ٹائیٹل گیت کے جو "شاستریہ سنگیت پر آدھارک" ہے دوسرا کوئی گیت شائد ہی مقبول ہو سکے۔ نیتن مکیش کے گلے ایک گانے میں کچھ موسیقیت ضرور ہے لیکن اس میں سنسکرت آمیز الفاظ جیسے شتیں، کومل، نرمل وغیرہ کی بھرمار نے گیت کو بوجھل بنا دیا ہے۔ فلم کے ایک دوگانے میں نیتن مکیش کی آواز کو شامل کیا گیا ہے اس سے راج کپور کی آنجہانی مکیش سے دیرینہ وابستگی خلوص یا خراج عقیدت کا اظہار تو ہو سکتا ہے لیکن دنیائے موسیقی کے لئے یہ کوئی خاص تحفہ نہیں ہے۔

ستیم شیوم سندرم کی اچھی خصوصیات میں عکاسی، آرٹ، ایڈیٹنگ اور زینت امان کی لاجواب اداکاری شامل ہیں کیمرہ مین علاؤالدین نے ناگرجونا ساگر کے دلکش مناظر کے علاوہ سیلاب کے مناظر بھی بڑی عمدگی سے فلمائے ہیں۔ فلم کی ایڈیٹنگ میں راجکپور نے اپنی دیرینہ مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے فلم کے بعض حصوں کو حسین سے حسین تر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ مکیش کے گانے کے پس منظر میں جو خوبصورت مناظر پیش کئے گئے ہیں ان کی دلکشی اور رنگینی تماشائیوں کے ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہے۔ ان خوبصورت سٹس کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ راج کپور نے کس طرح بے دریغ روپیہ صرف کیا ہے اور آرٹ ڈائرکٹر نے کتنی محنت کی ہے

زینت امان نے اس فلم میں جہاں عریاں فنکاری یا فنکارانہ عریانی پیش کی ہے وہیں اداکاری کی بے پناہ صلاحیتوں کا مظاہرہ بھی کیا ہے بہرحال راجکپور کی اس فلم کو فلاپ ہونے سے جو چیز بچا سکتی ہے وہ خوب صورت مناظر کے پس منظر میں نیم عریاں زینت امان کی معیاری اداکاری ہے۔

مجموعی اعتبار سے فلم ستیم، شیوم، سندرم میں صرف "سندرم" ہی موجود ہے اور "ستیم اور شیوم" دونوں اسی "سندرم" میں گم ہو چکے ہیں

دورِ حاضر کے نوجوانوں سے ایک پرزور اپیل

اسکولوں اور کالجوں کے طلباء وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیں سبزہ زار ہیں اور لہلہاتے درخت خدا کی نعمت ہیں

بغیر کسی خرچ کے اپنے اسکولوں اور کالجوں کے احاطوں کو سرسبز و شاداب اور خوش گوار و فرحت بخش بنائیے ۔

درخت لگانے کا موسم شروع ہو چکا ہے
ہمہ اقسام کے پودے اور مشورہ بالکل مفت

درج ذیل دفاتر سے ربط پیدا کیجئے

دونوں شہروں میں

ڈیویژنل فارسٹ آفیسر
ایکسٹنشن ڈیویژن
حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۴
فون نمبر ۷۰۵۴۱ (ایکسٹنشن ۴۵)

اضلاع میں

ضلع مستقر پر واقع
ڈیویژنل فارسٹ آفیسر

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

NO-16/78-79

LETTER NO. 992/ADVT/C4/78 DATED 14-4078

THE ANDHRA PRADESH STATE CO-OPERATIVE BANK LTD., HYDERABAD

(A SCHEDULED BANK)

r Bank Helps the Farmers of Andhra Pradesh by financing their short-ter
uirements for agricultural operations and by providing Medium term loan
Dairy, Poultry, Piggery, Sheep Rearing etc through District Co-operativ
ntral Bank and Village Agricultural Societies. Our APCOB extends all ou
pport to Weavers, the Weaker sections of the society by providing cash cred
ommodation to Weavers Societies through the Cooperative Central Bank an
to APCO direct.

r Bank is also arranging Finance for Small Scale, Village and Cottage Indu
s. Our Bank Offers attractive rate of interest on deposits and provides a
dern banking facilities. Our Bank has also various types of Deposit Accou
lucrative rates of interest for the discerning investing public.

e Bank also provides Safe Deposit Locker facilities at reasonable rate.

FOR ALL YOUR BANKING NEEDS
CONTACT
OUR HEAD OFFICE AND BRANCHES

Head Office :
TROOP BAZAR Post Box No. 142
Tel 44481 Hyderabad-500001

BRANCHES AT

Vidyanagar Tel. 61492
Narayanaguda Tel. 43209
Malakpet Tel. 51983
Secunderabad Tel. 72172
Vidyuth Soudha Tel. 220378
6) Saidabad Colony Tel. 592
7) Bondhnagar Tel. 740
8) Himayatnagar Tel. 2228
9) Tarnaka Tel. 713
10) Tirupati Tel. 292

K. Muralidhara Rao, I.A.S.,
Managing Director

SYED HASHIM ALI, I.A.
Chairman

SEPTEMBER

1978

Price : 1-25

[illegible]

[illegible]

ترتیب

جلد ۲ چودھواں سال

اردو کا کثیر الاشاعت علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

پونم

حیدرآباد

ایڈیٹر :
ناصر کرنولی (ایم اے عثمانیہ)

ستمبر ۱۹۶۸ء

شمارہ (۹)

جلد (۱۴)

قیمت فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

زر سالانہ ۱۵ روپے

لائبریریز کے لئے : زر سالانہ ۲۰ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :
منیجر ، ماہنامہ پونم
16-7-300/1
اعظم پورہ، حیدرآباد ۲۴...۵

مطبع :
دانش پرنٹنگ پریس
چھتہ بازار حیدرآباد

نئے دور کی دہلیز پر

ہمارے ملک سے غربت کے خاتمے کا بڑی حد تک مطلب یہ ہے کہ دیہی عوام خصوصیت کے ساتھ بے زمین مزدوروں، چھوٹے اور مارجینل کسانوں وغیرہ کے حالات کو بہتر بنایا جائے۔ چنانچہ انھیں دی جانے والی کوئی بھی امداد ہماری معیشت کو بنیادی سطح پر مضبوط بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

اس وسیع تر پس منظر میں ریاستی حکومت نے ایسے چھوٹے کسانوں کو جن کے پاس ڈھائی ایکڑ تری اور ۵ ایکڑ خشکی سے زیادہ اراضی نہیں ہے محصول مالگزاری کی ادائی سے مستثنیٰ قرار دیا ہے البتہ اس استثنا میں محصول آب کی ادائی شامل نہیں ہے۔

اس جدید اور جرائت مندانہ اقدام کا مقصد ان چھوٹے کسانوں اور بے زمینوں کی اعانت کرنا ہے جنھیں حال ہی میں سرکاری زمینات حوالے کی گئی ہیں۔..... آج آندھرا پردیش میں چھوٹا کسان ایک "نئے دور کی دہلیز پر" ہے۔

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

LETTER NO : 2075 / ADVT/C4/78 dt. 7-9-78 17/78-79

پروفیسر حبیب الرحمن معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھراپردیش سے
مسٹر ناصر کرنولی ایڈیٹر "پونم" کا خصوصی انٹرویو

س :۔ کیا اردو تعلیمی فنڈ کا قیام عارضی نوعیت کا حامل ہے یا اس کو مستقل حیثیت دیجائے گی؟

ج :۔ اردو تعلیمی فنڈ ایک مستقل ادارے کی حیثیت سے قائم کیا گیا ہے چنانچہ تحت قانون اس کی باضابطہ رجسٹری بھی کرائی گئی ہے۔

س :۔ اردو تعلیمی ٹرسٹ کے تحت جو مثالی (ماڈل) مدرسوں کا قیام عمل میں آرہا ہے آیا کہ وہ حیدرآباد کی حد تک محدود ہے یا اضلاع میں بھی اسی طرح کے مدارس قائم کئے جائیں گے؟

ج :۔ سردست صرف شہر حیدرآباد سے آغاز کیا گیا ہے لیکن جیسے جیسے مالیہ اجازت دے گا اور کام کرنے والے ملتے جائیں گے اضلاع میں بھی ماڈل اسکول یا مثالی مدرسے قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

س :۔ آندھراپردیش میں انگریزی تلگو اور اردو تینوں زبانوں کی پوزیشن مختلف ہے ایسی صورت میں کیا تینوں زبانوں کی تعلیم یکساں سطح پر ہوگی یا اردو زبان ہی پر زیادہ توجہ دیجائے گی؟

ج :۔ ان مدرسوں میں اردو زبان ذریعۂ تعلیم ہوگی لیکن ساتھ تلگو اور انگریزی زبانیں بھی سکھائی جائیں گی اور ان کی طرف خاص توجہ دی جائے گی۔

س :۔ مشن اسکولوں کی طرح کیا اردو کے مثالی مدارس کا کورس بھی حکومت کے مسلمہ کورس سے علیحدہ رہے گا۔ اور اس خصوص میں کیا انجمن ترقی اردو طلبا کے معیار اور مزاج کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے اپنے کورس کی کتابیں خود ہی مرتب کرے گی۔

ج :۔ کورس یعنی نصاب تعلیم حتی الوسع وہی رہے گا جو حکومت کا مسلمہ ہے۔ اگر خاص ضرورت محسوس کی گئی تو کچھ کتابیں اپنے ڈھب کی بھی تیار کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ مالیہ اس کی اجازت دے۔ تاہم اس مسئلے کا قطعی تصفیہ آئندہ کسی مناسب موقعہ پر کیا جائے گا۔

س :۔ اردو دوستوں سے ہٹ کر کیا انجمن حکومت اور اردو اکیڈیمیوں سے بھی اردو تعلیمی فنڈ کے لئے گرانٹ طلب کرے گی؟

ج :۔ حکومت سے امداد لینے کا ارادہ نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں انتظامیہ کے اختیارات محدود ہوجاتے ہیں اردو اکیڈیمیاں اگر کچھ مدد کریں تو وہ قبول کی جاسکتی ہے مگر اس شرط پر کہ انتظامات میں مداخلت نہ ہو۔

س : کیا اردو تعلیمی فنڈ انکم ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ رہے گا؟

ج : اردو تعلیمی فنڈ کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ کرانے کے لیے کارروائی کی جارہی ہے

س : انجمن کے تحت جو کوچنگ سنٹر قائم کئے گئے ہیں وہ انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کی حد تک ہے۔ کیا انجمن اسی طرح کے کوچنگ سنٹر دیگر امتحانات اور مسابقتی امتحانات کے تعلق سے بھی قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے کیونکہ اردو میڈیم کے طلباء کا معیار انگریزی میڈیم کے طلباء کے مقابلے میں کم ہوتا ہے جس کی وجہ سے اکثر مسابقتی امتحانات میں وہ کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اور کوچنگ سنٹر قائم کئے جائیں تو ان کا ذریعۂ تعلیم کیا ہوگا؟ کیونکہ تمام مسابقتی

یا تو انگریزی میں پڑھتے ہیں یا دیگر علاقائی زبانوں میں اور بد قسمتی سے اُردو کو کسی ریاست میں علاقائی زبان کا درجہ حاصل نہیں ہے ؟

ج : کوچنگ سنٹر سر دست صرف سال حال کے انٹرمیڈیٹ امتحان کے اُن ناکام طلباء کے لئے قائم کیا گیا ہے جو سپلمنٹری امتحان میں شریک ہونے والے ہیں۔ دیگر امتحانات یا مسابقتی امتحانات کے تعلق سے اس مسئلے پر ابھی غور نہیں کیا گیا۔ اس لیے اس نوبت پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا ذریعہ تعلیم کیا ہوگا۔

س : اُردو تعلیمی فنڈ کے قیام کا انجمن تحفظ اُردو، ساؤتھ انڈیا، اُردو اکیڈیمی اور دیگر انجمنوں نے نہ صرف خیر مقدم کیا ہے بلکہ اس سلسلے میں عملی تعاون کی بھی کوشش کی جا رہی ہے جو یقیناً مستحسن اقدام ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ اسی طرح کی مشترکہ کوشش آندھرا پردیش میں اُردو زبان کے حقوق کو منوانے کے تعلق سے بھی کی جائے تاکہ اُردو تحریک موثر و متحدہ انداز میں آگے بڑھ سکے۔

ج : انجمن تحفظ اُردو اور ساؤتھ انڈیا یا اُردو اکیڈیمی نے اُردو تعلیمی ٹرسٹ کی جو تائید کی ہے، اُس کے لئے ہم اُن کے شکر گذار ہیں۔ اُردو زبان کے حقوق منوانے کے لئے متحدہ اور مشترکہ کوششیں کرنا یقیناً زیادہ موثر اقدام ہوگا۔

س : دیگر ریاستوں میں بھی اگر اُردو تعلیمی فنڈ قائم کیے جائیں تو اُردو تعلیم کے حق میں نیک شگون ثابت ہوگا کیونکہ کم و بیش ہر ریاست میں اُردو تعلیم کا معیار انتہائی پست ہے۔ کیا مرکزی انجمن ترقی اُردو کی نگرانی میں ریاستی سطح پر اُردو تعلیمی فنڈ کا قیام مناسب رہے گا؟

ج : دوسری ریاستوں میں بھی اگر اُردو تعلیمی فنڈ قائم ہوں تو یقیناً وہ ایک نیک شگون ہوگا۔ مگر اُن پر مرکزی انجمن ترقی اُردو کی نگرانی قائم کرنے سے پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

س : اُردو بولنے والوں کا دائرہ بے حد محدود ہے۔ اُردو میڈیم کے مدارس اور کالجس بھی قابل لحاظ نہیں ہیں۔ اُردو کے حقوق کو آئینی تحفظ بھی حاصل نہیں ہے۔ ان حالات میں اُردو یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کہاں تک حق بجانب ہو سکتا ہے؟

ج : ایک علیحدہ اُردو یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے حالات ابھی سازگار نہیں ہیں۔ اس لیے سر دست ایسا مطالبہ کرنا مناسب نہ ہوگا بالفعل تو اُردو مدارس اور اُردو کالجوں کو مضبوط بنانے کی طرف ہماری ساری توجہ مرکوز ہونی چاہیئے۔

س : اُردو تحریک کو موثر بنانے کے لئے سیاسی سطح پر بھی انجمن احتجاج کی ضرورت ہے کیا اس سلسلے میں انجمن مختلف سیاسی جماعتوں کا تعاون حاصل کرے گی؟

ج : اُردو تحریک کو ملکی یا ریاستی سیاست سے علیحدہ رکھنا بہت ضروری ہے ورنہ اس میں سخت اُلجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ اُردو کا تو المیہ ہی یہ ہے کہ خود غرض اصحاب نے اس کو سیاسی رنگ دے دیا۔ حالانکہ وہ ایک قومی مسئلہ ہے انجمن کی پالیسی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ اُردو کے جائز حقوق کے لئے تمام لوگوں کی تائید حاصل کی جائے خواہ اُن کا تعلق کسی بھی سیاسی پارٹی سے ہو۔

س : آندھرا پردیش کے چیف منسٹروں نے ماضی میں اُردو زبان کے تعلق سے جو اعلانات کئے تھے وہ یقیناً حوصلہ افزاء ہے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان اہم اعلانات کو عملی شکل ہنوز نہیں دی جا سکی۔ اب جبکہ ڈاکٹر چنا ریڈی صاحب ریاست کے چیف منسٹر ہیں جو نہ صرف اُردو کے پرستار ہیں بلکہ ان کی تعلیم بھی اُردو میڈیم ہی کے ذریعے ہوئی ہے مجھے قوی امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب بعجلت ممکنہ ایسے اقدامات ضرور کریں گے جن سے اُردو زبان کے دیرینہ اور جائز مطالبات پورے ہوں ...... بقیہ صفحہ ۲ پر

ڈاکٹر صغرا خانم

نفسیات ۔ ادب اور آرٹ

جرمنی کے شہرۂ آفاق مفکر "یونگ" کا نقطۂ نظر

(ڈاکٹر صغرا خانم کی زیر طبع تحقیقی کتاب "یونگ کا نظریۂ نماٹپ ۔ اس کے فلسفیانہ مضمرات اور اس کا انطباق اردو کے چند کلاسیکی شعراء پر" کا ایک باب ۔)

ابتدا ہی سے آدمی کی نگاہ و فکر خارجی عالم کی طرف زیادہ تر رہی ہے ۔ اسی لیے وہ علوم جن کا تعلق خارجی دنیا سے ہے بڑی تیزی سے نشوونما پاتے رہے ۔ طبعیات، کیمیا اور علم نجوم نے غیر معمولی ترقی کرلی ۔ چنانچہ مغرب کے پہلے فلسفی نے بھی اصل حقیقت (ULTIMATE REALITY) کو خارج[1] ہی میں دیکھا اور اسی راز کی دریافت میں کوشاں رہا ۔ رفتہ رفتہ آدمی کی نگاہ خود اپنی ذات کی طرف لوٹی ۔ اور پھر اس نے اپنے متعلق سوچنا شروع کردیا کہ میں کیا ہوں ؟ میری تمنائیں اور خواہشات کیوں ہیں، ان کا مقصد کیا ہے ؟ گو یہ سچ ہے کہ نفسیات کی ابتدا ارسطو کی کتاب "DEANIMA" سے ہوتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ارسطو پر اور اس کے بعد قرون وسطیٰ میں متکلمین کے افکار پر ایک مابعد الطبیعاتی رنگ غالب رہا ۔ صرف انیسویں صدی میں نفسیات نے حقیقی معنوں میں ایک مستقل علم کی صورت اختیار کی ۔ لیکن بدقسمتی سے یہ جدید مفکرین بھی کسی نہ کسی فلسفیانہ مذہب خیال کے حامی رہے ۔ اور انہی بنیادوں پر نفسیات کی تشکیل ہوتی رہی ۔ اسی لیے نفسیات کو فلسفے ہی کا جزو سمجھا جاتا رہا ۔ ذہن انسانی کو صرف تصورات ہی میں تحویل کردیا گیا اور ان تصورات کے میکانکی تعلقات سے ذہن انسانی کو ترتیب دیا گیا ۔ انگلستان میں "تلازمی نفسیات" ASSOCIATIONIST PSYCHOLOGY ان ہی بنیادوں پر قائم ہوئی ۔ یہ سمجھا گیا کہ کچھ قوانین ایسے ہیں جن کے ذریعے ایک تصور دوسرے سے رشتہ جوڑتا ہے نفسیات کی تاریخ میں سب سے بڑا انقلاب اس وقت آیا جب یہ معلوم ہوا کہ بعض بیماریاں نہ صرف یہ کہ ذہنی ہوتی ہیں بلکہ ان کے محرکات بھی ذہنی ہوتے ہیں اسی لیے فرائیڈ کو تاریخ نفسیات میں بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ فرائیڈ نے اکثر جگہ حکیمانہ احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا اور مفروضات میں اتنی دور نکل گیا کہ ان کی جانچ ہی مشکل ہوگئی لیکن اس نے ہمارے لاشعور کو ثابت کرکے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے ۔ اس نے بتایا کہ ہمارا ذہن کتنا پیچیدہ اور وسیع ہے جس کو ہم اپنی شعوری زندگی کہتے ہیں ۔ وہ اس لاشعوری زندگی کے مقابل کتنی ہیچ ہے ۔

یہاں سے نفسیات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے ۔ اور اب یہ کوشش عام ہوگئی کہ نفسیات کو بھی دوسرے بہت علوم کی طرح بالکل تجرباتی بنا دیا جائے ۔ اس نیک کام کے لیے جرمنی کے مشہور شہر لائپزگ (LEIPZIG) میں ونٹ نے سب سے پہلا معمل قائم کیا ۔ اب تو نفسیات کی ترقی کے لئے نئی راہیں کھل گئیں ۔ فلسفیانہ موشگافیوں سے نجات ملی ۔ زندگی کے ٹھوس اور مادی پہلو اس کا موضوع بن گئے ۔ اسی روشن زمانے میں ایک فرانسیسی ماہر نفسیات نے ذہانت کی پیمائش کے اصولی طریقوں سے لوگوں

---

[1] مغرب کا پہلا مفکر تالیس (THALES) ہے ۔ اس نے پانی کو اصل حقیقت قرار دیا ۔

کو روشناس کرایا۔ بینے (BINET) نے تمام بچوں کے لیے نیا ٹیسٹ ہے۔ اس نے ذہین اور غبی بچوں کی ذہنوں کی پیمائش کے طریقے بتائے۔ ان کی علیحدہ تعلیم و تربیت پر زور دیا۔ پھر بچپن ہی سے ان کی کسی خاص میدان میں دلچسپی کی بنا پر راستے الگ الگ بتائے جس کی وجہ سے صحیح اور موزوں پیشے کے انتخاب میں بڑی آسانیاں پیدا ہو گئیں۔

اس کے باوجود یہ زمانہ علم نفسیات کے لئے عہد طفولیت ہی ہے۔ کیونکہ ابھی تک طبعیات کی طرح ٹھوس قوانین اور نتائج حاصل نہ ہو سکے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ نفسی اعمال پر اتنی آسانی سے تجربے نہیں ہو سکتے جتنے کہ طبعی واقعات پر۔

لیکن ہمارے لیے باعث دلچسپی نفسیات کا ادب پر اطلاق ہے۔ نفسیات چونکہ نفسی اعمال کا علم ہے اس لیے اس سے ادب کے مطالعے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ نفسِ انسانی تمام علوم و فنون کا سرچشمہ ہے اس لیے آرٹ کی اعلیٰ تخلیقات کی اس سے توضیح ممکن ہے۔

جب نفسیاتِ تحلیل نے یہ واضح کر دیا کہ لاشعور ہمارے لیے ایک اٹل حقیقت ہے اور ہماری ساری شعوری زندگی کا تعین اسی سے ہوتا ہے تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا کہ آرٹ کی تخلیق میں لاشعور کا کیا حصہ ہے؟ فرائیڈ نے بعض ادبی شاہکاروں کی اسی نقطۂ نظر سے توجیہہ کی۔ یعنی کسی فنی تخلیق کے پیچھے فن کار کی محبت کا ایسا تجربہ پوشیدہ ہوتا ہے جو اخلاقی اور جمالیاتی حیثیت سے اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتا یا اس کے شعوری تصورات کے متضاد ہے۔ فن کار اس تمنا کو دبا دینے (REPRESS) کی کوشش کرتا ہے یا کم از کم ناقابلِ شناخت بنانا چاہتا ہے۔ تخیلات کا ایک نظام کھڑا کر دیتا ہے تاکہ حقیقت افسانے کے پیچھے چھپ جائے۔ یہ کوشش بجائے خود غیر تشفی بخش ہوتی ہے۔ ان سب کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ ناقابلِ قبول تجربے کی قائم مقام ہوتی ہیں تو دوسری طرف اس کو چھپانے میں بھی مدد دیتی ہیں یعنی اس طرح سے ہمارا سارا آرٹ شاعری اور ادب کے تمام شاہکار، فن کار کے دبے ہوئے جذبات و خواہشات کا اظہار ہیں۔ فن کار کی شخصیت اس کے فن سے کھل جاتی ہے یعنی قنوطی شاعری سے شاعر کی حرماں نصیبی اور رجائی اور طربیہ شاعری سے شاعر کی خوشحال اور کامیاب زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس طرح ایک ماہر طبقات الارض قدیم آثار اور ہڈیوں (FOSSILS) کو دیکھ کر تاریخ اور زندگی کا پتہ لگا لیتا ہے، اسی طرح فن کو دیکھ کر فن کار کی زندگی کے سارے مسائل عیاں ہو جاتے ہیں۔ گویا آرٹ ایک اقرار (CONFESSION) ہے ۔۔

کھلی کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس نقطۂ نظر کو نفسیاتی حیثیت سے بالکل موضوعی قرار دیا جا سکتا ہے۔

یونگ کا نقطۂ نظر آرٹ اور ادب کے بارے میں

فرائیڈ کے ہم خیال تمام ماہرین نفسیات آرٹ کے تمام شاہکاروں کو علم الامراض ہی کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ اور اسی لیے فنی تخلیق کو شخصی عناصر میں تحویل کر دیتے ہیں۔ یونگ کے خیال میں یہ آرٹ کی تخلیق پر توجہ کرنی پڑے گی یا فن کار پہ۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے فن کار کے ادراک (VISION) میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے۔ وہ دراصل اجتماعی لاشعور سے متعلق ہے جو ایک خاص قسم کے نفسی رجحان کو ظاہر کرتا ہے ---

----

------------------ اس کا تعلق توارث سے ہوتا ہے۔ ہمارا شعور اسی لاشعور کا رہینِ منت ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب ہماری جسمانی ساخت میں ارتقاء کے ابتدائی مدارج ملتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہماری نفسی زندگی ان ابتدائی نشانات کی حامل نہ ہو۔ یہ ابتدائی

یا نیم حالت ہمارے شعور میں اس وقت داخل ہوتی ہے جب شعور پر ایک دھندلی سی کیفیت طاری رہتی ہے۔ مثلاً حالتِ خواب، نشہ یا جنون کی حالت، کسی قوم کی کبھی دیومالا کو اس کی شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے جن کے پُرانے موضوعات ادب میں ایک خاص دل نشیں کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ لاشعوری مظاہر شعور کے لیے "تلافی" کا کام انجام دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں شعور کی یک طرفہ غیر معمولی حالت کو متوازن کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے خواب اس کی بین مثال ہیں۔ بڑی شاعری ہو کہ اُونچا ادب، انسانی زندگی سے عبارت ہوتا ہے۔ اگر ہم اس کو شخصی عوامل (PERSONAL FACTORS) کا تابع کر دیں تو پھر آرٹ ذات اور درد کا اظہار ہو کر رہ جائے گا۔ اور دوسروں کی نظر میں نہ اس کی کوئی اہمیت رہے گی نہ قدر و قیمت۔ جس وقت اجتماعی لاشعور ایک زندہ تجربہ بن جاتا ہے اور زمانے کے شعوری تصورات پر اثر انداز ہوتا ہے تو اس کی اہمیت اور کشش آفاقی ہو جاتی ہے۔ ہمارے انسانوں کے لیے وہ ایک زندۂ جاوید تخلیق ہوتی ہے اور برسوں بعد لوگ اس پر سر دھنتے ہیں۔ فاؤسٹ ہر جرمن کی روح کو اب تک تڑپاتا ہے۔ ہر دور اپنا ایک خاص تعصب رکھتا ہے کیونکہ اس کی حیثیت ایک فرد کی سی ہوتی ہے اس کے تصورات اور اقدار کے اپنے کچھ حدود بھی ہوتے ہیں اسی لیے اس کو "تلافی" کی بھی ضرورت پیش آتی ہے — (COMPENSATORY ADJUSTMENT) اور یہ "تلافی" اجتماعی لاشعور کے واسطے سے ہی ممکن ہے۔

یونگ کی نظر میں آرٹ اس وقت تکمیل کو پہنچتا ہے جب شخصی زندگی کی حدود عبور ہو جاتی ہیں۔ اور فن کار انسانیت کے قلب کا ترجمان بن جاتا ہے۔ آرٹ میں شخصی پہلو حدود کو ظاہر کرتا ہے اور آرٹ کی دنیا میں یہ گناہِ عظیم ہے اگر آرٹ بالکل شخصی بن جائے تو اس کا مستحق ہے کہ اسے عصبی (NEUROSIS) امراض کے ساتھ رکھ دیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس جگہ فرائیڈ کا خیال صحیح ہو کہ سارے فن کار عصبی مریض (NEUROTICS) ہوتے ہیں اس سے یہ مراد ہے کہ شخصیتیں چونکہ غیر ترقی یافتہ ہوتی ہیں اس لیے ان میں طفلانہ (INFANTILE) خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ لیکن فرائیڈ کا یہ دعویٰ فن کار پر بہ حیثیت ایک شخص کے صادق آتا ہے، اس کا تعلق فن کار سے بہ حیثیت فن کار کے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس مقام پر فرد بالکل معروضی اور غیر شخصی بن جاتا ہے۔ یعنی فن کار کی حیثیت سے وہ خود فن ہے آدمی نہیں۔ ہر تخلیقی شخصیت ایک ثنویت رکھتی ہے ایک طرف تو وہ آدمی ہے جس کی شخصی زندگی ہے تو دوسری طرف وہ ایک غیر شخصی تخلیقی عمل ہے۔ بہ حیثیت آدمی کے وہ توانا بھی ہو سکتا ہے اور مریض بھی۔ اس کا فن صرف فنی تخلیق ہی سمجھا جائے گا۔ اگر کسی انگریز جنٹلمین کو یا جرمن سپاہی کے طریقِ زندگی کو شخصی عناصر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ہماری سخت غلطی ہوگی۔ ان کی زندگی میں ذاتی عنصر کے مقابلے میں اجتماعی نفسی عنصر کا پلہ بھاری ہوتا ہے۔ آرٹ ایک جبلّی رجحان ہے جب وہ آدمی پر تسلط جما لیتا ہے تو پھر وہ اس کو ایک آلے کے طور پر استعمال کرتا ہے اس کام کو مکمل کرنے کے لئے فرد کو بعض وقت اپنی ذاتی خوشی اور مسرت کا بلیدان بھی دینا پڑتا ہے۔ فن کار کی زندگی کشمکش کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ اس میں دو قوتیں برسرِ پیکار ہوتی ہیں۔ ایک طرف مسرت کی انسانی خواہش تو دوسری طرف تخلیق کا بے پناہ جذبہ، جس کی خاطر اسے اپنی شخصی خواہشات کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے فن کار کی زندگی بڑی غیر تشفی بخش ہے اسے ایک طرح کا تجربہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ایسے انسانی شخصی پہلو کو پستی کا احساس ہوتا ہے اور اسے دور کرنے کے لیے وہ اپنے ماضی کا غیر شعوری دامن تھام لیتا ہے۔ وہ اپنی تخیل میں ایک رہبر یا رہنما کو کھڑا کر جو "خضرِ راہ" کا کام دیتا ہے اور اقبال نے بھی اسی [illegible]

(…) کا … کی ابتدا
سے آج تک کے شعور میں ایک علم انسانیت
ایک مردِ دانا اور نجات دہندہ کا تصور
خفتہ ہے (آرکی ٹائپ) اور یہ اس
وقت بیدار ہوتا ہے جب زمانہ انتشار
کے طوفان میں بہا جا رہا ہو اور افراد گمراہ
ہوتے ہوں ایسے وقت میں ایک طبیب
اور رہبر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ
فرض فن کار انجام دیتا ہے اور اپنے فن سے
اس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ یہ ہے کیا
آرٹ اور آرٹسٹ۔

چنانچہ یہی آرٹ ہمارے سامنے باعث
کشش ہوگا جس میں آفاقی اقدار ہوں
اس میں تاریخ سے زیادہ اشاریت
ہوگی۔ اس لیے ہم کسی تاریخی واقعے سے اتنا
متاثر یا دلگیر نہیں ہوتے جتنا کہ ایک
فنی تخلیق سے۔ بہادر شاہ ظفر کی …
اور دردناک موت تاریخی حیثیت سے
اتنا متاثر نہیں جتنی تاثیر کہ اس کے
شعر میں ملتی ہے ؎

ہے کتنا بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

کیونکہ اس شعر کو پڑھ کر ظفر کے فراق
… بحث کر … ایک
… احساس ہوتا ہے۔ …
[illegible]
[illegible]

فیض کے دو تازہ شعر

۲۸ اگست کی شام تھی، اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جانب سے فیض احمد فیض کی خیر مقدمی تقریب کے بعد، فیض کے ساتھ چند گھنٹے، بہت دلچسپ صحبت رہی جس میں صرف چند احباب شریک تھے۔ اس صحبت کے اختتام پر فیض نے یہ دو شعر سنائے، یہ کہتے ہوئے کہ دو نئے شعر سن لیجئے — میں ان اشعار کو پونم کے قارئین کی نذر کر رہا ہوں — (اختر حسن)

ہزار درد شب آرزو کی راہ میں ہیں
کوئی ٹھکانا بتاؤ کہ قافلہ اترے
قریب اور بھی آؤ کہ شوقِ دید مٹے
شراب اور پلاؤ کہ کچھ نشہ اترے

شاذ تمکنت

غزل

چشم پُرآب میں کچھ یوں ترا پیکر اترے — جس طرح چاند سمندر میں کھلے سر اترے
زخم کی طرح یہ سناٹا ابھر دیتا ہے — کوئی بولے کسی آواز کا نشتر اترے
مدتیں گذریں تجھے کھو بھی چکے رو بھی چکے — لیکن اک بوجھ سا دل پہ ہے یہ کیونکر اترے
میں تو بس کانپ کے رہ جاتا ہوں جانے کیا ہو — گر یہی آیت غم کوہ گراں پر اترے
وہ نہ دیکھیں نہ سہی ہم تو نظر رکھتے ہیں — کہ ہر اک دوست کے ساغر میں برابر اترے
اس طرح اب کے ترے جی سے اتر جاؤں گا — جس طرح ترے بدن سے ترا زیور اترے

شاذ اس دور کے صحرا میں یوں شعر کہے ہیں کوئی
جیسے امت ہی نہ ہو اور پیمبر اترے

آخری شعری نشست

[۲۴۔اپریل ۱۹۷۸ء کو شعبۂ اُردو کے زیرِ اہتمام اقبال سیمنار کے موقع پر بعد مغرب آرٹس فیکلٹی کے لاؤنج میں ہونے والی شعری نشست خلیل صاحب کی زندگی کی آخری نشست تھی۔ اس نشست میں سامعین کے اصرار پر مرحوم نے یکے بعد دیگرے تین غزلیں سنائی تھیں، جو ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔] (ادارہ)

ہم بانسری پہ موت کی گاتے رہے نغمہ ترا
اے زندگی، اے زندگی رتبہ رہے بالا ترا

اپنا مقدر تھا یہی اے منبعِ آسودگی
بس تشنگی، بس تشنگی، گو پاس تھا دریا ترا

اِس گام سے اُس گام تک زنجیرِ غم کے فاصلے
منزل تو کیا ہم کو ملے، چلتا رہے رستہ ترا

تو کون تھا، کیا نام تھا، تجھ سے ہمیں کیا کام تھا
ہے پردۂ دل پہ ابھی دُھندلا سا اک چہرہ ترا

اک ایک کرکے بجھ گئی سینے میں جتنی آگ تھی
اب اے چراغِ آگہی زندہ رہے شعلہ ترا

سورج ہے گو نامہرباں ہے سر پہ نیلا آسماں
اے آسماں، اے آسماں، دائم رہے سایہ ترا

راستہ پُرپیچ ہے اور ہمسفر کوئی نہیں
سب مرے ہم شکل ہیں، مجھ سا مگر کوئی نہیں

ایک پرچھائیں نہ جانے کب سے اپنے ساتھ ہے
جسم اس کے سیکڑوں ہیں اور سر کوئی نہیں

اس جہاں میں میرے ہونے کی گواہی کون دے
اک ہجوم اور اس میں چشمِ معتبر کوئی نہیں

شہر کی سڑکوں پہ آخر کس نے جادو کر دیا
سائے ہی سائے یہاں ہیں اور شجر کوئی نہیں

اپنے حصہ میں رہا بس خود کلامی کا عذاب
اس جہاں سے اُس جہاں کا نامہ بر کوئی نہیں

آ مری ویران آنکھوں میں سدا آباد رہ
اے مرے خوابِ جواں، تیرا نگر کوئی نہیں

اس پر بھی دشمنوں کا کہیں سایہ پڑ گیا
غم سا پرانا دوست بھی آخر بچھڑ گیا

جی چاہتا تو بیٹھتے یادوں کی چھاؤں میں
ایسا گھنا درخت بھی جڑ سے اُکھڑ گیا

غیروں نے مجھ کو دفن کیا شاہ راہ پر
میں کیوں نہ اپنی خاک میں غیرت سے گڑ گیا

خلوت میں جس کی نرم مزاجی تھی بے مثال
محفل میں بے سبب وہی مجھ سے اکڑ گیا

بس اتنی بات تھی کہ عیادت کو آئے لوگ
دل کے ہر ایک زخم کا ٹانکا اُدھڑ گیا

کس کس کو اپنے خونِ جگر کا حساب دوں
اک قطرہ بچ رہا تھا، سو وہ بھی نبڑ گیا

یاروں نے جا کے خوب زمانے سے صلح کی
میں ایسا بد دماغ یہاں بھی بگڑ گیا

کہتا ہوں کچھ اپنی میں تاویل کیا کروں
میرا ہر ایک کھیل مجھی سے بگڑ گیا

اب کیا بتائیں کیا تھا خیالوں کے شہر میں
بسنے سے پہلے وقت کے ہاتھوں اُجڑ گیا

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

ف خلش

افق پر آگئے منظر سبھی بگڑے ہوئے
ی آنکھوں میں جھانکو، اُن کی تحریریں پڑھو
اب نے کیوں زخم بانٹے دائرہ در دائرہ
ی عیندوں میں تمازت کا پتہ چلتا نہیں
ن گھروندوں کی گھٹن سے ہم نکل آئے مگر
رات ہی کی کوکھ سے جنا، نئے دن کا سفر

صبح کا خوں ہو گیا اور رات کے ٹکڑے ہوئے
بادبانو! یہ جزیرے کب سے ہیں اُجڑے ہوئے
دھوپ میں کیوں سائبانوں کے بیاں دکھڑے ہوئے!
بس ابھی باتوں کو لے کر تم سے کچھ جھگڑے ہوئے
لوگ تو بیٹھا کئے سمٹے ہوئے سکڑے ہوئے
مُردہ سورج ایک اک لمحہ کو تھا جکڑے ہوئے

زندگی اک پیڑ ہے اور پیڑ کی شاخوں پہ روز
کونپلیں پھوٹیں، کھلے گُل، گُل کے پھر ٹکڑے ہوئے

غزل

محمد شمس الدین تاباں

چشمِ خوباں میں ہیں اشکوں کے گہر میرے بعد
عشق ہے نالہ بہ لب، خاک بسر میرے بعد
کون ہوگا ہدفِ ناوکِ مژگاں اے دوست
کس کو ٹوٹے گی یہ دزدیدہ نظر میرے بعد
نہ وہ احباب کے میلے، نہ وہ اغیار کی بھیڑ
سونی سونی ہے تیری راہ گزر میرے بعد
عمر بھر جذب ہوئے جس میں میرے اشکِ الم
دیدۂ تر پہ ہے وہ دامنِ تر میرے بعد
وہ گلی ہو گئی بازار میرے لوٹتے ہی
ہو گیا بے در و دیوار وہ گھر میرے بعد
اے صبا کون ہے گل چینِ بہارِ جاناں
کون ہے حلقہ بگوشِ گلِ تر میرے بعد
زندہ در گور ہوں میں ان سے جدا ہو کے ادھر
دوستو! حال ہے کیا اُن کا اُدھر میرے بعد
میں شہیدانِ وفا سے ہوں نہیں مر سکتا
ہوں گے تنہا نہ تیرے شام و سحر میرے بعد
وقت کاٹے نہیں کٹتا جو شبِ غم تاباں
ہوگی شاید شبِ فرقت کی سحر میرے بعد

غیاث متین

زمیں کے ساتھ فلک کے سفر میں ہم بھی ہیں
وہیں سے لوٹ گئی راستوں کی تنہائی
تو وہ شجر جو سدا برگ و بار دیتا ہے
جسے کہیں سے سمندر نے لا کے پھینک دیا
کتاب تھے تو پڑھے جا سکے نہ دُنیا سے
خیال آگ ہے، شعلہ ہے فکر، لَو الفاظ

قفس نصیب سہی بال و پر میں ہم بھی ہیں
جہاں پہ اس نے یہ جانا، سفر میں ہم بھی ہیں
مثالِ آب، نہاں اس شجر میں ہم بھی ہیں
تمہارے ساتھ اک ایسے ہی گھر میں ہم بھی ہیں
لو اب چراغ ہوئے رہگذر میں ہم بھی ہیں
یہ سب ہنر ہیں تو پھر اس ہنر میں ہم بھی ہیں

متین شہر بھی صحرا نژاد ہے اتنا
کہ سنگ و خشت میں دیوار و در میں ہم بھی ہیں

…مت الاکرام

ریت کا بھکاری

…ے رواں!
…ی تجھ کو درِ عقیدت میں کہتی ہے ماں]
…ذوقِ سخاوت کا فیضان مشہور ہے
…سیرابیاں — کتنی شادابیاں
…ے منسوب ہیں داستاں داستاں،
…یوں کے مٹیالی جو بادیاں
…وں کی ہواؤں سے لپٹے ہوئے
…تے، ایک البیلے ماضی کا شیریں تصور لئے،
…پر زمانے سے لپٹی ہوئی بستیاں
…ں، کرشمیں، بافن کا گلشن]
…لیں جان تیری امواج کا انگبیں
…دو بے، اونچے خزاوں کی پرچھائیوں کی امیں
…ے شہر کی آبجوئے رواں!
…یا ہوں اک سا لیا
…یا عطا
…تھوڑی سی ریت، اور کچھ بھی نہیں
…کہ میں بھی بنا لوں محل

○

اسلم عمادی

ایک خطۂ ارض پر

سمندر بہتے ہوئے چشمے بھی یہیں جذب ہوئے
اور وہ نہریں جو نازک تھیں رگوں کی مانند
اسی سنسان زمیں میں کہیں پوشیدہ ہوئیں

اس طرح جیسے کہ اب کھیتیاں جاگیں گی نہ پھر
وہی خوابیدگی ہر شئے پہ، وہی دھندلاہٹ
یہ زمیں لوگ یہ کہتے ہیں ابھی زندہ ہے

رؤف خیر

مائل بہ کرم

تم کوئی بھی نہیں ہو
آج بھی لیکن اماوس ہو کہ پونم
چاند کو پانے کی زریں لہر رگ رگ میں سمائے
تھال پانی کا سجائے
آسماں کی اور تکتی جا رہی ہو

میرے دونوں ہاتھوں میں ہیں چاند سورج
بولو تم کیا مانگتی ہو
تم کوئی بچی نہیں ہو

○

ڈاکٹر غیاث صدیقی

آج بھی ایسا ہوتا ہے

(منظوم مختصر کہانی)

حسین بیوی کو، اک ننھی سی بچی کو
بس اِک کمرے کے گھر میں
بے سہارا چھوڑ کر
وہ گھر سے نکلا تھا

حسین چہروں پہ تھوکا
سخی ہاتھوں کو پوجا
شفقت و تقدیس کے ہونٹوں نے
لاکھوں لفظ اُگلے
لفظ کیا، بیساکھیاں تھیں
اور وہ لنگڑی اُمیدوں کے لئے
منزل نشاں تھیں

سیاسی پرچموں کے نیچے
جانب داریوں کے سورجوں کی
تیز اور زہریلی کرنیں
سر سے گذریں
اور تلوے چھید کر نکلیں

اور اس کے پاس کیسی نعمتیں تھیں
جوانی، تندرستی، عزم
عصری علم، انساں دوستی
لیکن اس کے پاس عصری اسلحہ بالکل نہ تھے
کوئی داؤ
کوئی بھی ہتھیار اس کے ذہن تک پہنچا نہ تھا
جوانی، تندرستی، عزم
عصری علم، انساں دوستی کے کاسے لے کر
گھر سے نکلا تھا
تلاشِ زر میں پھرتا تھا

وہ دشتِ بے حسی میں جسم کا سونا
گِدھوں کی نذر کر کے
اشرف المخلوق ہونے کا
ثبوتِ بے ریا پہنچا رہا تھا
گِدھوں سے لاش اس کی پٹ گئی تھی۔

○

بے زمینوں کے ساتھ "نیا سلوک"

ہمارے ملک میں اراضیات کا مسئلہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ یہاں کے پہاڑ، ہماری آزادی کے بعد اس قدیم مسئلے کو حل کرنے کی ہم نے انتہائی کوشش کی ہے چند سال قبل ہم اس مسئلے کو حل کرنے کی سمت خاص پیش رفت کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔

ہماری ریاست آندھرا پردیش میں قانون تحدید اراضی ۱۹۷۳ء کے تحت کام زور و شور سے جاری ہے۔ فاضل اراضیات کے قبضوں کی حوالگی میں سرعت پیدا کرنے کے لئے ریاست بھر میں یکم جون ۱۹۷۸ء سے "حوالگی قبضہ اراضی" کا پندرواڑہ منایا گیا۔ اس پندرواڑہ کے دوران میں ۴۷۳۸۷ اشخاص کو ۱ء۳۲ لاکھ ایکڑ اراضیات کے قبضے دیئے گئے اور ۱۶۵۰۴۸۳ اشخاص کو مکانات کی تعمیر کے لئے زمینات کا قبضہ دیا گیا۔

بلاشبہ ریاست آندھرا پردیش نے اصلاحات اراضی کی عمل آوری کے ضمن میں اپنا مبارک قدم آگے بڑھایا ہے۔ بے زمینوں کے لئے یہ ایک "نیا سلوک" ہے۔

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

LETTER No: 2075/ADVT/C4/78 Dt: 7-9-78 16/78-79

تنہائی اور تنہائی

(عوض سعید)

راستہ چلتے چلتے اچانک اس کی نگاہ ایک پوسٹر پر گئی جہاں کسی نئی فلم کی بجائے تعزیتی جلسے کی تفصیلات درج تھیں۔

اس نے سوچا۔ پرانی پکچر کو دوبارہ دیکھ کر بور ہونے سے بہتر یہی ہے کہ وہ تعزیتی جلسے میں چلا جائے۔

سڑک انسانی قافلوں کی وجہ سے اندھی ہوئی تھی۔ لیکن ساری گرد بیڑ اس پوسٹر نے بچا دی تھی جس پر اس کی نگاہیں مضبوطی سے جمی ہوئی تھیں۔

وہ دیوار سے چپکے ہوئے پوسٹر میں ابھی تک کھویا ہوا تھا کہ دفعتاً ایک اجنبی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے عجیب انداز میں کہا "لوگ منہ پہ تھوکتے ہیں لیکن اس نے پان کی پیک میرے کپڑوں پہ اچھال دی تھی۔ میرے احتجاج پر اس نے کہا تھا۔ آج تک کسی نے میرے منہ پہ نہیں تھوکا۔ اس لئے میں نے آج پان کی پیک تمہارے کپڑوں پہ تھوکی ہے۔ کیا تم اس بدتمیزی کے لئے مجھے معاف نہیں کرو گے۔ ذرا سوچو۔ وہ آدمی کیسا رہا ہوگا مرتا وہی ہے جو پیدا ہوا ہو اس نے تو ابھی جنم ہی نہ لیا تھا کہ مر گیا۔"

اس نے جواباً کچھ نہ کہا۔ صرف اس کی باتیں سنتا رہا۔ نہ وہ مرنے والے سے واقف تھا اور نہ اس آدمی سے جو اچانک وارد ہوا تھا۔

وہ جب چلا گیا تو اس نے سوچا۔ کہیں ایسا تو نہیں اس آدمی نے زندگی کے سارے زہر کو چاٹ لیا ہو اور اب اس کے ہاں کچھ بھی باقی نہ رہا ہو۔

وہ اس ڈرامائی ملاقات کے پس منظر میں بڑی دیر تک ڈوبا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے ذہن سے یہ احساس ہی مٹ گیا کہ مرنے والا پان چبایا کرتا تھا اور اس نے کبھی زندگی میں پان نہیں کھایا تھا مگر یہ کیا۔ دیوار پہ جہاں تعزیتی پوسٹر کی جگہ ایک اور نئے پوسٹر نے کب جگہ بنالی۔

آج ہندوستان کے چند اہم مسخروں کے ساتھ شہریاری ہال میں شام گزارئیے۔

ٹکٹ سو روپے، پچاس روپے اور بیس روپے۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے ٹٹولے۔ اس کی جیب میں صرف چند روپے تھے۔ اور وہ ہندوستان کے چند اہم مسخروں کے ساتھ شام گزارنے کا اہل نہ تھا۔

اب اس کے لئے ایک ہی راستہ تھا یا تو وہ اپنے گھر جائے یا پھر تعزیتی جلسہ اٹنڈ کرے۔ اس نے دوسرے راستہ کو ترجیح دی۔

وہ اب جلسہ گاہ میں داخل ہو چکا تھا۔ ہال بہت بڑا تھا اور اسی مناسبت سے کرسیاں جمادی گئی تھیں۔ کچھ کرسیاں خالی تھیں اور کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے لوگ باتوں کے تانے بانے میں کھوئے ہوئے تھے۔ ہر آدمی مرنے والے کے بارے میں کچھ نہ کچھ سنا رہا تھا۔

وہ یہاں سے اکتا کر جلد ہی باہر آگیا۔

"دیکھ لیا نہ تماشا۔" اب اس کے سامنے وہی پر اسرار اجنبی کھڑا تھا اس کے لہجے میں بڑا طنز اور تیکھا پن تھا اب اور کوئی تماشہ دیکھنے کی خواہش نہیں ہے؟

وہ چپ رہا۔

کیا تمہیں وہ شئے بھی وہاں نہ ملی جس کے لئے تم وہاں گئے تھے! اس طرح کا سہ کیف لوٹ آئے ہو کہ مجھے تم پہ ترس آرہا ہے

وہ اب بھی چپ تھا۔

فلسفہ ہماری منزل نہیں ہے خ
فریبی ہی ہمارا اثاثہ ہے آؤ ان م

مصور کا رس نچوڑ لیتا ہے جب بہانے

قبضے میں ہیں۔

کیا ہے ہمارے قبضہ میں ؟ اس

نے بڑ کا لب والے سے کہا۔

چند سکے جو بار کی تند ہو جائیں

گے :

اس کے بعد کیا ہو گا ؟

آئندہ کیا ہو گا۔ یہ کبھی نہ

سوچو۔ وقت کہتا ہے ایسا نہ ہو کہ بار

کے دروازے بھی بند ہو جائیں۔

" لیکن بار تو کیلئے بند ہو جاتا

ہے۔ اس کے بعد کیا ہو گا "

اس نے پھر ایک بار اپنی بات

دہرائی۔ اس کے چہرے پر ایک انجانا

سا خوف طاری تھا۔

" آگے دیکھا جائے گا۔ اجنبی نے

بڑھ رہے تیاز سے کہا اور ٹیکسی والے

کو آواز دی۔

" ٹیکسی "

ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ رک

گئی تو ڈرائیور نے کار سے سر نکالتے ہوئے

کہا : " کیا آپ نے آواز دی تھی بابوجی "

" نہیں تو "

کار آگے نکل گئی

اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر

ادھر دیکھا۔ سڑک دور دور تک خالی اور

ویران تھی۔ اور اس کے وجود سے چمٹا ہوا

آدمی یہ سوچ رہا تھا کہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔

* منی کہانی

مظہر الزماں خان

جب وطن اجنبی بن گیا

(برما کے مسلمانوں پر لکھی گئی کہانی)

وہ برسوں سے ایک دوسرے کی آنکھوں کا خواب تھے۔ ایک دوسرے کی آواز اور ان کی گہرائی سے خوب واقف تھے۔ لیکن ایک رات جب وہ سو کر اٹھے تو ان کے درمیان اجنبیت کی آہنی دیوار کھڑی ہو گئی اور وطن نے منہ پھیر لیا تو ان کی آنکھوں میں بسے ہوئے شناسا خواب کٹ کٹ کر گرنے لگے تو اچانک زمین سرخ ہو گئی، احساس مر گیا اور ہتھیلیوں میں خنجر نما بال اُگ آئے اور انہوں نے اپنے ہم وطن و ہم زمین ساتھیوں کے گھروں میں گرم گرم شعلے ڈال کر انہیں سرحد کے باہر دھکیلا۔ اور وہ سب کے سب مظلوم سورج کو سائبان سمجھ کر اپنے خام اجسام اجنبی زمین کے سینے پر گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ لیکن سنگلاخ راستے میں مٹی کا تودہ ہو گئے تھے اور جو بچ گئے تھے وہ پوری قوت سے آگے بڑھنے لگے تھے اور جب میلوں لمبے دریا میں ان کے زخمی قدموں کے نیچے سے گزر گئی تو ایک جزیرہ بنگلہ زمین نے انہیں سہارا دیا لیکن کا کروڑ مسلسل قتل جل چکی تھی اور جسم کا ایک معذور حصہ بنا ہو گیا تھا تاہم وہ سب کے سب اجنبی زمین کے سینے کو ان کی گود سمجھ کر بیٹھ گئے تھے۔ لیکن طویل مسافت اور راستوں کے دردناک مصیبتوں نے نڈھال کر دیا تھا اور ان کے اجسام سیکڑوں امراض کا مسکن بنتے جا رہے تھے۔ بھوک اور پیاس انہیں اپنے آہنی پنجے میں جکڑتی جا رہی تھی اور وہ کمزور کیڑوں کی طرح آہستہ آہستہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ایک کے بعد ایک اجنبی زمین کے گہرے سینے میں اُترتے جا رہے تھے اور جہاں دنیا کے تمام اخبارات اُن کے دردانگیز واقعات کو جلی حرفوں میں چھاپ رہے تھے وہیں اقوام عالم ہمیشہ کی طرح چپ چاپ تماشا دیکھنے میں مشغول تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہی شہنشاہ کو شکر بڑا الٰہی شہ رگ میں داخل ہونے کا واحد ذریعہ تھا۔ ●●

بانو طاہرہ سعید

وادیٔ سبز میں

اُسے مغل بادشاہوں کے وقت سے "وادیٔ سبز" ہی کہا جاتا تھا۔ کشمیر کے مشرقی حصہ میں سرسبز وادی۔ سرخ و زرد پھولوں سے ہمیشہ سجی رہتی تھی چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑوں سے قدرتی دیواریں کھنچی ہوئی تھیں۔ اس وادی کی آبادی نہایت مختصر تھی لیکن جشن بہار کے موقع پہ آس پاس کے قصبوں اور دیہاتوں کے زن و مرد ہر سال یہاں آ کر تہوار مناتے اور بڑی دھوم دھام کا میلہ لگتا۔

وادیٔ سبز کے باشندے اس مبارک دن کے سال بھر بے چینی سے منتظر رہتے تھے تھی اندرا یہاں کے ایک معقول گھرانے کی بیٹی تھی۔ ماں باپ کی بڑی لاڈلی تھی۔ جشن بہار کا زمانہ تھا۔ سب لوگ اچھے کپڑے پہن پہن کر بنے سنورے اتراتے ہوئے چل رہے تھے اندرا کی پوشاک پہ جگمگاہٹ سے نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ ماں باپ سے پیسے لے کر اندرا بہت سی چیزیں خرید رہی تھی۔

اندرا کے باپ کے [illegible] پنڈت [illegible] ڈیڑھ کوس سے [illegible] تہوار منانے آئے تھے۔ سبز، سرخ، رنگ برنگ کے کھلونے لے کر خوش ہو رہا تھا۔

"تیر کمان۔ تیر کمان۔ بانکے کھلیں تیر کمان" میلے سے ایک کھلونے والے کے راگ بلند ہوئے۔

بیرجو۔ دوڑتا ہوا تیر کمان والے کے پاس پہنچا۔ سب کمانیں بک چکی تھیں صرف دو تین باقی بچی تھیں۔ دس بارہ بچے کھلونے والے کے ارد گرد جمع ہو گئے بیرجو جلدی سے پیسے دے کر ایک سرخ سرخ کمان ہاتھ میں لئے اچھلتا پھاندتا مندر کے دروازہ پر آ کھڑا ہوا۔ اندرا نے جیسے ہی لال لال کھلونا دیکھا فوراً ہی مچل گئی۔ چلا چلا کر رونے لگی "میں لوں گی میں لوں گی"۔

ماں باپ نے بہلایا لیکن ضدی [illegible] نے ایک نہ سنی۔ بیرجو پہلے تو چپ چاپ کھڑا رہا پھر شاید [illegible] رتی ہوئی لڑکی کے آنسوؤں پہ رحم کھا کر اپنا تیر کمان اس کے حوالے کر دیا۔ اندرا کل [illegible] تیر کمان پا کر ناچنے لگی۔ بیرجو [illegible] احسان تھا۔

بارہ برس بعد اندرا سترہ سال کی دوشیزہ تھی۔ ایک دن گروجی کے یہاں سے لوٹتے وقت راستے میں چشمے کے کنارے درخت پہ سے کوئی چیز دھم سے آ گری۔ اندرا کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ ایک جوان نیم بے ہوش پڑا تھا۔ ناک سے خون جاری تھا۔ لڑکی نے رومال بھگو بھگو کر پیشانی پر پھیرا۔ چلو بھر بھر کے پانی سر پر ڈالا۔ جوان نے آنکھیں کھول دیں۔

اندرا نے تعجب سے کہا۔ "بیرجو۔ یہ پیڑوں پہ چڑھنا کیوں سیکھا ہے؟"

"نہیں۔ شیطان نے دھکا دیا تھا۔ جھولا [illegible] درختوں کو دیکھ کر بس جی میں آیا کہ پھنگی تک سیدھے پہنچ جاؤں۔ آج بڑی گڑبڑ ننھیال سے گھر کو روانہ ہوا۔ ماں جی نے بہت کہا کہ رات اور رہ جاؤ لیکن میں نہ مانا۔" بیرجو نے جواب دیا۔

"ابھی۔ قدم نکالے تھا تو یہ واقعہ ہو گیا اچھا ہے ننھیال لوٹ جاؤ۔ دس منٹ کا بھی راستہ نہیں۔" اندرا نے ہمدردی سے صلاح دی۔

"نہیں۔ نہیں۔ لوٹتے تو مجھے شرم آتی ہے اور دیکھو گھاس کی گاڑی جا رہی ہے گاؤں جا رہی ہے۔ اس میں بیٹھ کر چلا جاؤں گا اندرا تم نے بڑی دیا کی ہے۔ [illegible]" بیرجو یہ کہتا ہوا لمبے قدم [illegible] گاڑی میں سوار ہو گیا۔

اندرا۔ موتی کی طرح مسکرائی [illegible]
درخت سے ٹیک لگائے سامنے والی
سڑک پر نظریں جمائے رہی تا وقتیکہ بائیں
ہاتھ پر مڑ کر گھاس کی گاڑی نظروں سے اوجھل
نہ ہو گئی۔

شام کی پرچھائیں کے گھنگھرو نے اندرا
کو چونکا دیا۔ آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے
گھر کی جانب قدم بڑھائے۔
آج اندرا کے دل کی دنیا ہار جیت
کی کشمکش میں جل گئی۔ وادیٔ سبز میں!!

~~~~~

کچھ عرصہ کے بعد وادیٔ سبز میں
ایک نئی چہل پہل تھی۔ لاکھوں کے اسامی
پنڈت بہاری لال کی اکلوتی بیٹی شانتی کی
برات کا دن تھا۔ تمام امیر و غریب مدعو
تھے۔ ایک دھوم مچا ہوا تھا۔ شانتی اندرا
کی سہیلی تھی مگر اندرا سر کے درد کا بہانہ
کر کے گھر میں تنہا لیٹی ہوئی تھی۔
یکایک باجوں کی آوازوں سے
سارا وادی گونج اٹھی۔ گھوڑوں پر نشان
جھنڈیوں اور پھلواریوں کا ایک دریا
امڈا چلا آ رہا تھا۔ ہر طرف ہلڑ مچ گیا
[illegible] ۔ برات آ گئی۔
اندرا بھی باجوں کا شور سن کر
[illegible] کھڑکی پر آ کھڑی ہوئی۔ جلوس
کے بیچ میں [illegible] میں
[illegible] بیٹھا
ہوا جھومتا آ رہا تھا۔ اندرا کی نظر [illegible]

میں آج آنسوؤں کا کھیل پتہ نہ تھا
بلکہ اس سکون یاس کی جھلک تھی جو
کوئی پیاری شے کھو کر حاصل ہوتا ہے
ابھی برجو کی شادی کے چھ مہینے بھی نہ
گزرے تھے کہ بچپن کے منگیتر منوہر
سے اندرا کا بیاہ کر دیا گیا۔ منوہر کا
گھر الہ آباد میں تھا۔ دلہن کو لیکر اپنے
دیس چلا گیا۔
سہیلیاں اندرا کی جدائی سے
اداس تھیں۔ پردیس سکھی کی یاد
میں اکثر آنسو بہایا کرتیں۔ وادیٔ
سبز میں ــــ!!

~~~~~

سسرال میں اندرا کی بڑی ہی
آؤ بھگت ہوتی تھی۔ منوہر اس کا
پریمی تھا۔ زندگی کی ساری خوشیاں مہیا
تھیں لیکن دل کی گہرائیوں میں اندرا
اداس ہی رہی۔ منوہر کی محبت اور مہربانیاں
اسے دکھ پہنچاتی تھیں۔
برجو کا پریم اب تک اس کے
دل پر چھایا ہوا تھا۔ اکثر وہ سوچا
کرتی کہ میں کتنی اچھی ہوں۔ کاش
منوہر مجھ سے اتنی محبت نہ کیا کرتا۔
میرے پریم کی [illegible]
کی محبت کا میرے دل پر اثر نہیں!
اندرا کی شادی کے بعد [illegible]
[illegible]
[illegible]

ملازم ہو گیا تھا اور تینوں چھوٹے لڑکوں
کی تعلیم بھی بنگلور ہی میں ہو رہی تھی۔
اندرا کا میکہ اب بجائے کشمیر کے
بنگلور تھا۔

چھ برس کے بعد اندرا کو چاچا
کے بیٹے کی شادی میں شرکت کرنے
کشمیر جانے کا اتفاق ہوا۔ بچپن کی
سرزمین کو دیکھ کر سینے میں محبت کی
لہر سی اٹھی۔ یہاں کے چپے چپے سے
لڑکپن کی یادگاریں وابستہ تھیں۔ آج
بیتے دن پھر یاد آ گئے۔
وادیٔ سبز میں!

~~~~~

پرانی سکھیاں سب اپنے اپنے
گھر بار کی ہو چکی تھیں۔ کئی ایک تو
بیاہ کر دوسرے قصبوں میں چلی گئی تھیں
صرف۔ چندرا۔ کملا۔ ساوتری اور
فاطمہ سے ملاقات ہو سکی جن کی سسرال
وادیٔ سبز ہی میں تھی۔
اندرا کے گلے مل مل کے سب
خوب روئیں۔ چھوٹی بچی شیلا کو بھینچ
بھینچ کر پیار کیا۔ "منوہر سے کتنی مشابہ
ہے۔ کیسی سندر بچی ہے" سب نے ایک
زبان ہو کر کہا۔
بچھڑی ہوئی اندرا سے چھ برس
کے بعد تھے۔ واقعے دکھ سکھ بیان
ہوئے۔ سب نے اپنی اپنی سسرالوں کی
داستانیں سنائیں۔
~~~~~

ساوتری کو اپنے سوامی سے تو خوش تھی لیکن ساس کی زیادتیوں نے ناک میں دم کر دیا تھا۔ کملا کا شوہر پہلے درجے کا شرابی تھا۔ باپ دادا کی جائیداد اڑائی جا رہی تھی۔ شرابی ہونے کے علاوہ اکثر بیوی کو دو چار ہاتھ جما دیتا! بایں ہمہ وجوہ کملا اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ اس کی برائیاں سن نہ سکتی تھی ساوتری نے جب اندرا سے کملا کے شوہر کی برائیاں کرنا شروع کیں تو کملا سے رہا نہ گیا۔ بول اٹھی "ہاں۔ دارو نے ضرور انھیں بگاڑ دیا ہے۔ عام طور پر مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان میں اور کوئی عیب نہیں۔ اگر یہ نقص بھی نہ ہوتا تو وہ "دیوتا" تھے ساوتری نے تنک کر جواب دیا۔ "ہوں" تم ہی جیسی بیچاریوں نے ان دیوتاؤں کے دماغ خراب کر دئے ہیں۔ ذرا چندرا رانی کو دیکھو۔ تین سال بھی بیاہ کے نہ گزرے کہ ان کے دیوتا نے سر پر سوکن لا بٹھائی۔ چاند ایسی استری کو جلا جلا کر خاک کر دیا پھر چندرا رانی ہے کہ سوامی کے پیچھے مری جاتی ہے۔ جان دئے دیتی ہے۔ پاؤں دھو دھو کر پیتی ہے۔"

چندرا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "قسمت ہی بری نہ ہوتی تو میں ان کی آنکھوں کو اچھی نہ لگتی تو دوسری عورت کیوں کرتے یہ ان کی غلطی نہیں غلطی میرے بھاگ کی ہے"۔ حقیقت یہ تھی کہ چندرا کی طرح سندر، باہنر اور خدمتگزار لڑکی سارے کشمیر میں ملنا مشکل تھا۔ نہ معلوم اس کے شوہر کو کیا سوجھی کہ اس طرح بے وفائی کر بیٹھا۔

اندرا سے بھی اس کے سسرال کا حال چال پوچھا گیا۔ سوائے تعریف کے اور وہ کیا کہتی۔ منوہر کی طرح چاہنے والے شریف النفس اور خوش اخلاق آدمی معدودے چند ہی پائے جاتے ہیں۔

فاطمہ، چندرا، کملا اور ساوتری چاروں اندرا کی زندگی پر رشک کر رہی تھیں۔ منوہر کی طرح نہ کسی کا شوہر وجیہ تھا اور نہ مالدار۔

"دمنتی تو اچھی طرح ہے؟" اندرا نے دمنتی سے سوال کیا۔

"اچھی طرح ہے۔ دو پیارے پیارے بچے ہیں۔ لیکن ساس نندیں میکے نہیں بھیجتی ہیں۔ بات بات پر جھگڑا کرتی ہیں سب ایک ہی گھر میں رہتی ہیں۔ دمنتی اور شانتی دونوں ایک ہی گاؤں میں ہیں۔ برجو بھیا کا مزاج بڑا تیز ہے اور گھوڑ دوڑ کی لت نے انھیں تباہی کے راستے پر لگا دیا ہے۔ ان کے باپ بھی بالکل سٹھیا گئے ہیں۔ بیٹھے بٹھائے جھک جھک کیا کرتے ہیں۔ شانتی سہمی رہتی ہے بیچاری شانتی کی زندگی میں ذرا بھی شانتی نہیں ہے"۔ کملا نے پان لگاتے ہوئے کہا

فاطمہ کے منہ سے نکلا ہائے۔ ہائے برجو۔ اندرا کے دل میں سی ٹیس سی اٹھی خیالات کو بھلانے کے لئے اٹھ کر ناچ رنگ کے کمرہ میں چلی گئی۔ کمرہ مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ اندرا کی ماں عورتوں سے اپنے داماد کی تعریفیں کر کے خوش ہو رہی تھی۔ اندرا کو بھی عورتوں نے اپنے گروہ میں بٹھا کر سسرال کے متعلق تفتیشات بھرے سوالوں سے حوصلہ تنگ کر دیا۔

اندرا کی طبیعت یکایک گھبرانے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سب کچھ بھول جائے گذشتہ۔ موجودہ۔ سب کچھ!

ایک طرف برجو کی پرانی یاد کروٹیں بدلتی تو دوسری طرف منوہر کی شرافت۔ مہربانیاں اور احسانات اسے اپنی بے احساسیوں اور بے اعتنائیوں کی یاد دلاتے اور برجو بد مزاج بھی۔ جواری بھی۔ رام رام! منوہر۔ میرا منوہر!

~~~~~~

دوسرے دن اندرا اپنے لیڈی گرو جی کے درشن کر کے واپس آ رہی تھی۔ دل ہی دل میں سہیلیوں کی زندگی کا اپنی زندگی سے مقابلہ کرتی جاتی تھی اور اپنے تئیں سب سے زیادہ خوش قسمت پاتی۔ کسی کو شوہر کے مظالم سہنے پڑتے تھے تو کسی کو سسرال کے۔ منوہر اور ساس کے گھر والے کتنے نیک۔ کیسے معصوم صفت!

اندرا کے احساسات میں عجیب کشمکش تھی۔ اپنی نگاہوں میں اپنے آپ کو مجرم محسوس
~~~~~~

کر رہی تھی ۔ چند سال کی گتا ر سرد تھپیڑیں کی کرب ناک تلافی کرے ۔ منوہر جیسے سیچے جیون ساتھی کو کھونا نہ ہو ۔ یہی سوچتی ہوئی سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی گھر کی طرف آ رہی تھی ۔

منوہر جھیل کے کنارے چھوٹی شیلا کا ہاتھ پکڑے پھول توڑ توڑ کر دے رہا تھا سامنے سے اندرا کو آتے دیکھ کر تیزی کیساتھ آگے بڑھا ۔

سرخ گلاب کا ایک بڑا سا خودرو پھول اس کے بالوں میں لگاتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہنے لگا " میں انتظار میں بڑی دیر سے ٹہل رہا تھا ۔ اندو ۔ کہو کر دی ملے !"

جواب میں اندرا کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اور ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ نمودار ہوئی جس میں گہری محبت، احترام شکریہ سب ہی کچھ شامل تھا ۔ اس نے بے اختیار منوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر رخساروں سے لگا لیا ۔

اندرا نے آج زندگی کے معنی سمجھے ۔

" خواب سبز میں " ۔ !

اساتذۂ سخن کی اصلاحیں

حضرت نوحؔ ناروی

شعر: بسمل الٰہ آبادی

اِدھر میں ڈوبنے جاتا ہوں دریائے محبت میں
اُدھر دنیا بلاتی ہے مجھے گھبرا کے ساحل سے

اصلاح:۔

اِدھر میں ڈوبنے آیا ہوں دریائے محبت میں
اُدھر دنیا بلاتی ہے مجھے گھبرا کے ساحل سے

بجائے "جاتا ہوں" کے "آیا ہوں" بنایا جس سے زمانہ کا جو نقص شعر میں تھا دور ہو گیا

شعر:۔

تیر نگاہِ یار خدا کی تجھے قسم
دل میں اُلجھ رہا ہے نہ جگر میں اُلجھ رہا ہے

اصلاح:۔

تیر نگاہِ یار ادا کی تجھے قسم
دل میں اُلجھ رہا ہے نہ جگر میں اُلجھ رہا ہے

تیر نگاہِ یار کو خدا کی قسم سے کیا سروکار ادا کی قسم نے شعر میں بانکپن پیدا کر دیا۔

شعر:۔

فصلِ گل آنے تو دو فصلِ بہار آنے تو دو
خود بخود کھل جائیں گی کڑیاں مری زنجیر کی

اصلاح:۔

فصلِ گل آنے تو دو فصلِ خزاں جانے تو دو
خود بخود کھل جائیں گی کڑیاں مری زنجیر کی

[illegible] فصلِ بہار [illegible] ہے۔ اس تکرار سے کیا فائدہ۔ آنے کے لئے جانے کا تقابل چاہئے تھا اس لئے بجائے "فصلِ بہار آنے دو" کے "فصلِ خزاں جانے دو" خوب بنایا۔ معنوی ترقی اصلاح سے ہو گئی۔

شعر:۔

کون رویا لاش پر کس نے جلائی آکے شمع
ہم کو اس کی کیا خبر ہم مر گئے تو کیا ہوا

اصلاح:۔

کون رویا لاش پر کس نے جلائی آکے شمع
ہم کو اس کی کیا خبر جب مر گئے تو کیا ہوا

مصرعۂ ثانی میں "ہم" کانوں کو ناگوار تھا اس لئے بجائے "ہم" کے "جب" بنایا جس کی ضرورت تھی۔

شعر:۔ فنی الٰہ آبادی

دل میں اگر مکین ہو آنکھوں سے کیوں نہاں ہو
اللہ رے بدگمانی اس درجہ بدگماں ہو

اصلاح:

دل میں اگر مکین ہو آنکھوں سے کیوں نہاں ہو
اللہ رے بدگمانی تم اتنے بدگماں ہو

"اس درجہ" سے "تم اتنے" میں زیادہ فصاحت و لطفِ زبان ہے۔

شعر:۔

مثلِ کلیم طور پہ ہرگز نہ جائیں گے
دیکھیں گے حسنِ یار کا جلوہ یہیں سے ہم

اصلاح:۔

مثلِ کلیم طور پہ جانے سے کیا فائدہ
دیکھیں گے حسنِ یار کا جلوہ یہیں سے ہم

"ہرگز نہ جائیں گے" قلم زد کر کے "جانے سے فائدہ" بنا دیا جس سے شعر میں کتنے نازک معنی پیدا ہو گئے مطلب یہ کہ جب ادھر کلیم تو ناظر ہے پھر طور پر جانے سے کیا فائدہ۔

شعر:۔

سیکڑوں ظلم و ستم ڈھاتے ہو مجھ پہ صبح و شام
اور پھر کہتے ہو تجھ کو چاہتے ہیں دل سے ہم

اصلاح:۔

سیکڑوں ظلم و ستم ڈھاتے ہو میری جان پہ
اور پھر کہتے ہو تجھ کو چاہتے ہیں دل سے ہم

بجائے "مجھ پہ صبح و شام" کے "میری جان پہ" بنایا گیا جس سے شعر میں لطافت پیدا ہو گئی۔

آئندہ اصلاحیں
نواب مرزا جعفر علی خاں اثر

دو باتیں
جناب [illegible] کلام [illegible] کیفیت [illegible] ہونا ضروری ہے (ادارہ)

مستقل عنوان — "غبارِ خاطر"

بھینس کے [illegible] سے بلغن گُل نکالنے کا مسئلہ

[illegible] حسن

(ایڈیٹر کا مراسلہ نگار کی رائے سے اتفاق کرنا ضروری نہیں)

(تین مختلف احباب کو پڑھنے کے لئے دی شعور نقاد اور ایڈیٹر۔ کہانی میں کوئے کا اپنے پیروں کو پھڑ پھڑا کر درخت کی ٹہنی پر جگہ تلاش کرنا ایک علامت شعر و ادب کسی کے پاس مبجگ۔ کسی کے پاس "تحفظ" اور کسی کے پاس "جنس زدہ عبارت تھی)

ایک پہیلی بوجھئے۔

فرمائیے۔

"ہری تھی من بھری تھی سالا کھ موتیوں سے جڑی تھی، ہر اودو شالا اوڑھے راجہ رام کے باغ میں کھڑی تھی؟"

"ہوگی راجہ رام کا کوئی جا سانی"

آپ بھی بس لال بجھکڑ نکلے!

یہ لال بجھکڑ کون بزرگ ہیں؟

ان کو آپ نہیں جانتے۔ سنئے

کہیں کسی بستی میں ایک ایسا مرد دانا رہتا تھا جو مشکل سے مشکل مسئلہ کو چٹکی کاتے حل کر دیتا تھا۔ بستی کے سب لوگ اُسے اپنا گرو اور مشکل کشا مانتے تھے۔ ایک رات یوں ہوا کہ ایک ہاتھی جو مست اُس بستی سے گزرا، گاؤں کے لوگوں نے دیکھا کہ بستی کے گلی کوچوں میں جگہ جگہ کسی دیو قامت مخلوق کے بڑے بڑے نقش قدم بکھرے ہوئے ہیں لال بجھکڑ کو بلایا گیا۔ انھوں نے بہ غور معائنہ کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "ہم سمجھ گئے، یہ حرکت کسی مینڈک کی ہے جو پیروں میں چکی کے پاٹ باندھ کر رات بھر بستی میں گھومتا رہا ہے"۔

واقعی بڑے باکمال تھے لال بجھکڑ صاحب۔ اُردو ادب کی بستی میں بھی آج کل آپ کو ایسے کئی لال بجھکڑ مل جائیں گے آپ پھر ادب کی باتیں لے بیٹھے۔ میں تو چاہتا تھا کہ آپ تازہ ترین معمہ حل کرنے میں میری مدد کریں۔ بس ایک خانہ خالی رہ گیا ہے جس میں تین لفظ بیٹھتے ہیں اور تینوں بالکل برابر کے لفظ ہیں — انتخاب بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ اور وہ تین لفظ ہیں 'رحمت' 'زحمت' 'تہمت' دوسرے حرف کی جگہ پُر کرنا ہے۔ لیجئے پورا جملہ سنیے۔

جملہ کیوں سناتے ہیں آپ، آسان ترکیب یہ ہے کہ تینوں لفظوں کو دیجئے اُسے آپ تو معمے کے سر پیر سے بھی واقف نہیں۔

کیوں نہیں، ابھی ابھی تو پڑھا ہے قدیر زماں کا مضمون۔ ملاحظہ کیجئے "نیم" کے اگست کے شمارے میں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۳۲) لکھتے ہیں کہ:

"تجربے کے دوران چھ ماہ، میں نے جان اپڈائیک کی کہانی "عمل گوا"

تو آپ کا مطلب ہے کہانی میں بھی معمہ ہوتا ہے اور ادب میں بھی لال بجھکڑ پائے جاتے ہیں۔

جی ہاں۔ آج کل کی کہانی میں معمہ ہی نہیں، پہیلی اور چیستان وغیرہ کے اچھے اچھے نمونے بھی آپ کو مل جائیں گے۔

تو میں بھی پہیلیوں کا لکھی کہانیاں، آپ میری دلچسپیاں تو جانتے ہیں، معمے حل کرنا پہیلیاں بوجھنا، چیستانوں پر سر کھپانا لیکن تو بتائیے کہ یہ قدیر زماں کون ہیں؟

"ہمارے شہر کے ایک نوجوان کہانی کار۔ اُن کی کہانیوں کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے۔ ریڈیو کے لئے ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔ ان کی فکر بہت اور قلم میں ندرت ہے۔ مطالعہ بھی اچھا خاصا ہے لیکن انکی کچھ بندشیں ایسی ہوتی ہیں اور عجیب جاتی ہیں کہ کہنا جانتے ہیں کہ دیکھنے ہوگا کہ "تجھے کس رنگ میں جلتے سر ہوتے تک" سرحدیت تو علاقتی ادب پر محنت ہوئے ہیں علامتی ادب کا بہت سے مطالبات۔

[illegible] ان کا خیال ہے کہ [illegible] کا وصف یہ ہے کہ [illegible]

تعبیر ڈھونڈتے رہیں جن علامتوں کو فنکار نے تخلیق میں لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ بھی جو علامتی ادب کو دلچسپی سے پڑھتے اور اس کی گرہوں کو کھولتے اور اس کا انبساط حاصل کرتے ہیں وہ بھی ضروری نہیں کہ اپنی رائے میں ایک دوسرے سے متفق ہوں۔"

یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے۔ میں بھی جب کوئی معمہ حل کرنے بیٹھتا ہوں یا کسی پہیلی کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو بڑا لطف آتا ہے اُن کی گرہوں کو کھولنے میں۔ اور کیا لکھا ہے قدیر زماں نے؟

انھوں نے تو اور بہت سی باتیں لکھی ہیں لیکن اُن کا سارا زور اس نکتے پر ہے کہ آج کے افسانے کی پہچان ہے جدید علامت نگاری۔ دراصل اُن کا یہ مضمون اقبال متین کے ایک مضمون پر تبصرہ ہے۔

اقبال متین۔ انھیں تو میں خوب جانتا ہوں۔ اُن کی کئی کہانیاں پڑھ چکا ہوں۔ اُن کی کہانیوں میں بھی تو علامتیں ہوتی ہیں۔ لیکن ذرا جلدی سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔ تو کیا لکھا ہے اقبال متین نے؟

"پونم" کے جولائی نمبر میں اُن کا ایک مضمون چھپا ہے "اردو افسانے کے بیس سال" یہ مضمون انھوں نے ادبی اکاڈمی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک سمینار میں سنایا تھا۔

"اردو افسانے کے بیس سال"۔۔۔؟

بہت لمبا مضمون ہوگا۔ بیس سال میں تو ہزاروں ہی افسانے لکھے گئے ہوں گے اردو میں۔ ہاں عنوان تو اس کا متقاضی تھا کہ بیس سال کے افسانوی ادب کا جائزہ لیا جاتا لیکن اُن کا پورا مضمون پونم کے صرف تین صفحوں میں آگیا ہے۔

یعنی سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے

اور کیا ہوتا ہے، یہی تو ہوتا ہے۔ پہیلی میں بھی اور معمے میں بھی۔۔۔

ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ اقبال متین نے بھی اردو افسانے کے بیس سال کے سفر کو اشاریوں، کنایوں اور علامتوں کے کوزے میں بند کر دیا ہے! کس طرح؟

وہ تو آپ مضمون پڑھ کر ہی معلوم کر سکتے ہیں۔ دراصل وہ "آج اور کل" کے چکر میں پڑ گئے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ وہ افسانہ جسے آپ کل کا افسانہ سمجھتے ہیں وہ آج کا افسانہ بھی ہے اور وہ آنے والا کل کا افسانہ بھی ہوسکتا ہے۔ بات تو کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے کسی شاعر نے بھی تو یہی بات کہی ہے

سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

آپ تو دوسری طرف چلے گئے۔ اقبال متین کا کہنا ہے کہ "ادب کی کسی صنف کو بھی زمانے کے محدود سیاق و سباق میں سمجھنے کے بجائے وسیع تر تناظر میں سمجھنے پرکھنے اور ردّ و قبول کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یعنی۔ ادب اگر اپنے وسیع تر مفہوم میں ادب ہے تو کل اور آج کے سوا آنے والا کل بھی اس کا ہوسکتا ہے اور اگر نہیں ہو سکتا تو اس ادب ہی میں کچھ کھوٹ ہے۔ اور اس کھوٹ کو کھرا ثابت کرکے زندگی عطا کرنا کسی فن کار کے بس میں نہیں ہے۔"

تو یہ نہیں بتایا انھوں نے کہ آج کے ادب میں کس کے پاس کھوٹ ہے اور کون کھرا ادیب ہے؟

یہ تو مشکل ہے ہمارے لکھنے والوں سے خصوصاً تنقید نگاروں سے کہ یا تو وہ مصری مولو[ی] کا شکار ہو جاتے ہیں یا پھر اُن کے اندر اخلاقی جرأت کی کمی ہوتی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ کھل کر اور صاف صاف بات کی جائے۔

دراصل اقبال متین کا اشارہ آج کے اُن افسانہ نگاروں کی طرف ہے جو علامت نگاری کی آڑ لے کر مہمل کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ ایسی کہانیاں جو ایک باشعور قاری کے بھی پلے نہیں پڑتیں۔ لیکن سبھی افسانہ نگار تو ایسے نہیں ہوں گے؟

ہاں۔ یہی بات تو انھیں دو ٹوک الفاظ میں کہنا چاہیے تھی۔

تو قدیر زماں کیا کہتے ہیں؟

قدیر زماں علامت نگاری کی آزادی کے حامی ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ آج کا افسانہ اسی بنا پر کل کے افسانے سے مختلف ہے وہ مواد سے زیادہ ہیئت کی بنا پر کسی افسانے کو گزرے ہوئے کل اور آج کے افسانے میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں اور اسی طرح اُنھیں تخلیق کار کو بھی۔"

[illegible] ہیں؟

وضاحت کیجیے کہ اقبال متین اور قدیر زماں دونوں نے افسانوں میں شعور کے بہاؤ سے بہت اثر قبول کیا تو ایک کی سوچ کا عکس ہی دوسرے کی تحریر [illegible] بالکل صرف [illegible] آپ بتا سکتے ہیں اور دونوں نے اس بات کی وضاحت سے اعتراف کیا ہے۔

اقبال متین کا نظریہ یہ ہے کہ اچھا ادب وہی ہے جو کسی دور کا ہو، زندگی کا ترجمان ہو، خارجیت اور داخلیت کے خوش گوار امتزاج کا حامل ہوتا ہے۔ علامت نگاری سے دونوں کو اختلاف نہیں ہے لیکن قدیر زماں علامت نگاری کو اصل مقصد قرار دیتے ہیں جب کہ اقبال متین علامت کو احساس اور جذبے کے اظہار کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

یہاں پہلے اقبال متین کی بات قابل قبول محسوس ہوتی ہے۔ بے شک ہر دور کے لکھنے والے کا [illegible] اور [illegible] اور اس کی [illegible] اور وہ نئی نئی [illegible] کا سہارا بھی لے گا لیکن [illegible] مقصد بالذات بن جائیں تو [illegible] ابہام پیدا ہو جائے گا [illegible] پڑھنے والے [illegible] باشعور پڑھنے والے بھی اس [illegible] تک [illegible] پہنچ سکیں گے۔

آپ کا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] میں سمجھتا ہوں کہ میرے [illegible] پڑھنے والے اس کے آخر تک لے جاتے ہیں برگشتہ ہیں جس میں سمجھنے والا کچھ علامتیں اور کہ خود اپنے خول میں بند ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ اسی کو جدیدیت یا فیشن زدہ جدیدیت سمجھ بیٹھے ہیں۔

جی ہاں۔ کل جدیدیت کا آئیڈیا۔

یہ تو بڑی مشکل ہے کہ جدیدیت نے لذیذ نہیں ہوتا۔ جدید لکھنے والوں میں بعض ایسے افسانہ نگار اور شاعر [illegible] بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے بھی چند حضرات نے جدیدیت کے نام پر ادب کو چیستاں بنا دیا ہے۔

قدیر زماں نے اُن کی شکایت پر اپنی میں کچھ مثالیں بھی دی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ آٹھ زبانوں کے ماہر ایک اسکالر نے مجھ سے کہا کہ نہ تو ٹی ایس ایلیٹ ہی بڑا شاعر ہے اور نہ ن۔ م۔ راشد۔

مجھ سے بھی یہ بات کہی ہے وہ [illegible] نقاد ہوگا۔ میں نے [illegible] کسی کو [illegible] نہیں۔

اور ٹی۔ ایس ایلیٹ کے بارے میں تو کہتے ہیں [illegible] کہ وہ [illegible] کے [illegible] [illegible] تعریف [illegible] کوئی [illegible]

[illegible]

[illegible]

جو کلام قدیر زماں سے [illegible] ہیں لیکن قدیر زماں نے ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ۔ آپ اپنا حق زبان و ادب ہی کی حد تک کیوں محدود رکھتے ہیں یہ تو موسیقی، پینٹنگ اور سارے فنون لطیفہ کی بات ہے۔ ماڈرن پینٹروں اور ماڈرن موسیقاروں سے کہیے کہ وہ قرون وسطیٰ کے فن کاروں کی طرح پینٹ کریں یا گائیں بجائیں۔

ٹھیک تو ہے یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ آج کل جیسے بھی آ رہے ہیں، پچھلے زمانے میں کہاں تھے۔ بہر حال فن یا تمام فنون لطیفہ کا یہی حال ہوگا۔

جی ہاں — اور مجھے یقین ہے کہ کسی باشعور فن کار یا قاری کو اس سے اختلاف نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ادب ہو کیا زندگی کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں جو اپنی جگہ پر ساکت اور منجمد ہو۔ ہر لمحہ نیا طور نئی صورت تخلیق ہو رہی ہے۔ زندگی اور اس کی فن کارانہ ترجمانی اور عکاسی کا نام ادب ہے اور تمام فنون لطیفہ میں ہم کو حرکت و روانی اور تغیر اور تبدیلی کا یہ رد عمل ملتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حوادث روزگار اور انقلابات زمانہ سے نظریں چرا کر ہم شتر مرغ کی طرح ریت میں اپنا منہ چھپا لیں اور یہ سمجھ بیٹھیں کہ سب کچھ ٹھیک ہے اور ہم بالکل محفوظ ہیں [illegible] اگر [illegible] راہ [illegible] داخلیت کے [illegible]

جیسا نے آپ کو جذب کر لیا اور پھر یہ توقع بھی رکھیں کہ بہت سی کہانیاں (یا شاعری) مکمل علامات کی شکل میں موجود ہوتی ہیں تو یہ "قاری کا فرض ہے کہ وہ ان کو کھینچ کھانچ کر اپنے ذہن پر بار ڈالے" اور پھر بھی اگر اس کی سمجھ میں نہ آئے تو یہ اس کے ذہن کا قصور ہے لکھنے والے کا نہیں۔

آپ کا مطلب ہے کہ کہانی یا شاعری کو معما یا چیستاں نہیں بننا چاہیے ورنہ بصورت دیگر قاری کو لال بجھکڑ بننا پڑے گا۔

جو بات جناب اقبال متین نے لیے بڑا دقیق اور فنی (نکتے کے معنوں میں) افسانوں کا ادب سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ وہ علامت نگاری کے مخالف نہیں ہیں "علامت" تو ہر اچھے ادب کا جزو ہوتا ہے سوال یہ ہے کہ کوئی ادیب کس قسم کی نئی نئی علامتیں تراشتا ہے اور کس طرح ان کو اپنی تحریر میں برتتا ہے تاکہ اس کی کہانی یا شاعری یا کوئی اور صنف ادب "عدم ترسیل کے المیے" سے محفوظ رہے۔ بے شک بہ قول قدیر زماں ایک علامت بے شمار حادثات اور احساسات کا احاطہ بھی کر سکتی ہے لیکن ـــــ ـــــ ـــــ ـــــ ـــــ ـــــ ـــــ ـــــ لیکن مریض ذہن سے پیدا ہونے والی علامتیں بہ دستور کس حد تک قبول کی جائیں گی؟ مریض ذہن سے آپ کی کیا مراد ہے؟

خود قدیر زماں نے اپنے مضمون کے آخری حصے میں لکھا ہے کہ "ہم سب اپنے اپنے جسم کی کھال کے اندر قید تنہائی بھگت رہے ہیں۔" اسی قسم کے ذہن کو میں بیمار ذہن سمجھتا ہوں جس کے تخلیقی یا فکری مظاہر بھی قدرتی طور پر مدقوق اور زرد رو ہوں گے۔

میں قدیر زماں سے بہ ادب عرض کروں گا اور تمام علامت نگاروں سے بھی میری گزارش ہے کہ وہ اپنے خول سے باہر نکل کر دیکھیں، ہوا کتنی خوشگوار اور فضا کتنی صاف و شفاف ہے زندگی کتنی خوبصورت اور کائنات کتنی دلکش ہے وقت آپ سے مطالبہ کر رہا ہے کہ آپ جو کچھ لکھیں، اس میں چاہے اور کچھ ہو نہ ہو زندگی کے دل کی دھڑکن ضرور ہو۔ ایسی دھڑکن جس کی آواز دوسرے بھی سن سکیں۔ زندگی سے کٹ کر اور شاہراہ حیات سے ہٹ کر نام نہاد 'تنہائی' بیگانگی اور ذات پرستی میں اگر آپ اسیر رہیں گے آپ سمجھیں کہ خالق و مخلوق کے محرم راز اور اسرار حیات کے خزانہ دار ہیں۔ تو پھر زندگی کرنے کا حوصلہ ہم کہاں سے لائیں گے اگر آپ کے ادب کے چہرے پر زردی چھائی رہے گی تو شادابی اور شگفتگی کی تلاش میں ہم کہاں جائیں گے۔

علامتی کہانی

(رحمٰن رضا۔ بمبئی)

جولائی کے شمارے میں اقبال متین صاحب کا مضمون "اردو افسانے کے بیس سال" نظر سے گزر چکا تھا۔ اگست کے شمارے میں اس مضمون کے تعلق سے مراسلے بھی نظر نواز ہوئے عاتق شاہ صاحب نے اپنے مراسلے میں اقبال متین کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے اس خصوص میں مزید روشنی ڈالی ہے۔ دوسرا مراسلہ جناب قدیر زماں صاحب کا ہے جو علامتی کہانی کے عنوان سے شائع کیا گیا جس میں وہ اقبال متین کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جوابات دینے کی کوشش میں خود بھٹک گئے ہیں مثال کے طور پر وہ لکھتے ہیں "ہیئت کی بنا پر ایک افسانہ گزرے ہوئے کل اور آج کے افسانے سے مختلف ہوگا اور اس کا تخلیق کار بھی" (جبکہ اقبال متین صاحب نے کہیں افسانے کی ہیئت کا ذکر نہیں کیا ہے) پھر کل کا اور آج کا ادیب اس سے کہلاتا ہے کہ اس نے فکشن کو جو نئی ہیئت عطا کی اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی (کل کا اقبال متین صاحب نے نام تک نہیں لیا) اور پھر کل کا آپ کے نزدیک عظیم اور آج کا ادیب اور کہانی متروک ہے کہ دوسرے بھی اس سے اتفاق کریں۔ ایک اور جگہ قدیر زماں صاحب لکھتے ہیں کہ "منشی پریم چند کا نام لیے بغیر اردو افسانہ کیونکہ آگے نہیں بڑھ سکتا ... فن کی لکنت کے فرق سے اٹھی

ادب جمود کے مترادف تھا۔ لیکن ان کے مقصد افسانے میں [illegible] "ان کا وجہ ہے ہم چند کہ آج کا افسانہ نگار منوانے کی کوئی بھی کوشش بے سود ہوگی۔ آج کا کوئی بھی ادیب پریم چند منٹو یا بیدی کی طرح افسانے لکھے تو اسے اپنی برتری منوانے کی ضرورت ہی نہیں وہ اچھے اور دیرپا ادب کا خالق ضرور کہلا سکتا ہے لیکن آج کے افسانہ نگار کا ساتھ نہیں دے سکتا۔" ایسا ادیب جس کے نام اور کام سے ناواقفیت شائستگی کے بجائے جہالت کے مترادف ہو اور جو اچھا اور دیرپا ادب کا خالق ہو بھلا کیسے آج کے افسانہ نگار کا ساتھ نہیں دے سکتا؟ پتہ نہیں قدیر زماں صاحب کے نزدیک آج کے افسانہ نگار کی کیا تعریف ہے کیا اچھا اور دیرپا ادب تخلیق کرنا آج کے افسانہ نگار کے لئے ضروری نہیں ہے؟ آگے چل کر قدیر زماں صاحب نے ایسی کسی روایت کا ذکر کیا ہے جو اردو ادب کے بڑے محقق اور غیر سے آگے [illegible] جانتے ہیں اور وہ ٹی۔ ایس ایلیٹ اور ن۔م۔ راشد کو بڑا شاعر نہیں مانتے۔ بھلا اقبال متین کے مضمون سے اپنے روایت کے تذکرے کا کیا تعلق! اور یہ سمجھنے کی بات ہے کہ اگر کوئی ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کو بڑا شاعر نہ مانے تو کیا کسی ایک شخص کی ایسی رائے سے ایلیٹ کا مقام ادب میں کچھ کم ہو جائے گا۔

علامتی ادب کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے موصوف رقمطراز ہیں کہ "چند ذہین قاری علامتی ادب کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے تو ان کی ذہانت پر کیا حرف آئے یہ تو علامتی ادب کا وصف ہے کہ آپ ان علامتوں کی تعبیر ڈھونڈتے ہی رہیں جن علامتوں کو فنکار نے تخلیق میں کھو دیا ہے" ٹھیک ہے صاحب علامتوں کو تلاش کرنا چاہئے لیکن بقول قدیر زماں صاحب کے ایک ذہین قاری بھی اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا تو بھلا ایک عام قاری سے کیا امید کی جا سکتی ہے۔ اس خصوص میں اقبال متین نے بڑی اچھی وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں "علامت تقاضے کا حسن ہے جبکہ وہ کم کم ہوں بہروپیا تناظر کا اظہار کرتا ہے علامت تخلیق کار کے ذہن سے قاری کے ذہن تک کا سفر ضرور ہو تب ہی مصنف اس کے وضع ہونے کی بات ہے کہ آپ کو افسانہ لکھنا ہے علامت کا سہارا لے کر [illegible] کا زیادہ رعب اٹھانے کے کتاب بن جاتا ہے ایسی علامت سے کیا فائدہ جو [illegible] مشکل کر دے" میں اقبال متین کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ادب کے ایک [illegible] حیثیت سے موصوف سے سوال کروں گا کہ فیشن کے طور پر ایسی علامتیں استعمال کرنا جن کی خود خالق کو [illegible] مفہوم کا علم نہ ہو صرف تخلیق کار کے ذہن تک محدود ہو کیا قاری کی ذہنی [illegible] کوشش میں مصروف رکھنے کے مترادف نہیں ہے؟ خود قدیر زماں صاحب کو بھی اعتراف ہے کہ بعض وقت خود تخلیق کار کے ذہن میں جو علامت دم تخلیق ابھرتی ہے وہی علامت خود اس کے لئے کوئی نئی معنوی وسعت بخشتی ہے یعنی لکھتے وقت تخلیق کار کے ذہن میں علامت کا جو مفہوم تھا وہ پڑھتے وقت نئے معنوں میں تبدیل ہو گیا۔ کیا کہنے ایسی علامت نگاری کے! جب خود تخلیق کار کا یہ عالم ہے تو بیچارے قاری کا اللہ ہی حافظ ہے۔ ابہام برا نہیں لیکن ایسا ابہام جو قاری کو ذہنی انبساط کی بجائے ذہنی خلفشار میں مبتلا کر دے ادب نہیں کہلا سکتا۔

آخر میں آپ کو اس سلسلے کے آغاز کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی ارباب نقد و نظر سے التماس کرتا ہوں کہ وہ اس سلسلے میں دلچسپی لیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کریں تاکہ ہم جیسے قاری بھی [illegible]

بقیہ "انٹرویو"

حقوق کا قانونی تحفظ ہو سکے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: آپ کی اس تمنا میں ہم بھی شریک ہوتے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ اردو والوں کے مطالبات کو ایک مرتبہ پھر حکومت کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

پس پردہ

فلمی دنیا کے شب و روز

محمد اکرام اللہ خان

...ن فلمی دنیا کی دو تین اہم خبروں کا جمع ...ملی۔ پہلی خبر تو یہ تھی کہ مشہور فلم کے ...ریکٹر اکیٹر ڈیوڈ صاحب ہندوستان ...کر ہمیشہ کے لئے کناڈا بسنے کے متمنی ... ڈیوڈ صاحب نے ہماری فلموں کو بہت ...دیا ہے ان کی باغ و بہار شخصیت کا ...کوئی شیدائی ہے وہ جس محفل میں ہوتے ... اس کا رنگ ہی بدل جاتا ہے چاروں ...رف قہقہے اور مسکراہٹیں بکھر جاتی ہیں۔ ان ...طرح کا لطیفہ باز فلم انڈسٹری میں شاید ...ہی کوئی اور ہوگا۔ ان کے لطیفے سنانے کا انداز بھی انوکھا ہے وہ اپنے لطیفوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں بقول ان کے "مردانہ" اور "زنانہ"۔ مردانہ وہ لطیفے ہوتے ہیں جو بے تکلف محفلوں میں سنے اور سنائے جاتے ہیں اور جن لطیفوں کو سناتے ہوئے تکلف کا احساس ہوتا ہے وہ زنانہ لطیفے کہلاتے ہیں۔ ڈیوڈ صاحب کی شخصیت بھی بڑی دلچسپ ہے ان کا شمار نہ تو جوانوں میں ہوتا ہے نہ بوڑھوں میں۔ ہزاروں کے مجمع میں اپنے گنجے پن اور بلند آواز کی بدولت آسانی سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے گنجے پن کی بھی ایک روایت ہے خود انھیں بھی یاد نہیں کہ ان کے سر پر کس وقت اور کہاں کہاں بال ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بمبئی ٹاکیز کی کسی فلم میں کام کرتے وقت شوق ہوا کہ کیوں نہ وگ لگا کر کام کریں چنانچہ اس وقت فلم میں انھوں نے وگ لگا کر کام کیا اور فلم دیکھنے کے بعد ان کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے کہا ڈیوڈ فلم تو اچھی تھی لیکن تمھارا دور دور تک کہیں پتہ نہ تھا۔ بس اس دن سے آج کا دن ڈیوڈ ہمیشہ بالوں سے بے نیاز رہنے میں ہی فخر محسوس کرتے ہیں۔ فلم کے علاوہ انھیں اسپورٹس کی دنیا میں بھی بہت اچھا مقام حاصل ہے وہ اکثر اولمپک کھیلوں میں بحیثیت جج شریک ہوتے ہیں۔ ڈیوڈ صاحب سے راقم الحروف کی ملاقات صرف ایک مرتبہ ہوئی تھی۔ اس دلچسپ ملاقات کی ایک ایک بات آج بھی ذہن میں محفوظ ہے جس زمانے میں خواجہ احمد عباس آسمان محل کی شوٹنگ کر رہے تھے اسی زمانے میں ڈیوڈ صاحب بھی اپنے کسی رول کے سلسلے میں حیدرآباد آگئے ہوئے تھے اور وہ عابد روڈ کی تاج محل ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں آسمان محل کی یونٹ کے لوگ بھی ٹھہرے ہوئے تھے ایک دن ان کے ایک حیدرآبادی دوست نے انھیں سکندرآباد کلب مدعو کیا تھا۔ ڈیوڈ صاحب اپنے دوست کے انتظار سے تنگ آکر بازو والے کمرے میں چلے آئے جہاں عباس صاحب کے بھائی اطہر صاحب ٹھہرے ہوئے تھے کمرہ میں رمی کی محفل جمی ہوئی تھی جس میں ڈیوڈ صاحب کو بھی زبردستی شریک کر لیا گیا۔ ڈیوڈ صاحب کی ایک طرف میں اور دوسری طرف ایک اور مسلمان بیٹھے ہوئے تھے ڈیوڈ کی رمی ہو چکی تھی بس ایک پتہ کا انتظار تھا اس دوران ان کے دوست بھی آگئے ڈیوڈ اٹھنے کے لئے بے چین تھے لیکن جس پتے کی ضرورت تھی وہ نہیں آرہا تھا آخر تنگ آکر پتے زمین پر رکھ دئے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کہنے لگے یا اللہ مجھے ان دو مسلمانوں سے بچا جو ایک غریب یہودی کو ایک بیکار پتہ دینے میں سیاست کر رہے ہیں۔

ڈیوڈ صاحب نے بمبئی میں چھوٹی موٹی سی جائیداد بنائی تھی کبھی سی، سی، آئی اور کبھی اپنے فلیٹ میں رہتے تھے زندگی بھر کنوارے رہے۔ کھیل، دوست احباب کی محفلیں اور کتابوں کا مطالعہ ہی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

دوسری خبر یہ ہے کہ معتبر سے

تابانی ہوئے۔ کرانجیا کو فیروز سے سبکدوش
ہوئے۔ سنگھ کی ادارت سنبھال رہے ہیں
کرانجیا ایک عرصہ سے فلمی صحافت سے
وابستہ ہیں اپنے بڑے بھائی آر کے کرانجیا
(ریٹز) ہی کی طرح کافی مشہور ہیں اور ہر جگہ
بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ مشہور صحافی اور
ادیب خشونت سنگھ کو بھی السٹریٹڈ
ویکلی کی ادارت سے سبکدوش کر دیا گیا
ہے۔ ٹائمز آف انڈیا گروپ سے جتنے بھی
اخبار نکلتے ہیں ان میں ویکلی کو ایک انفرادی
مقام حاصل ہو گیا تھا۔ سردار خشونت سنگھ
نے جس وقت ویکلی کی ادارت کا جائزہ لیا
تھا تو اس وقت ویکلی کی اشاعت ساٹھ ہزار
تھی اور وہ خسارہ میں چل رہا تھا لیکن
آج ویکلی کی اشاعت چھ لاکھ سے تجاوز
کر گئی ہے اور مالکین کو بے شمار منافع
ہو رہا ہے حیرت تو اس بات پر ہے کہ
صحافتی آزادی کے اس دور میں بھی ایک
ہی ادارے سے وابستہ دو ایڈیٹرز ایک
ہی وقت میں سیاسی دباؤ کی بنا پر ہٹا
دیئے گئے ہیں۔

فیروز کی خبر بڑی تشویش کا باعث
ہے اور وہ ہے پریم ناتھ کی دنیا [illegible]! یوں
تو پریم ناتھ عجیب و غریب حرکتیں کی
[illegible] ہیں لیکن اب
جب کہ وہ [illegible] اس
اعلان کیا ہے کہ کسی وقت بھی وہ
دماغی طور پر تارک الدنیا ہو چکے ہیں کبھی لنگی
اور کرتا پہنتے تو کبھی پورے فوجی لباس
میں اپنے آپ کو جنرل کہلاتے۔ کبھی دن
رات شراب میں ڈوبے رہتے تو کبھی
مہینوں شراب کو ہاتھ نہ لگاتے۔ کبھی
کبھی تو یہ حالت ہو جاتی کہ ہیروئن
کو زبردستی گود میں بٹھا لیتے اور کبھی
بیٹھے بیٹھے سیٹ پر پیشاب کر دیتے۔
غرض پریم ناتھ کا بھی ایک زمانہ
تھا۔ برسات اور آن سے ان کی شہرت
کی زندگی شروع ہوئی پھر کچھ دنوں بعد
اس زمانہ کی سب سے خوبصورت
ہیروئن بینا رائے سے شادی کر لی۔
بڑی اچھی زندگی گذر رہی تھی کہ انہیں
فلم بنانے کا خبط ہو گیا۔ گولکنڈہ کا قیدی
اور شگوفہ جیسی واہیات فلمیں بنائیں
پھر بہت دنوں تک بیکار رہے بھائی میرا
نام سے ان کی شہرت کا دوسرا دور شروع
ہوا۔ پریم ناتھ ایک قابل تعریف

خواہش ہے کہ وہ کسی کو کیا دیتے ہیں
آج تک کسی کو سمجھ ہو سکا۔ لیکن ہر ہفتہ
بڑی پابندی کے ساتھ ہر ایک کو
اس کا حصہ پہنچا دیا کرتے ہیں۔
ان میں لمبے ساتھی اداکاروں کی
مدد کرنے کا جذبہ شروع ہی سے
[illegible]
[illegible]

لیے ہیں تو ان مجبوروں کے لئے
جنکی امیدوں کا خون ہو جاتا ہے۔

* * *

بقیہ فلمی تبصرہ "قسمیں وعدے"

کا حصہ بہت اچھا۔ فلم [illegible]
اس کی تیز رفتار کا بھی ذہن [illegible]
ہیں۔ مختار اکبی کی وجہ ہے اور غیر شادی کے
اسباب کے گھر میں پانچ سال تک کیوں
ساتھ رہتی ہے؟ ایک [illegible]
مکان میں [illegible] ٹھاٹ باٹ کی زندگی کیسے
گزار سکتی ہے؟ پروفیسر [illegible] بھی
اور [illegible] ہم شکل کیسے ہیں!
ایک تعلیم یافتہ اونچے خیالات کی لڑکی،
جو آرٹسٹ [illegible] اپنے محبوب کی
موت کا دکھ بھی بھول جاتی ہے، محض
مشابہت کی وجہ سے ایک [illegible] جاہل
[illegible] سے کہ اپنے شوہر کے طور پر
کیسے قبول کر سکتی ہے؟ اگر کوئی جواب دے
سکے تو ہم بھی جانیں!
مختصر یہ کہ اگر آپ کو کسی طرح
اس فلم کا ٹکٹ مل جائے تو پھر بیٹھ کر
مزے سے دیکھئے اور لطف اٹھائیے
ورنہ [illegible] کوشش [illegible]

[illegible]

فلمی ڈائری

[redacted]

پچھلے مہینے کی سب سے اہم اور سنسنی خیز خبر یہ تھی کہ ونود کھنہ نے اپنے گرو اچاریہ راجنیش کی رہنمائی میں روحانی سکون اور موکش کی شانتی حاصل کرنے کی خاطر فلمی دنیا کو خیرباد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے وہ اپنی زیر تکمیل فلموں کا کام مکمل کرے گا اور جن فلموں کا کام ابھی شروع نہیں ہوا ہے ان کی پیشگی رقم واپس کر دے گا۔ ایک پریس کانفرنس میں اس فیصلہ کا اعلان کرتے ہوئے ونود کھنہ نے کہا کہ وہ گزشتہ دو ڈھائی سال سے راجنیش آشرم (پونے) جا رہا ہے اور اب اس نے محسوس کر لیا ہے کہ روحانی سکون پانے کے لئے اس کا فلموں سے کنارہ کش ہونا ضروری ہے۔ اس خبر نے فلمی دنیا میں ایک کھلبلی مچا دی کیونکہ آج ونود کھنہ اپنی محنت، لگن اور پھر قسمت سے ان گنے چنے مشہور و مقبول ستاروں میں سے ایک ہے جن کا نام فلموں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ ونود کھنہ کے ان گنت چاہنے والوں کے علاوہ یہ خبر ان فلم سازوں کے لئے بھی انتہائی دل شکن ہے جنہوں نے ونود کو سائن کیا تھا اور اس کے امیج کو سامنے رکھ کر فلمی کہانیاں لکھوائی تھیں مگر بعض حلقے اب بھی پُر امید ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ونود کھنہ کو .... اپنی فلموں کی تکمیل میں ابھی دو ڈھائی سال لگ جائیں گے تب تک ہو سکتا ہے کہ روحانی سکون کی دھن سر سے اُتر جائے۔ اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ فلموں سے کنارہ کشی کے اعلان کے بعد ونود کھنہ نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ ایک بڑی بین الاقوامی فلم میں کام کرنا چاہتا ہے جس کی کہانی فلمی دنیا کے مشہور ترین کہانی کار لکھیں گے اور جسے بی کا ایک فلم ساز فلمائے گا۔ یہ اس کی آخری فلم ہوگی۔ بعض لوگ ونود کھنہ کے اس اعلان کو صرف پبلسٹی اسٹنٹ سمجھ رہے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ فلمی دنیا کو چھوڑنا اتنا آسان نہیں ہے پھر جبکہ فیروز آنند اور دوسرے فلمی ستارے جو کل تک آچاریہ راجنیش کے چیلے تھے آج ان سے دور ہو گئے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا ضروری ہے کہ دو ڈھائی سال تک ونود کھنہ روحانی سکون کے سحر میں مبتلا رہے۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادھر جاتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ رہتا ہے

فلموں سے تیاگ کی بات چلی ہے تو یہ بھی سُن لیجئے کہ ہالی وڈ کے مشہور ہیرو عمر شریف نے روحانی سکون کی خاطر نہیں بلکہ ذہنی سکون اور آرام لینے کے لئے تین سال تک فلموں میں کام نہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

★

آچاریہ راجنیش کا روحانی کرشمہ تو آپ دیکھ چکے۔ اب "مادی کرشمہ" کا حال سنیئے۔ در دروغ برگردن راوی۔ آج کا مقبول ترین اور دولت مند ہیرو امیتابھ بچن ایک کار خریدنا چاہ رہا تھا اس نے ۸ لاکھ روپے کی پیشکش کی لیکن پھر بھی بیچارہ کار نہیں خرید سکا۔ پونے کے روحانی پیشوا آچاریہ راجنیش نے ۱۰ لاکھ ۴۵ ہزار میں وہ کار خرید لی۔

★

بی آر چوپڑہ ایک فلم "اگنی پریکشا" بنا رہے ہیں لیکن فلم کا نام انھیں پسند نہیں ہے انھوں نے ایک جرنلسٹ کو فلم کی کہانی کا مرکزی خیال سنایا اور نام تجویز کرنے کے لئے کہا تو اس جرنلسٹ نے مشورہ دیا کہ فلم کا نام "ڈائری" بہت موزوں رہے گا۔ بی آر چوپڑہ نے یہ نام فوراً قبول نہیں کیا بلکہ اب مختلف لوگوں اور دوستوں سے مشورہ کر کے ایک ڈائری میں مختلف نام نوٹ کر رہے ہیں ان ناموں میں سے کوئی ایک نام منتخب کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ "ڈائری" ہی ہو۔

★

فلموں سے دلچسپی رکھنے والی دلی کی ایک خاتون نے فلموں میں بار بار بازی کے

تحقیق سے اپنے طور پر ایک سروے کیا۔
۱۶ سال سے ۶۰ سال تک کی عمر کی تعلیم
یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ ۲۰۳ خواتین میں
۱۵۰ نے فلموں میں بوسہ بازی کی تائید کی
ان ۱۵۰ میں ۱۱۴ خواتین نے وضاحت کی
کہ بوسہ بازی صرف شوہر اور بیوی کی ہونی
چاہئے جبکہ ۴۱ خواتین نے شادی سے پہلے
محبت کرنے والے جوڑوں کی بوسہ
بازی کی تائید کی۔ لیکن پھر بوسہ بازی
کے مناظر دیکھنے کی خواہش مند ان خواتین
نے امیتابھ بچن اور زینت کی جوڑی کو
پہلا نمبر اور دھرمیندر اور ہیما کی جوڑی
کو دوسرا نمبر دیا۔ ان دو جوڑیوں سے
ہٹ کر بہت کم راشے دینے والی خواتین
نے رنجیتا اور شبانہ اعظمی کو بوسہ بازی
کے مناظر میں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

*

شیام بینیگل کی فلم "جنون" کے
لئے ایک گانا ریکارڈ کیا گیا۔ فلم میں
یہ گانا آپ آشا بھونسلے کی بیٹی ورشا
کی آواز میں سنیں گے جبکہ فلم کے ریکارڈ
(ڈسک) کے لئے یہ گانا خود آشا بھونسلے
نے گایا ہے اس طرح پہلی مرتبہ آپ فلم
اور ریکارڈ میں دو مختلف آوازیں سنیں گے

*

[illegible] کے بعد سدابہار
ہیرو دیو آنند کی کئی ناکام فلمیں آئیں۔
اب "دیس پردیس" ہر جگہ کامیابی کے پرچم
لہرا رہی ہے۔ اس کامیابی کے ساتھ ہی
فلم [illegible] کے ایت کرنے کے بعد جو فلم ساز بھی
ہیں اور گانے بھی لکھتے ہیں انھوں نے اپنی فلم
"نیا جاپان" کے لئے دیو آنند کو سائن کیا
ہے "نیا جاپان" میں دیو آنند کے [illegible]
بھی ہوں گے اب دیکھنا یہ ہے کہ دو
کامیاب فلموں کی یہ ٹیم تیسری کامیاب
فلم پیش کر سکتی ہے یا نہیں۔

*

"شعلے" کے فلم ساز جی پی سپی اب
"شان" بنا رہے ہیں اور بڑے ہی شاندار
پیمانے پر بنا رہے ہیں۔ جی پی سپی
نے کہا ہے کہ اس فلم کی تکمیل میں "شعلے"
سے تقریباً دوگنا سرمایہ لگے گا اور یہ
فلم بھی "شعلے" کی طرح "ایکشن" فلم
ہو گی۔ کیونکہ جی پی سپی کا خیال ہے کہ
آج کا نوجوان طبقہ صرف "ایکشن"
فلمیں دیکھنا پسند کرتا ہے۔ یہ بتانا
تو مشکل ہے کہ فلم باکس آفس پر کامیاب
جائے گی یا نہیں لیکن یہ بات یقین سے
کہی جا سکتی ہے کہ فلم اگر کامیاب بھی
ہو تو شعلے کی طرح کامیابی اسے نصیب
نہیں ہو سکتی۔

*

"[illegible]" کے فلم ساز کرشنا شاہ
نے فلم کا [illegible] کو چونکا دینے
والی بات کہی ہے۔ انھوں نے بتایا
ہے کہ گو ہندوستان دنیا میں سب سے
زیادہ فلمیں تیار کرتا ہے لیکن ان فلموں کی برآمد
سے حاصل ہونے والی زر مبادلہ کی آمدنی
سوویت یونین سے ہونے والی ملکی آمدنی سے
بھی کم ہے۔

*

ایف سی مہرہ کی فلم "علی بابا چالیس چور"
کی شوٹنگ تاشقند میں تیزی سے جاری ہے
یہ فلم ہندوستان اور روس کے اشتراک
سے بن رہی ہے جس میں روسی اداکاروں
کے ساتھ دھرمیندر، ہیما مالنی، زینت امان
اور دوسرے ہندوستانی اداکار کام کر رہے
ہیں۔ ابھی حال ہی میں جب ایک ہندوستانی اداکار
کی ضرورت پیش آئی تو یہاں سے میک موہن
کو ۲۴ گھنٹے کے اندر پاسپورٹ اور ویزا
تیار کروا کر روانہ کیا گیا۔

*

ہیرو اور ہیروئن کی جوڑیاں تو ہماری
فلموں میں ہمیشہ سے اہم رہی ہیں۔ لیکن
اب جب کہ ہیروئن کی اہمیت ہماری
فلموں میں کم ہو رہی ہے اور اکثر فلموں
کی کہانی صرف ہیرو کے گرد گھومتی ہے
تو اب ہیرو اور ہیرو کی جوڑی کی
اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ایک اندازے کے
مطابق آج امیتابھ بچن اور ششی کپور کی
جوڑی دھرمیندر اور ہیما مالنی کی جوڑی
سے زیادہ مقبولیت حاصل کر رہی
ہے۔

* * *

تماشائی

بے لاگ فلمی تبصرہ

قسمیں وعدے

رمیش بہل کی فلم "قسمیں وعدے"
(فلم کے ٹائیٹل میں اردو نام اسی طرح لکھا
ہے) بڑی کاسٹ اور بڑے بجٹ کے باوجود
موضوع اور مقصد کے اعتبار سے ایک بڑی
فلم نہیں بن سکی۔ البتہ کاروبار کے لحاظ سے
بہت زیادہ کامیاب فلم ثابت ہو رہی ہے
اس کی بڑی وجہ سلیم جاوید "اسٹائل" کی
کہانی اور اسکرین پلے ہیں جو سلیم جاوید
نے نہیں لکھے بلکہ "مرزا امیر اور سرو" کے
نام سے ہونہار ہونے والے قلمکاروں کی
صلاحیتوں کے رہین منت ہیں۔ تیز رفتار سے
بدلتے ہوئے واقعات، اعمال مصالحوں
سے بھرپور کہانی، زبردست مار دھاڑ
اور دنگے فساد والا کلائمکس، محبت
منظر نامہ، ڈرامہ، ایکشن اور آخر میں
"سب کچھ خیریت ہے" والے اختتام نے
"مرزا امیر اور سرو" کو اپنی پہلی کاوش میں
اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں پہنچنے کے
لئے سلیم جاوید کو دو چار فلموں کا سہارا
لینا پڑا تھا۔

پوری کہانی بہت اچھے انداز میں
شروع ہوتی ہے اور بہت دلکش ڈھنگ اسی
انداز میں چلتی رہتی ہے جس سے یقین ہو
جاتا ہے کہ کہانی ایک بہت اہم موضوع کو
پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہوگی مگر آدھے
راستے میں ہی "باکس آفس فارمولے"
والے گھوڑے کہانی کو آن لیتے ہیں اور
آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کہانی بے چاری
پیچھے رہ جاتی ہے لیکن کہانی آگے بڑھ
جائے یا پیچھے رہ جائے اس سے کچھ زیادہ
فرق نہیں پڑتا کیونکہ فلم بینوں کے لئے
دلچسپیاں تو بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں اور ایک
مرحلے پر تو اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ اصل کہانی
سے ان کا کچھ تعلق ہی نہیں معلوم ہوتا اور
یہی اس فلم کی کامیابی کا راز ہے

کسی ہل اسٹیشن کی رنگین فضاؤں
میں ایک آدرش وادی پروفیسر (امیتابھ بچن)
کی نیلی نیلی آنکھوں والی ایک کافر حسینہ
(راکھی) سے بالکل اتفاقیہ طور پر ملاقات
ہوتی ہے۔ بڑی فلموں کے پس منظر میں
پہلے تو تکراریں ہوتی ہیں، پھر دل ملتے ہیں پھر
دونوں ایک دوسرے سے قریب آ کر دلنواز
نظاروں میں جھوم جھوم کر گانے گاتے ہیں۔
مرغزاروں میں کلیلیں بھرتے ہیں ایک
دوسرے کا پیچھا کرتے ہیں۔ پھول
توڑتے ہیں۔ پھر تھک ہار کر کبھی
بیٹھ جاتے ہیں کبھی لیٹ جاتے ہیں اور
گمبھیر ڈائیلاگ ادا کرتے ہوئے
یہ ظاہر کرتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے
سے پیار کرنے لگے ہیں۔ کہساروں
اور وادیوں سے نکل کر پروفیسر صاحب
مع اپنی محبوبہ کے اپنے محل نما مکان میں
پہنچ جاتے ہیں جہاں ان دونوں کے
علاوہ پروفیسر کا چھوٹا چہیتا بھائی
(رندھیر کپور) بھی رہتا ہے۔ پروفیسر
صاحب اور ان کی محبوبہ پیار کی میٹھی
آگ میں جلتے ہوئے اور قسمیں کھاتے
وعدے کرتے ہوئے پانچ سال گزار
دیتے ہیں۔ وہ آپس میں شادی اس
لئے نہیں کرتے کہ ان پر رندھیر کپور کی
ذمہ داری ہے جس پر بھائی اور ہونے
والی بھابی دونوں ہی جان چھڑکتے
ہیں۔ ذمہ داری کا مطلب کھانے کپڑے
سے نہیں ہے بلکہ گریجویشن کی تکمیل ہے
جس کے بعد وہ اپنے پیروں پر آپ
کھڑے ہونے کے قابل بن سکتا ہے
مگر یہاں رندھیر کپور کو سیر، تفریح
ہو ہلڑ اور لڑائی جھگڑوں سے ہی
فرصت نہیں ملتی۔ کتابوں سے تو
اسے خدا واسطے کا بیر ہے۔ پروفیسر صاحب
اور ان کی محبوبہ لاکھ سمجھاتے ہیں اپنی
ہونے والی شادی کا واسطہ دیتے ہیں

بھی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک واقعہ ہوتا ہے کہ [illegible] ایک گھڑا ہیں طالب علم جو [illegible] ایک رئیس کا بیٹا ہے کالج میں داخل [illegible] باہر اپنے پروفیسر سے بدتمیزی کرنے لگتا ہے۔ رندھیر کپور سے اپنے بڑے بھائی کی یہ توہین دیکھی نہیں جاتی اور وہ اسے مار بیٹھتا ہے۔ اچھی خاصی مار پیٹ ہوتی ہے اور بدلہ لینے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پروفیسر صاحب اپنے بھائی کو سمجھاتے ہیں کہ بدلے کی بھاؤنا کا انت خونی واقعات پر ہوتا ہے اور سب کچھ سہہ لینا اور معاف کر دینا ہی انسان کی بڑائی ہے نفرت کا جواب پیار سے دینا چاہیئے۔ [illegible] بھی کہ رندھیر کپور [illegible] میں آنے سے [illegible] دوسری طرف سے شرارتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایک مرحلے پہ تو اس کی [illegible] والی بھابی کی بھی توہین کی جاتی ہے جسے وہ اپنی ماں کے برابر سمجھتا ہے۔ پھر کیا تھا اس کے سر پر خون سوار ہو جاتا ہے خوب جم کر دھینگا مشتی ہوتی ہے اور نتیجہ میں بیچ بچاؤ کرنے پہنچنے والے پروفیسر اجیتابھ بچن کا خون ہو جاتا ہے اور یوں [illegible] بدلے کی بھاؤنا کا انت ایک خونی واقعہ پر ہوتا ہے۔

[illegible] بہت [illegible] کہ [illegible] اور [illegible]

جو کام [illegible] رہا ہے وہ اس فلم کے ذریعہ بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

لیکن پروفیسر اجیتابھ بچن کی موت کے ساتھ ہی ایک دوسرے اجیتابھ بچن اپنے روایتی کردار میں موالی، مجرم اور داداگیر کر نمودار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کی کہانی کے متعلق کچھ نہ لکھا جائے تو مناسب ہے کیونکہ اس میں سوائے مار دھاڑ، اسمگلنگ، اسمگلروں کی چالبازیوں اور اسی قسم کے غیر ضروری اضافوں کے کچھ نہیں۔ فلم کے ختم ہوتے ہوتے غنڈے سے اجیتابھ بچن کا [illegible] ہو جاتا ہے جس کو رندھیر کپور اپنے بڑے بھائی اور راکھی اپنے شوہر کی حیثیت سے قبول کر لیتے ہیں۔ اور یہاں رندھیر کپور اور نیتو سنگھ کا بھی ملاپ ہو جاتا ہے۔ امجد خان 'جبن' کی تلاش فلم کے آغاز سے ہی [illegible] ہے ' اسی سے میں ظاہر ہو جاتا ہے اور فلم کے آخر تک خوب ہنگامے [illegible] کیا کرتا ہے۔

یہ بات تو ظاہر ہو گئی ہے کہ فلم کسی نہ کسی مقصد کو سامنے رکھ کر بنائی گئی اور اس مقصد کو [illegible] کی کامیاب [illegible] [illegible]

بھی شامل ہیں اجیتابھ بچن نے دو متضاد کرداروں کو بڑی کامیابی [illegible] سے نبھایا ہے۔ راکھی کے کردار [illegible] ایک [illegible] مشکل رول کو اس نے بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ امجد خان فلم کے آخر میں ایک ہیبت ناک کردار میں اپنی زبردست اداکاری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ [illegible] اپنے مختصر سے رول میں خوب ہے نیتو سنگھ کو زبردستی فٹ کیا گیا ہے اداکاری میں [illegible] کپور [illegible] رندھیر کپور [illegible] فلموں میں [illegible] میں [illegible] ثابت ہوا ہے۔ [illegible] کی کامیاب اداکاری [illegible] وہ لڑتا ہے۔ محبت بھی کرتا ہے، ہنساتا بھی اور رلاتا بھی ہے۔ فلم میں اس کا کردار بھی بڑا [illegible] رندھیر کپور کے فلمی کیریئر میں ایک سنگ میل ثابت ہوگی۔ فلم کا دوسرا [illegible] اس کے [illegible] گیت شامل ہیں۔ [illegible]

[illegible]

([illegible])

Registered with the Registrar of Newspapers [illegible] No. [illegible]

Phone : 52957

POONAM URDU MONTHLY

Azampura Hyderabad-500 024 — Editor : Nasir Kurnooli, M. A.

ماہنامہ پونم کی خصوصی اشاعت

افسانہ نمبر

جس میں

آندھرا پردیش کے ممتاز افسانہ نگاروں کی تصاویر اور حالات زندگی کے

ساتھ ان کی منتخب تخلیقات بھی شامل ہوں گی

رنگین ٹائٹل ۔ خوبصورت کتابت و طباعت سے آراستہ یہ ضخیم نمبر

عنقریب شائع ہوگا ۔

...عت کا چودھواں سال

جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت

علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

پونم

...: ۱۴
...: ۱۰
...کتوبر ۱۹۷۸ء

...سالانہ : (۱۵) روپے
...پیرینیکے لئے (۲۰) روپے
...نی ممالک سے (۲۵) شلنگ

ایڈیٹر : ناصر کرنولی ایم اے (عثمانیہ)

خط و کتابت کا پتہ :
مینجر ماہ نامہ "پونم"
16-3-300/1
اعظم پورہ
حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴

ترتیب

مطبوعہ : دائرہ الکٹرک پریس پھتہ بازار حیدرآباد ــ ۵۰۰۰۰۲

دیہی آبرسانی

محفوظ پانی کی سربراہی آج ہمارے سماج کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اس لیے آندھرا پردیش میں ہماری موجودہ منصوبہ بند ترقیاتی سرگرمیوں کے ضمن میں "دیہی آبرسانی کے پروگراموں کی اہمیت پر زیادہ زور دینے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اس سلسلے کی سرگرمیوں میں شدت پیدا کرنے کی خاطر ۷۹-۱۹۷۸ء کے موازنے میں ۲۵ء۷ کروڑ روپیوں کی متاثر کن رقمی گنجائش فراہم کی گئی ہے

بورویلز کی کھدائی کے کام کو تیز تر کرنے کے لیے آندھرا پردیش اریگیشن ڈیولپمنٹ کارپوریشن کو ایک کروڑ روپیے فراہم کرنے کی تجویز ہے۔ موجودہ باولیوں میں پانی کی مقدار میں اضافے کی خاطر منتخبہ مقامات پر ایسے تالاب تعمیر کیے جائیں گے جن سے پانی رس کر باولیوں میں جمع ہوگا۔

بلاشبہ ان اقدامات سے آندھرا پردیش کے مواضعات میں رہنے والے ہمارے لکھوکھا عوام کی ایک شدید اور دیرینہ ضرورت کی تکمیل میں زبردست مدد ملے گی۔

NO. 20/78-79

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش - حیدرآباد

LETTER NO: 2305/ADVT/C4/78
DATED 27-9-78

اردو ادب میں عقلیت پسندی

(داؤد اشرف)

یورپ میں نشاۃ ثانیہ اور بعد کو رونما ہونے والے صنعتی انقلاب کے باعث مذہبی، سیاسی اور فلسفیانہ افکار و تصورات میں بنیادی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں اور مادی خوشحالی میں اضافہ ہوا زندگی کے بارے میں ایک نیا نقطۂ نظر سامنے آیا۔ تنگ نظری، توہم پرستی اور غیر سائنٹفک رویہ کی بجائے روشن خیالی، عقلیت پسندی اور سائنٹفک رویہ کو اپنایا گیا۔ جو نئے علوم وجود میں آئے اُن کی بنیاد سائنسی تجربہ، عقلیت اور مادی افادیت پر رکھی گئی۔ ان باتوں کا ادبی اور فنی رویوں پر اثر پڑنا لازمی تھا چنانچہ ادب و شاعری میں نئے رجحانات پیدا ہوئے۔ یہ نئے افکار، رجحانات اور خیالات آج سے سو، سوا سو سال پہلے اُردو ادب میں داخل ہوئے اور پروان چڑھے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہمارے ملک کی معاشرتی، معاشی اور تہذیبی زندگی میں تیزی کے ساتھ تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ یہ حالات اور وقت کا ایک اہم تقاضا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی سیاسی، معاشی، تہذیبی اور اخلاقی اعتبار سے انتہائی زوال اور پستی سے ہم کنار تھی۔ وہ سخت بے عملی کا شکار تھے حال اور مستقبل کی زندگی پر توجہ دینے اور اُسے بہتر بنانے کی بجائے وہ ماضی کی عظمت اور کارناموں پر فخر کرتے اور اُن ہی باتوں کو دہرا دہرا کر خوش ہو لیا کرتے تھے۔

غیر صحت مند اور غیر متوازن روحانیت کی وجہ سے اداسی اور مایوسی عام تھی۔ ملاؤں نے مذہب میں دین کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا تھا ہر بات روحانیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سارے علوم بلکہ ساری زندگی پر روحانیت کا غلبہ اور اثر تھا۔ سر سید اس غیر متوازن روحانیت سے پیدا ہونے والی برائیوں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی تحریک قومی زندگی کے کئی پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے تھی جس نے ملک اور خاص کر مسلمانوں کی سیاسی معاشی، معاشرتی، مذہبی اور ادبی زندگی کو متاثر کیا۔

سر سید نے اپنی تحریک کی بنیاد سائنٹفک نقطۂ نظر، مادی افادیت، عقلیت پسندی اور قانونِ فطرت پر رکھی۔ فلسفہ اور معقولات کی تعلیم پرانے نصاب میں شامل تھی۔ سر سید کو معقولات سے خاصا لگاؤ تھا اور اسی دلچسپی اور لگاؤ کی وجہ سے سر سید نے بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ نئے دور کی عقلیت پسندی اور حقیقت پسندی کو قبول کیا۔

سر سید اور اُن کے رفقاء حالی، شبلی، محسن الملک، چراغ علی وغیرہ نئے حالات اور تقاضوں کے مطابق مذہب کو ڈھالنا چاہتے تھے۔ سر سید کی تفسیر عقلیت پر مبنی تفسیر ہے انھوں نے روحانی اور مافوق فطری تجربات کی عقلی تاویلات پیش کیں۔ اُن کی بعض تاویلات سے نہ صرف عام مذہبی عقیدے سخت مجروح ہوئے اور اُن کی تاویلات کو مضحکہ خیز سمجھا گیا۔ بلکہ اُن کے قریبی رفقاء بھی سر سید کی تفسیر کی مخالفت کرنے لگے۔ ان باتوں کے باوجود سر سید کی تفسیر سے فائدہ ضرور پہنچا۔ سر سید کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بعد کے مفسرین عقل کی روشنی میں قرآنی تعلیمات کو دیکھنے اور سمجھنے کی طرف راغب ہوئے اور مذہب کو زندگی اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی۔

سر سید چاہتے تھے کہ عقلیت پسندی عام ہو اور اُسے زندگی میں مشعل راہ بنایا جائے مذہب ہو کہ مادی زندگی کے مسائل وہ ہر معاملہ میں عقلیت پسندی

[illegible]
کو حل کرنے [illegible]
عقلیت پسندی کے [illegible]
سرسید کو اپنے [illegible] اور
خیالات کی اشاعت کے لئے [illegible]
الاخلاق جاری کرنا پڑا۔ انہوں نے [illegible] مضامین
نے مسلمانوں کی قومی زندگی کے [illegible] پہلوؤں
پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سرسید کے
مضامین سے پڑھنے والے نہ صرف نئے علوم،
فلسفے اور رجحانات کی اہمیت و قدر و قیمت
سے واقف ہوئے بلکہ نئے علوم اور سائنس
[illegible] سے ان کے ذہن روشن بھی ہوئے۔
سرسید اردو ادب کی پہلی شخصیت ہیں جنہوں
نے مغربی خیالات کو اردو ادب میں اپنانے
اور جذب کرنے کا میلان پیدا کیا۔ وہ جذبے
[illegible] صداقت سے زیادہ عقل کی کارفرمائی کو
ضروری سمجھتے تھے۔ سرسید کے ان خیالات
[illegible] اثر ان کے معاصرین اور بعد کے دور کے
[illegible] ادیبوں اور تنقید نگاروں نے قبول کیا۔
[illegible] کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حالی اور ادب یا
[illegible] ادب کے کوچہ میں اس سے پہلے
[illegible] عقلیت پسندی یا حقیقت پسندی کا گزر
نہیں تھا۔ عقلیت اور حقیقت کی چھاپ خود
[illegible] ادب میں بھی کہیں کہیں مل جاتی تھی
[illegible] کے نشتر اور لوچ کیا حقیقت اور
[illegible] عقلیت کی اکثر تصویریں نہیں کھینچتے۔
[illegible] اگر آبادی کے پیشتر شعر تھے جو گل و بلبل
[illegible] اور معشوق کی فضا اور محض خواب

خیال کی دنیا کے طلسم ہوشربا سے نکل
کر انسانوں کی بستیوں، میلوں ٹھیلوں
میں ایک نیا گیت گاتے ہوئے مجاہد کے
کے بھیس میں چلے آئے۔ غالب کا رویہ
زندگی کی جانب اور خود اپنے فن کی جانب
بھی عقلیت اور حقیقت پر مبنی تھا۔
انھوں نے مغرب کے نئے رجحانات کا
خیر مقدم کیا اور دقیانوسی باتوں، رسموں
رواجوں اور رجعت پسندی کے مقابلہ
میں نئی صنعتی اور مشینی تہذیب نئے
علوم اور نئے رجحانات سے رغبت
اور لگاؤ کا مظاہرہ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ
اردو ادب میں عقلیت اور حقیقت پسندی
کو ایک باقاعدہ تحریک اور ایک مستقل
رویہ کی شکل غالب ہی کے خوشہ چینوں
شیفتہ، سرسید، حالی، آزاد، شبلی
اور ان کے ہم عصروں نے دی جن کے
امام سرسید ہی تھے۔ سرسید کو اس تحریک
کے محور اور رہنما کی حیثیت حاصل ہے
انھوں نے معاشرتی اور قومی اصلاح
تعمیر جدید اور نئے تقاضوں سے مطابقت
پیدا کرنے کے لئے جس مشن کو آگے
بڑھانا چاہا تھا عقلیت اور حقیقت
کو اس میں قوت محرکہ کی حیثیت حاصل
تھی۔

سرسید کی تحریک کو ان کے رفقاء میں
جس رفیق نے اپنے ادبی و شعری کارناموں
اور تخلیقی صلاحیتوں سے بھرپور تعاون

دیا وہ حالی تھے۔ شعر و ادب کے بارے
میں حالی نے جو تصورات پیش کئے ان
کی بنا پر انھیں جدید اردو تنقید کے
بانیوں اور علمبرداروں میں امتیازی مقام
حاصل ہے۔ حالی نے یہ نظریہ پیش کیا
کہ شاعری مفید عمل ہے اور اسے معاشرہ
ملک اور قوم کی اصلاح کے لئے استعمال
کیا جانا چاہیے۔ وہ سادگی، جوش
اور اصلیت کو اچھی شاعری کا لازمہ
قرار دیتے ہیں اور ایک اچھے شعر کے لئے
تجربے کی سچائی اور اس کے اظہار میں سادگی
کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ حالی نے عقلیت
پسندی کے رجحان کو تقویت پہنچائی۔
انھوں نے اپنے پیش کردہ تصورات
کی روشنی میں شعر و ادب کے تخلیق کی
شعوری کوشش کی۔ چونکہ ان کی ایسی
تخلیقات میں خلوص بدرجہ اتم موجود
ہے اور وہ اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے
حامل بھی تھے اس لئے ان کی وہ تخلیقات
بھی اعلیٰ معیار تک پہنچتی ہیں۔ مسدس
ان کی ایک اچھی مثال ہے۔ حقائق،
جذبہ اور بے پناہ خلوص ہی کی وجہ سے
مسدس شاعری کا ایک بڑا کارنامہ
قرار پایا۔
عقلیت پسندی اور حقیقت پسندی
میں باہمی تعلق ہے۔ عقلیت پسندی
مادیت اور حقیقت پسندی کی تائید
کرتی ہے وہ ادب یا مخصوص تنقید

کو سائنس کے قریب لے جاتی ہے۔ عقلیت پسندی ہو کہ حقیقت نگاری دونوں رومانیت کی ضد ہیں۔ رومانی نقطۂ نظر کے حامل ادیب واقعی یا حقیقی چیزوں کی بجائے اُن چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو ہو سکتی ہیں یا ہونی چاہیئے اس کے علاوہ رومانیت میں عقلیت کے مقابلے میں جذبات اور عقل کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جذبہ اور تخیل بلاشبہ شاعری کے اہم لوازم ہیں لیکن انھیں زندگی کے حقائق پر مبنی ہونا چاہیئے محض جذبہ کی شدت اور تخیل کی پرواز شعر و ادب کو زندگی سے دُور رکھ دے گی۔ عقلیت پسندی اور حقیقت نگاری کی وجہ سے ادب زندگی کے قریب آئے گا ورنہ ان رجحانات کی عدم موجودگی میں ادب معلق ہو کر رہ جائے گا۔

سرسید اور حالی کے بعد عقلیت پسندی کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں اقبال کا نام قابل ذکر ہے یہ سچ ہے کہ اقبال کے ہاں سرسید حالی، شبلی اور اکبر کی روایات کا امتزاج موجود ہے لیکن اقبال کی شاعری میں سرسید اور حالی کی تحریک کے بعض بنیادی پہلوؤں سے سخت اختلاف بھی ملتا ہے۔

اقبال: "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" کی بجائے۔

"زمانہ با تو نہ سازد تو باز مانہ ستیز" کا مشورہ دیتے ہیں۔ اقبال پاسبان عقل کو دل کے ساتھ رکھنا اچھا سمجھتے ہیں مگر وہ عقل پر عشق اور دل کو ترجیح دیتے ہیں اور عقل کو عشق سے کم تر گردانتے ہیں۔

پریم چند نے عقلیت پسندی کے رجحان کے زیر اثر ماورائی تصورات اور مافوق الفطرت کرداروں کو یکسر بالائے طاق رکھکر حقیقی انسانوں، عام زندگی اور اس کے مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ پریم چند اپنی تخلیقات میں تصوریت پسند بھی نظر آتے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ حقیقت نگار ہیں۔ اور حقیقت نگاری کا یہ اہم فنی رویہ آنے والی ادیبوں کی نسلوں کو پریم چند سے ورثہ میں ملا۔

جوش نے اپنی شاعری میں عقلیت پسندی کے رجحان کو بہت فروغ دیا۔ جوش کے ہاں یہ رجحان ان کے پیش رو شعراء کے رجحان سے کچھ مختلف ہے۔ اسی رجحان نے جوش کی شاعری میں باغیانہ اور جارحانہ انداز اختیار کر لیا ہے۔ انھوں نے قدامت پسندی اور رجعت پسندی پر کاری ضرب لگائی۔ توہم پرستی جہالت، مذہبی انتہا پسندی کے خلاف نعرۂ بغاوت بلند کیا اور مذہبی ٹھیکہ داروں کے مکر و فریب اور مذہبی اداروں کی خرابیوں کا پول کھولا۔ جوش کی منظومات عقلیت پسندی اور حقیقت نگاری کے رجحان کی غمازی کرتی ہے۔

عقلیت پسندی کے رجحان کو عام کرنے میں نیاز فتح پوری کا رول نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے افسانے اور تنقید رومانی اور تاثراتی ہیں اور وہ اُردو ادب میں رومانی تحریک کی ایک اہم اور ممتاز شخصیت ہیں مگر نیاز نے اپنے مضامین اور رسالہ "نگار" کے ذریعہ ایک طویل عرصہ تک عقلیت پسندی کی تحریک کو تقویت پہنچائی۔

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء سے ہوا اور بہت مختصر عرصہ میں اس نے ایک وسیع اور ہمہ گیر تحریک کی حیثیت حاصل کر لی انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں جو لکھنؤ میں اپریل ۱۹۳۶ء میں منعقد ہوئی تھی ایک اعلان نامہ منظور کیا گیا جس کی آخری سطر میں کہا گیا ہے کہ "ہم اُن باتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں ترقی اور تغیر کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔"

سرسید، حالی، اقبال، پریم چند، جوش وغیرہ

(بقیہ صفحہ ۴۰ پر)

سکے رجحان کو اپنانے کے قائل تھے اور مسائل زندگی کو حل کرنے کے لئے جذباتیت کی بجائے عقلیت پسندی کے رویہ کو رہنما بنانا چاہتے تھے۔ سرسید کو اپنے مقاصد کے حصول اور خیالات کی اشاعت کے لئے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کرنا پڑا۔ اس کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کی قومی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سرسید کے مضامین سے پڑھنے والے نہ صرف نئے علوم، فلسفے اور رجحانات کی اہمیت و قدر و قیمت سے واقف ہوئے بلکہ نئے علوم اور سائنس کی روشنی سے ان کے ذہن روشن بھی ہوئے۔ سرسید اردو ادب کی پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے مغربی خیالات کو اردو ادب میں اپنانے اور جذب کرنے کا میلان پیدا کیا۔ وہ جذبے کی صداقت سے زیادہ عقل کی کارفرمائی کو ضروری سمجھتے تھے۔ سرسید کے ان خیالات کا اثر ان کے معاصرین اور بعد کے دور کے ادیبوں اور تنقید نگاروں نے قبول کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عالمی ادب یا اردو ادب کے کوچے میں اس سے پہلے عقلیت پسندی یا حقیقت پسندی کا گزر ہی نہیں تھا۔ عقلیت اور حقیقت کی چھاپ خود اردو ادب میں بھی کہیں کہیں مل جاتی تھی۔ میر کے نشتر اور لوچے کیا حقیقت اور عقلیت کی کھلی تصویریں نہیں کھینچتے۔ نظیر اکبرآبادی کے بہت سے شعر تھے جو گل و بلبل کی فرضی اور معنوی فضا اور محض خواب و خیال کی دنیا کے طلسم ہوش ربا سے نکل کر انسانوں کی بستیوں، میلوں ٹھیلوں میں ایک نیا گیت گاتے ہوئے بنجارے کے بھیس میں چلے آتے۔ غالب کا رویہ زندگی کی جانب اور خود اپنے فن کی جانب بھی عقلیت اور حقیقت پر مبنی تھا۔ انھوں نے مغرب کے نئے رجحانات کا خیر مقدم کیا اور دقیانوسی باتوں، رسموں رواجوں اور رجعت پسندی کے مقابلہ میں نئی صنعتی اور مشینی تہذیب، نئے علوم اور نئے رجحانات سے رغبت اور لگاؤ کا مظاہرہ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ اردو ادب میں عقلیت اور حقیقت پسندی کو ایک باقاعدہ تحریک اور ایک مستقل رویہ کی شکل غالب ہی کے خوشہ چینوں شیفتہ، سرسید، حالی، آزاد، شبلی اور ان کے ہم عصروں نے دی جن کے اہم سربراہ تھے۔ سرسید کو اس تحریک کے محور اور رہنما کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے معاشرتی اور قومی اصلاح، تعمیر جدید اور نئے تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے جس مشن کو آگے بڑھانا چاہا تھا عقلیت اور حقیقت کو اس میں قوت محرکہ کی حیثیت حاصل تھی۔

سرسید کی تحریک کو ان کے رفقا میں جس رفیق نے اپنے ادبی و شعری کارناموں اور تخلیقی صلاحیتوں سے بھرپور تعاون دیا وہ حالی تھے۔ شعر و ادب کے بارے میں حالی نے جو تصورات پیش کئے ان کی بنا پر انھیں جدید اردو ادب کے بانیوں اور علمبرداروں میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ حالی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ شاعری مفید عمل ہے اور اسے معاشرہ، ملک اور قوم کی اصلاح کے لئے استعمال کیا جانا چاہئے۔ وہ سادگی، جوش اور اصلیت کو اچھی شاعری کا لازمہ قرار دیتے ہیں اور ایک اچھے شعر کے لئے تجربے کی سچائی اور اس کے اظہار میں سادگی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ حالی نے عقلیت پسندی کے رجحان کو تقویت پہنچائی۔ انھوں نے اپنے پیش کردہ تصورات کی روشنی میں شعر و ادب کے تخلیق کی شعوری کوشش کی۔ چونکہ ان کی ایسی تخلیقات میں خلوص بدرجہ اتم موجود ہے اور وہ اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل بھی تھے اس لئے ان کی وہ تخلیقات بھی اعلیٰ معیار تک پہنچتی ہیں۔ مسدس اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ حقائق، جذبہ اور بے پناہ خلوص ہی کی وجہ سے مسدس شاعری کا ایک بڑا کارنامہ قرار پایا۔

عقلیت پسندی اور حقیقت پسندی میں باہمی تعلق ہے۔ عقلیت پسندی مادیت اور حقیقت پسندی کی تائید کرتی ہے وہ ادب یا خصوصی تنقید

کو سائنس کے قریب لے جاتی ہے۔ عقلیت پسندی ہو کہ حقیقت نگاری دونوں رومانیت کی ضد ہیں۔ رومانی نقطۂ نظر کے حامل ادیب واقعی یا حقیقی چیزوں کی بجائے اُن چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو ہو سکتی ہیں یا ہونی چاہیئے اُس کے علاوہ رومانیت میں عقلیت کے مقابلے میں جذبات اور عقل کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جذبہ اور تخیل بلاشبہ شاعری کے اہم لوازم ہیں لیکن انھیں زندگی کے حقائق پر مبنی ہونا چاہیئے محض جذبہ کی شدت اور تخیل کی پرواز شعر و ادب کو زندگی سے دُور کر دے گی۔ عقلیت پسندی اور حقیقت نگاری کی وجہ سے ادب زندگی کے قریب آئے گا ورنہ ان رجحانات کی عدم موجودگی میں ادب معلق ہو کر رہ جائے گا۔

سرسید اور حالی کے بعد عقلیت پسندی کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں اقبال کا نام قابل ذکر ہے یہ سچ ہے کہ اقبال کے ہاں سرسید حالی، شبلی اور اکبر کی روایات کا امتزاج موجود ہے لیکن اقبال کی شاعری میں سرسید اور حالی کی تحریک کے بعض بنیادی پہلوؤں سے سخت اختلاف بھی ملتا ہے۔

اقبال: "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" کی بجائے۔ "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز" کا مشورہ دیتے ہیں۔ اقبال پاسبان عقل کو دل کے ساتھ رکھنا اچھا سمجھتے ہیں مگر وہ عقل پر عشق اور دل کو ترجیح دیتے ہیں اور عقل کو عشق سے کم تر گردانتے ہیں۔

پریم چند نے عقلیت پسندی کے رجحان کے زیر اثر ماورائی تصورات اور مافوق الفطرت کرداروں کو یکسر بالائے طاق رکھکر حقیقی انسانوں، عام زندگی اور اس کے مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ پریم چند اپنی تخلیقات میں تصوریت پسند بھی نظر آتے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ حقیقت نگار ہیں۔ اور حقیقت نگاری کا یہ اہم فنی رویہ آنے والی ادیبوں کی نسلوں کو پریم چند سے ورثہ میں ملا۔

جوش نے اپنی شاعری میں عقلیت پسندی کے رجحان کو بہت فروغ دیا۔ جوش کے ہاں یہ رجحان ان کے پیش رو شعراء کے رجحان سے کچھ مختلف ہے۔ اس رجحان نے جوش کی شاعری میں باغیانہ اور جارحانہ انداز اختیار کر لیا ہے۔ انھوں نے قدامت پسندی اور رجعت پسندی پر کاری ضرب لگائی۔ توہم پرستی جہالت، مذہبی انتہا پسندی کے خلاف نعرۂ بغاوت بلند کیا اور مذہبی ٹھیکہ داروں کے مکر و فریب اور مذہبی اداروں کی خرابیوں کا پول کھولا۔ جوش کی منظومات عقلیت پسندی اور حقیقت نگاری کے رجحان کی غمازی کرتی ہے۔

عقلیت پسندی کے رجحان کو عام کرنے میں نیاز فتح پوری کا رول نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے افسانے اور تنقید رومانی اور تاثراتی ہیں اور وہ اُردو ادب میں رومانی تحریک کی ایک اہم اور ممتاز شخصیت ہیں مگر نیاز نے اپنے مضامین اور رسالہ "نگار" کے ذریعہ ایک طویل عرصہ تک عقلیت پسندی کی تحریک کو تقویت پہنچائی۔

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء سے ہوا اور بہت مختصر عرصہ میں اس نے ایک وسیع اور ہمہ گیر تحریک کی حیثیت حاصل کر لی انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں جو لکھنو میں اپریل ۱۹۳۶ء میں منعقد ہوئی تھی ایک اعلان نامہ منظور کیا گیا جس کی آخری سطر میں کہا گیا ہے کہ "ہم اُن باتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں ترقی اور تغیر کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں"۔ سرسید، حالی، اقبال، [illegible]

(بقیہ [illegible])

۱ اکتوبر ۱۹۷۸ء

چھوٹے کسانوں کا بڑا ہاتھ

آج ہماری معیشت کو خوشحالی کی سمت لے جانے میں چھوٹے کسانوں کا بڑا ہاتھ ہے ۔ چھوٹے کسانوں کی ترقیاتی ایجنسی (ایس ایف ڈی اے)۔ مارجینل کسانوں اور زرعی مزدوروں کی اسکیم (ایم ایف اے ایل)۔ خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں کا پروگرام (ڈی پی اے پی) اور افزائش مویشیاں کا پروگرام (ایل پی پی) جو فی الوقت آندھرا پردیش میں زیر عمل آوری ہیں درحقیقت ان کا بنیادی مقصد چھوٹے کسانوں کی فلاح و بہبود ہے جو زیادہ تر سماج کے کمزور طبقات سے تعلق رکھتے ہیں

جنوری ۱۹۷۸ء کے ختم تک چھوٹے کسانوں کی ایجنسیوں کی جانب سے بھرپور امداد کے لیے تقریباً ۶.۵۸ لاکھ کسانوں کی شناخت عمل میں لائی گئی ہے جن اضلاع میں خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں کا پروگرام روبہ عمل ہے ان اضلاع میں ۷۵-۱۹۷۴ء اور ۷۸-۱۹۷۷ء کے درمیان ۲۲.۵۴ کروڑ روپیوں کی متاثر کن امداد فراہم ہوئی ہے نتیجتاً توسیع کی جانب مائل ہماری دیہی معیشت میں چھوٹے کسان کو اہم کردار ادا کرنے کے لائق بنانے کے لیے تالابوں کی تعمیر۔ باولیوں کی کھدائی۔ درخت اگاؤ مہم اور دودھیلے مویشیوں کی تقسیم وغیرہ کے کاموں میں حوصلہ افزا پیش رفت ہوئی ہے ۔

No. 19/78-79

- -

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

آندھرا پردیش ۔ حیدرآباد

LETTER NO : 2305/ADVT/C4/78 — Dt. 27-9-78

★ ملکہ خورشید

اقبال کی ظرافت

(مختصر جائزہ)

اقبال کی شاعرانہ عظمت اور فنکارانہ حیثیت تسلیم شدہ ہے۔ یہ عظمت ان کی مخصوص طرز کی فلسفیانہ شاعری میں ہی پنہاں ہے اقبال اسی سے پہچانے جاتے ہیں۔ اقبال کی وہی نوائے پریشاں اُن کی حیات جاوداں کا سبب بن گئی جسے وہ شاعری نہ کہنے پر مصر ہے اقبال کی یہ شاعری تفسیرِ آئینِ حیات ہے۔ لیکن جہاں فلسفیانہ موضوعات کی فنکارانہ پیش کش کا پُر جوش اور متین انداز ہی اقبال کی شاعری کی پہچان ہے وہیں ظریفانہ اور طنزیہ اندازِ بیان بھی کلامِ اقبال میں موجود ہے۔ اقبال کی یہ ظرافت ان کی مقصدیت پسندی کی دین ہے اور ان کی مصلحانہ کوششوں کے نتیجے میں ان کی شاعری میں در آئی ہے۔ اس کو اقبال نے تزئینِ حیات کیلئے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا ہے۔

اقبال کی ظرافت اور ان کا طنزیہ لب و لہجہ ان کی تمام شاعری کی طرح ہی ان کے نصب العین کے تابع ہے۔ جب ظرافت کا استعمال کسی مقصد کے ماتحت ہوتا ہے تو یہ اس کے فنکارانہ استعمال کی دلیل ہے۔ اقبال کی ظرافت بھی محض تفننِ طبع کے لئے نہیں بلکہ اس کا محرک اقبال کا وہ جذبۂ اصلاح ہے جس کی بدولت وہ "اپڈیٹنگ" بنے جہاں سنجیدگی سے بات نہیں بنتی وہاں اقبال نے ظرافت کو پیرائیہ بیان کے طور پر استعمال کیا ہے اقبال کی شاعری با مقصد اور اصلاحی ہے اسے اس کے پس منظر کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہر عہد کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اس دور کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی حالات سے واقفیت ضروری ہے۔ ہر عہد کی شاعری لازماً متاثر ہوتی ہے۔ فن اور فنکار دونوں اپنے عہد کے میلان و ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ اقبال کا عہد بڑی اہم تبدیلیوں کا عہد تھا۔ ملک میں سیاسی اور سماجی تحریکات کی ابتدا ہو چکی تھی۔ سارے عالم میں افراتفری کا سماں تھا۔ ایشیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ ہندوستان بھی اپنی انفرادیت کھو رہا تھا مغرب کی چکا چوند روشنی سے دل و دماغ مسحور ہو رہے تھے۔ مغربیت کا طوفان تمام مشرقی صالح قدروں کو بہانے لئے جا رہا تھا۔ یورپ کی پیروی باعث افتخار تھی۔ مغرب کی ذہنی غلامی کے ہاتھوں اپنی تہذیب و تمدن سے بیزاری پیدا ہو گئی تھی۔ اقبال اسی کے شاکی ہیں۔ پیروئ تہذیب مغربی کا نمایاں نتیجہ بے راہ روی، بے پردگی اور اخلاقی قدروں سے بیزاری کی صورت میں رونما ہوا تھا۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ

روایتی مخالفانہ پس منظر رکھنے والے شرفا بھی نئی تہذیب کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے اس کے حامی ہو گئے۔ اس نئی تہذیب نے جہاں عورتوں کو بے پردہ کیا وہاں مردوں کی ان کی مردانہ وضع، اور صفاکٹ ناخو بھی چھین لی۔ نئے فیشن نے مردوں کو سجا سنوار کر عورتوں کی صف میں لا کھڑا کیا:

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

قوم کے رہنما بھی مصلحت اندیشی کا شکار تھے:

کچھ غم نہیں جو حضرتِ واعظ ہیں تنگ دست
تہذیبِ نو کے سامنے سر اپنا خم کریں!

یہ مصلحت کوشی دراصل غلامانہ ذہنیت کی علامت ہے جو تہذیبِ نو کی پیروی کو ہی ترقی کا زینہ سمجھے ہوئے تھے۔ اقبال تعلیم و تہذیبِ نو کی نعمتوں کے منکر نہیں ہیں۔ اس ذہنیت کے مخالف ہیں جس سے کہ خودی مجروح ہوتی ہے وقار متاثر ہوتا ہے۔ اقبال کی بصیرت نے دیکھا کہ "تعلیم مغربی" کی جراُت آفرینی اور تیز روشنی نے آنکھوں کو چندھیا دیا تھا

دھیوں کو مشکوک کر دیا تھا۔ نہ اپنی انا کا پاس رہا تھا نہ اپنی ذلت کا احساس:

میرا یہ حال بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں
ان کا یہ حکم دیکھ مرے فرش پر نہ رینگ

اقبال کی ظریفانہ شاعری کو بھی ان کی اصلاحی مساعی کے تحت ہی رکھنا چاہیئے۔ خود شناسی کا تقاضہ ہے جس کے لیے اقبال نے ظرافت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ ان کی ظرافت کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ یہ دیگر تو سے خالی نہیں۔ شیخ، برہمن، مولانا، کونسل اور ہنٹر، ایکشن، ممبر وغیرہ ظرافت اقبال کے خوبصورت علائم ہیں جن سے اقبال کی ظرافت کے فن کا خمیر تیار ہوا ہے۔ ان میں سے بعض علامتیں سماجی ہیں اور بعض کو سیاسی حیثیت حاصل ہے۔

ہندوستان میں جز و حکومت ہیں کونسلیں
آغاز ہے ہمارے سیاسی کمال کا
فالتو وقت کے لئے ترستے تھے شیخ جی
دھوکا ہوا واقف کرتے ہے جانثار بھی

اقبال کی ظرافت کسی مصلحت اندیشی کا نتیجہ نہیں اس لئے اس میں طنز کی کاٹ بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے:

[illegible] لکھی میں یہ کہ کہیں ہم بھی
[illegible] کو جاپ لیں تو کہیں
تو بے لڑکوں کے کام آسکے گی

[illegible]
[illegible] فرمایا [illegible]
[illegible] ہو تو بہیں

چھٹے بتے ایک ہی تھیلے کے ہیں
ساہو کاری بسوہ داری سلطنت

مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا
کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داری کا

حالات کے دھارے میں سب ہی بہہ رہے تھے۔ ایمان کا غلط تصور تھا "کلمہ گو مئے فروش" قوم کی لٹیا ڈبو رہے تھے۔ اقبال کی ظرافت میں ہندی انگریزی الفاظ کے استعمال کے سلیقے نے چار چاند لگا دیئے ہیں ؎

جان جائے ہاتھ سے جائے نہ ست
ہے یہی اک بات ہر مذہب کا تت

اور

من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اقبال اپنی باتوں کی طاقت سے واقف تھے اسی لئے اپدیشک سیفہ۔ یہ الگ بات ہے کہ "گفتار کا غازی" درحقیقت کردار کا بھی غازی بنا ساتھ کہ اقبال ازراہ انکسار ذکر نہیں کرتے۔ کلیات اقبال میں ظریفانہ کلام کا حصہ اگرچہ بہت کم ہے پھر بھی اس کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مجموعی طور سے اقبال کی ظرافت بھی انہی کے نصب العین کی دین ہے۔ اس کا مقصد محض ہنسی ہے۔ البتہ اس میں فن کی لطافت اور مقصد کی ثقالت دونوں کی جلوہ گری ہے ——

بقیہ: اردو ادب میں عقلیت پسندی کے عناصر

کی بعض اہم روایات کو اس تحریک نے آگے بڑھایا۔ بے عقلی اور غیر سائنٹفک رویہ کی بجائے ادب میں عقلیت پسندی اور سائنٹفک رویہ کو بنیاد بنانے پر زور دیا گیا۔ ماضی پرستی کی بجائے عقل کی روشنی میں ماضی کے مطالعہ کو ضروری سمجھا گیا اور عوام اور ادب کے رشتہ کو سائنٹفک طریقے سے ارتقائی انداز میں جوڑا گیا۔

غرض یہ کہ عقلیت پسندی کے رجحان کو جس کی بنیاد سر سید نے آج سے سو سال قبل اردو ادب میں باقاعدہ طور پر رکھی تھی رفتہ رفتہ فروغ حاصل ہوتا گیا اور جدید علوم و فنون کی ترقی کے زیر اثر یہ رجحان ایک عمومی میلان کی شکل اختیار کر گیا یا دوسرے الفاظ میں کہئے ہمارے ادبی و تخلیقی رویہ میں ایک لازمی فکری عنصر کی حیثیت حاصل ہو گئی آج عقلیت سے انحراف عیب و کمزوری کے مترادف مانا جاتا ہے یہ اور بات ہے کہ عقلیت کو نظرانداز کرنا یا اس کی نفی کرنے کے لئے بھی عقلیت کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتے ہوئے اس کے ڈانڈے عشق و جنون سے ملا دیئے جاتے ہیں اور دلیل و منطق کی معرفت سے ابہام اور تجریدی تصوریت کے معروضوں کا اطلاق کیا جاتا ہے ——

اساتذۂ سخن کی اصلاحیں

خان صاحب نواب جعفر علی آثر لکھنوی

شعر : اصغر گونڈوی

زلف تھی جو بکھر گئی رخ تھا کہ جو نکھر گیا
ہائے وہ شام اب کہاں ہائے وہ اب سحر کہاں

اصلاح :

زلف تھی جو بکھر گئی رنگ تھا جو نکھر گیا
ہائے وہ شام اب کہاں ہائے وہ اب سحر کہاں

رنگ نکھرتا ہے نہ کہ رخ۔ مصرعۂ اولیٰ میں "کہ" بھی زائد تھا اس ترمیم سے دونوں سقم رفع ہو گئے۔

شعر : اصغر گونڈوی

کچھ ان کی شوخیوں سے مجھے وہم ہو چلا
دیکھوں تو قلب چھاڑ کے شکل اضطراب کی

اصلاح :

کچھ ان کی شوخیوں سے مجھے وہم ہو چلا
دیکھوں تو دل کے چاک سے شکل اضطراب کی

دوسرے مصرعہ کی ترمیم سے شعر میں جو لطافت پیدا ہو گئی اس کی جس قدر داد دی جائے کم ہے۔

شعر :

مطلب وہ عرض مطلب میں شوخی عنوان
مطلب وہ شوق کی نیرنگی ادا باقی

اصلاح :

مطلب وہ عرض مطلب میں شوخی عنوان
[illegible]

ایک لفظ کی ترمیم سے شعر میں رنگ پیدا ہو گیا۔

شعر : اصغر

میخانے کی اک روح مجھے کھینچ کے دیدی
کیا کر دیا ساقی نگہ ہوش ربا سے

اصلاح :

میخانے کی اک روح مجھے کھینچ کے دیدی
ساقی نے جو دیکھا نگہ ہوش ربا سے

بلاشبہ "کیا کر دیا" کا یہ محل نہیں تھا لہٰذا مصرعۂ ثانی کی ترمیم سے شعر کے معنی صاف ہو گئے۔

شعر : اصغر

ادھر وہ خندۂ گلہائے رنگیں صحن گلشن میں
ادھر اک آگ سی بھڑکا دو بلبل کے نشیمن میں

اصلاح :

ادھر وہ خندۂ گلہائے رنگیں صحن گلشن میں
ادھر اک پھول آ پڑنا وہ بلبل کے نشیمن میں

اول تو دونوں مصرعے دو لخت ہیں دوسرے "آگ بھڑکانا" کسی قدر ذم کا پہلو لئے ہوئے تھا اس اصلاح سے دونوں عیب رفع ہو گئے۔

شعر : اصغر

ذرا سے پردۂ محمل کی کیا حقیقت تھی
[illegible]

اصلاح :

ذرا سے پردۂ محمل کی کیا حقیقت تھی
نگاہ قیس کہیں خود ہی پردہ دار نہ ہو

مصرعۂ ثانی میں بجائے غبار کے "نگاہ" بنا کر یہ نوٹ تحریر فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے شاعر نے "غبار قیس" سے یہ مراد لی ہے کہ جو غبار قیس کے تگ و دو سے بلند ہوا حالانکہ غبار قیس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ قیس خاک ہو گیا اس کا غبار پہلی صورت میں شعر کا مذاق پست ہو جاتا ہے دوسری صورت میں شعر مہمل ہے۔ اگر سوجھ بوجھ ہوتی تو بجائے غبار کے لفظ "نگاہ" لاتے۔

شعر : اصغر

ہاں وادیٔ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے
موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوق نظر دیکھا

اصلاح :

ہاں وادیٔ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے
موسیٰ نے فقط اپنا ہی ذوق نظر دیکھا

مصرعۂ ثانی میں فقط "اک" حشو تھا۔ اس لئے بجائے اس کے "ہی" بنا دیا۔

آئندہ اصلاحیں

نواب فصاحت جنگ جلیل

جواب طلب امور کیلئے جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجنا ضروری ہے!

رؤف خیر

فرصت کم کم

منہ اندھیرے روز جو کھٹ چھوڑتا ہوں
فائلوں میں سر کھپا کر
رات کتنی دیر سے گھر لوٹتا ہوں
ایک عرصے سے یہی معمول ہے

اپنی ننھی منی بیٹی کی منّا جاتیں
وہ پیاری پیاری باتیں
کب سُنوں سینہ پھلا کر
سوچتا ہوں !

نجم الہدیٰ

خود فریبی

چودھویں رات کی دلربا چاندنی
اور تاروں کی مدھم ضیاء
دامنِ دل کو چھوتی ہوئی
خوشبوؤں سے بھری، وجد کرتی ہوئی
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
رت بدل بھی گئی چپکے چپکے سلونی فضا
سامنے کب سے ہر اک شئے پہ پرتو فگن ہے
بہاروں کی رنگین قبا
جانتا ہوں کہ سیماب پا ہیں یہ سامنے کے سارے، مگر
والہٗ جلوۂ سیمیائی پہ پیار آ گیا !
ہر لمحہ بدلتی ہوئی زندگی کے نظاروں پہ کیوں اعتبار آ گیا !

قطب سرشار

خلاؤں میں

کوئی مجھ سے یہ پوچھتا ہے
خلاؤں میں کیوں گھورتے ہو، خلاؤں میں کیا ہے ؟
کئی رازِ پنہاں
کئی عہدِ رفتہ کے پُر کیف لمحے
کھنکتے ہوئے دلنشیں قہقہے
دہنِ شیریں سے نکلی ہوئی غسل آمیز لہجوں میں سرگوشیاں
پیار کی
جلوہ افروز چہرہ کی مہکی ہوئی
دودھیا چاندنی، تمتماتے ہوئے سرخ رخسار کی
دھیمی دھیمی لَویں
حسنِ مغرور کے پھول پیکر ثمر
جسم کا لمس جیسے مساس سمن
گرم انفاس کی خوشبوؤں میں بسی والہانہ لپک
دلکش و دلربا دلنشیں خواب ہیں
کیف و مستی کے گرداب ہیں
شش جہت زندگانی کے آثار ہیں
حُسن کا ایک مخفی جہاں ہے .... خلاء

●●

غزلیں

جرّام محمد آبادی

حدیثِ گلرخاں اچھی لگے ہے
یہ شرحِ گلستاں اچھی لگے ہے
سناؤ ہاں سناؤ آپ بیتی
تمہاری داستاں اچھی لگے ہے
غرورِ حسن و نازِ نو جوانی !!
بہارِ بے خزاں اچھی لگے ہے
بُری لگتی ہے اپنی فتنہ سازی
حدیثِ دیگراں اچھی لگے ہے
رچی ہے جس کہانی میں جوانی
وہی سے مہرباں اچھی لگے ہے
زمیں والوں کے زعمِ سرکشی سے
فضائے آسماں اچھی لگے ہے
چھڑک لو مانگ پہ افشاں چھڑک لو
فلک پہ کہکشاں اچھی لگے ہے
فنا کا پیش خیمہ ہے یہ پھر بھی
بہت عمرِ رواں اچھی لگے ہے
اُنھیں میں جرّام صاحب بھی ہیں شامل
جنھیں اُردو زباں اچھی لگے ہے

مہدیؔ پرتاب گڈھی

کرب جب روح کا آنکھوں میں اُتر آئے گا
اک دھواں سا ترے چہرے پہ نظر آئے گا
دورِ تہذیب میں بھی خونِ بشر سستا ہے
کیا کوئی اور اذیت کا سفر آئے گا
اندھی راہوں کے مسافر تجھے معلوم بھی ہے؟
اِس سمندر میں تو ہر آن بھنور آئے گا
جس کو تاریکیٔ شب شہر بدر کر کے گئی
کیا خبر تھی وہ بہ اندازِ سحر آئے گا
زندگی ایک سمندر سہی تسلیم مگر
اس میں جب اُتروگے پایاب نظر آئے گا
اپنی تنہائی سے گھبرا کے کسی دن انسان
اپنی ہی روح کے ساگر میں اتر آئے گا
وقت کے ساتھ بدل جاتی ہیں قدریں مہدیؔ
اجنبی بن کے تو خود اپنے ہی گھر آئے گا

بے تاؔب پیلی بھیتی

نقش آڑے ترچھے بھی روپ کی ہیں تعبیریں
فن اگر مکمل ہو بولتی ہیں تصویریں
سختیٔ عزائم سے خود ہی ٹوٹ جاتی ہیں
ہاتھ کی یہ ہتھکڑیاں پاؤں کی یہ زنجیریں
آدمیت انساں کو بانٹتی ہے خانوں میں
پستی و بلندی کیا ہیں کسی کی جاگیریں
دیکھتے رہے بیٹھے ہاتھ کی لکیریں ہم
لوگ آ گئے لے کر چاند کی بھی تصویریں
وقت کے تقاضوں کا ساتھ جو نہیں دیتے
کب معاف کرتا ہے وقت اُنکی تقصیریں
ہو اگر کہیں اِن میں کچھ خلوص کی گرمی
رنگ لائیں تحریریں یا اثر ہوں تقریریں
یہ اجنتا ایلورا تاج میں جو اُبھری ہیں
عشق ہی کے خوابوں کی ہیں حسین تعبیریں
کوئی بھی نہیں جاگا شہر بے حسی میں دوست
دستکیں بھی دیں میں نے کھٹکھٹائیں زنجیریں
پڑھنے والا ہو کوئی چہرۂ پر ہی بے تابؔ
اُبھری اُبھری ملتی ہیں آج دکھ کی تحریریں

نصیر پرواز

بھاگیہ ودھاتا کھیل رہا ہے دنیا ایک کھلونا ہے
پیاسے من نے قطرے کو بھی گہرا ساگر کر ڈالا
قسمت میں گر لکھی ہوگی کانٹوں کے اشکوں کی فصل
نہ میں اس کو ہاتھ لگاتا نہ اس کے سپنے بنتا
جہاں جہاں تیرے ہاتھوں نے چھوڑا ہے میری کایا کو
سچائی ہنستہ کھول چکی ہے سارے پتھر پگھل چکے
سپنوں کا سارا سرمایا اس دنیا نے لوٹ لیا
اپنے جگ میں پیار اور نفرت دکھ سکھ اپنے بیگانے
بجھنے لگا عمر کا سورج شام بیرہ کی آ پہنچی
کون تری بستی میں جائے کون یہ جھوٹا سوانگ رچے

پل دو پل کا ہنسنا ٹھہرا جیون بھر کا رونا ہے
انگ انگ اجیلا تھا ٹھہرا گھر گھر روپ سلونا ہے
آج مگر دل رادھا دھرتی پر ہم کو غم ہی بونا ہے
کاش کوئی یہ بتلا دیتا اسکو اک دن کھونا ہے
جیون بھر اشکوں سے مجھ کو انگ انگ وہ دھونا ہے
کل جس نے کاش مجھ کو چھوا تھا آج وہ سانس کا بونا ہے
باقی ہے جو سانس کی دولت کل اسکو بھی کھونا ہے
جانے کیسے لوگ ہیں جن کا جیون چاندی سونا ہے
چادر ہے اندھی تاریکی مٹی آج بچھونا ہے
قسمیں ہونگیں وعدے ہونگے اور وہاں کیا ہونا ہے

گنگا جل کی خواہش کی تھی تن کی چتا جلی پرواز
آگ کے اس دریا میں مجھ کو اپنا جسم بھگونا ہے

حسیر نوری
(بنگلہ دیش)

خود اپنی خواہشوں پہ بھروسہ نہ تھا مجھے
آسیب کا نگر کوئی کہتا نہ تھا مجھے

سورج گنوا کے دھوپ کی سرسبز وادیاں
تاریک دشت ہوں گی یہ دھڑکا نہ تھا مجھے

اس شہر بے پناہ میں مجھ پر مصیبتیں!
تیرے لئے تھیں تو نے ہی پوچھا نہ تھا مجھے

جو زخم تھا بدن میں وہ جز و بدن رہا
تم کہہ رہے ہو پیار سے دیکھا نہ تھا مجھے

جب تک مرے بہاؤ میں بہتا رہا حسیر
طوفان اپنا دریا سمجھتا نہ تھا مجھے

غزلیں

ڈاکٹر زریش

دل کا سکون ہوں نہ نظر کا قرار ہوں
جام شگفتہ ہوں نہ غم سوگوار ہوں

میرے لئے بھی دار و رسن کا ہو اہتمام
پتھر اٹھا کے مجھ کو دکھانے سے پیشتر

اہل وفا کے قلب حزیں کی پکار ہوں
پارینہ مے گساروں کی اک یادگار ہوں

میں بھی تو حق پرست حقیقت نگار ہوں
یہ سوچ لے کہ میں ترا آئینہ دار ہوں

کل تک زریش بزم رفیقاں مجھی سے تھی
گو آج میں رہین غم روزگار ہوں

عاتق شاہ

(افسانہ)

دمڑی کا مرد

وہ دمڑی کا مرد تھا!

اور وہ دمڑی کی عورت! ان دونوں میں وہی ازلی اور ابدی تعلق تھا جو دنیا کے پہلے آدم اور حوا میں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ حوا کو آدم کی پسلی سے بنایا گیا تھا۔ لیکن یہاں بطور خاص اللہ میاں نے دمڑی کے مرد کو دمڑی کی عورت کی پسلی سے بنایا تھا۔ اس لئے دمڑی کا مرد جو ہمیشہ اپنی عورت کی کاربن کاپی معلوم ہوتا تھا۔ شائد اسی لئے وہ دمڑی کی عورت کے دماغ سے سوچتا اس کی آنکھ سے دیکھتا اور اس کی زبان سے بولنے کی کوشش کرتا۔ اصل میں اس کی اپنی ذاتی کوئی شے نہیں تھی۔ اگر تھی بھی تو اس نے اسے اپنی عورت کے یہاں رہن رکھ دی تھی۔ بلاشبہ وہ سو فیصد دمڑی کا مرد تھا!

دمڑی کے مرد کا کوئی نام نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو لوگ اس کے سرکاری یا خاندانی نام کو بھول چکے تھے۔ اور نئی نسل تو اس بات سے واقف ہی نہیں تھی کہ اس کا بھی کوئی نام تھا۔ اور یوں بھی اس نے کبھی اپنے نام کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ وہ دمڑی کی عورت کے شوہر کی حیثیت سے مشہور تھا اور وہ اس پر فخر کرتا تھا کہ وہ فلاں بنت فلاں کا شوہر ہے!

عام طور پر بیویاں اپنے شوہروں کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ بیگم فلاں ابن فلاں۔ مسز فلاں — لیکن دمڑی کا مرد اپنی بیوی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مسٹر فلاں بنت فلاں کا شوہر — مسٹر سوائنڈ سو — ہسبنڈ آف سوائنڈ سو!!

دمڑی کے مرد کی تاریخ اور جغرافیہ دونوں اندھیرے میں تھے البتہ پہلے کے ایک دو بوڑھے زندہ تھے جو اس کے ماں باپ سے واقف تھے۔ اور ان کا کہنا ہے کہ شادی کے فوری بعد وہ اپنے آبائی مکان کو چھوڑ کر فادر ان لا یعنی سسر کے گھر منتقل ہو گیا۔ اور اس کے بعد کبھی اس نے اپنی بوڑھی ماں اور باپ کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ ایک بار باپ نے ملنے کی کوشش کی تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا اور نہ یہ اس کی ذمہ داری ہے!

ماں باپ ہوئے تو کیا ہوا — کیا اولاد اس لیے پیدا کی جاتی ہے کہ اس سے سود در سود وصول کیا جائے۔ کم از کم فارن میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ بوڑھے ہوتے ہی انھیں ریسٹنگ ہاؤز بھیج دیا جاتا ہے لیکن یہاں اپنے ملک میں — توبہ!!

ایک بار بڑی بیوہ بہن ملنے کے لیے آئی تو اس کی بیوی نے اسے اپنے گھر میں قدم رکھنے نہیں دیا۔ لہٰذا باہر جا کر فٹ پاتھ پر اس نے اپنی بہن سے ملاقات کی اور سخت لہجے میں اپنی بہن سے اس نے کہہ دیا کہ وہ آئندہ اس سے ملنے نہ آئے کیونکہ اس سے اس کی پوزیشن اور شخصیت دونوں متاثر ہوتے ہیں!

بہن کیا کہتی سکتے کے عالم میں آنکھیں پھاڑ کر اسے یوں دیکھتی رہ گئی جیسے اُسے اپنے کانوں پہ یقین نہ آیا ہو اور جب یقین آیا تو وہ الٹے پاؤں لوٹ گئی۔ اور پھر کبھی پلٹ کر نہ آئی۔

دمڑی کے مرد نے خود اپنی شادی کی اور ماں باپ نے برائے نام عام مہمانوں کی حیثیت میں شرکت کی۔ کیونکہ اس شادی میں اس کی پسند کو دخل تھا۔ شادی سے پہلے وہ اپنی سویٹ ہارٹ کے پیچھے لگاتار کئی مہینوں اور برسوں گھومتا رہا۔ آخر ایک دن سویٹ ہارٹ کے باپ کو اس پر رحم آ گیا۔ اور اس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا کہ آج سے یہ تمہاری ہے!

جس کا مطلب تھا کہ اب تم اس ایئر کنڈیشن بنگلے چمکتی ہوئی کار اور سامنے دو درجن نوکروں کے مالک بن گئے ہو۔ یہی نہیں بلکہ بینک کی

اس بلجک کا ایک کیمیو اسٹیل الماری میں محفوظ ہے۔ ہاؤ ینگ یو آر!

دوسری طرف اس نے اپنی بیوی سے کہا بے بی! کیا ہرج ہے اگر تم اسے قبول کرو۔ میرا خیال ہے اس سے اچھا اور خوش شوہر تمھیں نہیں ملے گا۔ جیسے کوئی سہیلی بڑے رازدارانہ انداز میں اپنی کسی سہیلی کو یہ پُرخلوص مشورہ دے کہ رکھ لے گھر میں اسے — کوئی چیخ پکار نہیں ہوگی۔

دمڑی کے مرد کو اپنی پسند پر ناز تھا۔

اس کے خیال میں اس کی بیوی سے زیادہ حسین اور کوئی عورت آس پاس میں نہیں تھی۔ اور جہاں تک ذہانت کا تعلق تھا اُس کی بیوی لاکھوں میں ایک تھی۔ تمام تام کالج نے آج تک ایسی ذہین طالبہ کو پیدا نہیں کیا!

وہ بات بات پر ان پروفیسروں کے حوالے دیتا جنھوں نے اُس کی بیوی کی کلاس روم میں تعریف کی تھی۔ اور پھر یوں خوش ہوتا جیسے پروفیسروں نے اُس کی بیوی کی نہیں بلکہ اس کی تعریف کی ہو!

پہلے تو جوان عورت اور اس پر حسن کچھ نہ پوچھیے۔ بس اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگتی اور وہ آپ ہی آپ بڑبڑاتا۔ ہاؤ سویٹ شی از — ہاؤ سویٹ!

اور یہ کہتے ہوئے اُس کے چہرے پر اُجالا پھیل جاتا!

وہ دبلا پتلا اور اوسط قد کا تھا۔ لیکن جہاں حسین عورتیں ہوتیں وہ ہیرو بننے کی کوشش کرتا۔ اور فلمی ڈائیلاگ بولتا۔ ہاؤ سویٹ — ونڈرفل — مارولس — کبھی آدھی انگریزی اور کبھی آدھی اردو سے وہ کام چلا لیتا۔

حسین عورت اس کے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی سچائی تھی۔ جہاں جہاں اُسے حسین عورت نظر آتی وہ اندر ہی اندر اچھل پڑتا۔ خواہ وہ حسین عورت اُس کے دوست کی بہن ہو یا بیوی۔ ہر حسین عورت کو چاہنا وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا اسی لیے تو ہر اس شخص کو اپنا دوست بنا لیتا یا اس کا دوست بن جاتا جس کی بیوی حسین ہوتی!

بھابی — بھابی!

کہتے ہوئے وہ کبھی اپنا منہ نہیں سکھاتا!

کبھی اپنے دوست کی بیوی کو اپنی کار میں لفٹ دیتا۔ اور کبھی کار لے کر دوست کے گھر چلا جاتا۔ تاکہ پکنک کے لیے اس کی فیملی کو لے چلے۔ یہی نہیں وہ وقتاً فوقتاً اپنی منہ بولی بھابیوں کے لیے جیب سے پیسہ بھی خرچ کرتا رہتا۔ اور اس دوران اگر اس کے کسی پیارے دوست کا انتقال ہو جاتا تو پُرسے کے ساتھ اپنی عزیز بھابی کی خدمت میں اپنا محبت نامہ بھی پیش کر دیتا۔ اور کہتا کہ وہ اپنے عزیز مرحوم دوست کی ذمہ داری کو سینے سے لگانے کے لیے تیار ہے۔

دمڑی کی عورت کو اپنے شوہر کی اس ہابی کا علم تھا۔ لیکن اس تعلق سے اُس نے کبھی اپنے شوہر سے کچھ نہیں کہا۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنے شوہر سے پوری پوری طرح مطمئن تھی وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے آگے بڑھ نہیں سکتا کیونکہ اُس کی "ہر شے" اس کے پاس رہنی تھی۔ اگر اتنا بھی وہ نہ کرے تو کیا کرے — بے چارہ — اسی لیے وہ بڑے پیار سے شوہر کو گھر میں چھوڑ کر سوشل کاموں میں مصروف ہو جاتی۔ اس کی پبلک انگیجمنٹ کا یہ حال تھا کہ آج یہاں پارٹی تو کل وہاں ڈنر — اور پرسوں شہر کے باہر پکنک —

اگر کبھی اُسے وقت مل جاتا اور اُس کا شوہر اپنی سویٹ ہارٹ یعنی اُس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا تو وہ ایک بلی کی طرح غرا کر پنجہ مارتی اور پھر جھلا کر تیکھی آواز میں کہتی 'یو ناٹی' سلی بوائے — ڈونٹ ڈسٹرب می۔

اپنی بیوی کے اس ریمارک پر وہ خوش ہو جاتا۔ اور اس لیے کہ انگریزی کے مشہور ناولسٹ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے ناول کی ہیروئین بھی اسی انداز اور لب و لہجے میں اپنے شوہر سے بات کرتی تھی!

"سلی بوائے" پیار کا نام تھا جو اُس نے شوہر کو دیا تھا۔ اور یہ ٹائٹل اس وقت استعمال کیا تھا جب وہ شادی سے پہلے کسی اور کو چاہتی تھی۔ لیکن سلی بوائے کا اصرار تھا کہ وہ اس کی ہو جائے یا اُس کو اپنا لے۔

چنانچہ وہ اس کی ہو گئی!

آخر اس میں برائی کی کیا بات تھی۔ شادی کا فیصلہ تو اس کا اپنا تھا آخر کچھ تو تھا

بات جو۔ اور ایک دن وہ نئی بات ہوئی اور وہ یہ کہ شادی کے چھ مہینے کے اندر اندر وہ ایک لڑکی کا باپ بن گیا۔ چھ مہینے ہی۔ جب کہ اس دنیا کے لاکھوں اور کروڑوں انسان اس منزل پر نو مہینے کے ختم پر پہنچتے ہیں اور وہ چھ مہینے میں پہنچ گیا۔ آخر ہوئی نا کچھ تو نئی بات!

اپنی اکلوتی لڑکی کو وہ بے حد چاہتا تھا۔

وہ اپنی ماں کی طرح ذہین اور حسین تھی ویسے اس کا قد اُس کی طرح اوسط تھا۔ لیکن کھڑی ناک پروفیسر جیمس کی تھی۔ روشن بڑی بڑی آنکھیں مسٹر لبتہ والا کی تھیں۔ رنگ فرہاد آسمانی کا تھا۔ آواز نور محمد کی تھی!

اور نور محمد گھر کی کار کا ڈرائیور تھا —

مسٹر لبتہ والا تاج محل بنک کا جنرل منیجر تھا پروفیسر جیمس ٹام ٹام کالج میں پولیٹیکل سائینس پڑھاتا تھا۔ اور فرہاد آسمانی شہر کی سب سے بڑی ہوٹل اور بار کا مالک تھا!

وہ ایک کی نہیں سب کی بیٹی تھی!

یہی نہیں وہ سب کی طبیعتوں کا مجموعہ تھی اپنی ماں سے اُس نے بات کرنے کا سلیقہ حاصل کیا تھا۔ نور محمد سے تیزی اور کسی کو اوور ٹیک کر کے آگے بڑھ جانے کا جذبہ' فرہاد آسمانی سے بہترین غذائیں اور اچھی شراب پینے کا ذوق' پروفیسر جیمس سے فن خطابت اور مسٹر لبتہ والا سے کمپیوٹر سے زیادہ تیز نوٹوں کی گنتی کا آرٹ!

یہ نئی لڑکی اس صدی کا معجزہ تھی۔ اور حقیقی معنوں میں یہ نئی تھی۔ ابھی حال حال میں اس نے اپنی عمر کے انیسویں بہاریں ختم کر کے بیسویں سال میں قدم رکھا تھا۔ برتھ ڈے پارٹی میں شہر کے بڑے بڑے لوگوں نے اس نئی شرکت کی اور چند نوجوان اپنی قسمت آزمانے آئے تھے۔ لیکن اس نئی لڑکی نے کسی کو لفٹ نہیں دی!

ویسے اب تک چار بوائے فرینڈ اس کی انیس سالہ زندگی میں آ کر جا چکے تھے۔ لیکن آج —

آج جو بوائے فرینڈ اس کی لڑکی سے ملنے آ رہا تھا وہ — وہ —!! وہ اُسے پسند نہ تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے کبھی اس نے اپنی اکلوتی لڑکی کو پچھلے چار بوائے فرینڈس پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ روشن خیال تھا اور سمجھتا تھا کہ لڑکیوں کو اس بات کی آزادی ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے لائف پاٹنر کو دیکھ بھال کر منتخب کریں۔ لیکن وہ — وہ تو اس کی بیوی کا بوائے فرینڈ رہ چکا تھا۔ تو پھر یہ بات اُسے کچھ عجیب سی معلوم ہوئی —

پہلے ماں — پھر بیٹی!!

اس اُلجھن کو اُس کی پیاری اور چہیتی بیوی نے فوراً نوٹ کر لیا۔ اور پھر بڑے لاڈ سے اُس کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ڈیر ڈارلنگ! یہ تم کیا دقیانوسی باتیں سوچ رہے ہو۔ غور کرو زمانہ کدھر سے کدھر نکل گیا۔ اور تم اب تک —! یاد ہے پرسوں ہم نے ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی جو ناول پڑھی تھی اُس کے ہیرو نے کیا کہا تھا؟

کیا کہا تھا؟

یہی کہا تھا کہ کوئی قدر مستقل اور مستحکم نہیں سب قدریں اضافی ہیں۔ آل ریلیٹو ویلیوز — کم از کم پڑھے لکھے آدمی کو چاہیئے کہ اپنا وژن بڑا رکھے!

اس کے ساتھ ہی اُس کے پیارے شوہر کے دماغ میں ایک روشنی سی چمکی۔ اور اُسے سب کچھ یاد آ گیا۔ ہاؤ سویٹ شی از۔ ٹوٹلی ماروِلس!

پھر اُس نے اپنی سویٹ ہارٹ سے کہا' سوری مائی ڈیر!

پھر دونوں میاں بیوی یعنی دمڑی کا مرد اور دمڑی کی عورت اپنی اکلوتی لڑکی کو بنگلے میں اکیلا چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ تاکہ وہ اپنے پانچویں بوائے فرینڈ کو اچھی طرح سمجھ سکے!!○○

خونی سہرا

خلیل سیمابی گوالاری

مدینہ کے کوچہ و بازار پر نور کی بارش ہو رہی تھی۔ دو آفتاب ایک ساتھ طلوع ہوتے تھے۔ ایک آفتاب فلک دوسرا آفتاب نبوت! زندگی کا کوئی گوشہ نہ تھا جہاں روشنی نہ ہو۔ اندھیرے سمٹ کر رہ گئے تھے اور انسانی تمدن میں اُجالا ہی اُجالا تھا۔ تاریکی نے ان مایوس انسانوں کو بھی دیکھا ہے جو دل محسوس کر لیتے تھے کہ ہم نہ جانور ہیں نہ انسان! دنیا ان سے پیار نہیں کیا تھا اس لئے کہ وہ بدصورت تھے۔ بدقطع تھے۔ بدرو تھے۔ لیکن دنیا انھیں ٹھکراتی ضرور تھی احساس کرب سے چیختے تھے کہ کیا بدصورت آدمی محبت کا مستحق نہیں ہے؟ کیا صورت اور حسن و رعنائی سے محروم جسم میں انسانی روح نہیں ہوتی؟

سعد بھی محبت کے پیاسے تھے وہ بدفام تھے اور لاتے سیاہ فام تھے کہ اسود ان کے نام کا جزو بن گیا۔ صورتاً حسن و رعنائی سے محروم لیکن ان کے پیکر سے ایک عظیم المرتبت انسان کی روح تھی۔ دنیا اُن سے بیزار تھی اور وہ دنیا سے بیزار تھے۔ ان کی بدصورتی ان کے لئے سماج کا ایک جرم بن گئی تھی وہ جسے بھی پیار کی نگاہ سے دیکھتے وہ پیار کی نگاہ کا جواب حقارت بھری نظر سے دیتا۔ اُن کے سینے میں بھی آدمی کا دل تھا اور یہ دل اتنی بار ٹوٹا تھا کہ چور چور ہو گیا تھا۔ زمانہ ظاہر پرست ہوتا ہے اس کی نگاہیں حسنِ باطن تک یا تو پہونچتی ہی نہیں یا ان رنگین مناظر میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ہی ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ جناب سعد میں حسنِ سیرت کی کوئی کمی نہ تھی لیکن دنیا ان کی صورت دیکھ کر ان کی بے قیمتی کا مایوسانہ احساس دلا رہی تھی۔ عرب کی کوئی بھی عورت ان سے شادی کرنے تیار نہ تھی۔

بدصورتی کے احساس کے ساتھ تنہائی کا غم سانپ بن کر اُن کے دل کو ڈس رہا تھا۔ اور جناب سعد بے دردی زمانہ کی ٹھوکر کھا کر میں اس طرح کراہ رہے تھے جیسے کوئی بچہ اپنے ہاتھ میں آگ کا انگارہ اُٹھائے اور بلک بلک کر رو رہا ہو ان کا کوئی سہارا نہیں تھا لیکن کس نے رہنمائی کی اس سہارے تک جو اس دنیا میں ہر بے سہارے کا سہارا بن کر آیا تھا۔

اپنی بدصورتی سے خوفزدہ اور مایوس انسان مسجد نبوی میں آیا اور انہوں نے لرزتے ہوئے کہا۔ اے محمدؐ۔ میں ایمان لانا چاہتا ہوں۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ مجھے جنت میں جانے سے روک نہ دیا جائے۔ میں بدصورت ہوں اور سنتا ہوں کہ جنت میں کوئی بدصورت نہ ہوگا۔ اس آواز میں انسانیت کا درد بھرا ہوا تھا۔ رحمت کی ایک ٹھنڈک تھی۔ جناب سعد کی نگاہوں سے نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا محسوس ہوا کہ یاس و ناامیدی کی وہ تمام تاریکیاں چھٹ گئیں جو جناب سعد کے دل پہ چھائی ہوئی تھیں۔

جن لبوں کے تبسم سے پھولوں نے کھلنا سیکھا تھا جن کی پیار بھری ہنسی سے صبح ازل کا نور پھیلا تھا جب جناب سعد سے گویا ہوئے تو شگفتہ ہوئی زندگی کے انگاروں پر شبنم حیات کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے برسنے لگے آپؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ نہیں سعد! خدا کی جنت کا دروازہ تمہارے لئے کھلا ہوا ہے وہاں جانے سے تمہیں روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ صادق الوعد، صادق الاقرار کی زبانِ طاہر سے یہ شیریں جواب سنتے ہی جناب سعد کا چہرہ خوشی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سے چمک اٹھا۔ کالی صورت پہ بھی ایک نکھار آ گیا اور ان کے چہرہ پہ خون کی سرخی اس طرح جھلکنے لگی جیسے کالے

بامل کے شکستہ دل میں سے شوق جھلکتی ہے۔

فرطِ حیرت و مسرت میں بے اختیار ان کے سیاہ اور موٹے ہونٹوں پر کلمۂ توحید کے نورانی الفاظ آگئے۔ ان کے دل میں محبت کی پیاس بھڑک رہی تھی اور اب جو محبت کا جام ملا تھا۔ تو وہ ڈگڈگا کر پینا چاہتے تھے۔ یوں پینا چاہتے تھے کہ تشنہ کامی کا کوئی گلہ نہ رہے۔ کوئی شکوہ نہ رہے۔ وہ مسلمان ہو گئے تھے ایک شکستہ دل انسان کو سہارا مل گیا تھا محبت کی راہ مل گئی تھی۔ اس نے اپنے خدا کو پا لیا تھا۔ خدا کے رسول ﷺ کو پا لیا تھا اور اس بے درد زمانہ کے سب ہی راز اس کی نگاہوں پر کھل چکے تھے۔ انھیں دنیا سے اب کوئی شکایت نہیں تھی اپنی بدصورتی کا کوئی رنج نہیں تھا۔

کچھ دن بیت گئے۔ لیکن تنہائی کا احساس اب بھی دل میں کانٹے کی طرح کبھی کبھی کھٹکنے لگتا۔ یہ خیال آتا کہ کاش میرا گھر بھی بس سکتا۔ کاش کوئی عورت مجھ سے شادی کر سکتی۔ کاش میری نسل چلتی۔ میرے بچے ہوتے۔ جناب سعدؓ کے چہرہ سے ایک بار پھر خونچکاں مایوسی ٹپکنے لگی۔ جناب سعد نے سوچا۔ وہ انسان کے ہر درد کا معالج ہے جس کی پر نور نگاہیں ہر زخمی دل پر ٹھنڈا ٹھنڈا مرہم رکھ دیتی ہیں۔ میں اپنے دل کا درد اس سے ہی کیوں نہ کہوں جو اس وسیع

دنیا میں جس میں عمر بھر میں نے حقارت کی ٹھوکریں کھائی تھیں میرے لئے عزت کا وسیلہ بنا ہے جس نے میرے ٹوٹے ہوئے دل کو سہارا دیا ہے جس نے مجھے خدا کی راہ دکھائی ہے زندگی کے راستہ پر رہنمائی کی ہے۔ یہ سوچتے ہی جناب سعد کا چہرہ ایک بار پھر دمک اٹھا اور انھوں نے محسوس کیا کہ جیسے ان میں زندگی کی نئی توانائی آگئی ہے وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور پھر اس دروازے پر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے جہاں انسان ہی کے نہیں بلکہ فرشتوں کے بھی سر جھکتے ہیں۔

"کیوں سعد خاموش کیوں ہو"

سعد کے دل کا درد محسوس کرتے ہوئے کوثر کے پانی سے دھوئی ہوئی اس زبان نے سوال کیا۔ خدا کے رسول نے مجھ سے جنت کا وعدہ تو کیا ہے لیکن دنیا بدستور تاریک ہے۔ میں اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں۔ مگر کوئی بھی شخص مجھے اپنی بیٹی دینے کو تیار نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں بدصورت ہوں۔ سعد نے اس لہجہ میں کہا جس میں ان کے دل کی دھڑکنوں نے ایک طرح کی لرزش پیدا کر دی تھی۔ ان کی آواز میں بے پناہ درد تھا۔ اس عظیم محسن انسانیت نے جناب سعد کے ٹوٹے ہوئے دل کی آواز کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "جاؤ سردار عمرو بن وہب کو خدا کا یہ فیصلہ سنا دو کہ اس کی مشہور عالم حسین بیٹی تمہارے نکاح میں دیدی گئی ہے" جناب سعد مسرت و حیرت سے دم بخود رہ گئے اللہ کا رسول اللہ کے فیصلہ کا اعلان کر چکا تھا۔ صادق القول کی آواز فضا میں گونج چکی تھی۔ جناب سعد کا دل سے ان کے سینے میں دھڑک رہا تھا اور ان کے سیاہ چہرہ پر مسرت کی لہر اس طرح جھلک رہی تھی جیسے گھرے ہوئے آفتاب کی روشنی!

جناب سعد نے جناب عمرو بن وہب کو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ سنایا تو اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی جس بدصورت شخص کو چھوٹے سے چھوٹا گھرانہ بھی اپنے اندر جذب کرنا عار سمجھتا تھا۔ اس کے نکاح میں قبیلہ کا سردار اپنی حسین ترین بیٹی دے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے گردن جھکائے خاموش تھے کہ کیا جواب دیں۔ ایک طرف ایمان تھا دوسری جانب بیٹی کی محبت تھی۔ عمرو بڑی کشمکش میں تھے۔ جناب سعد ان کے سکوت کو انکار سے تعبیر کر کے لوٹنا ہی چاہتے تھے کہ جب واپس جا رہے تھے ایک کانپتی ہوئی شرمیلی نسوانی آواز نے انتہائی بے باکی سے پکارا۔ اے خدا کے بندے! اگر یہ

خدا کے رسول کا یہ منشا ہے تو مجھے منظور ہے
جناب عمرو بن وہب کی صاحبزادی کی
آواز تھی۔

جناب سعد اپنی جگہ مبہوت رہ گئے
نگاہوں کے سامنے سفید چادر میں
لپٹی ہوئی ایک پاکیزہ نفس خاتون آئی اور
انہوں نے آہستہ سے کہا۔ میں نسلی وقار، سماج
شہرت اور اس کی جھوٹی عظمتوں کو
ٹھکراتی ہوں، جو خدا کا فیصلہ ہے خدا کے
رسول کا فیصلہ ہے اس کی تعمیل میرا شرف
ہے اور میں اس بے بہا شرف کو اپنے ہاتھ
سے نہ جانے دوں گی"۔ بیٹی کے اس جوش
ایمانی نے جناب عمرو بن وہب کی کشمکش
ختم کر دی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے
جناب سعد کے پاس آئے اور بولے مجھے
خدا کا یہ فیصلہ منظور ہے۔ آپ شادی کا
انتظام کریں۔ جناب سعد خوشی خوشی بازار
گئے اور شادی کا سامان خریدنے لگے۔
یکایک ان کے کانوں میں یہ آواز گونجی۔
"اللہ کے بندو! جہاد کے لئے تیار ہو جاؤ"
جناب سعد یہ آواز سن کر تھم گئے
جذبات کا طوفان سا اٹھا۔ ایک طرف
عروسی کا تصور تھا اور دوسری جانب
خدا کی راہ میں جہاد کا فرض تھا۔ اور اس
میں شہادت کا شرف تھا۔ جناب سعد
نے ایک لمحہ توقف کیا شادی کا سامان
... فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی وہ
مجاہدین کے ساتھ روانہ ہو گئے تھے۔

کے رسول نے سعد کو میدانِ جنگ میں
دیکھا تو آواز دی۔ لیکن سعد شہادت کی
سرمستی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ آواز
پر چونکے۔ لیکن جواب نہ دے سکے۔
فوج کے نرغے میں گھرا ہوا یہ شیر جنگ
کرتا رہا۔ آگے بڑھتا رہا۔ دشمنوں
کے سر دوش سے اتارتا رہا۔ لیکن ایک

تلوار سر پہ لگی اور جناب سعد کے ماتھے پر
"خون کی دھاروں کا سہرا" بندھ گیا۔
ان کی شہادت کی خبر جناب عمرو بن وہب
کی صاحبزادی کو ملی تو انھوں نے سوگوار
ہو کر کہا۔ سعد! شہادت مبارک ہو
مجھے جنت میں بھول نہ جانا"۔

★ ★ ★

پیٹر بکسل کی جرمن کہانی ترجمہ ★ تاج مہجور

میز تو میز ہے

میں آج آپ کو ایک ایسے شخص کی کہانی سنانے جا رہا ہوں جو کسی سے کچھ بولنے بتانے کے قابل نہیں ہے۔ وہ کافی عمر رسیدہ ہے اس کے چہرے پر تھکن اور مایوسی چھائی ہوئی ہے۔ یہ شخص ایک چھوٹے سے شہر میں چوراہے کے قریب واقع مکان کی سب سے آخری منزل کے ایک کمرے میں رہتا ہے۔ اس کا حلیہ بیان کرنا بے سود ہے اس لیے کہ وہ اپنے ہم عمر آدمیوں سے شکل ہی سے مختلف ہے وہ سرمئی رنگ کی ہیٹ اسی رنگ کی پتلون اور سبز رنگ کی قمیض پہنتا ہے۔ سردیوں میں البتہ اس کے لباس میں ایک لمبے کوٹ کا اضافہ ہو جاتا ہے اس کی جلد خشک سی ہے جس پر جھرّیاں پڑ گئی ہیں گردن بہت ہی پتلی ہے جس کی وجہ سے اس کا کالر اس کی سائز سے بہت بڑا لگتا ہے۔

اس نے شادی بھی کی ہوگی۔ اس کے بچے بھی ہو سکتے ہیں۔ یہاں آنے سے قبل وہ کسی اور شہر میں رہتا ہوگا اور یقیناً کسی زمانے میں وہ بچہ بھی رہا ہوگا۔ مگر یہ اس زمانے کی بات ہوگی جس زمانے میں بچے بھی بڑے آدمیوں کی طرح کے لباس زیب تن کیا کرتے تھے۔ (جس کا ثبوت دادی ماں کے البم میں لگی ہوئی تصویروں سے ملتا ہے) اس کے کمرے میں دو کرسیاں ایک میز ایک دری ایک مسہری اور ایک الماری ہے۔ ایک چھوٹا سا اسٹول جس پر الارم کی گھڑی رکھی ہے اور اس کے بازو پرانے اخبارات اور تصاویر کا ایک البم دھرا ہے۔ دیوار پر ایک آئینہ اور ایک تصویر آویزاں ہے۔

وہ صبح اور شام چہل قدمی کے لیے نکلتا ہے پڑوسیوں سے دعا سلام ہوتی ہے۔ رات دیر گئے تک اپنی میز کے سامنے بیٹھا گھڑی کی ٹک ٹک سنتے رہنا اس کا معمول ہے اور ان معمولات میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

لیکن ایک صبح جب وہ جاگا تو اس نے محسوس کیا کہ آج کا دن گذشتہ دنوں سے بالکل مختلف ہے ہلکی خوش گوار دھوپ نہ زیادہ گرم نہ زیادہ سرد چہچہاتی چڑیاں اردگرد چلتے پھرتے لوگوں کے چہروں پر اپنائیت اور دوستی، ہنستے کھیلتے بچے اور سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ اس روز یہ سب کچھ اس شخص کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ وہ مسکرایا، اس نے سوچا کہ یہ سب کچھ ایک خوشگوار تبدیلی کی علامت ہے چلتے چلتے اس کی رفتار خود بخود تیز ہو گئی۔ اس نے اپنے ہینگر کا بٹن کھول دیا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہ اپنی گلی میں داخل ہوا۔ کھیلتے ہوئے بچوں کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور سر کی جنبش سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور اسی طرح تیز تیز سیڑھیاں طے کرتا ہوا کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ جیب سے چابی نکالی تالے میں ایک خوشگوار ٹک کی آواز ہوئی اور تالا کھل گیا۔

لیکن کمرے میں پہنچ کر اسے بڑی مایوسی ہوئی یہاں ہر چیز جوں کی توں دھری تھی وہی کرسیاں وہی میز، وہی مسہری، وہی اسٹول پر رکھی ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی وہ آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اس نے دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں اس لیے کہ اس کی مٹھیاں کسی اندرونی ہیجان کی وجہ سے کسی ہوئی ہیں۔ اس نے زور سے ایک گھونسہ میز پر رسید کیا پھر وہ مسلسل میز پر گھونسے برسانے اور چیخنے لگا۔

یہ یکسانیت کب تک۔ کب تک!!!

کمرے میں اس کی چیخوں کی وجہ سے گھڑی کی ٹک ٹک جیسے غائب ہو گئی تھی پھر اس کی مٹھیاں دکھنے لگیں اور چیختے چیختے آواز گلے میں گھٹ گئی۔ کمرے میں پھر گھڑی کی ٹک ٹک واپس آ گئی۔ مگر کچھ بھی تو نہیں بدلا وہی کرسیاں، وہی میز، وہی تصویر، وہی مسہری، اس نے سوچا میں کس لیے میز کو میز کہتا ہوں۔ کرسیوں کو کرسیاں، تصویر آخر کس لیے۔ کس لیے۔ فرانس کے لوگ میز کو لیشے کہتے ہیں

کرسی کو چیس اور تصویر کو پلنگ کہتے ہیں پھر بھی ایک دوسرے کو سمجھنے میں انھیں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ تو پھر کیوں نہ مسہری کو تصویر کہا جائے۔ اس نے سوچا کچھ تو تبدیلی آنی چاہیے۔ وہ مسکرایا پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔ وہ ہنستا رہا ہنستا رہا یہاں تک کہ پڑوسیوں نے اس کے دروازے پہ دستک دی اور اس سے خاموش ہو جانے کی التجا کی۔

اب ہر چیز کو تبدیل ہونا پڑے گا اس نے سوچا۔ میں اب مسہری کو تصویر کہوں گا۔ پھر وہ اپنے آپ سے کہنے لگا اب بہت تھک گیا ہوں کیوں نہ تھوڑی دیر کیلئے تصویر پہ لیٹ جاؤں۔

صبح وہ دیر تک تصویر پہ لیٹا سوچتا رہا کہ کرسی کو کیا نام دیا جائے پھر اس نے تصفیہ کر لیا کہ وہ کرسی کو گھڑی کہے گا۔

پھر وہ صبح تصویر سے اٹھا کپڑے تبدیل کئے اور گھڑی پہ بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ میز پہ پھیلا دیئے۔ میز اب میز نہیں بلکہ دری کہلانے لگی تھی۔ تو وہ صبح تصویر سے اٹھا کپڑے تبدیل کیے اور دری کے سامنے گھڑی پہ بیٹھ گیا اور سوچ میں غرق ہو گیا کہ دوسری چیزوں کے نام کس طرح تبدیل کیے جائیں۔

مسہری تو ہوئی تصویر۔ میز دری اور کرسی گھڑی۔ اخبار مسہری بن گیا اور آئینہ اسٹول گھڑی کو البم کہا جائے دری کو الماری اور الماری کو اخبار۔ تصویر کو میز اور البم کو آئینہ۔ پھر یوں ہوا کہ وہ شخص صبح دیر تک تصویر پہ لیٹا رہا۔ نو بجے البم کا الارم بجنے لگا وہ اٹھا اور الماری پہ کھڑا ہو گیا۔ تاکہ اس کے پاؤں سردی سے محفوظ رہیں۔ اخبار سے کپڑے نکالے اور دیوار پہ لگے ہوئے اسٹول کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر دری کے آگے گھڑی پہ بیٹھ گیا۔ اور آئینے کی ورق گردانی کرنے لگا یہاں تک کہ اُسے اپنی ماں کی میز مل گئی۔

شاید آپ ہنسیں مگر یقین کیجئے کہ اُس شخص نے اس تبدیلی کو اپنے لیے بہت دلچسپ محسوس کیا۔ اب وہ دن کا بیشتر حصہ اشیاء کے نئے نام یاد کرنے میں گذارنے لگا۔ اب وہ آدمی نہیں پاؤں بن گیا تھا۔ پاؤں کو اس نے صبح بنا دیا تھا اور صبح کا نام آدمی رکھ چھوڑا تھا۔ اگر آپ اسے مذاق سمجھیں تو آپ خود اس کہانی کو مکمل فرما سکتے ہیں اور اس شخص کی طرح آپ بھی مختلف الفاظ کو ذیل کے الفاظ کی طرح جدید معنی و مفہوم عطا کر سکتے ہیں۔ مثلاً

بیٹھنا	معنی	رکھنا
ٹھٹھرنا	″	دیکھنا
لیٹنا	″	بیٹھنا
کھڑا ہونا	″	ٹھٹھرنا
لکھنا	″	ورق گردانی کرنا

تو اب اس شخص کے دن رات اس طرح گذرنے لگے کہ

”آدمی میں وہ عمر رسیدہ پاؤں دیر تک تصویر پہ بیٹھتا رہا۔ نو بجے البم کا الارم رکھنے لگا تو پاؤں ٹھٹھر گیا اور الماری کی ورق گردانی کرنے لگا تاکہ وہ اتنے سرد آدمی میں کھڑا نہ ہو جائے“

اس نے ایک نیلی نوٹ بک میں اشیاء اور ان کے نئے نام درج کرنے شروع کر دیئے اور اس کام میں وہ اس قدر منہمک ہو گیا کہ شاذ و نادر ہی وہ اپنے کمرے سے باہر دیکھا جانے لگا۔ بالآخر اس نے سارے نئے نام ازبر کر لیے اور رفتہ رفتہ پرانے نام اور ان سے وابستہ مطالب بھول چکا تھا اب اس کے پاس ایک نئی زبان مکمل تھی جس کا وہ تنہا جانشین اور واحد مالک تھا اور اب تو وہ خواب بھی اپنی نئی زبان میں دیکھنے لگا تھا۔ اس نے بچوں کی کتابوں سے بہت سارے گیت اپنی نئی زبان میں منتقل کر لیے تھے جسے وہ اپنے آپ میں گنگنایا کرتا تھا۔ لیکن اس نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ یہ ترجمہ بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہا۔ اس لیے کہ وہ پرانی زبان پوری طرح بھول چکا تھا اور ترجمے کے لئے بار بار اسے نیلی نوٹ بک سے مدد لینی پڑتی تھی اب تو وہ لوگوں سے بات چیت کرتے ہوئے بھی جھجکنے لگا تھا اس لیے کہ اپنے مخاطب تک بات کی ترسیل کے لیے اسے بہت دیر تک مناسب اور موزوں الفاظ کی تلاش میں بھٹکتے رہنا پڑتا تھا۔

وہ سوچتا کہ میری تصویر کو یہ لوگ مسہری کہتے ہیں جسے میں گھڑی کہتا ہوں یہ کرسی کہتے ہیں، میری میز کو تصویر، الماری کو دری، اسٹول کو آئینہ، اخبار کو الماری، البم کو گھڑی اور آئینے کو البم کہتے ہیں اور یہ بات اس کیلئے بڑی مضحکہ خیز تھی۔ وہ کسی کو آپس میں گفتگو کرتا ہوا سنتا تو بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک پاتا۔ مثلاً کوئی پوچھتا کہ آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہے یا تم نے آج صبح کا اخبار پڑھا تو وہ دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیتا تاکہ ہنسی روک سکے۔

مگر سچ پوچھیئے تو یہ کوئی ہنسی کی کہانی نہیں ہے۔ اس کی ابتداء بھی سوگوار تھی اور انتہا بھی سوگوار، سرمئی سوٹ میں ملبوس وہ عمر رسیدہ شخص اب کسی کی بات سمجھنے کے قابل نہیں ہے تاہم یہ بات اتنی تشویشناک نہیں اس کا افسوسناک پہلو تو یہ ہے کہ شہر کے لوگ اس کی بات سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں اور اب تو اسے جیسے چپ لگ گئی ہے وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں بولتا اگر کچھ بولتا ہے تو صرف اپنے آپ سے۔ اس لیئے کہ اب وہ ادمی نہیں پاؤ لہے جو دیر گئے تک اپنی تصویر پر بیکار رہتا ہے ●●

منیر حمائی — س۔ علی۔ نقی

وابستگی

وہ ایک عظیم مصور تھا۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں ساری دنیا میں منفرد تھیں ایک دن وہ برہم ہوگیا جبکہ اس کے دوست نے پوچھا "یہ کیسی فنکاری ہے کہ سنگِ مرمر کی موجودگی میں تم کھردرے پتھر تلاش کرتے پھرتے ہو۔ کیا ایک متوازن ذہن ایسی حرکت کرسکتا ہے" اس نے جواب دیا کہ جو زندگی بھر خار دار راستوں پر چلتے ہوئے لہولہان ہوگیا ہو اور جس کے پیر صحرا کی دھوپ سے جل کر خاکستر ہوگئے ہوں تو وہ بھلا سنگِ مرمر کے حسن سے کیا لطف اندوز ہوسکے ●●●

نوٹ! تخلیقات صاف، خوشخط صفحہ کے صرف ایک جانب تحریر کردہ ارسال کریں۔
(ادارہ)

مستقل فیچر —

غبارِ خاطر

(ایڈیٹر کا مراسلہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~

محسن علی، کتہ گوڈم

"کہانی علامت کی"

محترمی۔ جناب ایڈیٹر صاحب،

: we are moving towards west to-day, we are moving towards a social chaos- if towards east, towards a social disorder and if by chance towards North or South, certainly towards social freeze,

— — — — —

مگر میں نے یہ سوچا ہے آج کے ادب کا مت. ہو گیا ہے۔

مجھے ایسا خیال آیا جب بروری ۷۸ء کے "پونم" کا افسانہ نمبر میں نے اقبال متین کا مضمون پڑھا اور اس کے بعد کے شماروں میں اس مضمون کے متعلق کچھ اور حضرات کے اظہار خیال کرنے دیکھے گئے۔

جہاں تک اقبال متین کا مضمون قدیم کی نظر میں قاری ہے۔ پابندی کرانے کا مترادف ہے وہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بقول بشیر انور صرف لفاظی ہے (واہ کیا تاویل اور توجیہ کے ساتھ رائے دی ہے

PAUCITY OF ARGUMENTATIVENESS

شاید اسی کو کہتے ہیں ——

متین نے بھی اس مضمون میں کافی اِدھر، اُدھر اُٹھا پٹک کی ہے۔ پھر بھی متین اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے —— اور یہی بات اُن کے ادبی کردار کی صلابت کی دلیل ہے۔

برسہا برس سے ادب تخلیق ہوتا رہا ہے مناجیکر ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے ناز و نخرے سہتا رہا ہے۔ لیکن جو گزرا وقت اردو پر ترقی پسند تحریک کے زوال پر آیا ہے ویسا وقت خدا نہ کرے، پھر کبھی آئے۔

پہلے تو ان دنوں کوئی پڑھتا ہی نہیں اور پھر پڑھے بھی تو کیا؟ —— اردو؟؟ — اچھا صاحب اُردو پڑھنے کی طرف تھوڑا بہت رغبت ہو بھی گئی تو وہ بھی صرف یہ احسان جتانے کے لیے کہ اُردو زبان و ادب کو زندہ رکھنا ہمارا فرض ہے۔ اس پر یہ امید کی جاتی ہے کہ پڑھیں تو اردو ادب پڑھیں۔ یہ معیت مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اُردو ادب پر نظر ڈالی جائے تو صاحب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسا ادب پڑھا جائے۔ ظاہر ہے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے افسانوی ادب۔ تو صاحب افسانوی ادب کی بھی کئی قسمیں ہو گئی ہیں۔ علامتی افسانہ، تجریدی افسانہ، غیر علامتی افسانہ، غیر تجریدی افسانہ، مقصدی افسانہ، بے مقصدی افسانہ —— بالکل ویسے ہی رنگ جیسے فلم، اسٹنٹ فلم، سوشل فلم، موڈرن فلم، بھاتی فلم، ڈراونی فلم وغیرہ۔ فلم چونکہ معرضِ وجود میں ادب کے بعد آئی ہے ابھی اپنے ارتقاء کے اس دور میں داخل نہیں ہوئی جب کہ علامتی اور تجریدی فلمیں بننے لگیں۔ (اور اُردو میں ابھی اس ارتقائی درجہ پر جو اضافہ ادب پہونچ نہیں پائی ہیں وہ ہیں ناول نگاری اور ڈرامہ نگاری۔ پتہ نہیں کیوں آج کل اس کثیر تعداد میں علامتی کہانیاں لکھنے والے ایک علامتی ناول یا علامتی ڈرامہ نہیں لکھ دیتے۔ یہاں میرا مطلب ایسے علامتی ادب سے ہے جس کا ان دنوں بڑا چرچا ہے)

خیر تو بات چلی تھی اقبال متین کے مضمون سے آپ یقین کیجئے مجھے تو یہ بات کچھ عجیب سی لگی کہ متین نے یہ مضمون لکھا۔ اس قسم کے مضمون کی کم از کم متین سے مجھے توقع نہیں تھی۔ کیونکہ متین نے جس طرح ہزار صعوبتیں جھیل کر اپنی نجی زندگی میں ایک وضع نبھائی ہے، اسی طرح وہ اپنی ادبی زندگی کی نیچ اونچ میں بھی عجیب طرح سے ایک وضع نبھاتے رہے ہیں۔ حالانکہ یہی زمانہ دراز سے چاہتا تھا کہ وہ ایک ذمہ دار ادیب کی حیثیت سے اُردو ادب کی موجودہ صورتحال اور نظریاتی آویزشوں کے تعلق سے اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اس جنگل کی آگ میں متین کو پہلے ہی کود پڑنا

جبکہ اصل جنگل جل رہا تھا تو میں کو آج اتنا سکون قلب تو میسر ہو تا کہ انہوں نے بھی اس آگ کو بجھانے نہیں اپنی کوشش کی ہے ــــ اب تو آگ جنگل کے حاشیوں تک آ گئی ہے اور اب حاشیئے بھی تنگ ہو گئے ہیں۔

ترقی پسندی کی اصطلاح اگر کسی مخصوص تحریک کے لئے استعمال کی جاتی ہے تو یہ بات متنازعہ فیہ بن جاتی ہے۔ ورنہ ترقی پسندی اپنے عام معنوں میں تو انسانی فطرت کا تقاضہ ہے خصوصاً ادب، آرٹ اور سائنس میں ــ سائنس میں نئی نئی ایجادات ہوتی ہیں اور ہر ایجاد اپنے آپ کو دو اور دو چار کے فارمولے پر ثابت کر دیتی ہے تو لوگ ہر طرح اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اسی وجہ سے سائنس میں کبھی ترقی پسند تحریک یا جدیدیت کا رجحان جیسے ہنگامے کھڑے نہیں ہوتے۔ سائنس میں علم ٹھوس ہوتا ہے ــــ لیکن ادب اور آرٹ میں ایسی کوئی ٹھوس ایجاد یکلخت سامنے نہیں آتی۔ صرف نئے رجحانات نئے نظریئے اور نئے فلسفے سامنے آتے ہیں اور ان پر مباحثے شروع ہو تے ہیں۔ یہ رجحان کافی صحت مند ہوتا ہے اور اس قسم کے نئے پن کی زندگی کے ہر شعبے کو ضرورت ہوتی ہے ورنہ زندگی، ادب، آرٹ اور سارا کلچر صرف جامد و ساکت تاریخ بن کر رہ جائیں۔

اس لئے میں تو جدیدیت کے رجحان کو، جہاں تک اس میں اپج ملتا ہے، ترقی پسندی ہی مانتا ہوں ــــــ لیکن کسی مخصوص یا محدود معنوں میں نہیں ــ آخر اس مخصوص رجحان کے بعد جسے آپ جدیدیت کا نام دیتے ہیں، کوئی اور جدید رجحان بھی تو آئیں گے، تو ان کو کیا نام دیا جائے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وقت ایک نئی جدیدیت کہلائے اور دوسری پرانی جدیدیت ــــ اصطلاحوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نئے رجحانات اور نئی جہت کی تلاش انسانی فطرت کا تقاضہ ہے، اور وہ دراصل ترقی پسندی ہے، زوال پسندی نہیں۔

اس ترقی پسندی کا، ہر دور اور ہر زمانے میں، ہر وہ ادیب اور شاعر قائل رہا ہے جس نے صرف اپنے تخلیقی کرب سے مجبور ہو کر اپنے فن کی تخلیق کی ہے اور کبھی اس جرم کا مرتکب نہیں ہوا جسے مصلحت کہتے ہیں۔ (فن کی شریعت میں مصلحت بدعت ہے) ایسے ادیب کی تخلیق یقیناً صرف اس رجحان کا رنگ و اثر لیئے ہوئے ہو گی جو کہ تخلیق کار کی زندگی کے داخلی اور خارجی حالات کا نتیجہ ہو گا ــــ اور یہ رجحان انفرادی ہو تے ہوئے بھی لازمی طور پر اجتماعی ہو گا۔ (کسی معاشرہ میں کسی فرد کا کوئی رجحان صرف انفرادی نہیں ہو سکتا)۔ اور ایسے ادیب کی تخلیق ایک عام قاری کے شعور اور ذوقِ ادب سے یقیناً ہم آہنگ بھی ہو گی۔ اس قسم کے تخلیق کار ہر دور میں پیدا ہوئے ہیں اور ہر دور میں زندہ رہے ہیں اور ان ہی کی بدولت ادب ہر دور میں زندہ رہا ہے اور اسے فنی دوام بھی نصیب ہوا ہے۔

ورنہ انسانی تاریخ میں جس طرح خاندانی حکومتوں کے دورِ انحطاط میں افراتفری پھیلی ہے اور کچھ عناصر نے، جو اکثر درباری رازدوں سے بخوبی واقف ہوتے تھے۔ علمِ بغاوت بلند کیا اور اپنے آپ کے لئے تاریخ میں مقام پیدا کرنے کی کوشش کی ــ اسی طرح جب کبھی مخصوص ادبی رجحان یا نظریہ ادب روبہ زوال ہوا (جس کی وجہ اکثر سیاسی رہی ہے) تو کچھ ایسا ہی انتشار پیدا ہوا ــ شیر شاہ سوری کا مختصر دور آ گیا یا پھر کتنے ہی محمد شاہ رنگیلے بن گئے اور دربار کو وقتی یا لمحاتی عیش پرستی کا اڈہ بنا لیا۔ جن کا عوام سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ عوام ہوتے کون ہیں خصوصاً اقلیم ادب و فن میں ــ وہ تو صرف کاسہ کی دنیا کی مخلوق ہوتے ہیں۔

ایک سچا اور ایماندار ادیب جو اپنے سچے جذبے اور ایقان سے مجبور ہو کر اپنے فن کی تخلیق میں مجبور نہ صرف وقت اور زندگی کے رجحانات کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ اپنے تخلیق کار اور قاری دونوں کے ذوق کی تسکین کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عصری تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے۔

ایسے فن کار کی تخلیق ایک سیدھی سادھی کہانی ہو سکتی ہے، یا سیدھی سادھی شاعری، ایک علامتی کہانی ہو سکتی ہے یا علامتی شاعری، ایک تجریدی کہانی ہو سکتی ہے یا تجریدی شاعری۔ لیکن لازمی طور پر وہ فن ہو گی، ادب ہو گی۔ اور اس کی قدر و قیمت کیلئے یہ کہنا ضروری نہیں ہو گا کہ کیونکہ یہ علامتی کہانی ہے اس لئے قابلِ قدر ہے یا سیدھا سادہ ادب ہے سو قابلِ قدر ہے۔ بس فنی اعتبار سے یہ دیکھنا ضروری ہو گا کہ جس تکنیک اور ہیئت کا استعمال ہوا ہے وہ بالکل صحیح اور موزوں انداز میں برتی گئی ہے اور یہ بھی کہ اس تخلیق کے موضوع کا صحیح انداز میں اظہار ہو گیا ہے۔ ایسی شکل میں وہ تخلیق

٭ ۲۲ یہاں ادب جانتا ہے وہ یقیناً ایماندار فن اور ایسا ادب پیش کرتا ہے ٭

تخلیق بے اثر ہوگی اور اس کی قدر و قیمت جاننے کیلئے کسی مخصوص یا بہت زیادہ ذہین و فطین قاری کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ایک فن کار کے پاس اس کے تخلیق کے کرب میں صرف اظہار کا جبر نہیں ہوتا بلکہ یہ کرب بھی شامل رہتا ہے کہ وہ اپنا اظہار کس طرح کرے۔ وہ اپنی بات کس کو سنانا یا سمجھانا ہے۔

ہیئت، فارم اور ڈکشن کا فرق زمانہ اور وقت سے زیادہ موضوع، جذبہ اور تخلیق کار کے اپنے فنی رجحان سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک شاعر اپنی کسی تخلیق کو صرف غزل ہی میں پیش نہیں کر سکتا اسی طرح صرف نظم ہی میں بھی پیش نہیں کر سکتا۔ ایک مخصوص تخیل یا فکر یا جذبہ خود بخود اپنا موزوں فارم اور ڈکشن تلاش کر لیتا ہے اور شاعر خود بخود اس تخیل یا فکر کا اظہار اس ہیئت اور فارم میں کر دیتا ہے جو اس کے لئے موزوں ہوتا ہے۔

علامتی ادب کوئی حالیہ ایجاد ہے نہ اس دور کی دین۔ بنیادی طور پر کسی تحریر یا شعری اظہار کو علامتیں ہی فن کا رتبہ دیتی ہیں۔ سادہ اور خوبصورت بیان بھی اگر کسی مخصوص کیفیت اور معنویت کے خزینے کا پتہ دیتا ہے تو وہ فنی علامت بن جاتا ہے۔ مخالفت جتنی بھی ہونی چاہیئے وہ صرف ایسے ادب کی جو بے توجیہہ چیستاں لیکن بدنام کر رہا ہے علامتی ادب کو۔ علامتی ادب اگر محض چیستاں ہو جائے تو وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن علامتی ادب نہیں ہو سکتا۔

علامت، ادب اور آرٹ میں یا شعر و گفتگو میں بھی کسی مخفی یا لطیف و نازک ترین خیال یا جذبے کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے اور یہ اشارہ یا کنایہ کسی مخصوص کیفیت کا اظہار ہوتا ہے خواہ وہ المیہ ہو یا طربیہ۔ لیکن پتہ نہیں کیوں اکثر ایک مخصوص انداز تحریر کو علامتی ادب کا نام دے کر اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ بجائے کسی مخصوص کیفیت یا حالت کے لطیف اظہار کے، ہر بات کو روپوش اور پیچیدہ بنا دیا جاتا ہے لہذا ایسی باتیں بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ دقت پسندی کیوں؟ وہ بھی ادب اور آرٹ میں جو کہ بہترے ہی دلفریب، دلچسپ اور پُر اثر انداز میں زندگی کی تفسیر کرتے ہیں۔

یہ بات البتہ زیادہ اغلب ہے اور ایسا ہوتا آیا ہے کہ جب ہم تکنیکی اعتبار سے اپنے اظہار پر قادر نہیں ہوتے ہم کو اس قسم کی علامتیں استعمال کرنا آسان معلوم ہوتا ہے جو بے معنی ہوں لیکن صوتی اعتبار سے اچھی معلوم ہوں۔ اس لحاظ سے میں نے جس بات کو اوپر دقت پسندی کہا ہے وہ مہمل نگاری بن جاتی ہے اور یہ تکنیک استعمال ہوتی ہے ایسی چیستانوں اور نظریاتی الجھنیں پیدا کرنے کیلئے جو فوری شہرت یا اہمیت دلانے میں ممد و معاون ہو سکتی ہے۔

دراصل بات کو مبہم بنا کر یہ جتانے کی کوشش کرنا کہ یہ بات بہت بڑی ہے اور ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتی، یا تو مجبورے مجذوبوں، ملاؤں اور پنڈتوں کا شیوہ رہا ہے جو ہر بات کو ایسا ہی بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ بڑا فلسفہ ہے یا پھر روحانیت کے علمبرداروں کے ہتھکنڈے۔ مشکل یہ آ پڑی ہے کہ ترقی پسند تحریک کے دور میں پہلے یہ طے کر لیا گیا کہ ادب کو انقلابی ہونا چاہیئے۔ اس لئے حقیقت پسند اور زیادہ تر مارکس وادی ادب کی تخلیق ہونی چاہیئے۔ یہ باتیں شعوری طور پر طے کرنے کے بعد ادب کی تکنیک پر غور کیا گیا۔ بالکل اسی طرح آج کے زمانے میں جو ترقی پسند تحریک کے دور سے نہ خارجی طور پر نہ داخلی طور پر زیادہ مختلف ہے خصوصاً جہاں تک کہ فرد کی ذات بلکہ میں تو کہوں گا اس کی ذات کے المیہ کا تعلق ہے — بے وجہ انسان کو ذات کا شکار بتایا گیا ہے! بے وجہ تنہا اور بے سمت بتایا گیا اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ زمانہ بدل گیا ہے اور زمانے کے ساتھ نظریۂ حیات اور فن کی قدریں بھی بدل گئی ہیں۔ بس صاحب جیسے ایک بٹن دبا یا یا ایک کل گھمائی اور یہ سب کچھ ہو گیا۔ صرف اس کے لئے جو ادیب یا شاعر بن گیا، ورنہ اس بھرے پُرے معاشرے میں وہ انسان جسے تنہا سمجھا گیا۔ ان ساری تبدیلیوں اور انقلابوں سے ہمیشہ کی طرح بے خبر و بے تعلق رہا۔ جب یہ بتایا گیا کہ زمانے کے ساتھ فن کی اقدار بھی بدل گئی ہیں۔ تو یہ باور کرایا گیا کہ سچا ادب وہ ہے جو ذات کی طرف مراجعت کرے اور جو صرف علامتی اور تجریدی باتیں کرے۔ ان باتوں نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ان لوگوں نے جو کچھ کل تک ترقی پسند تحریک سے منسلک تھے یہ تعجب سے دیکھا کہ ترقی پسند تحریک کے کئی علماؤں نے انکی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا اور ان کو بہ مشکل تمام یا درجہ سوم پر رکھنے کی

کوشش کی تو دھیرے دھیرے ناراضگیوں نے نئے رنگ اختیار کیے۔ تحریک سے انحراف اور اس پر اعتراض شروع ہوئے۔ اُن اعتراضات اور اس انحراف کیلئے جو توجیہات اور تاویلات پیش کی گئیں۔

ان کے بطن سے ایک نیا رجحان پیدا ہوا جسے جدیدیت کا نام دیا گیا۔ یہ نوزائیدہ رجحان واقعی سبز اصحت مند تھا لیکن ٹھیک اسی زمانے میں چین کی جنگ نے ملک کی سیاست میں ایک رخنہ ڈال دیا۔

ترقی پسند تحریک کے بنیادی نظریے پر کاری ضرب لگی اور اُس کا چہرہ مسخ ہوگیا۔ نئے رجحان کو اس حادثہ سے دراصل ایک تقویت پہونچنی چاہیئے تھی لیکن پتہ نہیں کیوں جس طرح چین کی جنگ نے ہماری قوم کو ایک طرح سے DEMORALISE کر دیا اُسی طرح ہمارے ادیب و شاعر بھی بے وجہ اپنے آپ سے مایوس ہوگئے۔ محاذ پر کھائی ہوئی شکست کا اعتراف کرنے کی بجائے بہتر یہی سمجھا کہ خود سے لڑا جائے اور وہ روٹھ بیٹھے اور ذات کے کنوں میں پناہ لی۔

ایسے ہی ناراض اور مایوس ادیبوں اور شاعروں نے اس ترقی پسند تحریک کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا۔ جس کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ جدیدیت نیز سیدھے ادب کا دراصل احیاء تھی اور ہمارے ادب اور تمدن میں ایک صحت مند رجحان بن سکتی تھی لیکن ہوا یہ کہ اس رجحان کے حامل ادیب و شاعر بجائے اس کے کہ ایک مثبت رویے کے تحت اپنا ادب تخلیق کرتے، کچھ ذاتی پرخاش کی بنا پر اور ایک بار پھر پرانی غلطیوں کا اعادہ کرتے ہوئے IMPORTED TRENDS یعنی ایلیٹ، عذرا پونڈ، کافکا وغیرہ کی تعلیقات کے زیر اثر ترقی پسند تحریک کی شدید مخالفت کرتے ہوئے اپنی حد سے تجاوز کر گئے۔ اور عام زندگی میں نہ سہی بس اپنے ہم خیالوں کے رسالوں اور پرچوں میں اپنے آپ کا مقام اس طرح پیدا کرنے کی کوشش کی کہ اُن سب شاعروں اور ادیبوں کو صفحۂ ادب ہی سے مٹانے کے درپے ہو گئے جن کو ترقی پسند تحریک نے عظمت اور ملک گیر شہرت عطا کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن شہرت یافتہ ہستیوں کو دشنام زیادہ کیا گیا اور جدید ادب کی تخلیق کم کی گئی۔ پھر کچھ ایسی ٹھنی کہ ایک مقبولِ عام ادب کی ضد میں ایک غیر مقبول ادب کی تخلیق پر اصرار ہونے لگا اور علامتی اور تجریدی ادب کے نام پر ایسا ادب تخلیق ہوا جو زیادہ تر چیستاں بن گیا۔

خواہ وہ ترقی پسند تحریک سے پہلے کا ادب ہو ترقی پسند تحریک کے دور کا ادب ہو یا ترقی پسند تحریک کے بعد کا ادب ہو۔ ہر دور نے ایسے فنکار دیئے ہیں اور ایسا ادب تخلیق کیا ہے جو ہر دور میں اپنے آپ کو منواتا رہا ہے اور منواتا رہے گا۔ اور ساتھ ہی وہ ادب بھی تخلیق ہوتا رہے گا۔ جس کے خام معیار کو FRUSTRATED یا مایوس فنکار ایک دوسرا نام دیں گے، اُسے یا تو ایک تحریک بنائیں گے یا رجحان مشہور کریں گے لڑیں بھڑیں گے اور چپ ہو جائیں گے۔

کرشن چندر کو پتہ نہیں کس طرح ایشیا کا عظیم افسانہ نگار مانا گیا جبکہ اُن کے بعض ہمعصروں نے اور اپنے آپ کو نئے نوجوان کہانی بنانے والوں نے اُسے بنیادی طور پر افسانہ نگار ہی تسلیم نہیں کیا یہ تک کہہ دیا کہ کرشن کی کہانی کہانی ہی نہیں ہوتی۔

کرشن کے فن کے بارے میں بڑا شور و شغب ہوا۔ بڑی شدید مخالفتیں ہوئیں۔ لیکن اس شور و غل میں کرشن نے بڑے سلجھے ہوئے انداز اور سنجیدہ لہجے میں ایک بات کہی تھی بالکل ہی مختصر کہ بھائی آپ اپنا ادب تخلیق کیجئے اور ہم کو ہمارا ادب تخلیق کرنے دیجئے۔ کرشن کی یہ بات بڑی ہی بھلی لگی تھی۔

آپ کو تو پرواہ نہیں کہ قاری آپ کا ادب سمجھے یا نہ سمجھے۔ تو صاحب! آپ اپنا ادب تخلیق کیجئے اور چپ ہو جائیے۔ لیکن یہ کونسا علامتی و تجریدی ادب ہے کہ آپ بے وجہ اُن ادیبوں اور شاعروں پر تنقید سے زیادہ اُن کی ایسی مخالفت کریں جس سے یہ ظاہر ہو کہ آپ اُن کا نشان ہی مٹانے پر تلے ہوئے ہوں جس طرح قاری کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی پسند کا ادب پڑھے اسی طرح یقیناً ہر فنکار کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی پسند کا فن تخلیق کرے۔ اب اگر آپ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ کے فن کو سمجھنے والے اور اُس کی قدر کرنے والے کتنے ہیں تو آپ کو یہ فکر ہوگی کہ آپ کو مقبولیت حاصل ہوئی یا نہیں لیکن جب سرے ہی سے آپ کو یہ فکر ہے نہ تعلق کہ قاری آپ کا ادب سمجھتا ہے یا نہیں تو آپ کو کسی ایسے ادب سے پرخاش کیوں جس کو قاری زیادہ سمجھتا ہے اور جس کی زیادہ قدر کرتا ہے۔

میں اس کو نظریاتی اختلافات یا اسلوب

ذہنیت کے فرق کی بات بھی نہیں سمجھتا جس پر کہ ادبی مسئلہ پر کوئی معیاری بحث ہو سکے ۔ ہر اختلافات کو سنجیدہ و معیاری بحث کا رتبہ نہیں دیا جا سکتا ۔

اگر آپ کھلے ذہن و دل سے سارے ادب پر نظر ڈالیں تو آپ کو ہر دور میں ایسا ادب ملے گا جو علامتی کہلا سکتا ہے ترقی پسندوں نے بھی علامتی کہانیاں لکھی ہیں ۔ بیدی کی کئی کہانیاں علامتی ہیں ۔ کرشن کی بھی کچھ کہانیاں علامتی ہیں ۔ ان کی ایک کہانی جو میں ایک زمانہ پہلے پڑھی تھی اور جس کا عنوان شاید "غالیچہ" تھا ایک نمائندہ علامتی کہانی سمجھی جا سکتی ہے ۔ رام لعل، غیاث احمد گدی اور اقبال متین نے بھی علامتی کہانیاں لکھی ہیں ۔ ان کہانیوں کی فہرست تو میں یہاں نہیں لکھ سکتا البتہ چونکہ اقبال متین کے زیر بحث مضمون سے یہ بات چلی ہے میں ان کی کچھ ایسی کہانیوں کے نام لکھنے کی کوشش کروں گا جن کو آج کے ناقدانِ ادب نے علامتی اور تجریدی قرار دیا ہے ۔۔۔ حشرک، سچا جھوا البم، لکڑی کا آدمی، تین بہتر ڈھونڈنے والا آدمی وغیرہ ۔۔۔ چنانچہ جہاں تک میرے محدود مطالعہ کا تعلق ہے ان افسانہ نگاروں نے کچھ ایسی کہانیاں لکھی ہیں جو علامتی ہیں نہ تجریدی اور کچھ ایسی کہانیاں دی ہیں جو صحیح معنوں میں علامتی ہیں اور جو بہت ہی خوب ہیں ۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ ساری علامتی اور غیر علامتی کہانیاں اپنی جگہ ادب ہیں ۔ اور صرف ادب ۔

دراصل اس اصرار کی ضرورت ہی کہاں تھی کہ صرف علامتی اور تجریدی ادب کو عصری تقاضہ سمجھا جائے، خصوصاً ایسا ادب جس کو اپنے قاری سے کوئی تعلق ہی نہیں ۔ جبکہ آج کے معاشرے میں بھی ہر فرد اپنی جگہ اپنے ذاتی المیہ کا اس طرح اظہار چاہتا ہے کہ وہ اظہار ایک اجتماعی شعور اور قوت بن سکے ۔ اس کے المیہ کا کہیں جواز مل سکے، اور حق و انصاف کی بات ہو سکے ۔۔ گو اس گتھی کا کہیں حل ہو نہ ہو، اظہار تو انسانی فطرت کا تقاضہ ہے، وہ بھی ایسا جو کسی کی سمجھ میں آ سکے ۔ اور ادب ہر لحاظ سے صرف ایسا ہی اظہار ہے ۔ ایک ادیب اور فن کار جس کو اپنے فن کا پورا شعور ہے اور بحیثیت فن کار جسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے، اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنے ادب و فن کی روایات سے اپنا رشتہ توڑ کر، ان کی نفی کرنے کی کوشش میں صرف چند غیر فطری اور غیر ملکی رجحانات کو اپنا کر بے وجہ اپنی ذات سے حتمی طور پر مایوس ہو جائے تو اس رویے کو فن کارانہ رویہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے مانا کہ آپ فکری اور نظریاتی طور پر دن بہ دن COSMOPOLITAN اور INTERNATIONALISED PROCESS ہوتے جا رہے ہیں ۔ لیکن اس کا جو دکی بنیاد اور اصلیت کو اپنے معاشرتی تہذیبی اور خصوصاً فنی اور ادبی ارتقاء سے ۲۲ تا ۔ ۵۸ کرتے ہیں ۔ تو یہ بات کس ذہنیت کا پتہ دیتی ہے صرف فرار کا ۔ اور یہ فرار کسی صورت میں اپنی ذات کی طرف مراجعت نہیں ہے ۔ بلکہ اپنی ذات سے مفارقت ہے ۔۔۔ ★★

اشفاق حسین (اورنگ آباد)

★ ستمبر ۱۹۷۸ء کا شمارہ

جناب ایڈیٹر صاحب ۔

پونم کا تازہ شمارہ نظر سے گذرا ۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب کا انٹرویو آندھرا پردیش میں اردو لونے والوں کیلئے امید افزا ہے چونکہ میرا تعلق بھی حیدرآباد سے رہا ہے اس لئے میں حبیب الرحمٰن اور عابد علیخاں صاحب ایڈیٹر "سیاست" کی اردو خدمات سے واقف ہوں ۔ اردو تحریک کے لئے ان لوگوں کا دم غنیمت ہے ۔ ہماری نیک تمنائیں ان اصحاب کی کوششوں سے وابستہ رہیں گی ۔ خدا کرے اردو تعلیمی فنڈ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائے اس مرتبہ پونم کا شعری حصہ خوب ہے ۔ خصوصاً فیض، خلیل الرحمٰن اعظمی، شاذ تمکنت، غیاث متین، رؤف خلش کی غزلیں اچھی ہیں ۔ نظموں میں مجھے حرمت الاکرام اور اسلم عمادی کی پسند آئے ۔ البتہ اس دفعہ افسانوی حصہ کمزور سا لگا ۔ اختر حسن صاحب کے عنوان سے مزاحیہ مضمون کا گمان ہوا لیکن فیشن زدہ جدیدیت کے تعلق سے انھوں نے جو نکتے دیئے ہیں اس پر جدید لکھنے والوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے ۔ بہر حال یہ سلسلہ بیحد دلچسپ ہے ۔

★ ★ ★

محمد اکرام اللہ خان

فلمی دنیا کے شب و روز

پردۂ پسِ پردہ

بیگ گراؤنڈ میوزک

اگر کوئی آپ سے یہ کہدے کہ فلم کا گیت بنانا اور اسے ٹیون پہ گوانا آسان ہے بہ نسبت کسی فلم کی بیگ گراؤنڈ موسیقی کے تو آپ شائد مشکل ہی سے یقین کریں گے حالانکہ حقیقت میں یہ بات بالکل درست ہے۔ کسی گیت کی موسیقی اور بیگ گراؤنڈ موسیقی میں فرق صرف اتنا ہے کہ گیت لکھنے سے پہلے دھن بنائی جاتی ہے اور یہ دھن بھی کسی انگریزی فلم کی موسیقی سے چرالی جاتی ہے اور شاعر صاحب جنہیں آپ واقعی شاعر کہنا پسند کریں تو اس بنی بنائی دھن میں الفاظ بھر دیتے ہیں۔ الفاظ کا بھرنا ایک آرٹ ہے جو ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ مجھے یاد ہے جب ساحر، مجروح، شکیل فلموں میں نئے نئے آئے تھے اور ان دنوں فلموں میں سنتوشی، مدھوک اور کچھ منشی قسم کے گیت کاروں کا دور دورہ تھا ان ہی دنوں میں راجندر کرشن چلے آئے تھے اور ان کے لکھے ہوئے گیت ہر جگہ پسند کئے جارہے تھے ایک فلم تھی "مستانہ" جس میں موتی لال اور ردی نے کام کیا تھا اس میں ایک گیت تھا جس میں "تن پہ لنگوٹی" کا ذکر تھا جو شائد اس معصوم لڑکے کی طرف بھی کوئی اشارہ کرتا تھا جسے پہننے کیلئے مناسب کپڑے بھی نصیب نہ تھے یہ گیت فلم والوں کی زبان میں ہٹ ہوگیا ایک دن ساحر راجندر کرشن سے ملے اور انہوں نے پوچھا کہ یہ "تن پہ لنگوٹی" کونسی شاعری ہوئی؟ انہیں شاید اس کی شعریت پہ اعتراض تھا۔ راجندر کرشن نے جواب دیا "میاں شاعری واعری کے چکر میں رہو گے تو اس فلم نگری میں ایک دن واقعی لنگوٹی بھی پہننا پڑے گی۔ یہاں تو یہ دیکھو کہ کیا چلتا ہے اور اس چلن میں کس کا بینک بیلنس کتنا رہتا ہے۔ لنگوٹی نما شاعری کرنے والے کا بینک بیلنس زیادہ رہتا ہے یا حقیقی شاعری کا ڈھول پیٹنے والے کا۔" تو یہ ہوئی گیتوں کی اور اس کی موسیقی کی بات۔

اب سنیئے بیگ گراؤنڈ میوزک کا حال۔ کسی بھی میوزک ڈائرکٹر کا صحیح امتحان اس کی بیگ گراؤنڈ میوزک سے آسانی سے لگایا جا سکتا ہے بیگ گراؤنڈ موسیقی کی بدولت کہانی اور مکالموں کی ادائیگی کا تاثر بڑھ جاتا ہے یعنی کہیں کوئی سسپنس یا ڈراؤنے خوف کا چونکا دینے والا منظر ہو تو بیگ گراؤنڈ موسیقی میں ایک زبردست دھماکے کے ساتھ سازوں کو جھنجھنایا جاتا ہے اور اگر کہیں محبت یا اسی قسم کا کوئی سین آجائے تو یہ موسیقی دریا کی روانی اور جھرنوں کے ترنم کا انداز اختیار کر لیتی ہے جس سے منظر میں جان پڑ جاتی ہے اتنا ہی نہیں بلکہ یہ موسیقی اداکاروں کے جذبات و احساسات کی بھی خوشنما انداز میں ترجمانی کرتی ہے۔

۱۹۶۰ء میں بی آر فلمز کی ایک فلم آئی تھی "قانون" جس میں ایک بھی گیت شامل نہ تھا لیکن اس فلم کی کامیابی میں بیگ گراؤنڈ موسیقی کو بڑا دخل تھا جو بیرہ صاحب نے اس فلم کی موسیقی سلیل چودھری نے دی تھی جو آرکسٹرا کی زبان اور موسیقی کی گرامر سے بخوبی واقف تھے۔

جب غلام محمد کا انتقال ہوا تو "پاکیزہ" کے تمام گانے ریکارڈ ہو چکے تھے اور برسوں بعد جب "پاکیزہ" ریلیز ہو رہی تھی تو کمال صاحب نے نوشاد علی کو اس کی بیگ گراؤنڈ موسیقی کے لئے طلب کیا۔ نوشاد نے اپنی پوری مہارت کیا تھ ایسی جاندار بیگ گراؤنڈ موسیقی ترتیب دی کہ ہر سین اور ہر مکالمے میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ساز پہلے بولتے تھے اور مکالمے بعد میں سنائی دیتے ہیں ۔ او پی نیر کا بھی ایک زمانہ تھا ان کی موسیقی کی ہر طرف دھوم تھی ان کی فلمی زندگی کی ابتدا بھی بیگ گراؤنڈ موسیقی سے ہوئی یعنی ۱۹۴۹ء میں ایک فلم بنی تھی "کنیز" جس کی موسیقی ماسٹر غلام حیدر اور ہنس راج بہل نے دی تھی لیکن جب فلم ریلیز کے لئے تیار ہوئی تو ان دونوں میں سے کوئی بھی بیگ گراؤنڈ موسیقی کے لئے دستیاب نہ ہو سکا

(بقیہ سلسلہ صہ ۳۲ پر)

فلمی ڈائری

پچھلے ہندوستان کی طرح بمبئی کی فلمی دنیا نے بھی اردو کے عظیم ترین اور دنیا کے چند بڑے شاعروں میں سے ایک فیض احمد فیض کا انتہائی پرخلوص و پُرجوش خیر مقدم کیا۔ سنیل دت کے گھر پہ ایک پرتکلف پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں نرگس اور سنیل دت کے علاوہ راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، نمی، علی رضا، سجاد ید، راج کھوسلہ اور دوسروں نے شرکت کی۔ کھانے پینے کی محفل کے بعد ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ فیض شاعر کی حیثیت تو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں لیکن شخصیت کی حیثیت سے اتنے زیادہ مشہور مقبول نہیں ہیں حالانکہ انہوں نے دو فیچر فلمیں بنائی ہیں اور دس بارہ ڈاکومنٹری فلمیں۔ پہلی فلم "جاگو ہوا سویرا" ۱۹۵۹ء میں جو مچھیروں کی زندگی پہ بنائی گئی تھی۔ فیض فلم کے پروڈیوسر بھی تھے اور رائٹر بھی۔ یہ پاکستانی فلم ہے جسے چار بین الاقوامی ایوارڈ مل چکے ہیں۔ ان کی دوسری فلم سکھ ایسی ہے جسے انگریزی زبان میں بھی بنایا گیا ہے۔ یہ فلم ابھی ریلیز نہیں ہو سکی ہے۔ فلمی دنیا کی کشش نے فیض کو اپنی طرف نہیں کھینچا ہے بلکہ ان فلموں کے ہدایت کار اے۔ جے۔ قادر فیض کو فلمی دنیا میں لانے کے ذمہ دار ہیں۔ فیض نے جو ڈاکومنٹری فلمیں بنائی ہیں ان میں ایک علامہ اقبال پہ بھی ہے۔ علامہ اقبال پہ جو ڈاکومنٹری ہندوستان میں بن رہی ہے اسے سردار جعفری مکمل کر رہے ہیں۔ دو ہدایت کار، شاعر، دو فلمیں اور ایک موضوع جو خود ایک عظیم ترین مفکر شاعر کی زندگی و فن سے عبارت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون اس "موضوع" کی ہمہ گیریت کو کس رنگ اور کس انداز میں پیش کرتا ہے۔

★

ہالی ووڈ کی مشہور و مقبول فلمیں عام طور پہ یا تو بائیبل کے تاریخی پس منظر میں بنائی جاتی ہیں یا مشہور ناولوں کو فلمایا جاتا ہے جن کا کئی ہزار ڈالر معاوضہ دیا جاتا ہے۔ لیکن آج کل ایم۔ جی۔ ایم کی ایک فلم "THE CHAMP" بن رہی ہے جو کسی ناول کی بنیاد پہ نہیں بنائی جا رہی بلکہ ایک مشہور پرانی فلم کا نیا روپ ہے۔ اس فلم کو ناول کے روپ میں پیش کرنے کے لئے ایک پبلشر نے ایم۔ جی۔ ایم کو ۲ لاکھ ۳۶ ہزار ڈالر کا معاوضہ دیا ہے۔

★

۱۹۵۰ء میں امریکہ کی ایک کار کمپنی پہ ڈاکہ پڑا تھا اور ڈاکو نقد ۱۲ لاکھ ڈالر لے کر رفو چکر ہو گئے تھے۔ اس وقت کی تاریخ کے اس سب سے بڑے ڈاکے کیلئے ڈاکوؤں کو چھ سال تک پلاننگ کرنی پڑی تھی اور حکومت مسلسل چھ سال کی تلاش و جستجو کے بعد مجرموں کو پکڑنے میں کامیاب ہو سکی تھی اس مشہور ڈاکے اور مجرموں کی گرفتاری پہ ایک فلم بنائی گئی جس کا نام کار کمپنی کے نام پہ BRINKS رکھا گیا اور فلم کی تیاری کے سلسلے میں اصل مجرموں سے بھی مشورہ کیا گیا۔ فلم جب مکمل ہو گئی تو بوسٹن کی فلم لیبارٹری میں جہاں فلم کے پرنٹس تیار ہوئے تھے تین آدمی داخل ہوئے انہوں نے پستول نکالا، لیبارٹری کے کام کرنے والوں کو رسیوں سے باندھ دیا اور فلم کے پرنٹس لے کر چلتے بنے۔ ان پرنٹس کی قیمت ڈاکے کی رقم یعنی ۱۲ لاکھ ڈالر سے کہیں زیادہ ہے

★

بمبئی کے ایک مشہور ٹی وی پروگرام کا عنوان جگر مرادآبادی کا مصرعہ "پھول کھلے ہیں گلشن گلشن" تھا فلم ساز سریندر کپور نے اسی نام سے ایک فلم بنائی ہے جس میں اشوک کمار، رشی کپور، موسمی چیٹرجی کے علاوہ امجد خان بھی کام کر رہے ہیں۔ امجد خان پہلی مرتبہ اس فلم میں اسی انداز کا رول کریں گے جس انداز کا رول انہوں نے فلم "انکار" میں کیا تھا۔ ویسے اس فلم پر منوج کمار کی "انکار" کا کافی انکار نظر آئے گا کیونکہ فلم کے ہدایت کار سکندر کھنہ مرحوم منوج کمار کے اسسٹنٹ رہ

چکے ہیں۔

★

شکتی سامنت صرف فلم ساز اور ہدایت کار ہی نہیں ہیں بلکہ ڈسٹری بیوٹر بھی ہیں۔ انھوں نے پنجاب کے ڈسٹری بیوشن کے لئے فلم "گنگا ساگر" خریدی تھی اور خریدنے سے پہلے فلم دیکھنا اس لئے ضروری نہیں سمجھا کہ انھیں یقین ہے کہ فلم کے ٹائیٹل میں گنگا کا نام کامیابی کی ضمانت ہے۔ اسے کہتے ہیں سچا عقیدہ۔

★

این۔ سی۔ سپی ایک فلم بنا رہے ہیں "وستو پہ ستّا" جس میں امیتابھ بچن اور راکھی کی جوڑی کام کر رہی ہے ویسے یہ انگریزی فلم "سیون برائڈس فار سیون برادرس" کی کاپی ہوگی۔

★

راج کپور اپنی پرانی فلموں "میرا نام جوکر" اور "سنگم" کے نئے نیگیٹوز لندن میں تیار کروا رہے ہیں تاکہ پوری پبلسٹی کے ساتھ اس سال ان فلموں کو دوبارہ نمائش کے لئے پیش کیا جا سکے۔ اس سے شاید ستیم شیوم سندرم کی ناکامی کا احساس کچھ کم ہو جائے گا۔

★

فلمستان اسٹوڈیو کے سب سے بڑے فلور پر ایک عظیم الشان سیٹ تیار کیا گیا ہے جس پر راجہ صاحب فلمستان کے تاریخی شاہکار

"رضیہ سلطان" کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ اس فلم میں ہیما مالنی کے ساتھ جو رضیہ سلطان کا کردار ادا کر رہی ہے، دھرمیندر کام کر رہا ہے دوسرے اداکاروں میں سارِیکا، اجیت، پردیپ کمار اور سہراب مودی شامل ہیں۔ ہدایت کار کمال امروہی کے لڑکے تاجدار اور شاندار بھی پہلی مرتبہ اس فلم میں کام کریں گے۔ ہالی ووڈ کی مشہور فلموں "بن ہر" اور "خرطوم" کا فوٹو گرافر یانیما کینوٹ فلم کے کلائمکس پر ہونے والی جنگ کے سین کی فوٹوگرافی کرے گا۔

★

بمبئی کے سینما ڈریم لینڈ میں جہاں "پتی پتنی اور وہ" ہاؤس فل جا رہی ہے چار قسم کے ٹکٹ فروخت ہو رہے ہیں۔ اصلی ٹکٹ جو صحیح دام پر آپ کو مل جاتے ہیں، بلیک ٹکٹ جسے زائد پیسے دے کر خریدنا پڑتا ہے، اکسٹرا ٹکٹ جو دوسرے والوں کے پاس زائد ہوتے ہیں اور جسے وہ فروخت کر دیتے ہیں اور چوتھے "وہ ٹکٹ" جو نقلی پرنٹ کیے ہوتے ہیں اور جنھیں خرید کر بھی آپ سینما ہال میں داخل نہیں ہو سکتے۔

★

بہت سے فلم آرٹسٹ جو اسٹیج سے فلمی دنیا میں قدم رکھتے ہیں اسٹیج کو بھول جاتے ہیں لیکن امول پالیکر جو گیارہ سال

اسٹیج پر ایکٹنگ کرنے کے بعد فلموں میں آیا ہے آج بھی اسٹیج سے وابستہ ہے اسٹیج ایکٹنگ سے اسے اتنا پیار ہے کہ اس نے اسٹیج پر کام کرنے کا کبھی معاوضہ نہیں لیا۔ وہ بینک میں کام کر کے پیسہ کماتا تھا اور ڈراموں میں کام کر کے اپنا شوق پورا کرتا تھا۔ آج وہ فلموں سے پیسہ کماتا ہے اور بینک میں جمع کرتا ہے۔

★

جس فلم میں آپ کو بالکنی کا ٹکٹ نہ ملے اور سامنے کے درجوں کے ٹکٹ آسانی سے مل جائیں تو سمجھئے کہ کوئی ایسی فلم چل رہی ہے جسے صرف ذہین اور دانشور تماشائی پسند کر سکتے ہیں عام تماشائی نہیں۔ آج کل بمبئی کی ریگل سینما کا بھی یہی حال ہے جہاں ستیہ جیت رے کی "شطرنج کے کھلاڑی" چل رہی ہے۔ امریکہ کے ایک اخبار "واشنگٹن پوسٹ" نے اس فلم کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فلم کی کہانی پریوں کی داستانوں کی طرح حسین ہے۔ ایک ایسی فلم جو تاریخی پس منظر میں بنائی گئی ہو اس کے لئے "پریوں کی داستان" کے الفاظ استعمال کرنا پتہ نہیں تعریف ہے یا طنز۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امریکی ستیہ جیت رے کی بنگالی فلمیں تو سمجھ سکتے ہیں ہندی فلمیں ان کے پلے نہیں پڑ سکیں۔

★

یش چوپڑہ "کالا پتھر" اور بی۔ آر چوپڑہ "دی برننگ ٹرین" بنا رہے ہیں ان فلموں میں حادثوں کی تباہ کاریوں کو پیش کیا گیا ہے اور

پر عکس ہالی [illegible] TOWERING [illegible] EARTH QUAKE اور INFERNO جیسی فلموں سے متاثر ہو کر بنائی جا رہی ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں ہر سال سیلاب سے جو تباہ کاریاں ہوتی ہیں انھیں کسی فلم ساز نے فلمانے کی کوشش نہیں کی۔ ویسے "ستیم شیوم سندرم" میں راج کپور نے سیلاب کے منظر کو تو خوبصورتی سے فلمایا ہے لیکن فلم کا موضوع سیلاب نہیں ہے۔ اس سال شمالی ہند میں سیلاب سے ہونے والی بھیانک تباہ کاریاں یقیناً کسی فلم ساز کو متوجہ کریں گی۔

★

گزشتہ ماہ فلمی دنیا کی تین اہم شخصیتوں نے ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منہ موڑ لیا۔ ۶ ستمبر کو فلم ساز شیام بہل قلب کے حملے سے جانبر نہ ہو سکے۔ ان کی پہلی فلم "دنیا" تھی۔ ان کی نئی فلم "گولڈ میڈل" ریلیز کے لئے تیار ہے۔

جنوبی ہند کے مشہور فلم ساز چینپا دیور جنھوں نے جانوروں کو موضوع بنا کر کئی تلگو، تامل اور ہندی فلمیں بنائی تھیں ۸ ستمبر کو چل بسے۔ موت کی وجہ دل کا دورہ۔ ان کی مشہور ہندی فلموں میں ہاتھی میرے ساتھی، جانور اور انسان، گائے اور گوری" اور "ماں" کو تماشائی فراموش نہیں کر سکتے۔ ان کی نئی فلم "میرا رکشک" ابھی ابھی ریلیز ہوئی ہے۔

پرانے زمانے کے مشہور فلم ساز، ہدایت کار اور گیت کار ڈی۔ این۔ مدھوک کا ۸ ستمبر کو انتقال ہو گیا۔ گردوں کے علاج کے سلسلے میں انھیں دواخانے میں شریک کیا گیا تھا لیکن موت، اچانک دل کی حرکت بند ہونے سے واقع ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے فلمستان کی فلم "شہنائی" بنائی تھی جو اس زمانے کی کامیاب ترین فلم تھی۔ اس فلم میں "جوانی کی ریل چلی جائے رے" اور "آنا میری جان سنڈے کے سنڈے" جیسے مشہور گانے بھی لکھے تھے۔ ان کی دوسری مشہور فلموں میں "کھوڑی"، "ترنم"، "شن شنا کی بوبلا بو" اور "برسات کی رات" شامل ہیں۔ گرودت، سبودھ مکرجی اور چاند ان کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔

★

مسقط کے ایک تاجر اے اسلم نورانی نے جوہو بمبئی میں ایک فلم "وطن" بنائی ہے۔ عید الفطر کے موقع پر فلم والوں کو ایک شاندار پارٹی دی۔ ناؤ نوش و رقص و موسیقی کی اس محفل میں دلیپ کمار، سنیل دت، دھرمیندر، رینا رائے کے علاوہ کئی اہم فلمی شخصیتوں نے شرکت کی۔

"رات پھر نہ آئے گی" اس فلم کی آخری دو ریل مکمل کرنے کیلئے پروڈیوسر کے پاس پیسہ ختم ہو گیا تھا بڑی مشکل سے فلم مکمل ہوئی اور اب بیگ گراونڈ میوزک کا سوال پیدا ہوا۔ آپ جانتے ہیں انھوں نے کیا کیا۔ میوزک ڈائرکٹر کو ہزاروں روپیہ دینے کے بجائے انھوں نے پانچ روپیہ میں انگریزی فلم "گولڈ فنگر" کی موسیقی کا ریکارڈ خریدا اور اسے فلم کے کلائمکس اور دوسرے مقامات پر بجا کر بیک گراونڈ موسیقی کا مشکل ترین حل نکال لیا ہے۔

بقیہ :- "پس پردہ پس پردہ"

بیگ گراونڈ میوزک

صفحہ ۲۹ سے آگے۔

اور آخر کار او پی نیر کو یہ مشکل کام انجام دینا پڑا یوں تو شانتارام کے گروپ میں وسنت دیسائی مستقل طور پر ملازم تھے اور ان کی ہر فلم کی موسیقی وہی دیا کرتے تھے لیکن انھوں نے اپنی فلم "پرچھائیں" کی موسیقی کے لئے رامچندر کا انتخاب کیا۔ رامچندر نے بڑی اچھی دھنوں میں اس فلم کے گیت گوائے تھے لیکن اپنی بے پناہ مصروفیت کی وجہ وہ اس فلم کی بیگ گراونڈ موسیقی نہ دے سکے۔ چنانچہ شانتارام نے ان کی اجازت سے یہ کام پھر وسنت دیسائی کو سونپ دیا۔ شنکر جے کشن کی ٹیم میں، جے کشن بیگ گراونڈ میوزک دیا کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح لکشمی کانت پیارے لال کی ٹیم میں پیارے لال کو یہ کام انجام دینا پڑتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے پریسیڈینٹ اوارڈ جیتنے والی فلم "شہر اور سپنا" جب بنائی تو ٹائیٹل میوزک دینے کیلئے انھیں کسی بھی میوزک ڈائرکٹر کی خدمات حاصل نہ ہو سکیں چنانچہ انھوں نے اس جگہ شہر کی بھیڑ، موٹروں کی آواز، گھوڑا گاڑی کے شور کو ملا کر ایک ایسی "موسیقی" ترتیب دے ڈالی جو کسی بھی میوزک ڈائرکٹر کے بس کا روگ نہ تھی۔

اسی طرح سے ایک فلم "انوراگ" تھی جس میں...

بےلاگ فلمی تبصرہ

پتی پتنی اور وہ

از:۔ تماشائی

بی۔ آر۔ چوپڑہ ہماری فلمی دنیا کے ایک تجربہ کار اور ذہین فلم ساز و ہدایت کار ہیں۔ ان کی فلمیں موضوع اور پیش کش کے اعتبار سے عام فارمولا فلموں سے مختلف ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود باکس آفس پہ کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ "ایک ہی راستہ" "نیا دور" "سادھنا" "قانون" اور "اتفاق" اس قسم کی کامیاب فلموں میں سے چند ہیں۔ "پتی پتنی اور وہ" بی آر۔ چوپڑہ کی پہلی کامیڈی فلم ہے۔ سلیم جاوید ٹائپ کی مار دھاڑ انتقام اور تشدد سے بھری فلموں کی دم گھٹا دینے والی فضا میں اس قسم کی فلمیں تازہ ہوا کا ایک جھونکا سا لگتی ہیں۔ اس سے پہلے اپنی فلموں "اتفاق" اور "دھند" روپ کو مجروح کر کے اس کی بے وفائی کو پیش کیا تھا۔ اس بار انہوں نے مرد کے دوسرے روپ کو پیش کیا ہے اور یہ "وہ" مرد کی وہی ازلی کمزوری ہے جس کا نام عورت ہے۔ فلم کی کہانی کا مرکزی خیال جاپان کے ٹی۔ وی۔ کی کسی گھریلو فلم سے لیا گیا ہے اس خیال کو ٹی۔ وی۔ سے کاغذ پہ بی۔ آر چوپڑہ کی بیوی نے منتقل کیا تھا پھر اسے ہلکی پھلکی کامیڈی کا روپ خود بی۔ آر۔ چوپڑہ نے دیا ہے کہانی بہت ہی روایتی انداز میں شروع ہوتی ہے یعنی ایک نوجوان رنجیت (سنجیو کمار) جو کسی کمپنی کا کلرک یا کونٹنٹ ہے سائیکل پر جاتے ہوئے ایک دوسری سائیکل سے ٹکرا جاتا ہے ظاہر ہے اس دوسری سائیکل پر کوئی مرد تو ہو نہیں سکتا۔ ایک حسین لڑکی شاردا (ودیا سنہا) ہے جو رنجیت سے الجھ پڑتی ہے۔ رنجیت اس حسین حادثہ کو اپنی ڈائری کے صفحے پر ہی نہیں بلکہ اپنے دل کے گوشے کاغذ پر بھی تحریر کر لیتا ہے۔ دل کی اس تحریر کی کشش کی بدولت ایک دوست کی شادی میں رنجیت اور شاردا کا ایک بار پھر سامنا ہو جاتا ہے۔ نظریں ملتی ہیں۔ دل کی دھڑکنیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ اور پھر دونوں شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں "گربہ کشتن روز اول" کے چکر میں رنجیت خود کشتۂ الفت ہو جاتا ہے اور اس طرح قافلہ موسم گل نئی منزلوں کی طرف چل پڑتا ہے۔ اس سفر میں مستقبل کی بہار دل کا پیامبر بن کر ان کی محبت کی نشانی رنکو بھی ان کا ہم سفر بن جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سات سال گزر جاتے ہیں۔ یہاں تک تو سب ٹھیک ٹھاک رہتا ہے۔ لیکن زندگی میں ہمیشہ یکسانیت نہیں رہتی۔ چنانچہ پتی جب کمپنی کا منیجر بن جاتا ہے تو یہ گھریلو پتنی پٹاخہ بن کر گرتی ہے اور یہ کمی ہے پتی کی حسین کا قرار اسکریٹری۔

نرملا (رنجیتا)۔ نرملا کاغذوں پر رنجیت کے دستخط لینے سے پہلے ہی اس سے اس کا دل چھین لیتی ہے اور یہیں سے "وہ" کی کہانی شروع ہوتی ہے شاردا کو جب اس "وہ" کی خبر ہوتی ہے اور وہ اپنی آنکھ اور اپنے کیمرے کی آنکھ سے شوہر کی بے وفائی کو دیکھ لیتی ہے تو گھر میں ایک طوفان آجاتا ہے رنجیت کا دوست درانی (اسرانی) اس طوفان کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن شاردا رنجیت کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ مگر شادی شدہ زندگی میں ایسے فیصلے صرف پتی اور پتنی کے ہاتھ میں نہیں ہوتے بلکہ اس پیار کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جو انہیں اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہوتا ہے رنکو کی پیار بھری مسکراہٹ شاردا کے قدموں کو روک لیتی ہے۔ فلم ویسے تو یہیں ختم ہو جاتی ہے لیکن بی آر چوپڑہ نے ایک قدم اور آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک طوفان تو ختم ہو جاتا ہے جب نرملا چلی جاتی ہے۔ لیکن اس کے جانے کے بعد ایک اور حسین سکریٹری کاغذوں پر دستخط لینے کے لئے رنجیت کے روم میں داخل ہوتی ہے۔ اس کا دل ایک بار پھر اپنی جگہ چھوڑنا چاہتا ہے کہ اسے گزرے ہوئے طوفان کی یاد آجاتی ہے اگر آپ کی یادداشت بہتر ہے تو آپ بھی شیکسپیئر کو یاد کر کے MEN WERE DECEIVERS EVER کہتے ہوئے اپنی سیٹ چھوڑیں گے۔

بی۔ آر۔ چوپڑہ کی ہدایت فلم کے ہر فریم پر آپ کی توجہ برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے کملیشور کا اسکرین پلے بے حد چست ہے لیکن فلم کے مزاحیہ جملوں میں کملیشور کے قلم

...سامراتی کے لئے ...

کچھ اور COMIC SITUATION پیدا کئے جا سکتے تھے۔ شادی کے موقع پر قوالی کے انداز میں گانے کا مقابلہ ہیش کش اور موسیقی دونوں اعتبار سے لاجواب کہا ہے۔ بہت کم تجارتی اداکاروں کے ہاں ایسے ہوں گے جہاں سات سال میں کسی کلرک یا اکونٹنٹ کو ڈپٹی منیجر بننے کا موقعہ مل جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایسی کمپنیاں بھی بہت کم ہیں جہاں منیجر کو اپنی سکریٹری سے پیچھا چھڑانے کے لئے اتنا درد سر مول لینا پڑتا ہے۔ سنجیو کمار نے اتنی پیاری اداکاری کی ہے کہ ذہن میں ایک احساس یہ بھی گزرتا ہے کہ کہیں اس رول کی وجہ سے وہ زندگی بھر کنوارا ہی نہ رہ جائے۔ ودیا سنہا نے کامیابی سے اپنے رول کو نبھایا ہے۔ اسرانی کی بے ساختہ اداکاری تماشائیوں سے مسکراہٹوں کا خراج حاصل کرتی ہے۔ رنجیتا نے اپنے نسبتاً مختصر رول کو ٹھیک انداز میں ادا کیا ہے۔ آنند بخشی کے گانے اور رویندر راجین کی موسیقی صرف فلم کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ فلم کی ابتدا میں ایک دلچسپ INTRODUCTORY TITLE پیش کیا گیا ہے جس میں نکتہ آغاز سے آدم کا بچے آپ بنتے آتے ہیں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اس ٹائیٹل کو کارٹون ٹائیٹل کے طور پر دکھایا جا سکتا تھا کیونکہ کارٹون ٹائیٹل کا فلم میں پتہ نہیں ہے۔ ہدایت کار و فلم ساز کو ایک اور بات کے لئے مبارک باد دی جا سکتی ہے کہ انہوں نے صرف ایک مہینے میں اس فلم کی شوٹنگ مکمل کر لی تھی۔

مقصد یہ کہ آپ فلم "پتی پتنی اور وہ" سکون کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں اور اگر ابھی "پتی پتنی" کا چکر نہیں چلا ہے تو بھی دیکھ لیجئے۔ کیونکہ ایک دفعہ اگر یہ چکر چل جانے والا ہے اور پھر وہ شے بچنا بہت مشکل ہے۔ ●●

★ پونم کے جن خریداروں کی مدت ختم ہو چکی ہے وہ بعجلت ممکنہ چندہ روانہ فرما کر سالانہ خریداری کی تجدید کروائیں ورنہ پرچے کی اجرائی بند کر دی جائے گی۔ (ادارہ)

HSE : 6.
POONAM URDU MONTHLY
Editor : Nasir
Office : Azampura Hyderabad-500024

Decem.

1-25

علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ — جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت — اشاعت کا چودھواں سال

جلد : ۱۴
شمارہ : ۱۲
ڈسمبر ۱۹۷۸ء
زرِ سالانہ : (۱۵) روپے
لائبریریز کیلئے (۲۰) روپے
بیرونی ممالک سے (۲۵) شلنگ

پونم

خط و کتابت کا پتہ :-
مینجر ماہ نامہ "پونم"
16-7-300/1
اعظم پورہ
حیدرآباد 500024

ایڈیٹر : ناصر کرنولی ایم اے (عثمانیہ)

ترتیب

مطبوعہ : دائرہ الکٹرک پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۲

کرشنا اور گوداوری

ہماری دو عظیم ندیاں کرشنا اور گوداوری آندھرا پردیش کی اراضیات کو بڑے پیمانے پر مالامال کرتی ہیں۔ ہندوستان کے بڑے ہمہ مقصدی پراجکٹوں میں سے ایک دریائی پراجکٹ ناگرجونا ساگر ہے جس سے ملک کی پیداوار کو بڑھانے کے لیے دریائے کرشنا کے پانی کو روکا گیا ہے۔ اس پراجکٹ کی دونوں دائیں اور بائیں کنالوں سے ۲۱ر۵۴ لاکھ ایکر زمین سیراب کرنے کے لیے پانی دستیاب ہوگا۔ کنالوں کی پوری لانبائی تک تعمیر کے لیے کھدائی کا کام جاری ہے۔ موجودہ صورت میں تقریباً ۱۲ر۷۰ لاکھ ایکر زمین کو سیراب کرنے کے لیے آبپاشی کی سہولتیں دی جا رہی ہیں۔

ناگرجونا ساگر ہائیڈرو الکٹرک اسکیم کے تحت بجلی پیدا کرنے کی مکمل تنصیبی صلاحیت ۱۱۰ میگاواٹ ہے۔ صدر جمہوریہ ہند نے ۱۰ر جولائی ۱۹۷۸ء کو اس اسکیم کا افتتاح کیا۔ سری سیلم ہائیڈل پراجکٹ جو منقریب کام کرنا شروع کر دے گا تو اس وقت ریاست میں بجلی پیدا کرنے کی تنصیبی صلاحیت میں مزید اضافہ ہوگا۔

۳۰.۸ کروڑ روپیے کی لاگت سے گوداوری پر تعمیر کیے جانے والے پوچم پاڈ پراجکٹ پر کام تیزی سے جاری ہے۔ اس پراجکٹ سے تلنگانہ کے بیشتر علاقے کو فائدہ پہنچے گا۔

No: 28/78-79

ڈائرکٹر جنرل محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ۔ آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

LETTER No: 2590/ADVT/C4/78 Dt 23-11-78

نفیس کاشان

ادب میں وجودی تصور

دیگر فلسفہ وجودی نظریہ یوں ہے کہ انسان اس بیزار حوادث دنیا میں اپنے انتخاب، اپنی رضا اور اپنے اعمال کے سلسلے میں بغیر اخلاقی تذبذب کے کس حد تک مختار ہے۔ وہ وجودی فلسفی جو کیر کیگارڈ کی طرح خدا کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں انسان کے اختیار کے ساتھ اس کی اخلاقی ذمہ داری پر بھی زور دیتے ہیں جیسا کہ سارتر کہتا ہے کہ خدا کا وجود نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اس نے انسانی موقف پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بہرکیف یہاں موضوع بحث زندیقیت یا اعتقادیت نہیں بلکہ ادب ہے۔

موجودہ صدی کے اوائل میں فلسفہ کی متعزلات میں آشفتہ سر بھٹکنے کے بعد سورن کیر کیگارڈ نے ادب میں وجودیت کا خواب دیکھا۔ لیکن اس کی کاوش کلیتاً دلگیر پہ قتل ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ ادب اور فلسفہ دو جداگانہ منطقات ہیں جن کے درمیان کی سعی لا منطقی ثابت ہوتی ہے۔ ادب میں وجودی تصور اس کے فلسفہ نظریے سے مختلف ہے۔ یہاں وجودیت سے مراد یوں لیا جا سکتی ہے کہ حوادث سے مملو اس روئے زمین پر افتادِ انسانی ایک ذمہ داریوں سے لیس المیہ ہے۔ اس طرح انسانی وجود بذاتِ خود ایک عظیم المیہ ہے۔ انسانی وجود ایک ایک ازلی کابوس، مہیب تابوت، بھیانک تجر، عفریتی سرطان، تاریخی استحصال، تہذیبی جبر، عمرانی جدلیت، فلسفیانہ حزن، نفسیاتی فشار، احساساتی انفجار، ظلماتی فریبِ آگہی، مابعد الطبعیاتی ہراس، پُر ہول خواب، دوامی کرب اور جبری مشقت کا مجموعہ ہے۔ خاک آغاز ہے خاک انجام ہے۔ خاک آفرینش ہے ادوار پر بسیط ایک غیر مختتم تسلسل ہے۔ حزنیہ احساس کی سطح پر مکتسب انسانی وجود ایک المیاتی دستاویز ہے جس سے فرد کے لئے مفر ممکن نہیں۔ وہ صرف حذر کر سکتا ہے۔ تب بھی نامساعد حالات کی یلغار اور محرومیوں کی ضرب اُسے ژولیدہ خاطر کر دیتی ہے۔ اس پر مستزاد ظلمِ کج رفتار کی ستم ظریفی اُس کے وجود کی جڑیں کھوکھلی کر دیتی ہے۔ بربنائے مصائب و آلام فرد مایوس

ہو گیا ہے۔ بے بس ہو گیا ہے۔ اندر سے ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ اُس کا کوئی چارہ گر نہیں، کوئی غم گسار نہیں، کوئی ندیم نہیں چنانچہ وجودیت کا حامی فنکار معاشرے میں فرد کے اس سوزیدہ موقف پر اظہار کرتا ہے۔ وجودیت کے مُضمر انسانی وجود کے تعلق سے اگر اس قبیل کے منفی نظریات قائم کریں تو یہ وطیرہ غیر فطری نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ حقیقت بہرحال اتنی ہی تلخ ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ مراجعت قنوطیت اور ظلمت پسندی سے احتراز کرتے ہوئے اُمید کے بل بوتے مستقبل کی درخشانیت میں یقین رکھتے ہیں۔

وجودیت مغربی ممالک میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد عالم وجود میں آئی۔ لیکن ہمارے یہاں اس کے اثرات نصف صدی بعد رونما ہوئے ویسے وسیع پیمانے پر جائزہ لیا جائے تو سقراط کی منطق ہو یا کنفیوشس کی تعلیق، افلاطون کی میتافزیقا ہو یا ارسطو کی بوطیقا، دانتے کی طربیۂ خداوندی ہو یا ایلیٹ کی ارض الفقرا کہ، ڈاکٹر رادھا کرشنن کی ویدانتیت ہو یا علامہ اقبال کی وحدانیت، ان میں وجود کی کڑیاں مربوط ملیں گی۔ فلسفیوں کے یہاں وجودی فلسفہ ملتزم رہے گا اور ادیبوں کے یہاں وجودی فکر غالب رہے گی۔ الغرض لاہوت، ناسوت اور جبروت سے لے کر طاغوت، عنکبوت اور تابوت تک سلاسل وجود موجود ہیں

یورپائی ادب میں کیرکیگارڈ، کافکا، رلکے، کامو، سارتر، نطشے، پاسکل، دوستوفسکی وغیرہ وجودیت کے علمبردار ہے۔ اُردو ادب میں صفدر میر اور افتخار حسین کے نام نمایاں ہیں۔ لیکن اردو ادب میں وجودیت کو پوری طرح ابھر آنے میں ابھی عرصہ درکار ہے۔

ایک وجودی ادیب تمام تر شدتوں کے ساتھ مکمل کا انسانی شعور رکھتا ہے۔ وہ آفرینشیت سے ابتدا کر کے اساطیری ادوار سے گزر کر پُرخوف شتابیت اور روحانی جمعیت لیے ہوئے عہد عصر میں داخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو قرونِ اولیٰ، ازمنۂ وسطیٰ اور [illegible] ادوار سے غیر وابستہ نہیں کرتا۔ [illegible] متوسطین اور متاخرین کے ادبی فنون سے متمتع ہوتے ہوئے ان میں عصریت کے لوازم اور درد بھی شامل کر لیتا ہے۔ اُن کے کلاسیکی موسیقی رومانوی اور جدید علائم وجودیت کا موثر ناشناسی کرتے ہیں وہ اقتدار زمانہ کے رطب و یابس سے کامل واقفیت رکھتا ہے۔

وجودی ادب میں اساطیر سے مناسب اکتساب احسن ہے لیکن اساطیر کو محض تصور کر کے انہیں ہو بہو [illegible] حال و مستقبل سے گریز اور ماضی کی طرف لا حاصل مراجعت ہے۔ [illegible] کھولتے اور ان ہی کو موضوع بناتے

میں بڑا فاصلہ ہے۔ اساطیر کا اخلاقی استعمال ادب کو ایک [illegible] کا مطلق استعمال [illegible] ہے [illegible] وصف کی حیثیت رکھتا ہے۔ کافکا اس نوع کی اساطیری تجرید کا پیش رو تھا۔

ادب میں وجودی فکر کے تحت مشیئت کا انطباق نہ صرف زمانی و مکانی علائق پر مرکوز ہوتا ہے بلکہ لازمانی و لامکانی مراحل تصعد اور مدارج تنزل و صعود پر بھی مرتکز ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اکثر مفکرین اور ادبار کے اس تصور کی نفی ہو جاتی ہے جو یہ سوچتے ہیں کہ مرئی نہ سہی کم از کم غیر مرئی موجودات عدمیت کے زمرے میں آتے ہیں۔ لہٰذا نیز شیت اور لا عدمیت کے تصورات وجود کی نفی کا نہیں بلکہ وجود کی لا یعنیت کا اظہار ہیں۔ کسی شے کا بے معنی ہونا اسے عدم قرار نہیں دے سکتا۔

سی۔ جے ینگ کا اجتماعی لاشعور، الفرڈ ایڈلر کے شعوری مدارج، سگمنڈ فرائڈ کے نفسیاتی تجزیے، ہنری ایلس [illegible] الکٹرا اپیچیدگیاں نفسیاتی سطح پر وجودی موشگافیاں ہیں جو جدید ادب میں در آئی ہیں۔ کافکا کا ادبی فیصلہ روحانی سفر وجودیت کے [illegible] ذات کی تلاش میں سرگرداں رہ کر انجام [illegible] قریب آ کر [illegible] طے کرتا

ہوا [illegible] ہوتا ہے [illegible] فلسفیانہ [illegible] سارتر کا ژاں ژنے [illegible] دوسری وجودی تنویر [illegible] الموسوم ہیں اور کافکا کا تبدیل یعنی میٹامارفوسس وجودی فکر کا دائرۃ المعارف ہے، ایڈگر ایلن پو کے یہاں خباثت کا پیکر وجودی ظلمت کی علامت ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظم ارض القفر میں پیرانہ سال نابینا [illegible] کا پیکر وجودی رموز اور کربیت کا ضامن ہے، اسپلینڈر کے یہاں انسانی افکار وجود کی متفرق پوشیدگیوں کی مرکزیت ہے، الوجین اونیل کے ایفائن میں شناخت، تعمیر ذات اور قیام تعلق وجودیت کے ابعاد ثلاثہ ہیں۔ ایڈورڈ ایلبی اور سیموئیل بیکیٹ کے ہاں معنویت کے تعین کی اساس وجود کی غیر یقینی کیفیات پر مبنی ہے۔ کافکا کا مابعد الطبیعیاتی خوف وجود کی پُر ہجوم تنہائیوں کا شاخسانہ ہے، البرٹ کامو کی بیگانگیت وجودی انشقاق کا نتیجہ ہے، ژاں پال سارتر کی فلسفیانہ ناول [illegible] وجود کے اظہار کا حاصل ہے۔ کافکا کے [illegible] کا جبر [illegible] میں اور [illegible] انسانی کا [illegible] میں متغیر ہو جانا وجود کا [illegible] ثابت [illegible] ہے

[illegible] اور [illegible] کافکا کی [illegible]

ادب میں وجودیت کے تصور کی ایک بہتر مثال [illegible] انسانی وجود کی [illegible] وجودیت کا بہترین [illegible] غیر مرئی اشیاء کے خوف کی اور پانی تخلیق جوہر کا [illegible] ہو چکا ہے۔ اس ناولٹ میں [illegible] انسانی وجود کی درماندگی کا قائم مقام ہے۔ مقام افسوس ہے اس فن پارے کو بہت کم پڑھا گیا اور اس سے بھی کم لوگ سمجھ سکے۔ اس کی تہہ داری اور [illegible] ادیب کی خصوصیات اور [illegible] کے مواقع [illegible] کی روشنی میں ممکن ہے اس کی قدردانی اور پسندیدگی کا انحصار قاری کی عالمگیر عصری ادب سے واقفیت پر ہے۔ برصغیر میں اس روش کا اب تک یہ واحد شہ پارہ ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" سے چند ناقدین نے وجودیت کے تانے بانے منسلک کرنے کی سعی کی ہے۔ حالانکہ اس طرح کا انسلاک [illegible] غیر معقول ہے۔ کیونکہ "آگ کا دریا" کرداروں کی باہمی کشمکش کی ڈرامائیت سے قطع نظر محض ایک سیاسی اور سماجی دستاویز ہے۔ اس طرح اس ناول کی فنی تشکیل پر وجودی تشکیل کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

[illegible] کا نام [illegible] دریافت کیا جاتا تو [illegible] انکار کر دیتا [illegible]

میں جکڑی ہوئی ہے۔ زندگی ایک تاریک مسلسل ہے [illegible] کو رنج میں گرفتار کرتا ہے انسان ایک ایسے وجود کی حیثیت سے زندگی کو [illegible] پہنچتا ہے جو خود اپنے دردوں اور [illegible] ہے ایک فرد اپنے غم و الم کی حالت میں ایک وجودی حیثیت سے جو کچھ محسوس کرتا ہے وہ بھی اپنے آپ کو ذمہ داریوں میں محبوس کرتا ہی ہے وجود کے کل احساس کی کیفیت تاسف اور حزن کی ہے۔

ایک وجودی فکر کا قائل فطین انسان شعوری سطح پر بھول جانا چاہتا ہے کہ وہ انسان ہے۔ لیکن وہ اس دنیا کی عارضی حقیقتوں کے جال میں اس حد تک گرفتار ہے کہ بھول نہیں سکتا۔ وہ روئے زمین پر [illegible] نہیں۔ زمین اس کے لئے نہیں بنائی گئی وہ محض اتفاق سے اس کرۂ ارض پہ ہو موت صرف ایک تبدیلی ہے۔ ان معنی میں کہ موت انسان کی مامتا ہی زندگی میں محض ایک مرحلہ کا نام ہے۔

زندگی کا ظرف ہے اس کی زمبیل میں تسخیر در انسان نہیں۔ وجودیت اس خطۂ ارض پر ایک لاچار اجنبی ہونے کا روح فرسا احساس ہے۔ فرد کی تنہائی اس کی روحانی تشنگی، اس کی زندگی کی بے معنویت، مغویت اور لغویت کا احساس اور اس کی آفریت کی بے پناہ اور وحشیانہ جبلتوں کی بے رنگی کا شعور اسے پژمردہ کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ زندگی بے معنی ہے انسانی وجود لا طائل ہے۔ لیکن لایعنیت بجائے خود ایک معنوی جواز رکھتی ہے لایعنیت کی اذیت ناک وجوہات ہی اس کا معنوی جواز ہیں۔ ان سب کے باوجود صرف وجود ہی ایک حقیقت عظمیٰ ہے لیکن تلخ ترین۔ کیونکہ وجودیت ایک ازلی کرب کی [illegible] ملفوف زندگی سے معاونت کا نام ہے۔

ایک صنعتی انقلاب سے متاثر شاعر یا ادیب میں اور ایک وجودی فکر میں بڑا تفاوت ہے۔ ایک وجودی شاعر یا ادیب میکانکی اور ترقی پسند شعراء و ادباء سے قطعی منفرد و ممتاز ہوتا ہے البتہ وجودیت کے حامی فنکاروں سے بہت قریب ہے بلکہ چند جدید فنکار بذات خود ادب میں وجودی نظریے کے قائل ہیں۔ وجودیت اور جدیدیت ایک دوسرے کی معاون ہیں۔

ادب میں وجودی تصور اس لیے جاگزیں ہوا کہ ہم عصری انسان کے وجود کی تکمیل کے خدشے سے دوچار ہیں۔ وجودی ادب کے تحت جو نکتہ مستنبط ہوتا ہے اس کی توجیہ یوں کی ہے کہ یہ ایک متکلمانہ اور دانشورانہ فلسفہ اظہار ہے اور اس ضمن میں کسی قسم کے افہام و تفہیم کی چنداں ضرورت نہیں۔۔۔

★

آندھرا پردیش ترقی کی سمت گامزن

وندھیاچل کے جنوب میں رہنے والے تلگو عوام جن کے شاعروں، مصوروں اور بادشاہوں، سائنسدانوں اور فنی ماہروں نے بیسیوں سال سے ہندوستان کی سدا بہار عظمت کو دوبالا کرنے کے لیے روایتی اور نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔

ملک کے بیچوں بیچ میں واقع ریاست آندھرا پردیش کو قدرت نے بے پناہ وسائل سے مزین کیا ہے۔ تاریخ نے اس کو ملک و ملت کے تعصبات سے آزاد مشترکہ تہذیب سے آراستہ مستحکم عطا کیا ہے جہاں قدیم دنیا کی مہک اور جدید صنعتی بنیادیں ملتی ہیں۔ آندھرا پردیش ہمارے لیے جنت نشان ہے

صورت سے صنور جنوب کا یہ علاقہ ملک کا غلہ گودام کہلاتا ہے جہاں کے کسان ہر اور کاشت سال ۷۸ - ۱۹۷۷ میں ۶۰ء۸۹ لاکھ ٹن غذائی اجناس پیدا کیا۔ فاضل غلے کے قومی اسٹاک میں آندھرا پردیش نے ۱۰ لاکھ ٹن سے بھی زیادہ اناج جمع کروایا ہے۔ اس سال آندھرا پردیش نے ۹۸ لاکھ ٹن اناج پیدا کرنے کا بلند حوصلہ نشانہ مقرر کیا ہے۔ آندھرا پردیش کے کسان قوم کی ضروریات سے بھی زیادہ غلہ اگانے کے لیے اپنے آپ کو وقف کیے ہوئے ہیں

RO. 2-27/78-79

ڈائرکٹر جنرل، محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ ۔ آندھرا پردیش، حیدرآباد

LETTER NO: 2530/ADVT/C4/78 Dt. 23-11-78

پطرس — اپنی نگارشات کے آئینہ میں

محمد شاہد عظیم

شاید ہی کسی کو اس بات سے انکار ہو کہ مزاح نگاری ایک مشکل ترین صنف ہے اور بات بات میں طنز و مزاح کے پھول بکھیرنا مشکل ترین امر ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہنسنے ہنسانے کی کوشش میں اکثر [illegible] اور ادیب کی خود اپنی حیثیت "مضحکہ خیز" ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ اس مداری کی طرح نظر آتا ہے جو کوئی نئی چیز پیش کرنے کے زعم میں اپنی "شاندار حماقت" ہنسانے کے لئے جھولی الٹ دیتا ہے اور وہ بھی خالی نکلے۔ دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں مزاح نگار دشوار ترین امتحانی مرحلے سے گزرتا ہے۔ مزاح نگار کے لئے چاق و چوبند ہونا گویا لازم ہے۔ اس کے لئے طرز و فکر کے ساتھ اسلوب بیان، مزاح کی چاشنی اور ایک مخصوص لہجہ کی ضرورت ہے جو ظرافت اور کڑواہٹ کا بہترین امتزاج پیش کر سکے۔

ہمیشہ ہماری پطرس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی ذہانت اور [illegible] ارباب انجمن [illegible] کے مالک تھے اور بلاشبہ ایک عظیم المرتبت انسان، ایک غیر معمولی ادیب تھے۔ اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی سے انھوں نے اپنے طنزیہ مضامین کے ذریعے ارباب علم کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ پطرس نے زندگی کے جس گوشے میں خواہ وہ ادب کا ہو یا سیاست کا اپنا ایک الگ رنگ اور مستقل نقش چھوڑا ہے۔

وہ ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ اس صدی کے ابتدائی بیس اور تیس برسوں کے درمیان انھوں نے چھ سال کیمبرج میں تعلیم پائی، دوسری عالمی جنگ کے وقت وہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل تھے۔ ان کی سفارتی زندگی کا آغاز ۱۹۴۸ء میں اس وقت ہوا جب وہ بین الاقوامی براڈکاسٹنگ کانفرنس منعقدہ میکسیکو میں پاکستانی وفد کے صدر کی حیثیت سے شریک ہوئے، مئی، جون ۱۹۵۹ء میں انتقال ہو گیا۔

پطرس کے مضامین، گالزوردی، جارج برنارڈ شاہ اور اسٹیونسن کے ترجمے اور مستقبل کے نام چند خطوط، یہ ہے پطرس کی کل کائنات۔ پطرس نے اردو میں پیروڈی کے کامیاب نمونے پیش کئے اور قہقہوں کا سیلاب بہا دیا۔ بورڈنگ کی لائف، کتوں کا مشاعرہ، میری بائیسکل مرحوم کی یاد میں، سویرے جو آنکھ کھلی، بیچے، لاہور کا جغرافیہ اور مرید پور کا پیر۔ گو بظاہر ہلکے پھلکے اور سیدھے سادے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مگر ان سادہ نقوش کے سامنے سینکڑوں سحر کاریاں اور رنگینیاں پھیکی پڑ جاتی ہیں جو روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔

پطرس کی تحریریں ان ہلکی پھلکی دواؤں کی طرح ہیں جن کا ذائقہ خوشگوار ہوتا ہے اور اثر روح بخش، ان کا اپنا ایک مخصوص اور دلکش لہجہ ہے۔ پطرس نے مغربی تہذیب کی آڑ لے کر مشرق کے خدوخال سنوارنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی نگارشات میں ایک خاص لطف، نکھار اور لکھاوٹ پیدا ہو گیا ہے جو اپنی وضع کی ایک ہی چیز ہے حضرت علامہ نیاز فتح پوری نے اسی کو اپنی زبان میں یوں کہا ہے۔

"پطرس کی مزاح نگاری بڑی حد تک مغربی رنگ کی ہوتی ہے اور واقعہ و انداز دونوں سے مضحکہ خیز کیفیات پیدا کی جاتی ہیں [illegible] سے بہلانے کے [illegible]

...پطرس کا فن بام عروج پر نظر آتا

"لاہور تک پہونچنے کے کئی راستے
...لیکن ان میں بہت مشہور ہیں ایک
...سے آتا ہے دوسرا دہلی سے۔
...وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے راستہ
...یورپ کے حملہ آور دہلی کے راستے وارد
...ہوتے ہیں، اول الذکر اہل سیف کہلاتے
...اور مؤخر الذکر اہل زبان تخلص کرتے ہیں
...خر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں اور یہ
...تخلص کرتے ہیں اور اس میں یدطولیٰ
...رکھتے ہیں۔ جبھی حالت پڑھ کر رہتا

...ہے
ہر رسالہ کا پطرس نمبر
اور عام نمبر خاص موقعوں پر شائع کرنے
...اور خاص
نمبروں میں مس سلوچنا کی تصویریں کثرت سے
بھی دی جاتی ہیں اس سے ادب کو بہت
فروغ نصیب ہوتا ہے اور فن تنقید ترقی
کرتا ہے"۔

ایک مشہور مفکر کا کہنا ہے کہ مزاح
نگار کا اولین فرض ہے کہ زبان سے ظرافت
پیدا کرنے کی کوشش کرے، واقعات سے
ظرافت پیدا کرنا ایک افسانہ نگار کا کام ہے
پطرس اس ادبی کسوٹی پر پورے اترتے
ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ افسانہ نگاری سے
زیادہ مشکل روزمرہ مشاہدہ میں آنے والی
چیزوں پر مضمون نگاری ہے جو جوئے شیر
لانے سے کم نہیں، اردو میں ایسے مزاحیہ
مضامین کی کمی نہیں جنہیں پڑھ کر ہنسنے کے
بجائے جی کھول کر رونے کو جی چاہتا ہے
لکھنے والے کے زور قلم پر۔ شاید اس کی
ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ایک چیز جو ہم
پسند کرتے ہیں ہو سکتا ہے کہ دوسرے

رس پطرس
ہی لکھ سکتے ہیں۔ پطرس نے اپنے مضامین
کا مجموعہ چھپا کر شائع کیا اس میں شاید
گیارہ مضامین ہیں لیکن بعد کے ایڈیشنوں
میں اضافہ ہوتا گیا۔ پطرس کو پڑھتے
وقت ایک چیز جو قاری محسوس کرتا ہے
وہ ایک عجیب ناقابل بیان خوبی ہے۔
ایک مجسم لطافت جو پطرس کے جملوں میں
پائی جاتی ہے اور جس نے انہیں انفرادیت
بخشی ہے وہ اپنی تحریروں میں لطیفوں
کے پیوند نہیں لگاتے یوں بھی پطرس کے
مضامین ان کی مزاحیہ طبیعت کے آئینہ دار
ہیں۔ "مضامین پطرس کا دیباچہ اپنی قسم
کا آپ مثال ہے اور نثر میں بجا طور حماقت"
کے نام سے موسوم ہے۔ "اگر یہ کتاب آپ
کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان
کیا ہے اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے
تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں،
اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے
ہمدردی ہے اب بہتر یہی ہے کہ اس کتاب
کو پڑھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت

[illegible]

...کیا اور پھر اس کا بھونکنا کرے نہیں ...سے ایک مدرسے کے ...مشاعرہ سے تشبیہ دینا اور اس ...حرکت کو اس نفاست سے بیان ...کے بس کی بات نہیں۔ دیکھئے یہ ...ں کا مشاعرہ کس ڈھنگ سے شروع ہوتا ہے۔

"گائے کو بچے دودھ دیتی ہے۔ ...ری کو بھی دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں ...ں۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں ۔۔۔؟ کہئے ... کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب ...فاداری اگر اس کا نام ہے کہ شام کے ...ے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار ...خدوم ہیں صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو اس نے باہر سڑک پہ آکر طرح کا ایک مصرعہ دے دیا۔ ایک آدھ منٹ بعد سامنے کے بنگلے سے ایک کتے نے مطلع عرض کیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا تو ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر نکلے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی جانب سے ایک قدر شناس نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ [illegible]

[illegible] ... البدیہہ قہقہے کے قہقہے ... [illegible]

"سینما کا عشق" میں پطرس نے دل کے کئی رخ دکھائے ہیں۔ یہ مضمون اپنی روانی، تسلسل اور زورِ بیان کے لحاظ سے بڑا ہی بکھان، تیکھا اور مزے دار ہے۔ اس میں انسانی جھلاہٹ کے سارے پہلو نمایاں کیے گئے ہیں اور سینما دیکھنے والوں کی حرکات و سکنات پہ بڑا ہی لطیف طنز کیا گیا ہے۔ یہ طنز جتنا گہرا ہے اتنا ہی لطیف اور اسی قدر واقعاتی ہے۔

"مرحوم کی یاد میں" یہ کسی کا مرثیہ نہیں ہے اور نہ ہی اس میں واقعی کسی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے بلکہ یہ بھی پطرس کے دوست مرزا کی سادہ لوحی کا ایک نقشِ جمیل ہے۔ اس مضمون میں پطرس نے سماجیات، ثقافت، تہذیب تمدن روزمرہ زندگی اور فطرتِ انسانی کے بڑے بڑے نکتے حل کر دئیے ہیں۔ تمہید میں لکھا ہے کہ "جب دوستی پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس مضمون کا دلچسپ ترین حصہ مرزا کی پرانی بائیسکل کے تذکرے پر مشتمل ہے پطرس اس مضمون میں طنز کی بلندیوں کو چھوتے ہیں انھوں نے اس مضمون میں

[illegible] ہیں وہ بہت ... ایک ایک ... ہیں

"اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لوہے کو اوپر اٹھاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی تھوڑی کے نیچے مکے مار رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیوں کو ملا کر چوں چوں پھٹ، چوں چوں پھٹ کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر سائیکل کے کئی پرزے جو اب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے، ادھر ادھر کے لوگ چونکے ماؤں نے اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب کے ہینڈل یکلخت نیچے ہو گیا اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا اور تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے آپ میری حالت کا تصور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔"

پیروڈی جسے اردو میں تحریف کہتے ہیں ایک ایسا حربہ ہے جسے مزاح نگار بھی استعمال کرتا ہے اور طنز نگار بھی۔ مزاح نگار اس سے آسودگی کے حصول میں مدد

ہے کہ اس میں واقعی تاریخ حقیقت کا
مطالعہ پیش کیا ہے مضمون لاہور کا
جغرافیہ ان ہی خصوصیات کا حامل ہے
اور بڑا کامیاب طنز ہے لاہور کے
متعلق پطرس لکھتے ہیں:

"کہتے ہیں کہ کسی زمانہ میں لاہور کا
حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا لیکن طلبہ کی
سہولت کے لئے میونسپلٹی نے اسے منسوخ
کر دیا ہے اب لاہور پنجاب میں واقع
ہے لیکن اب پنجاب "پنج آب" نہیں رہا
اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب
ساڑھے چار دریا بہتے ہیں۔ اور جو نصف
دریا ہے وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں
رہا اس کو اصطلاح میں راوی ضعیف
کہتے ہیں۔ بہنے کا شغل عرصہ سے بند ہے"
اس مقام پر مضمون کی خوبصورتی اور دلکشی
اور خود پطرس کا فن بام عروج پر نظر آتا
ہے۔

"لاہور تک پہونچنے کے کئی راستے
ہیں لیکن دو ان میں بہت مشہور ہیں ایک
پشاور سے آتا ہے دوسرا دہلی سے۔
وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے راستے
اور یوپی کے حملہ آور دہلی کے راستے وارد
ہوتے ہیں، اول الذکر اہل سیف کہلاتے
ہیں اور خود غزنوی تخلص کرتے ہیں
موخر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں اور یہ
بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں ید طولیٰ
رکھتے ہیں۔ طبی حالت پڑھ کر دیکھنا

نہیں پڑتا ہے" لاہور کے لوگ بہت
خوش طبع ہوتے ہیں" ان کے صنعت
و حرفت کا تذکرہ اپنی گوناگوں لطافتوں کے
لحاظ سے دلچسپی سے خالی نہیں۔

"اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب
سے بڑی صنعت رسالہ سازی ہے اور
سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے
ہر رسالہ کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے
اور عام نمبر خاص موقعوں پر شائع کئے
جاتے ہیں۔ عام نمبر میں ایڈیٹر اور خاص
نمبروں میں مس سلوچنا کی تصاویر کی تعداد
بھی دی جاتی ہیں اس سے ادب کو بہت
فروغ نصیب ہوتا ہے اور فن تنقید ترقی
کرتا ہے۔"

ایک مشہور مفکر کا کہنا ہے کہ مزاح
نگار کا اولین فرض ہے کہ زبان سے ظرافت
پیدا کرنے کی کوشش کرے، واقعات سے
ظرافت پیدا کرنا ایک افسانہ نگار کا کام ہے
پطرس اس ادبی کسوٹی پر پورے اترتے
ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ افسانہ نگاری سے
زیادہ مشکل روزمرہ مشاہدہ میں آنے والی
چیزوں پر مضمون نگاری ہے جو جوئے شیر
لانے سے کم نہیں، اردو میں ایسے مزاحیہ
مضامین کی کمی نہیں جنھیں پڑھ کر ہنسنے کے
بجائے جی کھول کر رونے کو جی چاہتا ہے
لکھنے والے کے زور قلم پر۔ شاید اس کی
ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ایک چیز جو ہم
پسند کرتے ہیں ہو سکتا ہے کہ دوسرے

کی نظر میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو۔ بظاہر
کوئی بات ہمیں ہنسنے ہنسانے پر مجبور کرتی
ہے لیکن دوسرے پڑھنے والے پر اس کا اثر
الٹا پڑتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کچھ
لکھنے سے پہلے اس پر غور و خوض کیا جائے
شاعروں کی بے طرحی سے کون واقف نہیں
اور شہروں کی گندگی حالات کون نہیں جانتا
لیکن کتے اور لاہور کا جغرافیہ صرف پطرس
ہی لکھ سکتے ہیں۔ پطرس نے اپنے مضامین
کا جو پہلا مجموعہ شائع کیا اس میں شاید
گیارہ مضامین ہیں لیکن بعد کے ایڈیشنوں
میں اضافہ ہوتا گیا۔ پطرس کو پڑھتے
وقت ایک چیز جو قاری محسوس کرتا ہے
وہ ایک عجیب ناقابل بیان خوبی ہے۔
ایک قسم کی لطافت جو پطرس کے جملوں میں
پائی جاتی ہے اور جس نے انھیں انفرادیت
بخشی ہے وہ اپنی تحریروں میں لطیفوں
کے پیوند نہیں لگاتے بلکہ پطرس کے
مضامین ان کی مزاحیہ طبیعت کے آئینہ دار
ہیں۔ "مضامین پطرس" کا دیباچہ اپنی قسم
کی آپ مثال ہے اور حق بجانب حماقت"
کے نام سے موسوم ہے " اگر یہ کتاب آپ
کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان
کیا ہے اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے
تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں،
اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے
ہمدردی ہے اب بہتر یہ ہے کہ اس کتاب
کو پڑھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت

ثابت کریں۔

"مصنف کتے" پطرس کا شاہکار ہے بعض جانوروں سے بعض افراد کو نفرت یا خوف ہوتا ہے کتوں اور پھر سڑک کے کتوں سے کون نالاں نہیں اور پھر ان کا بھونکنا کسے نہیں کھلتا مگر اس بھونکنے اور ایک دوسرے کے سُر ملانے کو مشاعرہ سے تشبیہ دینا اور اس نفرت خیز حرکت کو اس نفاست سے بیان کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ دیکھئے یہ کتوں کا مشاعرہ کس ڈھنگ سے شروع ہوتا ہے۔

"گائے کو لیجئے دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجئے دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں ۔۔؟ کہنے لگے کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اس کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو اس نے باہر سڑک پہ آ کر طرح کا ایک مصرعہ دے دیا۔ ایک آدھ منٹ بعد سامنے کے بنگلے سے ایک کتے نے مطلع عرض کیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا تو ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے اور بھنا کر پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی جانب سے ایک قدر شناس نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے۔

بعض کمبخت تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔

"سینما کا عشق" میں پطرس نے کچھ دل کے داغ دکھائے ہیں۔ یہ مضمون اپنی روانی، تسلسل اور زورِ بیان کے لحاظ سے بڑا ہی یکساں، تیکھا اور مزے دار ہے۔ اس میں انسانی جھلاہٹ کے سارے پہلو نمایاں کیے گئے ہیں اور سینما دیکھنے والوں کی حرکات و سکنات پر بڑا ہی لطیف طنز کیا گیا ہے۔ یہ طنز جتنا گہرا ہے اتنا ہی لطیف اور اسی قدر واقعاتی ہے۔

"مرحوم کی یاد میں" یہ کسی کا مرثیہ نہیں ہے اور نہ ہی اس میں واقعی کسی مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے بلکہ یہ بھی پطرس کے دوست مرزا کی سادہ لوحی کا ایک نقشِ جمیل ہے۔ اس مضمون میں پطرس نے سماجیات، ثقافت، تہذیب، تمدن، روزمرہ زندگی اور فطرتِ انسانی کے بڑے بڑے نکتے حل کر دیئے ہیں۔ تمہید میں لکھا ہے کہ "جب دوستی پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس مضمون کا دلچسپ ترین حصہ مرزا کی پرانی بائیسکل کے تذکرے پر مشتمل ہے پطرس اس مضمون میں فن کی بلندیوں کو چھوتے ہیں انھوں نے اس مضمون میں

لطافت بھی مزاح کے جو پھول بکھیرے ہیں وہ ہمیشہ شگفتہ اور عطر بیز رہیں گے ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں۔

"اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو اوپر اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی تھوڑی کے نیچے مکے مار رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیوں کو ملا کر چوں چوں پھٹ، چوں چوں پھٹ کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر سائیکل کے کئی پرزے جواب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے، اِدھر اُدھر کے لوگ چونکے ماؤں نے اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب کے ہینڈل یکلخت نیچے ہو گیا اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا اور تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے آپ میری حالت کا تصور کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔"

پیروڈی کا جسے اردو میں تحریف کہتے ہیں ایک ایسا حربہ ہے جسے مزاح نگار بھی استعمال کرتا ہے اور طنز نگار بھی۔ مزاح نگار اس سے آسودگی کے حصول میں مدد

لیتا ہے اور طنز نگار اس کا سہارا لے کر [illegible] کو جو فن طنز کا [illegible] پیروڈی کی [illegible] تعریف کے یہ دونوں رخ ملتے ہیں۔ اردو نثر میں پیروڈی کے [illegible] پطرس کو استادی مقام حاصل ہے پطرس نے غالباً سب سے پہلے نثر میں پیروڈی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ پطرس سے قبل اردو شاعری میں پیروڈی کے نمونے تو ملتے ہیں لیکن نثر میں پطرس سے قبل اور بعد پیروڈی کا نمونہ ہی مشکل سے ملتا ہے اور اگر کہیں ایک آدھ چیز نظر بھی آتی ہے تو اس کی ادبی حیثیت کچھ زیادہ بلند نہیں۔ پطرس کی پہلی تحریف "اردو کی آخری کتاب" سے یہ چند نمونے دیکھئے۔

"دیکھنا بیوی آپ بیٹھی پکا رہی ہیں ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھلائے برتن صندوق پر چنے ہیں تاکہ صندوق نہ کھل سکے۔ ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں کسی میں دال ہے کسی میں آٹا اور کسی میں [illegible] ہے۔ چھلنی اور پانی کا لوٹا پاس ہے تاکہ جب چاہے آگ جلائے اور جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔

[illegible]

شوکت تھانوی اپنی فروتنی کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں:

"غضب خدا کا پطرس لے بیٹھا
سے مجھ جان ناتواں کو بٹھا دیا"

اپنی کتاب سیلاب تبسم کے مقدمے میں شوکت تھانوی نے پطرس سے مقابلہ کے خیال کو "مزاحیہ کفر" قرار دیا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے پطرس کی صلاحیتوں کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے "ظرافت نگاری میں پطرس کا ہمسر ان کے ہم عصروں میں کوئی نہیں"۔

پطرس نے جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ تعداد کے لحاظ سے تھوڑا مگر معیار کے لحاظ سے بڑا ہے کبھی کبھی آڑی ترچھی لکیروں میں کوئی بڑا مصور ایسی روح پھونک دیتا ہے کہ بہت سے فنکاروں کے پورے نگار خانے ماند پڑ جاتے ہیں۔ ●

نوحہ ...!

محسن احسن (پاکستان)

سدا ساون کی رت آئی
سدا چھائے گھٹاؤں کے حسیں سائے
سدا ابر کرم برسا
زمیں کی تشنگی کو دور کرنے کے لیے پیہم
و کم برسا
یہ برسا تو غبار آلود پیڑوں پہ
ہمیشہ تازگی آئی
سلگتی کھیتیوں اور خشک فصلوں پر عجب بالیدگی
آئی
شجر جو پیاس سے جل جل کے اپنی آگ میں مرنے لگے
ان میں لہو کی گردش پیہم سے تازہ زندگی آئی
نمو کی قوتوں نے مجتمع ہو کر
دہکتی صبح جلتی شام کو رنگ دگر بخشا
گھٹا نے جھوم کر آئی تو اس نے دل گرفتہ گشت
بے نم کو اثر بخشا
ستم موسم کے سہنے کو نئی تاب و تواں بخشی
نیا اک حوصلہ نے کر نیا عزم سفر بخشا
نیا عزم سفر جس سے اشکوں پہ نکھار آیا
زمیں کے ملتے رنگوں پر نکھار آیا
حسیں کھیتوں کا جوبن

لہلہاتے جھومتے خوشوں سے یوں نکھرا
کہ جیسے آرزوؤں کی تمناؤں کی ساری
رونقیں ان میں سمٹ آئیں
مگر ــــ اب کے برس
ساون کی یہ اودی گھٹائیں بھورے بادل
اس طرح امڈے، امڈ کر اس طرح برسے
کہ جو بھی زد میں آیا اک بپر کاہ کی طرح سیل بلا کی
تند موجوں پر نظر آیا
سکوں برہم ہوا
بے آب دریاؤں کے بے حس ساحلوں سے موت کی
طغیانیاں اٹھیں
افق سے تا افق لہروں پہ گھر کچھ اس طرح رقصاں تھے
جیسے کشتیاں طوفان کی زد میں کہیں ابھریں، کہیں
ڈوبیں
کہیں ان پانیوں کی سطح پر بچے
کہیں بوڑھے کہیں وہ نوجواں جن کی محبت میں
اسیر اخلاص کے پیکر
وہ پیکر ـ جو جوانی کی سبھی دلداریوں کا آئینہ بن کر
غموں کے سیل بے پایاں میں یوں گم سم
کہ جیسے مسکراہٹ ان میں ہونٹوں کی زینت
بن نہیں پائی
کہیں گھر کا اثاثہ ہے، کہیں مال مویشی ہیں
کہیں وہ دل کے ٹکڑے ہیں
جنھیں آغوش مادر میں سکوں کی نیند سونا تھی
مگر اب سب کے سب ر نوحہ بلب

سبھی کچھ نذر سیل بیکراں
آفت میں جاں
زمیں پر آب بے پایاں
فلک پر ابر کا اک فیل بے زنجیر یوں رقصاں
کہ ہر دل ہیبت افلاک سے ترساں
یہی ابر کرم اب ابر آفت خیز کی صورت
ہر اک سو مینہ برسائے خون برسائے
جو زد میں اس کی آئے وہ سلامت بچ نہیں پائے
مگر صد آفریں
ان حوصلوں پر جو ہر اک موج ہلاکت خیز سے لڑ کر کبھی
ڈرنے نہیں پائے
جو آلام و حوادث کے تھپیڑوں سے کبھی مرنے نہیں پائے
کروڑوں جاں نثاروں نے مشعلوں کی طرح مل کر
تیرگی و سیل بے پایاں کو للکارا
اپنی کھولتی بوندوں سے آگے بچے سیلاب کا
دھارا
بہ فیض ہمت و جرأت
بہ نام عزم و استقلال ملت
چلو مل کر بنائیں ہم نیا گارا
نئی اینٹیں، نئے پتھر سجائیں
نئے دیوار و بام و در بنائیں

لیتا ہے اور طنز نگار اس کا سہارا لے کر معاشرے کی ناہمواریوں کو ہدفِ طنز بناتا ہے۔ پطرس کے ہاں تحریف کے یہ دونوں رخ ملتے ہیں۔ اردو نثر میں پیروڈی کے سلسلے میں پطرس کو اساتذہ کا مقام حاصل ہے پطرس نے غالباً سب سے پہلے نثر میں پیروڈی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ پطرس سے قبل اردو شاعری میں پیروڈی کے نمونے تو ملتے ہیں لیکن نثر میں پطرس سے قبل اول تو پیروڈی کا نمونہ ہی مشکل سے ملتا ہے اور اگر کہیں ایک آدھ چیز نظر بھی آتی ہے تو اس کی ادبی حیثیت کچھ زیادہ بلند نہیں۔ پطرس کی پہلی تحریف "اردو کی آخری کتاب" سے یہ چند نمونے دیکھئے۔

"دیکھنا بچو! آپ بیٹھی پکا رہی ہیں ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھلائے برتن صندوق پر چنے ہیں تاکہ صندوق نہ کھل سکے۔ ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں کسی میں دال ہے کسی میں آٹا اور کسی میں کچھ ہے۔ انگیٹھی اور پانی کا لوٹا پاس ہے کہ جب چاہے آگ جلائے اور جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔"

پطرس نے اگرچہ کبھی اردو ادب کے لیکاک اور مارک ٹوین بننے کا دعویٰ نہیں کیا لیکن وہ حقیقتاً ان مغربی مزاح نگاروں کے مقابل پیش کئے جا سکتے ہیں

شوکت تھانوی اپنی فروتنی کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

"غضب خدا کا پطرس ایسے پہاڑ سے یہ جانِ ناتواں کو ٹکرا دیا۔"

اپنی کتاب "سیلابِ تبسم" کے مقدمے میں شوکت تھانوی نے پطرس سے مقابلے کے خیال کو "مزاحیہ کفر" قرار دیا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے پطرس کی صلاحیتوں کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے "ظرافت نگاری میں پطرس کا ہمسر ان کے ہم عصروں میں کوئی نہیں"۔

پطرس نے جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ تعداد کے لحاظ سے تھوڑا مگر معیار کے لحاظ سے بڑا ہے کبھی کبھی آڑی ترچھی لکیروں میں کوئی بڑا مصور ایسی روح پھونک دیتا ہے کہ بہت سے نقاشوں کے پورے نگار خانے ماند پڑ جاتے ہیں۔

ارشادِ مرتضیٰ علیؑ

حضرت علی علیہ السلام اپنے فرزند [illegible] کو نصیحت کرتے ہیں کہ

"اے فرزند بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جو [illegible] آپ کے ہم خیال نہیں لیکن احتیاط کرنا ایسی گفتگو نہ کرنا جس سے کسی کا دل شکستہ ہو۔"

طوفان

محسن احسن (پاکستان)

سدا ساون کی رت آئی
سدا چھائے گھٹاؤں کے حسیں سائے

سدا ابرِ کرم برسا
زمیں کی تشنگی کو دور کرنے کے لیے یہ بیش
و کم برسا

یہ برسا تو غبار آلود پیڑوں پہ
ہمیشہ تازگی آئی
سلگتی کھیتیوں اور خشک فصلوں پہ عجب بالیدگی
آئی

شجر جو پیاس سے جل جل کے اپنی آگ میں مرنے لگے
ان میں لہو کی گردشِ پیہم سے تازہ زندگی آئی

نمو کی قوتوں نے مجتمع ہو کر
دہکتی صبح جلتی شام کو رنگ دگر بخشا
گھٹا جھوم کر آئی تو اس نے دل گرفتہ کشت
بے نم کو اثر بخشا

ستم موسم کے سہنے کو نئی تاب و تواں بخشی
نیا اک حوصلہ دے کر نیا عزمِ سفر بخشا

نیا عزمِ سفر جس سے امنگوں پہ نکھار آیا
زمیں کے مٹتے رنگوں پر نکھار آیا
حسیں کھیتوں کا جوبن

لہلہاتے جھومتے خوشوں سے یوں نکھرا
کہ جیسے آرزوؤں کی تمناؤں کی ساری
رونقیں ان میں سمٹ آئیں

مگر — اب کے برس
ساون کی یہ اودی گھٹائیں بھورے بادل
اس طرح امڈے، امڈ کر اس طرح برسے
کہ جو بھی زد میں آیا اک پرِ کاہ کی طرح سیلِ بلا کی
تند موجوں پر نظر آیا

سکوں برہم ہوا
بے آب دریاؤں کے بے حس ساحلوں سے موت کی
طغیانیاں اٹھیں
افق سے تا افق لہروں پہ گھر کچھ اس طرح رقصاں تھے
جیسے کشتیاں طوفان کی زد میں کہیں ابھریں، کہیں
ڈوبیں

کہیں ان پانیوں کی سطح پر بچے
کہیں بوڑھے کہیں وہ نوجواں جن کی محبت میں
اسیر اخلاص کے پیکر
وہ پیکر — جو جوانی کی سبھی دلداریوں کا آئینہ بن کر
غموں کے سیلِ بے پایاں میں یوں گم سم
کہ جیسے مسکراہٹ ان حسیں ہونٹوں کی زینت
بن نہیں پائی
کہیں گھر کا اثاثہ ہے / کہیں مال مویشی ہیں
کہیں وہ دل کے ٹکڑے ہیں
جنھیں آغوشِ مادر میں سکوں کی نیند سونا تھی
مگر اب سب کے سب / نوحہ بلب

سبھی کچھ نذرِ سیلِ بیکراں
آفت میں جاں

زمیں پہ آبِ بے پایاں
فلک پر ابر کا اک فیلِ بے زنجیر یوں رقصاں
کہ ہر دل ہیبتِ افلاک سے ترساں
یہی ابرِ کرم اب ابرِ آفت خیز کی صورت
ہر اک سو مینہ برسائے خوشی برسائے
جو زد میں اس کی آئے وہ سلامت بچ نہیں پائے
مگر صد آفریں
ان حوصلوں پر جو ہر اک موجِ ہلاکت خیز کے آگے کبھی
ڈرنے نہیں پائے
جو آلام و حوادث کے تھپیڑوں سے کبھی مرنے نہیں پائے
کروڑوں بازوؤں نے مشعلوں کی طرح مل کر
تیرگی و سیلِ بے پایاں کو للکارا
اٹھا کر ہوتے بوندوں کے آگے بیچ بہتے سیلاب کا
دھارا

بہ فیضِ ہمت و جرأت
بہ نامِ عزم و استقلالِ ملت
چلو مل کر بنائیں ہم نیا گارا
نئی اینٹیں، نئے پتھر بچھائیں
نئے دیوار و بام و در بنائیں

نظم

ابھی نہ آؤ...!

رونق دکنی سیمابی

[illegible]ہا نہ آؤ، نہ آؤ ابھی تو اچھا ہے
حقیقت یہ ہے مجھے فکرِ [illegible] قدم ہے
ہر قدم میرے زخمِ جگر [illegible]ہم ہے
[illegible]ں ڈال لوں ذرا گھر پہ بھی [illegible] نظر
ہم مزاج تو ماحول سے بھی [illegible]م و گھر

اُداس صحن بلکتے ہوئے یہ بام و در
یہ ٹوٹتے ہوئے لمحے وبالِ ذہن و نظر
شکستہ حال اور بے نور سی یہ دیواریں
ٹپکتی چھت ہے اُدھر جیسے اشکبار آنکھیں
ملالِ حزن کے ہیں طاق پر سسکتے دیئے
ہے وقت سر بگریباں جو اپنے ہونٹ سیئے
خموشیوں پہ مسلط مہیب سناٹے
صدائے گریہ سے منسوب عجیب سناٹے
خرد کے سامنے ہے جہل پاؤں پھیلائے
یقیں کی دھوپ پہ وہم و گماں کے ہیں سائے
وہ زور پیٹتی چنگھاڑتی ہواؤں میں
خیال لپٹا ہوا مکڑیوں کے جالوں میں

-۲-

صحن میں اُونگھتے ہیں پیڑ! اسائیں سائیں ہے
نہیں ہے اب کہیں چہکار! کائیں کائیں ہے
کثیف اندھیرے کے تعاقب میں، عفریت جیسے
چھپا ہوا ہو کہیں مہرِ عافیت جیسے
نفس نفس پہ ہے چھائی ہوئی گھٹن جیسی
فشارِ قبر کے جیسا، مہک کفن جیسی
گھٹی گھٹی سی فضا ہے، بجھا بجھا ماحول
یہ نفی مائل تخریبِ ارتقاء ماحول
جو کرب زہر کا تھا تنہائیوں نے چاٹ لیا
غموں نے درد بھی محرومیوں کا بانٹ لیا

تم ایک پل نہ ٹھہر پاؤ گے، جو آؤ ابھی!
یہ مجھ سے ملنے کی زحمت ہی کیوں اٹھاؤ ابھی!
اداس اُفق سے طلوع ہوگا مہرِ تاباں بھی
غریب خانہ میں ہوگا کبھی چراغاں بھی
ابھی نہ آؤ......

غزلیں

ڈاکٹر نریش

دن رات کا طلسم کہیں توڑ ڈالیئے
سورج نیا اُگا کے خلا میں اُچھالیئے

یوں زیست کو حدود میں مقیّد نہ کیجئے
خود کو حصارِ ذات سے باہر نکالیئے

آئینہ تو دکھائے گا چہرے کا داغ داغ
بہتر یہی ہے آپ اسے توڑ ڈالیئے

سب کی نظر سوالیہ ہونے سے پیشتر
ہاتھوں سے چھوٹتا ہوا ساغر سنبھالیئے

اُن کا یہ مشورہ کہ نہ ڈھونڈو دُرِ وفا
اپنی یہ ضد نریش سمندر کھنگالیئے

رؤف خیر

اے ہوائے شہر لیجے تھے ترے اکھڑے ہوئے
پھول زخمی ہوگئے گلدان کے ٹکڑے ہوئے

ایک بے تسکین بے خوابی سی ہے جُزوِ بدن
سو گئے تھے جیسے ہم سمٹے ہوئے سکڑے ہوئے

بے دھواں بے گرد بے آواز تھے سب راستے
ہم جہاں پہنچے وہاں خیمے ملے اکھڑے ہوئے

تھا قصیدہ شہر تو ثقلِ سماعت کا شکار
سُن رہا تھا کون اے خیر کیوں بیاں دکھڑے ہوئے

کیا بتائیں کس تکلف سے کٹا عہدِ بہار
کب گریباں چاک تھا، دامن کے کب ٹکڑے ہوئے

خیر ہم تو دھوپ کے بن باس پر بھیجے گئے
کس سفر میں ساتھ اپنے پھول سے مکھڑے ہوئے

مہدی پرتاپگڑھی

میں ساعتوں کی انگلیاں مروڑتا چلا گیا
ہزاروں ناظرین کو جھنجھوڑتا چلا گیا

وہ ایک برگِ آخری جو شاخِ گل کی جان تھا
کوئی شریر لڑکا اُس کو توڑتا چلا گیا

نہ جانے کیا سحر اُس کی نطق کو عطا ہوا
یہ جنبشِ زباں دلوں کو جوڑتا چلا گیا

شعورِ ذات کے سفر میں تھیں بڑی صعوبتیں
میں راستے کے پتھروں کو توڑتا چلا گیا

ہر اک زباں پہ جس کی صلح جوئی کا تھا تذکرہ
وہ کتنے ہی دلوں کو آج توڑتا چلا گیا

جہاں جہاں کسی کے نقشِ پا کا احتمال تھا
میں اُن تمام راستوں کو چھوڑتا چلا گیا

اُس آدمی پہ مہدی کائنات ناز کر سکے
سمندروں کے رخ کو بھی جو موڑتا چلا گیا

اسلم شیخ

[illegible] پہ آیا
پھر کی رات میں بھی رنگِ طرب پہ آیا

[illegible] میز کا ملنا کوئی آسان نہ تھا
رُخ ذرا بدلا ہواؤں کا تو ڈھب پہ آیا

[illegible] سکوتِ شب تنہائی [illegible]
اس کی آنکھوں میں جو مفہوم تھا لب پہ آیا

[illegible] نے احسان کیا
وہ جو خوابوں میں بھی ہرگز نہ طلب پہ آیا

[illegible] مجسم ہجور کی صورت
ایک ہی رات میں سیلابِ غضب پہ آیا

[illegible] ایک عمر ہوئی [illegible]
تیر خوشبوؤں کی مانند جو سب پہ آیا

راستے سب ہی منزل کی طرف جاتے ہیں
میں جو گمراہ ہوا راہِ ادب پہ آیا

[illegible] لیے

راز اٹاروی

[illegible] ہیں بہت ایسے زمانے لوگو
کیا ہے اس دَور کا انجام پُرلنے لوگو

[illegible] خوابوں کی تعبیر نہ جانے کیا ہو
روز آتے ہیں نظر سپنے سہانے لوگو

[illegible] نے کبھی حال نہ پوچھا میرا
کیا ہوا آج کہ بیٹھے ہو سرہانے لوگو

[illegible] سمجھتے ہیں ستمگر ہم کو
کتنا مظلوم بنایا ہے خدا نے لوگو

[illegible] پھونک دیا گلستاں تاراج کیا
اب کہاں جاؤ گے سر اپنا چھپانے لوگو

[illegible] انسان نہیں ننگِ شرافت کہیے
جو کسی شخص کا دکھ درد نہ جانے لوگو

[illegible] کے سائے [illegible] ہیں
ہم کو آئے ہو عبث خوف دلانے لوگو

ہم ہیں واقفِ اسرارِ درونِ محفل
راز کو آئے ہو کیا راز بتانے لوگو

ظفر [illegible]

کیجیے قدر [illegible] آرزو کیجیے
کیا ہے کس [illegible] شبنم سے وضو کیجیے

چھری کیوں آستینوں میں چھپا لی یہ ہے دوستی کیسی؟
ہماری جو بھی خامی ہو ہمارے روبرو کہیے

جو عارض پر ہے رنگِ گل تو خوشبو ہے گل بدن میں
نہ پھر کیوں ان کے پیکر کو طلسمِ رنگ و بو کہیے

جو علم و فہم سے عاری ہیں ان کو بولنے دیجیے
جو ہیں خاموش ان کی خامشی کو گفتگو کہیے

کبھی سوچا کہ صحرا میں بہاریں کس طرح آئیں
یہ کس کے خون سے کانٹے ہوئے ہیں سرخرو کہیے

بھرم اپنی محبت کا اگر رکھنے کی خواہش ہے
تو ان کے سامنے کیوں داستانِ آرزو کہیے

کہیں کیا کتنا قاتل ہے یہ شغلِ خلوت آرائی
کریں تصویر سے آخر کہاں تک گفتگو کہیے

ظفر کیا مسکراؤں ہے طبیعت کا عجب عالم
غمِ محبوب کو چاکِ جگر کی آبرو کہیے

سخن

حافظ حکیم محمود خاں محمودی

شق میں موت سے بھی نہ ڈر
ود جا آگ میں بے خطر

ہے کٹھن زیست کی رہگذر
م نہیں ہو مرے ہمسفر

ھی حسن سمجھا ہوں میں
زم میں آپ کو دیکھ کر

ں چمن میں جو چٹکی کلی
ں کا انجام آیا نظر

ت نگاہ کرم کیا ہوئی
لسو ہی ہمکی ... پر

رہگذر میں ترے نقشِ پا
ہے تری جستجو کا اثر

قلندروں کا ہے محمودی کرم
ینا ہر ... ہے ... بدلہ

محبوب قدسی

نشتر ہی اب لگا کہ یہی التماس ہے
دل کیا ہے کوئی آبلہ سینے کے پاس ہے

رنج و الم ہے درد ہے حسرت ہے یاس ہے
اس کے سوائے اور کیا دُنیا کے پاس ہے

صدیوں کی کاوشوں کا نتیجہ یہی تو ہے
اک کربِ ناتمام میکدے ہماں پاس ہے

ساقی تو اب حلق میں سمندر انڈیل دے
اتنی پلا کہ پھر نہ کہوں ' مجھکو پیاس ہے

اک آپ ہیں کہ ہنستے رہے اس کی لاش پر
قدسی کی موت پر تو زمانہ اُداس ہے

حفیظ فضا

زینہ سے شب کے ماہ کرنوں کا پیکر اُتارئیے
پھر اس کے بعد صبح کا منظر اُتارئیے

ناسور بن نہ جائیں کہیں زندگی کے زخم
شہ رگ میں ان کی وقت کے نشتر اُتارئیے

تنہائیوں کے دشت میں در آئیے گی بہار
دل کی بساط پر کوئی دلبر اُتارئیے

رہ جائے آرزو نہ کہیں دل مسوس کر
اپنی جبیں سے اب تو یہ تیور اُتارئیے

گمراہ ہیں زمیں پہ یتیمانِ آگہی
ان کے لئے فلک سے پیمبر اُتارئیے

چہروں پہ جن کے کربِ مسافت کی گرد ہے
ان کے دلوں کا بوجھ بھی بڑھ کر اُتارئیے

کہتا ہوں حرفِ حق یہ اگر جُرم ہے فضا
میں ہوں گناہ گار مرا سر اُتارئیے

ملاوڑی وینکٹ رمنّا
کی تلگو کہانی کا ترجمہ

مترجم
قطب سرشار

ابنِ آدم اور وقت

بجلی کے کھمبوں کے نیچے ایستادہ آنند راؤ بے داغ لباس میں ملبوس آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ .... گھیوں کو نے کے بجھنے والی خاموشی کو سن رہا ہے۔ اس کا من بازار کی ہماہمی میں گھر گھراتی ہوئی بسوں کے شور میں سکون کا متلاشی ہے۔ .... قیمتی ملبوسات میں ڈھکے ہوئے جسموں میں پتھر کا دل رکھنے والے انسانوں کے جنگل میں اپنے وجود سے اکتا جانے کے غصے .... ویران زندگی کے پچاس سالہ ماضی کے نیچے تلے دبی ہوئی مسکراہٹ کو ہونٹوں پر سجائے کھڑا ہے۔ اس کے آگے ہاتھ پھیلائے لاکھوں زندہ لاشوں کے ہم لمحہ پھیلتے بڑھتے ہوئے لاکھوں سایوں کے درمیان اپنے بھوک کو بے زمینی سے بچانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

بازار میں، جہاں آنند راؤ کھڑا ہے وہاں اس کے بالکل مدِ نظر ایک ہوٹل ہے اس وقت نو بجکر تیس منٹ ہو رہے ہیں۔ ہوٹل کے بند ہونے میں صرف سات منٹ رہ گئے ہیں۔ احتمال اور جدو داری کے لمحے ہیں۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ بازار اُونگ رہا ہے خود اس کو اُونگ نہیں ہے بلکہ بھوک ہے۔

کوئی کسی سے کہہ رہا تھا۔۔ سینما دنیا کچھ نہیں، ان پیسوں کا کچھ کھا کر سو جاؤں گا"

آنند راؤ نے اپنے وجود پر ایک نظر ڈالی اس کے معدے کے اندر کی بھوک چیخ اٹھی "شام تم نے وہ شخص کیا کہہ رہا تھا سبق لینا اُس سے۔۔ اب صرف سات منٹ رہ گئے ہیں۔ ہوٹل کے بند ہونے سے قبل جلدی سے کھانے کا انتظام کر لینا"

تیری دھمکیاں مجھے متاثر نہیں کر سکتیں بھوک! آنند راؤ نے کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتی آج تم کھانا فراہم کرنے میں ناکام رہے تو ہڑتال کر دوں گی۔ بھوک نے وارننگ دی۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں" آنند راؤ نے جواب دیا۔

ایسے اک دن ہی نہیں سارے اعضاء ہڑتال کر بیٹھیں گے سمجھو۔ کل تم اپنے کمرے سے باہر نہ نکل پاؤ گے پھر بازار کا دیدار بھی نصیب نہ ہو سکے گا۔

آنند راؤ:۔ خاموش! کوئی دوست تو ہے۔

بھوک:۔ جھوٹ! سفید جھوٹ!

آنند راؤ:۔ سمجھا وہی دوست ہے کل شام جس سے میں نے گفتگو کی تھی۔

بھوک:۔ کل جس نے تمہارا حال نہ پوچھا آج کیا پوچھے گا بھلا؟

آنند راؤ:۔ خیر۔۔ دوست توقف کرتا۔۔ کافی نہ سہی چائے ضرور فراہم کروں گا۔

بھوک:۔ ہرگز نہیں میں چائے کافی پر اکتفا نہیں کر سکتی مجھے ان سے بہلانے کی کوشش نہ کرنا ہاں! اگر کافی فراہم کرو گے بھی تو میں اسے تمہارے منہ پر مار دوں گی!

آنند راؤ کو بھوک کا انتباہ متاثر نہ کر سکا اس نے سگریٹ جلائی اپنے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ طاری کی اور اس طرح چہرے کو جیسے بشاش بنا لیا۔ اس دوست سے کچھ اتنی بے تکلفی نہیں تھی لہٰذا اس سے قرض ملنے کے قوی امکانات تھے۔

آنند راؤ:۔ کہیئے کیا حال ہے

دوست:۔ ہلو آپ فرمایئے

آنند راؤ:۔ اپنا حال کیا بیان کرتا ایک لمحہ کیلئے خاموش ہو گیا۔ معدے کے اندر سے بھوک نے ٹوکا۔ ایسے بار بار وقت کیوں ضائع کر رہے ہو گے۔

آنند راؤ:۔ (دوست سے)

آپ اپنی کہیئے جنب کہاں کے ارادے میں
دوست: بس کچھ نہیں بس سینما جانے
کا ارادہ ہوا ہے۔
آنند راؤ: اپنے لیے تو کوئی
فلم نئی نہیں رہی بہت ساری دیکھ ڈالیں
خیر چلیے ایک دم دیکھ لیں گے۔
معدے کے اندر بھوک نے کتھا
کلی کا رقص شروع کر دیا۔
بھوک: یہ سینما کی کیا سوجھی ہے
پانچ منٹ رہ گئے ہیں ہوٹل بند ہونے میں۔
آنند: تو خاموش رہ کیا مجھے
اتنی بھی عقل نہیں۔ !!
سینما چلنے کی بات پر دوست نے کچھ
تامل کیا۔ ایک لمحے کے بعد آنند راؤ نے کہا
خیر کوئی بات نہیں۔ آج نہیں تو کل سہی
ویسے آج میری طبیعت بھی کچھ ناساز ہے
کل دیکھ لیں گے۔ آپ کوئی خیال نہ فرمائیں
تو عرض کروں۔ بس کچھ زیادہ نہیں صرف ایک
روپیہ ادھار دیجئے کل پکچر کیلئے آؤں گا نا
تب لوٹا دوں گا۔
دوست نے ایک عجیب سا قہقہہ لگایا
ویری سوری! اتنے پیسے میرے پاس نہیں
ہیں۔ آپ نے جب سینما چلنے کا آفر کیا تب مجھے
تشویش ہوئی۔۔ یقین مانو اس وقت
میری جیب میں صرف چھ آنے رہ گئے ہیں۔
بیچارے ہی ... بھوک استہزائیہ
انداز میں ہنسی افسوس کرنے لگا لیاں
تیرے جیسے دوست ہیں مسٹر آنند راؤ!

بھوک نے کہا۔
آنند راؤ: (دوست سے) خیر چھ
آنے ہی سہی۔ ماؤنٹ روڈ پر ایک صاحب
پر میرا ادھار ہے وہیں چلتا ہوں شکریہ!
کل ضرور آیئے گا پیسوں کی فکر نہ کریں میری
جیب میں بہت پیسے رہتے ہیں۔ گڈ نائٹ!
جیسے ناگہانی بارش تھم گئی آنند راؤ
نے بھوک کو آواز دی۔
آنند: چائے پیو گی!
بھوک: جی (جل کر) ضرورت
نہیں اپنے سر پر پھونک لینا۔
آنند: بھئی چائے کے ساتھ
سگریٹ بھی جلائیں گے
بھوک: میری جوتی بھی نہیں
پیئے گی سگریٹ!
آنند: اچھا بابا تو ہی بتا کہ کیا
چاہئے یہاں ایک گھنٹے سے کھڑا ہوں
تو نے دیکھ لیا نا کہ کسی نے بھی کچھ نہیں دیا۔
اور جنہوں نے ادھار لیا تھا ان کا تو حال
ہی عجیب ہے!
بھوک: انہیں ادھار دینے کا
مشورہ تمہیں کس نے دیا تھا؟
آنند: اور میں جو دوسروں سے
لیتا ہوں؟
بھوک: خیر مجھے کیا بھگتو گے
تم۔ مگر یاد رکھنا کل سہ پہر تک یقینی ہے
اسے قطعی نوٹس سمجھ لینا۔
آنند: تمہیں قطعی فیصلے کا

اعلان ابھی نہ کرنا۔ ٹھہرو ایک میرا دیرینہ
ساتھی آ رہا ہے اب کی بار کم از کم ڈبل روٹی
ضرور ہاتھ آئے گی!
بھوک: اب تیر مار دو گے گویا۔
وہ ٹھینگا تم لوگے ہونہہ!
آنند: ایسی بات نہیں ہے اس
نے مجھ سے بارہا ادھار لیا ہے آج کل وہ
نوکری بھی کر رہا ہے (دوست سے) ارے
بھئی راجو کہاں جا رہے ہو؟
راجو: کہو بھیا تم ابھی تک اسی
گاؤں میں ہو؟
آنند: ہاں حسب معمول یہیں
رہتا ہوں۔
راجو: یہ کتاب کیسی؟
بھوک: کہیں کتاب پر تبصرہ
شروع کر دو گے وقت کم ہے!
آنند راؤ: نہیں کروں گا مطمئن
رہو۔ (دوست سے) اوہ! یہ کتاب پڑھو
گے؟ ٹھیک ہے لے جاؤ اور اطمینان سے
پڑھ لینا۔ فی الحال اس پر تبصرہ کیلئے میرے
پاس وقت کم ہے۔
راجو: ٹھیک ہے ٹھیک
ہے اور یار.....
آنند راؤ: (بات کاٹ کر) غالباً
تم پکچر پر تبصرہ کرو گے۔ پکچر تو خیر ٹھیک ہی
ہوگی۔
راجو: کیا بات ہے یار دوست
کچھ ٹھیک نہیں لگتے تم یار؟

آنند راؤ :۔ دراصل اب تک
یا مجھ سے بچھڑا ہوا اور تقدیر سے کتاب
یہ نمک کی ہے انسان کی بھی یک بک
ستی ہے گویا بکواس کرنا لوگوں کی تفریح
اور میرا پیشہ بھی !

بھوک :۔ بہرحال تم اپنی فطرت
سے باز نہیں آؤ گے ؟ کیا یہ بکواس نہیں
ہے ؟

آنند :۔ میری بھوک ہو گئی ہے
لیکن کچھ اور توقف کرنا ہے دوپہر میں
بتا سکتے تھے ان کا کیا بنا ہے ؟

بھوک :۔ آج کی نہیں یہ کل
دوپہر کی بات ہے !!

آنند راؤ :۔ بھئی راجو بڑی
مصیبت ہے سمجھ میں نہیں آتا کیسے کہوں ...
مجھے ایک روپیہ کی ضرورت ہے ... اگر
روپیہ نہیں ہے تو کم از کم دس آنے بھی چل
جائیں گے ! کتنے ہوں گے تمہارے پاس
جلدی سے کہنا وقت نہیں ہے۔

راجو نے کچھ نہیں کہا نہایت ہی
اطمینان سے سگریٹ جلائی اور آنند راؤ کو
ایک سگریٹ دیتے ہوئے کہا۔

راجو :۔ بس یہی ایک سگریٹ
اب میرا کل سرمایہ ہے کچھ بس سکے کر لے
کی حد تک ریزگاری ہوگی۔

آنند راؤ کی آنکھوں کے سامنے مایوسی
کی گھٹا سی چھا گئی۔ اس نے خود پہ اور بھوک پہ
لعنت بھیجی۔ اسے اپنے خلوص سے نفرت

ہی ہوتے لگتے۔ اور وہ سرد آہ بھر
کر رہ گئے۔

بھوک :۔ دھیمے سے آواز دی
مزاج پرسی ہو چکی جناب ؟

راجو :۔ بے کسی لئے بھوبن کے
نے ذہن نے خلاء میں گھورتے ہوئے سوال
کیا اور پھر ہنسنے لگا۔ صبح سے کچھ کھایا
بھی ہے ؟ راجو نے سڑک سے گزرتی
ہوئی ایک لڑکی کا جائزہ لیتے ہوئے
گنگناتے ہوئے پوچھا " تمہیں بھوبن
کئے کتنے دن ہوئے ہوں گے ؟

آنند :۔ کچھ یاد نہیں۔ پرسوں
کی یا ترسوں رات کو بھوبن کی تلاش میں
مایوس۔ پچھلے ساٹھ منٹوں میں مختلف انداز
سے بیٹھتے ہوئے کبھی خوشامد کرتے ہوئے
احباب کا جی بہلاتے ہوئے ہنساتے
ہوئے صرف ایک روپیہ ادھار حاصل
کرنے کے لئے نہ جانے کتنے دوستوں اور
شناساؤں کی دلجوئی کی ہے۔ اپنی ذات
پر رحم کھاتا ہوا بھوک سے برسرِ پیکار
آنند راؤ پر راجو کے سوال کا کوئی منفی
اثر نہیں ہوا۔ معدے کے اندر کا شور
تھم گیا ہے۔ غالباً بھوک کو نیند آ گئی
ہے۔ راجو نے اخلاقاً آنند راؤ کی حالت
پہ افسوس ظاہر کرنا چاہا۔ لیکن آنند نے
سختی سے ٹوک دیا۔

"مجھ پہ افسوس کرنے کی قطعی ضرورت
نہیں میں اظہار ہمدردی کا مستحق نہیں ہوں

لیکن پھر بھی کیا واقعی ہو بھی جا سکے
خیر کوئی بات نہیں آدمی بھوکا رہ کر چند
روز جی سکتا ہے۔

راجو نے تھوڑے دکھ بھرے لہجے
میں کہا :۔ کیا واقعی قلاش ہو بھئی مجھ
پر تمہارا کچھ ادھار بھی تو ہے لیکن .....
اپنی بات کو ادھوری چھوڑ کر راجو نے اپنے
دونوں ہاتھ وویکانند سوامی کی مانند سینے
پر باندھ لئے۔ اس لئے کہ اسے اچانک یہ
احساس ہو گیا تھا کہ اس کی جیب
سے جھانکنے والا روپیہ کا نوٹ اس کی
جھوٹ کی چغلی کھا رہا ہے۔

* * *

تین دن سے کچھ کھایا نہیں صاحب،
مسافر ہوں کچھ مدد کیجئے۔ ایک بھکاری نے
سوال کیا۔ آنند راؤ نے جیسے ایک سرد آہ
بھری اور کہا۔ اپنا بھی یہی حال ہے اس
گاؤں کے لئے میں بھی اجنبی ہوں :
بھکاری کے لئے آنند راؤ کے دل میں
بے پناہ رحم کا جذبہ بیدار ہوا اس نے جیب
میں پڑے ہوئے چھ آنے اس کے حوالے کر دیئے

* * *

آنند راؤ اپنے ہوٹل کا قد ناپتے
ہوئے آزردہ خاطر کھڑا ہے۔ اب سے ٹھیک
ساتویں منٹ کے بعد وہ اپنے کسی بھی لوٹ
جائے گا۔ بازار میں کھڑے ہوئے ان سات
منٹوں میں وہ ساتھ ... ظاہر کر کے
... نرم ... خوبصورت سی

کار ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ اس کے آگے رک جاتی ہے۔ کار میں اس کی اپنی سیتا بیٹھی ہوتی ہے۔ فرطِ مسرت میں اس کا چہرہ بے حد تابناک لگ رہا ہے۔ یہ تابناکی نور سے بھی زیادہ روشن اور پرکشش ہے۔ دو سکنڈ کے لئے سیتا مبہوت رہ جاتی ہے پھر پیاری نظروں سے آنندراؤ کی طرف دیکھتی ہے سیتا کے چہرے سے معصومیت ملاحت اور کشش جھلک رہی ہے۔ وہ کار کا دروازہ کھولتی ہے دوسرے لمحے آنندراؤ کار میں بیٹھ جاتا ہے نرم رو اور بے آواز کار سڑک پر تیرنے لگتی ہے۔ پیچ چہرے والی سیتا آنندراؤ کو اپنی آغوش میں بھینچ لیتی ہے۔ مسرت، خود فراموشی اور بے پناہ قربت کے نشہ میں آنندراؤ سیتا کے آغوش میں فنا ہو جاتا ہے

آنندراؤ کی زندہ لاش مختلف گلیوں میں چکراتی ہوئی اس گلی میں پہنچ جاتی ہے جہاں اس کا اپنا گھر ہے اس نے سات کروڑ دنیاؤں کی سات کروڑ سیتاؤں اور سات کروڑ کاروں کو ایک لات ٹھوکر ماردی۔ نائر کے چھوٹے سے چائے خانے پر نظر پڑتے ہی اس کے اندر کی بھوک شعلہ بجاں ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے آنندراؤ نے برسوں کے دن کے بعد جن کی بشاشت اپنے چہرے پر طاری کی۔ اور چائے خانے میں قدم رکھا۔ دیکھو نائر۔ میرا ادھار کتنا ہوا... خانا ایک روپیہ تیرہ آنے ہو چکے ہیں فی الوقت ایک بن، ایک سنگل چائے اور ایک آنے کے چار مینار سگریٹ دینا۔ کل شام تک پورے دو روپئے ادا کر دوں گا۔ ارے بھئی کوئی خیال نہ کرنا ضرور ادا کر دوں گا۔ کسی وجہ سے پیسے فراہم نہ بھی ہو سکیں تو میرے پاس پرانے رسائل ہیں انھیں بیچ کر ادا کر دوں گا۔ یقین مانو یہ سچا وعدہ ہے مجھے تمہارے دھندے کا خیال ہے اور ہاں چائے تھوڑی سی اسٹرانگ ہونی چاہئے ●●

ٹوٹی ہوئی کمند (افسانہ)

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بات
آگے بڑھ کر ختم ہو جائے گی۔ سب سے
[illegible] ملاقات" وارڈی ریلوے اسٹیشن
[illegible] اپنے ماں باپ کے ساتھ گلبرگہ سے
[illegible] رہی تھی۔" وارڈی پر ان لوگوں کو
[illegible] وہ شاید گلبرگہ سے مدراس جا رہے
[illegible] گاڑیاں کافی لیٹ تھیں۔ ان کے [illegible]
انتظار میں بیٹھے ہوئے دور نکل گئے تھے
[illegible] کے پاس سخت گرمی کے باعث اُف
[illegible] تھی۔ ایک نوجوان ٹھنڈے پانی
[illegible] کے اُدھر سے گزرا۔ اسے ایسا معلوم
[illegible] لڑکے کو اس نے کہیں دیکھا ہے۔ وہ
[illegible] پر پوچھنے لگا۔ آپ پانی پئیں گی
[illegible] ٹھنڈا ہے" اس کے اس سوال پر
[illegible] رہ گئی۔ پھر سچ مچ اس کے حلق میں پیاس
[illegible] پڑ گئے تھے گرمی سے اس کا بُرا حال
[illegible] بے اختیار کہا۔ "ہاں"۔ نوجوان
[illegible] گلاس میں پانی انڈیلا اور اس کا
[illegible] اس نے جھکتے ہوئے ٹھنڈے
[illegible] لیا اور شکریہ ادا کیا۔ لڑکے نے
[illegible] ٹھنڈا پانی پی چکے
[illegible] ہوئے کہا [illegible]
[illegible] کہا آپ

مدراس جا رہی ہیں؟ اس نے لڑکے کے سوال
پر سر اُٹھایا۔ جی نہیں ہم لوگ حیدرآباد جا رہے
ہیں۔ لڑکے نے کہا اور ہم لوگ سے کیا مطلب
ہے کیا آپ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے اس
نے کہا ہاں میرے بابو بھی ہیں۔ ہم دونوں
حیدرآباد جا رہے ہیں۔
پھر اس نے ایک طرف نظر اُٹھا کر کہا
دیکھئے میرے بابو آ رہے ہیں۔ اتنا سنتے
ہی لڑکا شرماس کنتے سے لگا کر جلدی جلدی
دوسری طرف چلا گیا اور وہ بے اختیار ہنس پڑی کئی
کئی مہینے گزر گئے۔ ایک دن اچانک آصفیہ
لائبریری میں کتابیں دیکھتے دیکھتے اس نے
دیکھا سامنے کی طرف کی الماری میں کوئی شخص
کتابیں دیکھ رہا ہے۔ اس نے ذرا غور سے
دیکھا تو اسے وہ نوجوان جانا پہچانا نظر آیا۔
ارے یہ تو وہی لڑکا ہے۔ جس نے اسے
کئی مہینے پہلے وارڈی اسٹیشن پر جلتی دوپہر
میں ٹھنڈا پانی پلایا تھا۔ اس لڑکے کا چہرہ
دیکھتے ہوئے اسے پھر ہنسی آ گئی۔ اس کے
سامنے الماری [illegible] وہاں [illegible] نوجوان
دو چار کتابیں ہاتھ میں لئے اسی کی طرف
دیکھ رہا تھا۔ شاید [illegible] پہچان
سکا۔ لیکن پھر اسے دیکھ کر لڑکے کی آنکھوں

بہت [illegible] معلوم ہوئی۔ [illegible]
بعد [illegible] ملاقات میں نے اچھی
کے پاس [illegible] اور کہا آپ یہاں کہاں؟
اس نے کہا آپ یہاں کہاں تو وہ بولا میرا پہلا
اپائنٹمنٹ حیدرآباد ہی ہوا ہے یہاں آئے ہوئے
مجھے ابھی دو مہینے ہی ہوئے ہیں۔ میں اکاؤنٹ
ڈیپارٹمنٹ میں سب انسپکٹر ہوں۔ وہ یہ ساری
باتیں ایک سانس میں کہہ گیا۔ وہ دنگ اس کی باتیں
سنتی رہی۔ اپنی باتیں ختم کر کے اس نے پوچھا آپ کہاں
رہتی ہیں۔ وہ بولی میں تو یہیں رہتی ہوں۔ لڑکا
بولا پھر بھی اتنے دنوں بعد ملاقات ہوئی۔ اس
نے کہا میں کبھی کبھی لائبریری آتی ہوں آج بھی
کچھ کتابیں لینے آئی تھی کیا معلوم تھا کہ آپ سے
ملاقات ہو جائے گی۔ لڑکے نے پوچھا ابھی
آپ کسی کالج میں پڑھ رہی ہیں؟ اس نے کہا جی
میں اپنی تعلیم ختم کر چکی ہوں۔ اس دن وہ دیر تک
باتیں کرتے رہے۔ لائبریری گھوم پھر کر انہوں نے
بیسیوں کتابیں دیکھ ڈالیں۔ ان کتابوں میں کچھ
ان کے مطلب کی بھی تھیں اور کچھ بے مطلب۔
لیکن وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے ہر شلف
کی کتابیں دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ [illegible] سے
باہر نکل کر انہوں نے قریب کے کافی ہاؤس میں
کافی پی۔ کافی پینے کے دوران اس لڑکے
نے جو کچھ کہا اس کا جواب اس نے مسکرا کر
اس وقت میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ آپ کے کسی بھی
سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔
[illegible] گھر [illegible] ہے۔ آپ نے
بزرگوں سے [illegible]

بات کرلی ہے تو اللہ کرے جلد کا جلد اپنی کتا ہیں سمیٹ کر [illegible] ہو گئی اور دیر تک ٹہلتے ہوئے دل ہی دل میں [illegible] ہو گئی۔ ایک نہایت ہی شریف، تعلیم یافتہ اور اچھی سیرت والے لڑکے سے اس کا رشتہ طے ہو رہا تھا بات چیت چل رہی تھی لیکن اس نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ شادی کرے گی تو اس جوان سے جو اسٹیشن پر ملنے والے اور لائبریری میں دیر تک وقت گزارنے والے نوجوان کے ساتھ کرے گی بس۔ وہ یہ فیصلہ اپنے دل سے جبر کر کے کر رہی تھی۔ لیکن سوچتی تھی کہ یہی اچھا ہوگا۔ ایک ہفتہ کی شام لائبریری والے لڑکے کے والد دو تین آدمیوں کے ساتھ اس کے والد سے ملنے آئے وہ پردے کے پیچھے کھڑی ان لوگوں کی اور اپنے والد کی باتیں سننے لگی۔

آنے والوں میں سے ایک بوڑھے شخص نے جو لڑکے کا باپ معلوم ہوتا تھا اس کے والد سے کہا جناب ہمیں لڑکی دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں لڑکی ہمارے لڑکے کو پسند ہے۔ یہی بہت ہے لیکن ہمارے لڑکے کو جو اب آپ کا لڑکا ہو جائے گا ایک چھوٹا سا کاروبار [illegible] سے ممکن ہو۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایک کوٹھا اور سالم [illegible] اعلیٰ تعلیم [illegible] ہوگا بس اور کچھ نہیں۔

وہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] لگی۔

جس لڑکے سے اس کے رشتے کی بات چل رہی تھی وہ لڑکا بھی خوبصورت تھا تعلیم یافتہ تھا اچھی پوسٹ پر تھا مگر وہ [illegible] نہیں مانگ رہے تھے اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا وہ دروازے کی چوکھٹ کو تھامنے کی کوشش کرتے ہوئے دھڑام سے نیچے گر پڑی۔

***

منی کہانی

شبنم سحر دہلوی

نتیجہ

حسب معمول شیرو جب رات کو ایک بجے شراب کے نشے میں دھت گھر پہنچا تو گھر کے کواڑ بند تھے پورے محلے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا شاید بجلی فیل ہو گئی تھی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لڑکھڑاتے قدموں سے وہ بڑی مشکل سے گھر تک آیا تھا اور دروازہ بند دیکھ کر اس کی جھنجھلاہٹ عروج پر پہنچ گئی تھی۔

کتنی بار کہا ہے کہ دروازہ کھلا رہنے دے سالی جان بوجھ کر مجھے غصہ دلا رہی ہے خیر آج اس حرام زادی کو مزہ نہیں چکھایا تو میرا نام بھی شیرو نہیں۔ اس نے اپنی بیوی کی شان میں ایک موٹی سی گالی دی اور زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا "گلشن دروازہ کھول" جب دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے اُسے کافی دیر گذر گئی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اس سے پہلے کہ وہ دروازہ توڑ کر اندر گھستا کھٹکتے قدموں کی آہٹیں گونجیں اور دروازہ کھل گیا۔

کمینی تو بہت سر پر چڑھ گئی ہے دوپہر کو مجھے مائکے جانے کی دھمکی دینے لگی اور اب آدھے گھنٹے سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں اللہ جان بوجھ کر بہری بنی بیٹھی ہے۔ شراب کی زیادتی نے غصے کو اور ہوا دی اس نے لپک کر گلشن کا گلا پکڑ لیا اور پوری قوت سے دبانے لگا اندھیرے میں اُس نے گلشن کو ٹٹول کر دیکھا گلشن کا جسم سرد پڑ چکا تھا اور اس کی ناک نے سانس چھوڑنی بند کر دی تھی۔

"خس کم جہاں پاک" اُس نے گلشن کو وہیں زمین پر ڈالا اور ڈگمگاتے قدموں سے اپنے کمرے میں جا کر سو گیا دوسرے دن صبح اس نے عجیب ہی منظر دیکھا اس کے گھر میں بھیڑ جمع تھی اور آنگن میں اس کی ماں کی لاش پڑی تھی جس کی گردن پہ نیلے نیلے انگلیوں کے نشان تھے کچھ سوچ کر وہ کانپ گیا۔

چندا گلشن کہاں ہے

اُس نے گھر کی نوکرانی سے پوچھا

وہ تو کل دوپہر ہی کو ماں جی سے کہہ کر اپنے میکے چلی گئی تھیں۔ چندا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ چندا نے ابھی جملہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ اس پر غشی طاری ہو گئی اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

مستقل فیچر (ادارہ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں)

غبارِ خاطر

[illegible] یہ محض اتفاق ہے کہ تب ایک جگہ
[illegible]ست کے ذریعہ "ہم" کے تمام شمارے
[illegible] لگے۔ ورنہ حیدرآباد کا "اردو دنیا"
[illegible] ایک تنگ ہے۔ جولائی ۸ء ۱۹۹
[illegible] شمارے میں اقبال متین صاحب کا افسانے
[illegible] مختصر سا مضمون پڑھنے کو ملا اس سے قبل
[illegible] مضمون علی گڑھ کے سیمینار میں سن چکا تھا
[illegible] اس بحث میں شریک بھی تھا جو اس
[illegible] کے بعد ہوئی تھی۔ اگست ۸ء ۹
[illegible] شمارے میں جناب قدیر زماں صاحب کا
[illegible] مضمون بھی پڑھا۔ ان دونوں کے
[illegible] مطالعے کے بعد چند باتیں جو ردِ عمل کے طور پر
[illegible] ذہن میں ابھر آئی ہیں وہ میں تحریر
[illegible] رہا ہوں ان دونوں بزرگوں سے معذرت
[illegible] ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی بعض باتوں سے
[illegible] زماں صاحب کے بعض نکتوں سے
[illegible] آپ کو متفق نہیں کر سکا۔ میں یہ باتیں
[illegible] کے طور پر نہیں بلکہ افسانے کے معمولی
[illegible] اور ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے
[illegible] پیش کروں گا۔

سب سے پہلے تو مجھے اقبال متین
صاحب کے مضمون کے ان ابتدائی جملوں سے
[illegible] اختلافات عرض کرنا ہے جہاں موصوف

نے قاضی عبدالستار کے افسانے پر باتیں کیں
اور جدید یت کے خلاف آواز اٹھائی
ہے اور اپنی مشکلات کا اظہار کیا ہے
وہ فرماتے ہیں:

"میری دانست میں ادب کی کسی
صنف کو بھی زماں کے اس محدود سیاق
و سباق میں سمجھنے کی بجائے وسیع تر
تناظر میں سمجھنے، پرکھنے اور رد و قبول
کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔ آج
اور کل یا بیس سال ادھر یا ادھر۔
اس عنوان کے لباس پر وہ ایک بات جو
ڈھکی چھپی ہے وہ ذہن کو اس طرف
منتقل کرتی ہے کہ ہم کل کے افسانے کا
آج کے افسانے سے تقابلی موازنہ کرنے
کا جواز تلاش کر رہے ہیں۔ سوال یہ
ہے کہ اس موازنہ یا تقابل کی ضرورت
بھی کیوں محسوس کی گئی وہ افسانہ جسے
آپ کل کا افسانہ سمجھتے ہیں وہ آج کا
افسانہ بھی ہے اور وہ آنے والے کل کا
افسانہ بھی ہو سکتا ہے یہ بھی ممکن
ہے کہ میرے آج کے افسانے کے آنے
والا کوئی کل ہو یا نہ ہو۔
[illegible] گزر چکا یا اس صدی کے [illegible]

مطلب یہ [illegible] بالکل نہیں ہے
یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم اب گویا افسانے
کو آج اور کل کے خانوں میں بانٹ رہے
ہوں بلکہ تجزیہ کرنے کا ایک یہ
ایک طریقہ ہوتا ہے جب ہم آج کے افسانوں کی
اگر باتیں کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ
ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم کل کے افسانوں کو نکال
کر پھینک رہے ہیں یا امروز۔ فردا
کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ افسانہ تو افسانہ
ہوتا ہے اگر وہ زندہ ہے تو پھر آنے
والے کل میں بھی زندہ رہے گا۔
ہمارے پاس وقت کم ہوتا ہے ہم
دو تین دن کے سیمینار میں ستر اسّی سال
کے افسانوی سرمایہ کا بیک وقت جائزہ
نہیں لے سکتے اور پھر ۴۷ء کے افسانے
آزادی کے بعد افسانے۔ ترقی پسند افسانے
وغیرہ کا بے حد تجزیہ کیا جا چکا ہے پہلے
کانفرنسیں، سیمینار وغیرہ ہو چکے ہیں
اور اب ضرورت ہے کہ ادھر کی چند
برسوں کے درمیان افسانوی ادب میں کیا
کیا تبدیلیاں آئیں اس پر غور کیا جائے
تو پھر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم اسے
خانوں میں بانٹ رہے ہیں۔
ہم پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ
سکتے کہ پریم چند سے قبل افسانے نہیں
تھے لیکن پریم چند نے اپنے طور پر جو راستہ
اختیار کیا اس کا رشتہ ہر حال اپنے
وقت سے جڑا ہوا ہے ترقی پسند افسانوں

[illegible] حجاب ہے۔ منٹو، بیدی، کرشن، عصمت وغیرہ کے افسانے جب حقیقت کے نقطۂ عروج پر پہنچے تو ان کا تجزیہ مکمل ہوا اور اس کے ردِ عمل کے طور پر جو افسانے نظر آئے وہ اپنے آپ میں انفرادیت کی گہری چھاپ رکھتے ہیں۔ پھر تو افسانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا لیکن اس کو اس منزل تک پہنچانے میں بنیادی رول ان افسانوں کا ہے جن کے جواب میں یہ افسانے لکھے گئے اور اب بالکل نئے دور میں نئی نسل کے ذریعے لکھے گئے افسانے سارے گرد و غبار کو ہٹا کر اور تمام پیچیدہ حلقوں سے باہر نکل کر ایک بار پھر صاف ستھری فضا میں قدم رکھے ہیں جہاں ترقی پسندی بھی ہے۔ جدیدیت بھی۔ علامتیں بھی ہیں اور دوسرے تجربے بھی۔ لیکن اس کے باوجود اپنا الگ راستہ ہے اپنی ایک الگ منزل۔ تو پھر اب سوچئے کہ افسانے کا یہ طویل سفر ایک دوسرے سے کس قدر منسلک اور مربوط و پیوستہ ہے ایسی صورت میں ہم افسانے کے تمام رشتوں کو توڑ کر اسے سال و ماہ کے اور نئی و پرانی نسل کے الگ الگ ڈبوں میں کیسے بند کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ جہاں تک اہم اور چونکا دینے والی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں خواہ وہ تعمیری ہوں یا تخریبی لیکن افسانے نے اگر کروٹ لی ہے وہاں پر ہم کو تبدیلیوں کی علامات کے پیدا ہونے کی، فن کے رد و بدل کی اہمیت نئے تجربوں کی، نئی ہیئت و تکنیک کی آمد کی ایک خط تو بہر حال کھینچنا پڑتا ہے اور اگر نہ کھینچا جائے تو پھر افسانہ کیا کسی صنف کے اتار چڑھاؤ۔ انقلابات کا صحیح تجزیہ ہم کسی حالت میں نہیں کرسکتے اور اس طرح سے ہم افسانے کا صحیح ارتقاء پیش کرنے سے معذور ہو جائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض افسانہ نگار جنھوں نے آزادی سے قبل لکھنا شروع کیا تھا وہ آج بھی لکھ رہے ہیں۔ ۶۰ کے اردگرد لکھنے والے تو پورے طور پر آج کی فضا پر چھائے ہوئے ہیں اس کے علاوہ ۷۰ کے اردگرد ایک اور نئی پود نمودار ہوئی ہے وہ بھی پوری کامیابی کے ساتھ لکھ رہی ہے لیکن سہیل عظیم آبادی، کوثر چاند پوری کے افسانے، 'اقبال متین'، اقبال مجید غیاث احمد گدی۔ اور جوگندر پال کے اپنے افسانے اور شوکت حیات، انور قمر، سلام بن رزاق، شفق وغیرہ کے افسانوں میں بنیادی فرق جو ہوگا وہ ان کے اپنے دور اور اپنے وقت کی تبدیلیوں کے اعتبار سے ہوگا اور یہ فرق بتدریج آگے بڑھتا جائے گا۔ تو یہ فرق کیوں؟ کیسے ہے؟ انھیں سوالوں کا جواب پانے کے لئے ہم سیمینار کرتے ہیں۔ مضامین لکھتے ہیں اور بحثوں کا سلسلہ چلاتے ہیں تاکہ پتہ چل سکے کہ اس شکست و ریخت میں کون زندہ ادب ہے اور کون مرجانے والا بقول اقبال متین سے

"ادب کے ہر دور میں نظریے اور اقدار کے بدلنے سے شکست و ریخت کا یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ جو بچ رہتا ہے وہی صرف وہ ہوتا ہے جو ادب ہوتا ہے"

قدیر زماں نے اپنے اس مضمون میں جو اشارے کئے ہیں ان کے سہرے اقبال متین کے مضمون میں بہت کم ملتے ہیں لیکن پھر بھی ایک دو بحث طلب باتوں کی طرف اچھا اشارہ کیا ہے۔ میں زماں کے اس مضمون کی دل سے تعریف کرتا اگر وہ اتنے سنجیدہ ہو کر گروہ بندی کی باتیں نہ کرتے۔ اس طرح سے گروہ بندی کی باتیں صاف صاف قطعی نہیں ہونی چاہئے ہماری چھوٹی سی اردو کی دنیا اور اس مختصر سے دائرے کو ہم مزید چھوٹے چھوٹے دائروں میں بانٹ دیں تو یہ ہمارے حق میں قطعی مناسب نہیں لیکن اس کے باوجود میں ان کو یہ حق دیتا ہوں کہ وہ اگر کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں تو ضرور رکھیں لیکن اس طرح سے بے باکانہ اعلان اور اس کی پر زور وکالت سے قاری کا اور نئے طالبعلم کا قدم ڈگمگا دیتا ہے اقبال متین نے علامتی یا تجریدی افسانوں سے متعلق جو باتیں اٹھائی ہیں ان سے قطعی اختلاف کیا جا سکتا تھا اور سختی کے ساتھ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن زماں

[illegible] ہے۔

[illegible] ایک گروہ بھی جو صرف میرا ہم خیال ہے اس کا مجاز نہیں ہے کہ کسی ایسے ادب کو رد کر دے اور اسے غیر ادب کا لیبل لگا دے۔ جس ادب کی بازیافت کے لئے عصری یا اس گروہ کے افراد کی طبیعت موزوں نہیں ہے۔

علامتوں کی بے زور حمایت کرنے والے زماں صاحب اپنی بات کتنے سیدھے سادے انداز میں کہہ گئے۔ غور کرنے کی بات ہے اقبال متین افسانہ نگار یقیناً اہم ہیں لیکن ان کو یہ حق کہیں سے نہیں پہنچتا کہ وہ کسی ادب کو رد کر دیں۔ رد و قبول کا یہ فیصلہ تو تاریخ کے ہاتھوں سے گذرتا ہوا آنے والا وقت کرتا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ۔ ن م راشد کی باتیں محض گروپ کی باتیں ہیں اور میں نہیں جانتا کہ یہ اشارہ انھوں نے کس کی طرف کیا ہے۔ بہت سے لوگ پریم چند، کرشن چندر اور سجاد ظہیر کے کارناموں کو ایک سرے سے انکار کرتے ہیں اور پریم چند وغیرہ کو افسانہ نگار ہی نہیں مانتے۔ کلیم الدین احمد نے غزل کی معنویت سے انکار کر دیا تو کیا اس کی حقیقت ختم ہو گئی۔ ہر قاری کو اپنے انداز سے سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا حق ہے لیکن تخلیق کار کے ساتھ اس [illegible] تقاضے جڑتے ہیں کہ وہ منفرد طور پر آزادانہ [illegible] [illegible] تک [illegible] اور ابلاغ تا مضمون پر کامیابی کے ساتھ کہہ جاتا ہے تو افسانہ نگار ہوتا ہے۔ تخلیق کار سوچنے سمجھنے میں یقیناً آزاد ہے جو اپنی انفرادیت اور اپنی علیحدہ شناخت بنانے کے لئے نئے نئے راستے اختیار کرتا ہے لیکن جب تخلیق کے سانچے میں ڈھلتی ہے تو اس کے بعد وہ اس بات کا خواہش مند ہوتا ہے کہ اس کی یہ تخلیق ایک ایسے جریدے میں شائع ہو جو ہر خاص و عام میں مقبول ہو۔ مقبولیت اور قاری کے دل [illegible] کے لئے [illegible] فکر دی جاتی ہے اگر فکری سطح پر قاری اور تخلیق کار میں ہم آہنگی ہو جائے تو یہ تخلیق کار کی کامیابی ہوتی ہے اور جو تخلیق کار ایسا نہیں سوچتے تو پھر وہ کس کے لئے لکھتے ہیں اور کس کے لئے شائع ہوتے ہیں۔ آسمان سے اتر کر تو ان کی تخلیق کو کوئی پڑھنے کا نہیں۔

یہاں بات مزاج اور نظریے کی نہیں [illegible] سمجھ میں آنے اور نہ سمجھ میں آنے کی ہے۔ قاری اس بات کی فرمائش قطعی نہیں کر سکتا کہ ہر لکھنے والا اس کے مزاج کے مطابق لکھے لیکن اتنی بات تو کہہ سکتا ہے کہ لکھنے والا کچھ بھی لکھے لیکن قاری کے واسطے ایسا تو لکھے کہ کم از کم اس کا دسواں حصہ تو سمجھ میں آ جائے۔

[illegible] لکھ رہا ہے وہ شاعری ہے [illegible] کوئی شاعر [illegible] نہ ہو کیونکہ اس میں بہت زیادہ سمجھنے کی بات نہیں ہے [illegible] لوگوں کے لئے مزہ دار ہو سکتی ہے۔

بے تکی اور انتہائی بے تکی چیز جس کا کوئی سر اور نہ پیر ہو اگر ضعیف زبان کے [illegible] کے سامنے پیش کی جائے تو وہ بھی انتہائی معصومیت سے مان لے گی [illegible] اور نا سمجھی کا اعلان کر دے گا۔

علامتوں کے سلسلے میں زماں صاحب نے دلچسپ باتیں اٹھائی ہیں۔ علامت کی اہمیت اور اس کی قدر و منزلت سے کون کافر انکار کر سکتا ہے۔ علامت ہمارے ادب کا جزو لاینفک ہے۔ ہمارا پورا سرمایہ علامتوں سے لبریز ہے۔ ایک عام آدمی اپنی بات سیدھے سادے اور کبھی کبھی رمز کے انداز میں کہہ دیتا ہے لیکن باشعور ادیب و تخلیق کار گہری گہری باتوں اور بے شمار طنز و مزاح کو سلیقے کے ساتھ اشاروں اور کنایوں میں کرتا ہے اور یہی فرق ایک عام آدمی اور ادیب و فنکار میں ہوتا ہے اور یہ فرق علامتوں کے ذریعے واضح طور پر پیدا ہوتا ہے۔

شاعری کے علاوہ داستانوں [illegible]

علامتیں استعمال ہوتی ہیں۔ ناولوں میں افسانوں میں یہاں تک کہ کرشن چندر اور منٹو جیسے ادیبوں نے بھی علامتیں استعمال کی ہیں اور بڑی کامیابی کے ساتھ کی ہیں لیکن ان کے دور میں علامتوں کے خلاف آوازیں نہیں اٹھیں پھر یہ آج اتنا ہنگامہ کیوں ہے؟ غور کرنے کا مقام ہے اگر ہم اس کا جواز تلاش کریں تو شاید دو باتیں سامنے آئیں ایک تو اس دور کا افسانہ نگار ضرورت سے زیادہ قابل، فلسفی اور باشعور ہے اور برعکس اس کے قاری اتنا ہی جاہل اور کم سمجھ۔ یا پھر افسانہ نگار بے حد چالاک و ہوشیار ہو گیا ہے اور قاری انتہائی معصوم اور ایماندار — اور اگر یہ سب کچھ نہیں تو پھر یہ ٹکراؤ کس بات کا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ علامتوں کے استعمال کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے علامتیں تو ہر ادب میں اور ہر دور میں استعمال ہوتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس جدید دور کے ہندوستانی ادب میں جو علامتیں استعمال ہو رہی ہیں وہ خود ساختہ آپ نے کیا ہیں اور ان کی ترسیل میں قاری کس حد تک کامیاب ہے۔

ایک علامتی افسانے لکھنے والے نئے افسانہ نگار آج کل یہ سے شکوہ سے کس قدر پریشان اور عدیم الفرصتی کا رونا رویا کرتے ہیں تو دوسری جانب زماں صاحب اپنی گفتگو میں یہ لکھتے ہیں کہ "یہ علامتی ادب کا ضعف ہے کہ آپ ان علامتوں کی تعبیر ڈھونڈھتے جا رہے ہیں جن علامتوں کو فنکار نے تخلیق میں سمویا ہے۔"

ہمیں یقیناً اتنی فرصت ہے کہ ہم ان علامتوں کی گرہیں کھولنے کے لئے دنیا کے تمام کام کاج چھوڑ کر ذہنی انسائیکلوپیڈیا کے اوراق پلٹتے اور معنی تلاش کرتے رہیں پتہ نہیں وہ کون لوگ ہیں جو اس طرح کی گرہوں کو کھولنے میں انبساط حاصل کرتے ہیں جن کی جانب زماں صاحب نے اشارہ کیا ہے مجھے تو آج تک کوئی ایسا نہیں ملا میں ایک بار پھر عرض کر دوں کہ میں علامتی افسانوں یا اس طرح کے دوسرے تجرباتی افسانوں کا قطعی مخالف نہیں ہوں بلکہ نئے نئے تجربے ہونے چاہئیں لیکن یہ تجربے معتدل، مناسب اور تعمیری ہوں، گروپ بندی، نظریاتی کیمپ سے قطع نظر اگر واقعی علامت خوبصورت ڈھنگ سے استعمال کی گئی ہے اور علامتوں کے ذریعہ واقعی ہماری موجودہ زندگی اور سماج کی ترجمانی ہوئی ہے تو ہم سب اسے آگے بڑھ کر گلے لگانے کو تیار ہیں۔

ہم گروہ بندی کے قائل نہیں اور نہ ہی کوئی ایسا منفرد مزاج رکھتے ہیں ہاں پڑھنے لکھنے کے معاملات میں اپنا ایک ٹوٹا پھوٹا شعور اور نظریہ ہے اور اس راہ میں جو مسائل آئیں گے ہم ان کا ٹھا ہر حالت میں کریں گے ان کے ردّ عمل میں کس گروپ پر کیا گذر رہی ہے ہمیں اس کی پرواہ نہیں ہے۔

کہانی کے دروازے چاروں طرف سے کھلے رہنے چاہئیں اور ہر طرح کے تجربے ہونے چاہئیں کیونکہ کہانی کو ابھی بہت آگے بڑھنا ہے لیکن کہانی کے لئے بنیادی شرط کہانی پن ہے اور اگر وہ نہیں ہے تو پھر وہ کہانی نہیں کوئی اور چیز ہوگی۔ اقبال متین کے ان جملوں سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں ؎

"میرے نزدیک کہانی خواہ علامتی ہو کہ تجریدی اس کو پہلے کہانی ہونا چاہئے اس کا کہانی پن یا اس کی افسانویت ہی اس کو اس کی بے چہرگی سے بچا سکتی ہے جو ضروری ہے۔" ▲▲

علی احمد فاطمی
الہ آباد

★ برادرم ناصر کرنولی صاحب

میرا خط پاکر آپ متعجب ہوں گے (اس کا سبب یاسی کچھ نہیں ہے "نوم" مسلسل ملا ہے اور میں "بار ندامت" سے کمر خمیدہ ہوا جا رہا ہوں۔ علامتی افسانے کی بحث پسند آئی۔ کیا اس میں مزید اضافے کے امکانات ہیں۔ اس عید پر آباد آنا نہیں ہوا اور فی الحال کوئی پروگرام بھی نہیں ہے بمبئی میں ہوں اور حسب سابق مصروف ہوں۔ ایک تحریر بھیج رہا ہوں۔ "نوم" میں تھوڑی سی جگہ ہو تو شامل کر لیجئے۔

یوسف ناظم (بمبئی)

فلمنامہ

بہت دنوں کی بات ہے ایک محفل میں
ہندوستانی فلموں کی تکنیک، معیار اور موضوع
پر بحث چل رہی تھی۔ باہر کی فلموں کے مقابلے
ہماری فلموں کے پست معیار پر بھی تفصیلی
گفتگو ہو رہی تھی۔ خواجہ احمد عباس بھی اس
محفل میں شریک تھے انھوں نے بحث میں حصہ
لیتے ہوئے اپنا ایک تجربہ بیان کیا۔ پنڈت
جواہر لال نہرو نے آزادی سے پہلے ہندوستان
کی تحریک کی پبلسٹی کے لئے دو شخصیتوں کا
انتخاب کیا تھا۔ جن میں ایک کرشنا مینن
اور دوسرے خود عباس صاحب تھے کمیونسٹ
ممالک میں پبلسٹی کی ذمہ داری
عباس صاحب کو سونپی گئی تھی۔ اس اہم کام کی
تکمیل کے لئے انھوں نے ہماری فلموں کا سہارا لیا
... نمائش پر ہندوستانی فلمیں روس بھیجی
گئیں جہاں ان کی نمائش نے سب لوگوں کو حیرت
میں ڈال دیا۔ کچھ دنوں بعد عباس صاحب ہی
کی لیڈرشپ میں ایک فلم ڈیلیگیشن ماسکو روانہ
ہوا جس میں راجکپور اور نرگس بھی شریک
تھے۔ ... ہندوستانی اداکاروں کی مقبولیت
... لوگوں کی زبانی "آوارہ ہوں" کا مقبول
گیت سنتے ہوئے ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔
... اور ہندوستان کو ایک دوسرے کے قریب
لانے میں فلموں نے جو کام کیا ہے وہ شاید کوئی

تقریبوں اور میٹنگوں سے نہیں ہو سکتا۔
ابھی کچھ دن پہلے پاکستان کے سفیر جناب
عبدالستار صاحب حیدرآباد تشریف لائے
تھے۔ جن سے ایک دعوت میں دوپہر کے
کھانے پر میری ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے
ان سے دریافت کیا کہ ہند و پاک میں بسنے
والوں کے تہذیبی رشتے مشترک و مستحکم
ہونے کے باوجود کیا وجہ ہے دونوں ملک
کو قریب سے قریب تر ہونے کے لئے کافی
عرصہ درکار ہو رہا ہے۔ جس پر پاکستانی سفیر
نے کہا کہ یہ منزلیں آہستہ آہستہ طے کی جائیں
گی۔ یعنی کہ
"راستے ہموار ہونے کو زمانہ چاہیئے"
پھر میں نے ان سے کہا کم سے کم دونوں ملک
میں فلموں کے تبادلے اور ان کی نمائش کی ضرورت
پر زور دیا کیونکہ اس اقدام سے دونوں
ملک کو ایک دوسرے سے قریب ہونے
میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ جس پر انھوں
نے کہا کہ پاکستان میں ہندوستانی فلموں کی
نمائش پاکستان فلم انڈسٹری کے لئے ایک
موضوع فکر بن جائے گی کیونکہ ہندوستانی فلمیں
تکنیک کے اعتبار سے بہت آگے ہیں۔ جس پر
میں نے کہا کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہماری
فلمیں دیکھ کر پاکستانی فلم سازوں

[illegible] ہو جائے اور ان کی طرف [illegible] نہیں کر
[illegible] پاکستان [illegible]
فلمیں بھی [illegible]
[illegible] کا اضافہ
جنھیں یاد ہیں وہ آج بھی کہہ سکتے ہیں
کہ فلم سازی میں ان ہی دو تصویروں نے
انقلاب برپا کر دیا تھا۔ ان فلموں کی
غیر معمولی کامیابی کو دیکھتے ہوئے کلکتہ کے
فلم سازوں نے اردو فلموں کا بنانا ترک کر
دیا تھا۔ غرض ملکوں کو قریب لانے میں دونوں
کی فلمیں جو کام کر سکتی ہیں وہ ادیب شاعر
جرنلسٹ اور دیگر فنکاروں کے تبادلوں سے
شاید ہی ممکن ہو سکے۔

★

فلم انڈسٹری کی ایک با صلاحیت اداکارہ
لینا چنداورکر آپ کو ضرور یاد ہوں گی۔ اس
خوبصورت ہیروئن سے شادی کی تمنا میں
انڈسٹری کے کئی نامور اداکار سرگرداں تھے
لیکن اس نے گوا کے چیف منسٹر کے بھائی سے
شادی رچا کر ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا
تھا۔ شادی جس دھوم دھام سے ہوئی تھی
اس کا انجام بھی کہیں زیادہ دردناک ثابت
ہوا۔ شادی کے کچھ ہی دنوں بعد اس کے
شوہر کی پراسرار موت نے لینا چنداورکر
کو پھر سے بمبئی کے نگارخانوں میں دھکیل
دیا۔ وہ ایک عمر کی ناکامی [illegible]
[illegible] کر دیا [illegible]

لیے ہرا بالی وڈ کی دھماچوکڑی لگی ہے ۔ کل تک جو ہیرو اس سے شادی کرنے کی شرطیں باندھا کرتے تھے آج انھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ لینا نے مکان ، موٹر اور دیگر شاندار جائیداد بیچ کر رنگ و نور کی اس دنیا سے بیراگ لے لیا ہے ۔

★

جس طرح ہیما مالنی نے انڈسٹری میں داخل ہو کر وجینتی مالا کی جگہ لے لی تھی اسی طرح ان دنوں ایک نئی لڑکی ابھر رہی ہے جس کا نام ہے بندیا گوسوامی فلموں میں کافی کام مل رہا ہے ۔ صورت شکل سے ہیما مالنی سے بہت زیادہ مشابہہ ہے دیکھنا یہ ہے کہ اداکاری کے اعتبار سے بھی وہ ہیما مالنی کا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے گی یا نہیں ۔ ؟

★

آج کل کہانی کاروں کی ایک اور ٹیم کا بہت چرچا ہے "مرزا برادرس" ۔ یہ حضرات سلیم جاوید کی طرح بلند بانگ دعوے تو نہیں کرتے لیکن ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کامیابی کی منزلوں کو طے کر رہے ہیں ان کی قلم ... دھمکے ... سارے ہندوستان میں باکس آفس پر ہٹ کیا ہوئی ہے کہ راجیش کھنہ کی طرح کئی اور ہیرو بھی اپنے لئے ان سے کہانیاں لکھوا رہے ہیں جس طرح سلیم جاوید نے امیتابھ بچن کی قسمت چمکا دی تھی ... [illegible]

بلکہ سے راجیش کھنہ کا بگڑا مقدر سنوار دیں ۔ ●●

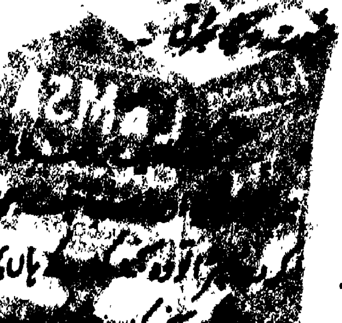


[illegible] کی طرح
[illegible] ناول۔ ۱۹۴۹
[illegible] بنائے گئے۔ فلم
[illegible] بہت سے گئے [illegible]
[illegible] بھی ان کی وجہ سے محروم
[illegible] سے [illegible]
[illegible] کا اعلان کر دیا
[illegible] میں بہت سی باتیں
[illegible] اور زور و شور سے ان کی
[illegible] بات تو
[illegible] ہندو۔ امریکی فلم
[illegible] یہ بات [illegible]۔ اس سے پہلے
[illegible] کی کئی فلمیں جیسے "[illegible]"
[illegible] ہندوستان اور امریکہ
کی [illegible] کا نتیجہ [illegible] دوسری بات
یہ کہ [illegible] امریکی اداکاروں نے ہندوستانی
فلم میں کام کیا ہے۔ اس بات [illegible]
[illegible] کا کام
[illegible] بیرونی اداکاروں نے کام کیا ہے

[illegible] اور
میں یہ عمل دکھایا جا چکا
شاید یہ بات بہت فخر کی ہے کہ اس فلم
کی شوٹنگ صرف تین ماہ میں مکمل کر لی
گئی ہے حالانکہ ہمارے پاس بہت سے
فلم ساز ایسے ہیں جو اس سے کم عرصے
میں اپنی فلمیں مکمل کر لیتے ہیں۔ اس سلسلے
میں [illegible] مرنال سین، [illegible]
[illegible] اور شیام بینیگل کے نام قابل
ذکر ہیں۔ خود اس فلم کی یونٹ کے ایک
فوٹوگرافر نے "مرنے رے لو" کی شوٹنگ
صرف ۲۴ گھنٹے میں مکمل کی تھی۔ اس فلم
میں بیرونی ٹیکنیشن کام کر رہے ہیں لیکن
یہ بات بھی اب نئی نہیں رہی۔ [illegible]
میں بیرونی ملک سے کام لیا گیا تھا اور اب
[illegible] کی "[illegible]" میں
[illegible] کی "[illegible]" میں اور [illegible] کی
"[illegible]" میں بیرونی ممالک سے کام

× دھرم [illegible]
سب سے زیادہ [illegible]
جوڑی ہے [illegible]
ان کی جتنی فلمیں [illegible]
ہوئی ہیں [illegible]
ان کے آپسی تعلقات
میں کئی باتیں مشہور [illegible]
انکشاف ہوا ہے وہ [illegible]
والا ہے۔ ایک مشہور فلمی رسالے
سے بات چیت کرتے ہوئے دھرم
نے کہا کہ ہیما مالنی اس کی بیوی ہے۔ دھرم
نے بتایا کہ ان کی شادی [illegible]
میں ہوئی جبکہ "[illegible]" کی شوٹنگ [illegible]
اور وہ "[illegible]" کی شوٹنگ میں مصروف تھا
[illegible] یا کہ ان دونوں نے ایک دوسرے
[illegible]
[illegible]

[illegible] ان کی مت
بھارتی فلم [illegible] کو ایک دلچسپ
[illegible] ہوگیا۔ قریب ہی میں ایک شادی
[illegible] پھر اقتدار کو کسی نہ کسی
[illegible]
[illegible] کہا کہ وہ شادی کی تقریب
میں شرکت کریں گے۔ ان دونوں نے
تقریب میں شرکت کی اور پھر شاندار
دعوت اڑائی۔ پھر اس کے بعد دونوں کا
[illegible]
میں [illegible] اور دعوت کھا کر لوٹ
گئے۔ پھر [illegible] جب شادی
خانے [illegible] کو اس بات کا احساس
ہوا کہ [illegible] دعوت میں
بلا دعوت شرکت کرتے ہیں تو اس نے
انہیں [illegible] روک دیا۔ کسی
[illegible] کو پکڑ کر کہا یا
[illegible] پیسے رشوت دے کر دعوت
میں شرکت کی۔ اس کے بعد [illegible]
کرنے [illegible] کو دو روپے
[illegible]



کا ایک فلیٹ خالی ہے اور وہ وہاں
رہ سکتا ہے [illegible] کرایہ کی

بات کی تو سنجیو کمار نے کہا تم کیا کرایہ دو گے
جاؤ جا کر ٹھہر جاؤ۔ اس آدمی کو سنجیو کمار
کے رویے پر تعجب ہوا کہ سنجیو جیسا کنجوس
اسے مفت میں اپنا فلیٹ رہنے کے لئے
دے رہا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سنجیو
کی دریا دلی کی تعریف کی اور فلیٹ میں
منتقل ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب اس آدمی کی
مالی حالت ٹھیک ہو گئی تو اس نے سنجیو کمار
کو فلیٹ کا کرایہ دیا۔ سنجیو نے کرایہ
لیتے ہوئے کہا بھائی یہ تو ایک مہینے کا کرایہ
ہے۔ مجھے تو کرایہ اس وقت سے چاہئے
جب سے تم فلیٹ میں مقیم ہو۔ اب اس
بیچارے کو پتہ چلا کہ سنجیو کی دریا دلی کا
کیا مطلب تھا۔

★

چکمگلور میں شریمتی اندرا گاندھی کی
کامیابی سے بہت سے فلم ساز سوچنے لگے
ہیں کہ کہیں پھر ایمرجنسی کا زمانہ لوٹنے
والا تو نہیں ہے۔ ایمرجنسی کے دوران
سنسر شپ کی سختیوں سے ہمارے فلم ساز
اس قدر پریشان ہوئے تھے کہ آج بھی
اس کے تصور سے ان کی رگوں میں خون منجمد
ہونے لگتا ہے۔ ویسے جنتا حکومت نے
بھی اتنی کھلی چھوٹ نہیں دے رکھی ہے
جس کا وہ خواب دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ فلم
پروڈیوسرز کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ سنسر
شپ کے قانونی جواز کے خلاف ہائی کورٹ
میں رٹ داخل کی جائے۔ یہ فیصلہ سنسر شپ

فلمی ڈائری

کرشنا شاہ کی عظیم فلم "شالیمار" جس
پر پانچ کروڑ سے زیادہ روپیہ صرف ہو چکا ہے
اور جس کی پبلسٹی پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا
جا رہا ہے کب نمائش کے لئے پیش کی جائے
گی کوئی نہیں بتا سکتا۔ فلم کی شوٹنگ کی طرح
ڈبنگ بھی بنگلور میں ہوئی اور ریل ۷۰ ایم ایم
میں تیار کرنے کے لئے لندن بھیج دیئے گئے۔ فلم
کے پرنٹس کسی کو نہیں بتائے گئے حتیٰ کہ
ڈسٹری بیوٹرس بھی اس کی دید سے محروم
ہیں۔ جیسے ہی فلم کے پرنٹس لندن سے
آ جائیں گے نمائش کی تاریخ کا اعلان کر دیا
جائے گا۔ فلم کے بارے میں بہت سی باتیں
مشہور کی گئی ہیں اور زور و شور سے ان کی
تشہیر کی جا رہی ہے۔ سب سے پہلی بات تو
یہ ہے کہ یہ سب سے پہلی ہند۔ امریکی فلم
ہے لیکن یہ بات غلط ہے۔ اس سے پہلے
دوسری مرچنٹ کی کئی فلمیں جیسے "شیکسپیئر والا"
اور "بمبئی ٹاکیز" ہندوستانی اور امریکی
مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ دوسری بات
پہلی مرتبہ امریکی اداکاروں نے ہندوستانی
فلم میں کام کیا ہے۔ اس بات میں بھی کوئی
صداقت نہیں کیونکہ آئی وری مرچنٹ کی کام
میں بیرونی اداکاروں نے کام کیا ہے
[illegible] کے علاوہ ڈی میں خیز ڈاکیٹرو نے کام
کیا ہے۔ ویسے "شالیمار" کے بیرونی
اداکاروں میں صرف ایک ہی بڑا نام ہے
اور وہ ہے ریکس ہیریسن اور وہ بھی
اب اپنی فلمی زندگی کے ریٹائرمنٹ کے
قریب ہے۔ تیسری بات یہ کہ پہلی مرتبہ
میسور کے مہاراجہ کے محل کو "شالیمار"
میں پیش کیا گیا ہے۔ اس بات میں
بھی کوئی صداقت نہیں کیونکہ "دلدار"
"شیلے شرم" اور بعض دوسری ہندی فلموں
میں یہ محل دکھایا جا چکا ہے۔ کرشنا
شاہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ اس فلم
کی شوٹنگ صرف تین ماہ میں مکمل کر لی
گئی ہے حالانکہ ہمارے پاس بہت سے
فلم ساز ایسے ہیں جو اس سے کم عرصے
میں اپنی فلمیں مکمل کر لیتے ہیں۔ اس سلسلے
میں ستیہ جیت رے، مرنال سین، اپلیش
چٹرجی اور شیام بینیگل کے نام قابل
ذکر ہیں۔ خود اس فلم کی یونٹ کے ایک
فوٹوگرافر نے "مرنے رے لو" کی شوٹنگ
صرف ۲۴ گھنٹے میں مکمل کی تھی۔ اس فلم
میں بیرونی ٹیکنیشن کام کر رہے ہیں لیکن
یہ بات بھی اب نئی نہیں رہی۔ "شعلے"
میں بیرونی عملے سے کام لیا گیا تھا اور اب
[illegible] "برننگ ٹرین" میں
بھی۔ سیپی کی "شان" میں اور سپے کی
"عبداللہ" میں بیرونی عملے سے کام
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کرشنا شاہ کا [illegible]
[illegible]
یہ فلم فنی اعتبار سے تمام ہندی فلموں کو
پیچھے چھوڑ دے گی۔ یہ تکنیک کے اعتبار سے
ایسی ہی اچھی فلم ہوگی جیسی کہ JAWS یا
GOD FATHER۔ اب
دیکھنا یہ ہے کہ "شالیمار" کی پبلسٹی کے بعد فلم
باکس آفس پر کیا رنگ لاتی ہے۔
★ دھرمیندر اور ہیما مالنی انڈسٹری کی
سب سے زیادہ مقبول اور خوش قسمت فلمی
جوڑی ہے۔ خوش قسمت ان معنوں میں کہ
ان کی جتنی فلمیں باکس آفس پر کامیاب
ہوئی ہیں اتنی کسی اور فلمی جوڑی کی نہیں ہوئیں
ان کے آپسی تعلقات کے بارے میں فلمی دنیا
میں کئی باتیں مشہور ہیں۔ مگر اب جس بات کا
انکشاف ہوا ہے وہ یقیناً چونکا دینے
والا ہے۔ ایک مشہور فلمی رسالے کے نامہ نگار
سے بات چیت کرتے ہوئے دھرمیندر
نے کہا کہ ہیما مالنی اس کی بیوی ہے۔ دھرمیندر
نے بتایا کہ ان کی شادی ۱۹۷۹ء میں میسور
میں ہوئی جبکہ ہیما "امورت" کی شوٹنگ میں
اور وہ "مالا" کی شوٹنگ میں مصروف تھا
[illegible] تھا کہ ان دونوں نے ایک دوسرے
کے [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
... دونوں کے
... تو کہتا ہے۔
... کی ... اور
... چاہتی ... کہ وہ اپنی
... نے جب میا
... تو میا مالینی نے
... کہا ہے وہ سب
... ہمیشہ ایک ... مالا
... منگل سوتر"
... مندر نے
... انسان ہے
... ؟
... نہیں
... حد
... دنوں ان
... کی قدر ہوتا ہے
... سے ہو بھی ... کے
... اپنے گھر کے ایک ...
... یہاں ...
... بعض
... پروڈیوسروں کو
[illegible]

★

... فلم ...

پڑا ... [illegible] بہت ... ایک ترکیب سوجھی۔ قریب ہی میں ایک شادی خانہ تھا جہاں ہر اتوار کو کسی نہ کسی شادی کی تقریب ضرور ہوتی تھی۔ کرن کمار نے شاہ مراد سے کہا کہ وہ شادی کی تقریب میں شرکت کریں گے۔ ان دونوں نے تقریب میں شرکت کی اور پھر شاندار دعوت اڑائی۔ پھر اس کے بعد دونوں کا معمول ہو گیا کہ ہر اتوار کو شادی کی تقریب میں شریک ہوتے اور دعوت کھا کر لوٹ آتے۔ پھر کئی دنوں کے بعد جب شادی خانے کے چوکیدار کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ دونوں ہر شادی کی دعوت میں بلا ناغہ شرکت کرتے ہیں تو اس نے انہیں دروازے پر ہی روک دیا۔ کسی طرح سے انہوں نے چوکیدار کو سمجھایا اور دو روپے رشوت دے کر دعوت میں شرکت کی۔ اس کے بعد سے ہر دعوت کے لئے انہیں چوکیدار کو دو روپے رشوت دینی پڑتی۔

... [illegible] اطلاعات ... فلیٹ بھی خالی کر ... تو وہ ... کے ہاں پہنچا اور ... اس کا ایک فلیٹ خالی ہے اور وہ وہاں ... سکتا ہے اس ... کرایہ کی

... تم کیا کرایہ دو گے جاؤ جا کر ٹھہر جاؤ۔ اس آدمی کو سنجیو کمار کے رویئے پر تعجب ہوا کہ سنجیو جیسا کنجوس اسے مفت میں اپنا فلیٹ رہنے کے لئے دے رہا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سنجیو کی دریا دلی کی تعریف کی اور فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب اس آدمی کی مالی حالت ٹھیک ہو گئی تو اس نے سنجیو کمار کو فلیٹ کا کرایہ دیا۔ سنجیو نے کرایہ لیتے ہوئے کہا بھائی یہ تو ایک مہینے کا کرایہ ہے۔ مجھے تو کرایہ اس وقت سے چاہئے جب سے تم فلیٹ میں مقیم ہو۔ اب اس بیچارے کو پتہ چلا کہ سنجیو کی دریا دلی کا کیا مطلب تھا۔۔

★

بنگلور میں شریمتی اندرا گاندھی کی کامیابی سے بہت سے فلم ساز سوچنے لگے ہیں کہ کہیں پھر ایمرجنسی کا زمانہ لوٹنے والا تو نہیں ہے۔ ایمرجنسی کے دوران سنسر شپ کی سختیوں سے ہمارے فلم ساز اس قدر پریشان ہوئے تھے کہ آج بھی اس کے تصور سے ان کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگتا ہے۔ ویسے جنتا حکومت نے بھی اتنی کھلی چھوٹ نہیں دے رکھی ہے۔ جس کا وہ خواب دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ فلم پروڈیوسرز کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ سنسر شپ کے قانونی جواز کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ داخل کی جائے۔ یہ فیصلہ سنسر شپ

کے لیے وہ سکتے ہیں کہ بہت [illegible] کیا
گیا ہے۔

*

گیتا بالی فلم ستارہ ادا کار [illegible]
سے ایک فلمکاروں کا تک ہر ایک اس وقت
کے انتظار میں رہتا ہے جب اس کی قسمت کا
ستارہ چمکے اور اسے آسمانِ شہرت پر پہنچنے
برسوں اس انتظار میں گزر جاتے ہیں تب
کہیں جا کر چند خوش نصیبوں کو اس انتظار کا
پھل ملتا ہے۔ "مقدر کا سکندر" کے کہانی
کار بھی چند خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں
لکشمی کانت شرما بمبئی آنے سے پہلے دلی میں
آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے ایک عرصے
سے فلمی دنیا میں جدوجہد کر رہے تھے۔ انہوں
نے اس سے پہلے تین فلمیں "تمہاری میری
زندگی" "سورما" اور "زہریلا انسان" لکھیں
لیکن یہ تینوں فلمیں باکس آفس پر فلاپ
ہو گئیں۔ "مقدر کا سکندر" کی کامیابی کے
ساتھ ہی ان کی قسمت کا ستارہ چمکا اور آج
بیس فلمیں ان کے ہاتھ پر ہیں۔

*

حیدرآباد کا مشہور مزاحیہ ڈرامہ
[illegible] خان کا "ادرک کے پنجے" جس کے سارے
ہندوستان میں تین ہزار سے زائد شوز پیش
ہو چکے ہیں اب فلمایا جا رہا ہے۔ فلم
میں مرکزی کردار بھی [illegible] خان ہی ادا کریں گے

*

گلزار اور راکھی [illegible] کے

کیونکہ آندھی کی [illegible] کو
[illegible]
[illegible]
[illegible]

تعلق ہے سوالات ہی ہیں [illegible]
سوالات کا کوئی جواب دینا نہیں چاہتی
ایسا لگتا ہے کہ راکھی نے اپنے ذہن
سے ہر اس تصویر کو کھرچ ڈالا ہے
جس پر گلزار کا نام تحریر تھا۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible] پیش کی جائے گی۔



بدلتے رشتے

فلموں سے دل میں اترنے والے رشتے نفرت اور محبت کی کشمکش میں کبھی کبھی بدل بھی جاتے ہیں۔ سو ریش کمار کا فلم "بدلتے رشتے" ایسے ہی رشتوں کی کہانی ہے جو جوتش ودیا کی کرامات سے شروع ہوتی ہے اور ایک ایسے حیرت انگیز انجام پر ختم ہوتی ہے جہاں زندگی ستاروں کا کھیل نہیں رہتی بلکہ محبت و نفرت کے متغیر جذبات کے ساتھ ایک تلخ حقیقت بن جاتی ہے۔ کہانی کی بنیاد محبت کے اسی عام اور گھسے پٹے مثلث پر رکھی گئی ہے جس پر آج تک ہزاروں کہانیاں لکھی جا چکی ہیں اور سینکڑوں فلمیں بن چکی ہیں۔ لیکن پس منظر کے تانے بانے کچھ اس انداز سے بنے گئے ہیں کہ تماشائی کی توجہ شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔

کہانی ایک خوبرو نوجوان منوہر (رشی کپور) سے شروع ہوتی ہے جو شملہ کی حسین فضاؤں میں مسافروں کے گائیڈ کا فرض انجام دیتا ہے۔ انہی فضاؤں میں ایک ریلوے اسٹیشن پر وہ ساوتری (ریناراے) سے ٹکراتا ہے۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر وہ ایک دوسرے سے قریب آ جاتے ہیں مگر (اسے اتفاق) نہیں بلکہ محض ان کے دلوں کی دھڑکنیں

پھر بھی ان دھڑکنوں کو پیار کے رشتے میں بدلنے کے لئے منوہر کو کئی جتن کرنے پڑتے ہیں کئی بچکانہ حرکتیں کرنی پڑتی ہیں تب کہیں ساوتری کا دل پگھلتا ہے۔ ابھی یہ محبت کے راہی پہلی منزل بھی طے کرنے نہیں پاتے کہ ساوتری کی شوخ نظریں اور جادو جگانے والی آواز ایک اور نوجوان ساگر (جیتندر) کے دل کو گھائل کر دیتی ہے۔ ساوتری ساگر کی چھوٹی بہن کو سنگیت سکھانے کے لئے اس کے گھر جایا کرتی ہے اور ساگر سنگت کی لہروں میں ڈولتے ہوئے پیار کے ساگر میں ڈوبتا جاتا ہے۔ اس کے گھر والے اسے کنارے سے لگانے کی خاطر ساوتری کے گھر والوں سے رشتے کی بات کرتے ہیں تو ساوتری کی ماں (دینا پاٹھک) اور اس کا بھائی (اسرانی) فوراً اس رشتے کو قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن ساوتری جو منوہر کے پیار سے سرشار ہے اس رشتے سے انکار کر دیتی ہے اس ذہنی صدمے کی وجہ سے ساوتری کی ماں پر فالج کا حملہ ہوتا ہے اور وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ساوتری اس کٹھن آزمائش میں بھی اپنے پیار کو قربان کرنا نہیں چاہتی اور ہر قیمت پر منوہر کو اپنانا چاہتی ہے۔ اسی دوران SKIING کرتے ہوئے منوہر ایک خطرناک حادثے سے دوچار ہوتا ہے اور بڑی مشکل سے ڈاکٹر اس کے سر کا آپریشن کرکے اس کی جان بچا پاتا ہے۔ ساوتری کے محبوب کی جان تو بچ جاتی ہے لیکن اس

انکشاف کرتی ہے۔ وہ اُسے اپنے باپ کی پیشن گوئی سے آگاہ کرتی ہے کہ ساوتری جس کسی سے شادی کرے گی وہ شادی کے بعد چالیس دن سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ چھایا کے باپ پروفیسر (اے۔ کے۔ ہنگل) نے اس سے پہلے ساوتری کے بھائی اور اس کی ماں کے تعلق سے جو پیشن گوئیاں کی تھیں وہ بالکل سچ ثابت ہوئی تھیں۔ ساوتری سوچتی ہے کہ اس نے منوہر کو اپنانا چاہا اور وہ ایک شدید حادثے سے دوچار رہا۔ اب اگر وہ منوہر سے شادی کرے گی تو یقیناً پروفیسر کی پیشن گوئی سچ ثابت ہوگی۔ منوہر کی زندگی کی خاطر اور اپنی ماں کی خوشی کے لئے ساوتری ساگر کے رشتے کو منظور کر لیتی ہے۔ لیکن انسانیت کے ناطے شادی سے پہلے وہ ساگر کو پیشن گوئی سنا دیتی ہے۔ ساگر اسے بتاتا ہے کہ جوتش میں اس کا یقین نہیں ہے اور اگر پیشن گوئی سچ بھی ثابت ہو تو ساوتری کے ساتھ چار دن اس کی زندگی کی تمام خوشیوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔ شادی ہو جاتی ہے سہاگ رات کو ساگر جب ساوتری کے قریب پہنچتا ہے تو ساوتری کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ سمجھ جاتا ہے کہ ساوتری نہیں چاہتی ہے کہ چالیس دن کے لئے اس کی زندگی میں آنے والا آدمی اس کی بہاروں کو لوٹ لے بہاروں کو لوٹنے کے لئے ساگر کا بڑھتا ہوا ہاتھ رک جاتا ہے اور اسی ہاتھ سے وہ

[illegible] کر دیتا ہے [illegible] وہ اپنی
[illegible]

[illegible] اس کی بیوی [illegible]
[illegible] طرح ہو جاتا ہے
[illegible] کے نشان ابھرتے ہیں اور
[illegible] شوہر ایک
[illegible] اور وہ صنف انسانی کا روپ
[illegible] کے
[illegible] آپ شوہر
[illegible] نفرت ہو جاتی ہے اور وہ حسنی ساوتری
[illegible] دل [illegible] بچی کے
[illegible] کسی دوسرے مرد کے خیال کی پرچھائیں
[illegible] نہیں ہوتی۔ [illegible] تمناؤں اور آرزوؤں
[illegible] روشن کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے
[illegible] آپ کو پتہ چلتا ہے کہ اس روشنی کے پیچھے [illegible]
[illegible] ایک روشن سایہ ہے جو موم بن کر
[illegible] ہے اور وہ ہے شوہر۔ پھر وہ وندنا
[illegible] ؟ وہ تو صرف ایک دھوکہ تھا
[illegible] زندگی ایسے کتنے ہی
[illegible] سے بہل جاتا ہے

کہانی کار مہندر [illegible] نے ہندوستانی
[illegible] کے آدرش روپ کو پیش کرنے کی
[illegible] کہانی کو حقیقت سے بہت دور کر دیا
[illegible] کہانی کار کا بھی کوئی قصور
[illegible] آدرش [illegible] اب صرف
[illegible] ہیں۔
[illegible] زندگی میں آدرش انسان تو کبھی
[illegible] بہت کم [illegible] شوہر اگر

[illegible]
[illegible]
ڈرامے کا [illegible]
[illegible] شوہر [illegible]
[illegible]
[illegible] جاتا ہے۔ [illegible]
[illegible] ناکام کوشش کی گئی ہے۔ [illegible]
کا اسکرپٹ ہے کہانی کی [illegible] دلچسپی اور
سسپنس کو پوری طرح برقرار رکھتا ہے۔
ہدایت کار آر۔ [illegible] نے [illegible] اور
کرداروں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے
ایک [illegible] ہوا ہوتا ہے
ساوتری [illegible] ہے کہ ایک ناگ سانپ اس
کے سینے پر بیٹھا ہے۔ ساوتری سانپ کو
اپنے ہاتھ سے پرے جھٹک دیتی ہے اور
ساگر سے لپٹ جاتی ہے۔ یہ ایک سین
ساوتری کے جذباتی [illegible] کی پوری
تصویر کشی کرتا ہے۔ ساگر کے ساتھ موٹر کا
حادثہ اور پھر اس کا جلتی ہوئی موٹر کار سے
نکلنا جیسے [illegible] پھول سے نکل رہا ہو،
بچکانہ اور [illegible] ہے۔ رشی کپور نے
ایک [illegible] عاشق مزاج نوجوان کے
روپ میں بہت اچھی اداکاری کی ہے لیکن
فلم کے دوسرے حصے میں ایک [illegible] اور
خودغرض [illegible] کے روپ میں ان کی اداکاری
اتنی متاثر کن نہیں ہے۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] میں پیش کرنے
کی [illegible] کوشش کی ہے۔ [illegible]
[illegible] اسرانی، [illegible]
قابل ذکر ہیں۔ مکالمے [illegible] نے تحریر کئے
[illegible] ہیں انہیں
[illegible]

لکشمی کانت پیارے لال کی موسیقی اوسط
درجے کی ہے۔ [illegible] کو گلوکارہ
کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے موسیقی
کو اور دلکش [illegible] ہونا چاہیئے تھا۔
گیت [illegible] کے [illegible]
ہیں۔

مختصر یہ کہ "[illegible]" ایک اوسط
درجے کی فلم ہے جو دیکھی جا سکتی ہے۔